

سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

بازیگر



بازگیزی

سے قریب دو فٹ اوپر کھڑکیاں نصب تھیں۔ دونوں کھڑکیاں اندر سے بند تھیں اور اندر ہی کی جانب پردے لگے ہوئے تھے۔ متعدد روشن دانوں نے کمرے میں ہوا اور روشنی کی کمی نہیں رہنے دی تھی مگر روشن دان بہت اونچے تھے۔ بچوں کی آمد و رفت روکنے کی خاطر کھڑکیوں کے نچلے حصے پر لوہے کی جالی دار سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ارشاد علی کے محکم کے بہ موجب ہم اندرونی کمرے میں بند ہو جاتے اور باہر سے وہ کنڑی لگا دیتا تو کرسی رکھ کر کھڑکیوں سے بیرونی کمرے میں کودا جاسکتا تھا۔ کھڑکیاں نہ ہوتیں تو دروازہ توڑنا ایسا دشوار نہیں تھا لیکن ارشاد علی کو قوت ہی کتنا چاہیے تھا، بس اس قدر کہ اندرونی کمرے میں ہمیں بند کرتے ہی وہ بوٹلی اپنے قبضے میں کرے اور آٹا فانا انتظار گاہ سے نکل کر اسٹیشن کے بیچوم میں گم ہو جائے۔ سہلی کے ساتھ یقیناً رکاوٹ پیش آتی۔ مال ہاتھ میں آجانے کے بعد اسے سہلی سے غرض بھی کیا تھی۔ سہلی کو دہیں چھوڑ کے وہ کسی محفوظ سمت کو نکل سکتا تھا۔

سورج زمین سے خاصا اوپر ہو چکا تھا۔ یہ بڑی لائن کی گاڑی تھی۔ رفتار بہت تیز تھی۔ ڈبا بھی کشادہ تھا۔ سہلی بانو کے خیال نے مجھے روکے رکھا۔ میں جمرو اور زورا سے نہ پوچھ سکا کہ انہوں نے ارشاد علی سے کس درجے کا سلوک کیا تھا۔

گاڑی آچکی تھی۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا اژدحام تھا۔ خدمت گار نے ڈبے تک ہماری رہبری کی۔ سہلی کے ہاتھ پاؤں پکپکا رہے تھے۔ سانس بھی قابو میں نہیں تھی۔ پتھل نے نشست پر بٹھا کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اسے بازو میں سمیٹ کے بولا "اب مٹی بھاڑ دے ری ساری۔"

سہلی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہنسل کے شانے پر سر رکھ کے وہ پھوٹ پڑی۔ بہت دیر بعد پتھل کی تسلیوں سے کہیں اس کے آنسو ٹپکے۔

گاڑی چلنے سے چند منٹ پہلے زورا اور جمرو خندہ پیشانی سے ڈبے میں داخل ہوئے۔ "بس استاد!" جمرو نے زبردور آواز میں کہا "گاڑی چلنے تک شاید لوٹ کے نہ آئے۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہے۔"

اس طرح سہلی کو کچھ یاد کرنا جمرو کا مقصود تھا۔ ہنسل نے بھی ان سے تفصیل نہیں پوچھی۔ جمرو اور زورا دو ایک رکے لیے ضرور ارشاد علی کو خود سے بے گانہ کر کے آئے دن گئے۔

انتظار گاہ کا اندرونی کمرہ ایسی جگہ نہیں تھا جہاں سے کوئی باہر نہ نکل سکے۔ دروازے کے ساتھ دائیں بائیں فرش

دلی تک کا سفر پورے دن اور رات پر محیط تھا۔ ہوش میں آتے ہی ارشاد علی سے بعد نہیں کہ وہ سیدھا پولیس کا رخ کرے۔ وہ کوئی بھی دیوانگی کر سکتا ہے۔ نواب عابد علی خان نے جس طرح حیدر آباد سے جانے والی گاڑیوں پر پیرے بٹھا دیے تھے، ہماری جگہ میں بھی آنے والے ایشینوں پر پولیس چھاپے مار سکتی ہے اور ہمیں تلاش کرنا نہایت آسان ہوگا۔ چار آدمی، ساتھ میں ایک عورت اول درجے کے مسافر ان عموں اور ایسی وضع قطع کے حامل! زور جو اہر کی پولی نہیں محفوظ نہیں کی جاسکتی تھی۔ سامان میں نیپے اور کارتوس الگ تھے۔ شاید مختلف ڈبوں میں ستر کرنا ہمارے لیے بہتر ہوتا یا پھر آنے والے کسی ایشین پر اتر کے کوئی اور گاڑی پکڑنی چاہیے تھی۔

گامڑی من ماڑ سے دور آگئی۔ ہم صم سلتی بانو نشست کے کوئے میں دبی ہوئی تھی۔ نیشنل در تک اس کے قریب بیٹھا جانے کیا کتنا برا پھر وہ سامنے کی نشست پر آگیا۔ ابھی تک کسی کے چرے سے غشیں دور نہیں ہوئی تھیں۔ اس کا سبب محض مرکز شہ رات کا غبار نہیں ہوگا یا ورپش ستر کی طوالت کا بار۔ میری طرح ان کے سروں پر بھی کڑی جلا بن رہی ہوگی کہ وہ مجھ سے زیادہ شامل رہے تھے۔

جمو اور زورا، ارشاد علی کو ختم کر کے نہیں آئے ہوں گے۔ اڑے پاڑے کے لوگ اور ہوتے ہیں۔ وہ ارشاد علی کو اندرونی کرے کی آرام کرسی یا صوفے پر لٹا کے آئے ہوں گے۔ خدمت گار کو ابتدا میں بھٹلنے لے آج بھی بخشش دی تھی اور میں نے بھی نوازا تھا۔ وہ مسلسل سلام کرتا رہا تھا۔ انتظار گاہہ واپس جا کے جیسے ہی خدمت گار کی نظر بے حس و حرکت ارشاد علی پر پڑی، وہ اپنے افسر کو مطلع کرنے لگا۔ کوئی میل و جیت کے بغیر افسر کو طیب اور پولیس طلب کرنا چاہیے۔ طیب کی کوششوں سے ارشاد علی جلد ہوش میں آسکتا ہے۔ اپنے حواس کے قیام و قرار کے بعد اسے دو میں سے کوئی ایک فیصلہ کرنا ہے۔ اپنی جاں بخشی غنیمت سمجھے اور نوشتہ مجھ کے دانش مندی کا ثبوت دے یا اپنی آگ کا فیلہ پولیس کے ہاتھ میں تھما دے۔ سنا ہے، ڈوتا ہوا آدمی کنارے پر پھڑپھڑے ہوئے لوگوں کے ڈوب جانے کی آرزو بھی کرتا ہے، خواہ دوستوں کے لیے کوئی ایسا نہ چاہے، دشمن تو دشمن ہوتے ہیں۔ دوسرا فیصلہ صاف خود کشی تھی لیکن روح کی طمانیت کے ساتھ فیصلہ کرنا ارشاد علی کے لیے اتنا سنا نہ ہوگا۔ زندگی زور جو اہر کے بڑے سے بڑے ذخیرے سے پیش بہا ہوتی ہے۔ یہ زندگی ہی کا غلبہ تھا کہ اس نے نظام آباد ایشین پر پولیس دیکھی تو سلتی

بانو کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ اسے پولی بھی ساتھ ساتھ لے جانی چاہیے تھی مگر پولی کے ساتھ زندگی عذاب سے دو چار ہو سکتی تھی۔ زور جو اہر ارشاد علی کا ترکانہ نہیں تھے کہ ابداد سے پشیمانی کا خیال کاٹنے بجھانے رکھے۔ خاموشی میں ارشاد علی کے لیے بڑی نجات تھی۔ سلتی کی بازیابی خارج از امکان نہیں تھی۔ امید رکھنے والے کو دنیا بیش چھوٹی نظر آتی ہے، دیواریں بھی۔ قمار باز از سر نو بساط بجھانے سے نہیں گھبراتا بلکہ چمکتا رہتا ہے۔ ارشاد علی بہر حال ایک آدمی تھا۔ آدمی احساس سے عبارت ہے۔ ممکن ہے، کوئی خوابیدہ احساس ارشاد علی کے سیر خانے میں بیدار ہو جائے اور آئینہ دیکھنے کے لیے خند کرے۔

بھٹل کی ہدایت پر سلتی نے حویلی والے کپڑے پہن لیے، برقع بھی نکال لیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد چالیس گاؤں نامی ایشین آگیا۔ درمیان میں جمو اور زورا نے سلتی سے آڑ رکھ کے سامان میں کچھ رو دیا کر دیا تھا۔ بھٹل کے اور میرے کپڑے سلتی کے اپنی کس میں رکھ دیے گئے تھے۔ سلتی نے اور کارتوس والی اپنی ساتھ لے کے جمو اور زورا چالیس گاؤں نامی ایشین پر اتر گئے۔ بھٹل نے زور جو اہر بھی ان کے حوالے کر دیے تھے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو ایشین سے باہر جا کے بس نئے ٹکٹ خریدنے تھے اور کسی بھی ڈبے میں بیٹھ جانا تھا۔ اس اہتمام سے ظاہر تھا کہ بھٹل کے دماغ میں بھی وہ خود رو دم و قیاس نمودار ہے تھے جن سے میرا سر جکا ہوا تھا۔

من ماڑ سے چلے ہوئے تین گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ گیارہ بجے ہمسالہ جکشن آگیا۔ کسی سپاہی نے ہمارے ڈبے کا رخ نہیں کیا۔ پلیٹ فارم پر بھی دور دور تک پولیس نہیں تھی۔ چالیس گاؤں میں زورا اور جمو کے ڈبے سے اتر جانے کے بعد بھٹل نے چائے منگوائی تھی۔ ہمسالہ پر پولیس کی طرف سے مطمئن ہو کے زورا کھانے پینے کا سامان دے گیا تھا۔ دو گھنٹے بعد کھنڈو جکشن آگیا۔ اس بار جمو ہمارے ڈبے کے گرد چکر لگا رہا۔ ناشایب اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ دوپہر کے کھانے کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی۔ اٹارے سے ہوتی ہوئی گاڑی ساڑھے پانچ بجے بھوپال پہنچ گئی۔ دلی جتنی قریب ہو رہی تھی، پولیس کی دست اندازی کا اندیشہ اتنا ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔ ڈبے سے زور جو اہر چلے جانے سے سلتی بانو کا چہرہ گھبر گیا تھا۔ اطمینان صرف چہرے کا نہیں ہوتا، آدمی کی حرکات و سکنات میں بھی ایک توازن آ جاتا ہے۔ جمو اور زورا کے ساتھ نہ ہونے سے بڑی ایوا سی ہو گئی تھی۔ سفر میں ساتھیوں

کی کثرت سے منزلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ بھوپال شہر گزر جانے کے بعد میں ادھر کی برتھ پر چلا گیا۔ سلتی نے بھی مسلسل دو بے چین رائیں گزاری تھیں۔ عورت کو نیند میں بھی حجاب کا کیسا خیال رہتا ہے یا یہ سلتی کی بات تھی۔ خوابیدگی کی حالت میں بھی سلتی کا سلیقہ دیدی تھا۔ سر سے سر تک بدن چادر میں چھپائے، چپکے چپکے سوتی رہی۔ درمیان میں آنے والے ایشینوں کی جگہ بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ جتنا جکشن پر بھٹل کی صداؤں سے کہیں آنکھ کھلی۔ جانے کہاں سے جمو نہیں قسم کے کھانوں کا انبار اٹھایا تھا۔ ہم تینوں نے سیر ہو کے کھایا۔ جمو اور زورا کو اب ڈبے میں واپس آ جانا چاہیے تھا لیکن نہ بھٹل نے واپسی کے لیے ان سے کچھ کہا نہ انہوں نے زبان کھولی۔ چالیس گاؤں میں انہوں نے تیسرے درجے کے ٹکٹ لیے تھے اور جگہ نہ ملنے پر انٹر میں بیٹھ گئے تھے۔ ہمسالہ اور بھوپال میں ٹکٹ چیکر ہمارے ٹکٹ چیک کرنے آیا تھا۔ زورا بتا رہا تھا کہ کھنڈو میں کسی قوطی ٹکٹ چیکر نے ان کے ڈبے کا بھی پھیرا لگایا تھا اور انٹر میں ان کے ستر کرنے پر معترض ہوا تھا۔ زورا نے جب انٹر کا کرایہ ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو ٹکٹ چیکر نے پروائی سے بولا ”رکھو یا رب، جب تک گوری سرکار ہے، بیش کرو۔“

زورا اور جمو اس سے نہ کہہ سکے کہ گوری سرکار کا پوتا تو انہوں نے پہلے ہی ترک کر دیا ہے۔ ان کے پاس تو من ماڑ سے دلی تک کے اول درجے کے ٹکٹ ہیں۔

صبح خوب روشن ہو گئی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے گاڑی دلی شہر میں داخل ہو گئی۔ زورا اور جمو نے آخر تک احتیاط کی۔ دلی ایشین ہی پر وہ ہمارے ساتھ ہوئے۔ ارشاد علی کے سر میں کسی وقت بھی سودا سا مسکتا تھا۔ ممکن ہے اس بار یکم بین کے ذہن پر یہ رمز نقش نہ ہو گیا ہو کہ ہم نے من ماڑ سے آگے کسی بھی ایشین سے راستہ بدل دیا ہوگا۔ عاقبت اندیشی یہی ہے کہ ہمیں اس گاڑی سے دلی کا سفر نہیں کرنا چاہیے۔ جزیری کی اپنی خامیاں، خویاں ہیں۔ کوئی عجب نہیں، یہی نتیجہ سوچ کے ارشاد علی نے ہمارے تعاقب کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو۔ اس کے لیے یہ جتنی مستزاد تھی کہ پولیس کو میمیز کرنے سے مراد اپنے آپ سے بھی دست بردار ہو جانا ہے۔

دلی ایشین بھول بھلیوں کے مانند ہے۔ ہر وقت ایک ہنگامہ، کسی گاڑی کے کوچ کا قنارہ پٹ رہا ہے۔ کسی گاڑی کی آمد کا غلغلہ ہے۔ دلی سے ہمیں فیض آباد کا ٹکٹ لینا تھا لیکن جب بھٹل نے زورا اور جمو سے مراد آباد کے ٹکٹ کے لیے کہا تو تیسرے پیر زمین پر پتے نہ رہ سکے میرے لیے یہ بہت

ان کی، ان ہوتی تھی۔ میں تو بھٹل کو دیکھتا رہا۔ مراد آباد میں مولوی صاحب کی موجودگی کی کسی توقع ہی میں بھٹل نے یہ عزم کیا ہوگا۔ درمیان میں یقیناً مجھ سے تسلسل کی کوئی چوک ہو گئی تھی۔ مجھے کہیں بھی گمان نہیں ہوا کہ بھٹل کو حیدر آباد میں کسی جگہ مولوی صاحب کی انکی منزل کا اشارہ ملا ہے اور اسے دلی آنے کی کیا ضرورت ہے۔ سلتی بانو کو زریں کے پاس فیض آباد پہنچنا ہے تو من ماڑ کے قریب کے کئی راستے ہیں۔ حیدر آباد میں ہر دم میں بھٹل کے ساتھ رہا تھا۔ صرف ایک جگہ جب ڈاکٹر ناصر مرزا کے بتائے ہوئے پتے پر وہ مولوی صاحب کی بالائی اقامت گاہ پر گیا تھا تو میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہیں خادمہ سے باز پرس میں اسے مولوی صاحب کے آئندہ پراڈ کی سن کر من ملی ہو۔

ڈھانکی گھٹنے انتظار کے بعد ساڑھے دس بجے مراد آباد جانے والی پینجر ٹرین ہمیں مل گئی۔ دلی سے مراد آباد تک سو میل کا فاصلہ گاڑی نے ریگ ریگ کے کاٹا۔ راستے بھر میں نے مولوی صاحب کی بابت بھٹل سے کوئی سوال نہ کیا۔ زورا اور جمو سے میں اپنے آپ ہی کو تلقین کرتا رہا کہ مجھے کون سا کام ورپش ہے۔ جو پہلے ہوتا رہا ہے، اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کوشش کر لینے میں یہ ملال تو نہیں رہتا کہ ایک خانہ خالی رہ گیا تھا۔ خوش نمائی کی امید کم سے کم رکھی جائے تو آدمی ٹھکانے سے رہتا ہے۔ شکت تو یہ امید ہی کرتی ہے۔

مراد آباد کے ارد گرد کے ایشین مجھے اذیر تھے۔ امر ہے سے مراد آباد میں میل کی دوری پر ہے۔ امر ہے ہی سے میرا دل اڑنے لگا تھا۔ آدمی دوسروں کی لگا میں خوب کھینچ سکتا ہے۔ خود کو قابو میں رکھنے کی دسترس اسے نہیں ہوتی۔ مراد آباد ایشین پر قدم رکھ کے میرے ہاتھ پیر کھینچے گئے تھے۔ ہمیں زیادہ دور نہیں جانا تھا۔ ایشین کے عین مقابل، سڑک کے اس پار اسلامیہ مسافر خانہ واقع ہے۔ قلی نے ہمارا سامان وہاں تک پہنچا دیا۔ مسافر خانے کی دوسری منزل ایک زمانے سے ادھوری تھی۔ پہلی منزل پر ایک کشادہ کمرے میں سلتی بانو کا انتظام کر کے بھٹل نیچے مسافر خانے کے ٹیبلر کے پاس آگیا۔ فیجر کی تبدیلی ہو گئی تھی۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا اور مولوی صاحب کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ قصہ تمام ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ مرکز شہ تین چار دن کے مسافروں میں مولوی صاحب کا نام روز نچانے میں کہیں درج نہیں تھا۔ حیدر آباد سے مولوی صاحب کے براہ راست مراد آباد آنے کی صورت میں دو تین دن سے زیادہ کسی طور نہ ہوئے ہوتے۔ بھٹل سے بحث و تکرار فصول بھی در نہ کئی بار

میرے جی میں آئی، اس پر واضح کردوں کہ اب مراد آباد کے اسلامیہ مسافر خانے میں مولوی صاحب کے قیام کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انہوں نے اسی دن ہی طے کر لیا ہو گا جب حیدر آباد میں انیس نواب ثروت یار کی زبانی ہماری آمد کی اطلاع ملی تھی۔ نواب ثروت یار کا پتا ہم نے مسافر خانے کے روزنامے ہی سے حاصل کیا تھا۔ مولوی صاحب تو اس راستے سے اب گزر رہے ہیں اب بھی نہیں اور بھٹل کے خیال میں مولوی صاحب کو بے در پے حواش، ایک مسلسل دریدری و درماندگی سے تنگ آکے آخر اپنے آبائی شہر میں پناہ لینے کا کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے بھولے بھرے اہباب، اعزاء کے دروازوں پر دستک دی ہوئی۔ مغلوں کے زمانے سے مسلمانوں کی ایک سرائے بھی شہر میں موجود تھی لیکن وہاں کورا کے ساتھ قیام ممکن نہیں تھا۔

بھٹل کی گزرا شائع خواہش کی تعمیل میں منیجر نے کسی قدر توقف کے بعد اپنے معاون کو دفتر سے باہر بھیج دیا۔ غلط ہوئے پر بھٹل نے کسی تمہید کے بغیر اس سے کہا، "بہتر ہوگا، وہ کوئی سوال نہ کرے کہ دونوں کا وقت ضائع ہوگا۔ ایک پرانی معاملت کے سلسلے میں ہمیں مولوی محمد شتیق کی تلاش ہے۔ اس نام اور محلے کا کوئی شخص آئندہ مسافر خانے میں قیام کرے تو مار کے ذریعے ہمیں مطلع کر دیا جائے۔ دو ہزار روپے ایک بڑی رقم تھی۔ منیجر کی آنکھیں حیرت سے دوچار ہوئیں۔ بھٹل نے اس خدمت یا سلوک کے عوض دو ہزار روپے کی نذر کا وعدہ کیا۔ منیجر ایک اصل نوجوان تھا، اس نے ہمارے پتے پورے اہتمام سے گانڈھین کیے، پھر مسکراتے ہوئے بولا، "پاپ کا کام ہو جائے گا جناب عالی! اس مسرت سے بڑھ کے کوئی انعام کیا ہوگا۔" بھٹل نے کرسی سے اٹھ کر اسے گلے سے لگایا۔

بھٹل نے مسافر خانے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ سلمیٰ کے پاس زور اور جرد کو چھوڑ کے وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ انشیں سے کچھ فاصلے پر شہر شروع ہو جاتا ہے۔ بازار شاہی مسجد کے علاقے میں جامعہ قاسمیہ کا راستہ مجھے یاد تھا۔ تاکہ والے نے ہمیں شاہی مسجد کے سامنے اتار دیا۔ ایک بڑی مسجد کے اطراف دو منزلہ عمارتوں پر دارالعلوم قائم ہے۔ درس گاہیں بند ہو چکی تھیں لیکن ایک بنگالی طالب علم نے محلہ گھیر سید خاں میں مقیم دارالعلوم کے مہتمم کے گھر تک ہماری رہ نمائی کی۔ مغرب کی نماز کا وقت گزر جانے کے بعد ہم نے ان کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ وہ نہایت متین اور غلیظ بزرگ تھے۔ بیٹھک میں بٹھایا، شہرت منگوایا۔ مولوی

صاحب سے اچھی طرح واقفیت کے باوجود ایک عرصے سے انہیں مولوی صاحب کی کوئی خبر نہیں تھی۔ البتہ ان سے شہر میں مولوی صاحب کے کئی شناساؤں کے نام اور پتے معلوم ہو گئے۔ وہاں سے اٹھتے اٹھتے عشا کی اذان ہو رہی تھی۔ اس وقت کسی اور دروازے پر جانا مناسب نہیں تھا۔ پیدل چلتے چلتے ہم بازار منڈی چوک تک آ گئے۔

چوک میں دن کا منظر تھا۔ آٹے سامنے قریب قریب جگمگاتی دکانیں، خانچے والوں کی صدا، راہ گیروں اور خریداروں کا جھوم، ایک جانب گل فروش پھولوں کی ٹوکریاں لیے قطار سے بیٹھے تھے۔ بھٹل نے موتیا کے بست سے ہار خریدے۔ اتنے دنوں بعد یوں فرصت و فراغت سے بازاروں میں گھومنا عجیب لگ رہا تھا، "نایا نیا۔ اب نہ کوئی گراں باری تھی نہ وقت جلدیاد پر سے گزرنے کا احساس نیا۔ پس پانی کی بے حسی بھٹل کے تیوروں سے نمایاں تھی۔ پس پانی کا سکون بہت ٹھہرا ہوا اور پتھر لاسا ہوتا ہے۔ اپنے بہتر تمام کر لینے کے بعد آدمی کے پاس سوزش کے لیے رہ بھی کیا جاتا ہے۔ بے کار مباحث کچھ کیا کرے، پیتل کے بھیکے پتوں میں بار پھول بندھوا کے بھٹل پان کی ایک سادہ اور صاف ستھری دکان پر ٹھہر گیا۔ دکان میں لوہاں سنگ رہا تھا اور کرشن جی کے چھوٹے جیسے کے سامنے دیا روشن تھا۔ اچلے پکڑوں میں لمبوس، قنچہ لگائے عمر رسیدہ پڑاری نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور اہتمام سے بیڑا بنا کے تقریاً ٹھٹھری میں بھٹل کو پیش کیا۔ مکے ٹھٹھری میں ڈال کے بھٹل چل پڑا تھا کہ پیڑاری نے ہاتھ کے اشارے سے رک جانے کی درخواست کی اور قسم قسم کے سالوں سے مزین، چاندنی کے ورق میں لپٹا ہوا ایک بیڑا میری طرف بڑھا دیا "کھاؤ جیلا!" وہ دیدے ہتھماتے ہوئے بولا "ایک تم بھی کھاؤ اور جان ناؤ۔ بھگوان نے چاہا، پنڈت کو یاد کرو گے۔"

مجھ سے منع نہیں کیا جا سکا۔ میں نے بیڑا منہ میں رکھ لیا۔ بہت نفیس پان تھا۔ منہ میں خوشبو بکھر گئی۔

"جی بولو، راج مارا اسواو آیا؟"

"بہت اچھا ہے۔" میں نے ممنونیت سے کہا "کوئی خاص چیز ڈالتے ہیں آپ اس میں؟"

وہ اوپر کی طرف سر اٹھا کے بولا "سب اس کی لپٹا ہے، وہی ڈالتا ہے۔"

"بولتے ہیں ہاتھ کی بات ہوتی ہے پنڈت جی۔" بھٹل نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"ناما راج! جو بچ پوچھو بات ساری من کی ہے۔ پان

تو دن بھر لگتا ہوں پر دن میں کوئی کوئی آتا ہے جن میں من لگتا ہے۔"

"اس کی پہچان کیا ہوتی ہے پنڈت؟" بھٹل نے میرے منہ کی بات چھن لی۔ میں بھی یہی پوچھنے والا تھا۔

"اب کیا بولیں بھیا، اس کا تو روپ ہی اور ہوتا ہے۔" پنڈت جی بھی آواز میں بولا "بن باس والا الگ سے پہچانا جاتا ہے۔"

میرا جسم بل کھا گیا۔ پنڈت کی نگاہیں بھی پر مرکوز تھیں۔ مجھے حصار میں لیے ہوئے ہوں۔

"پکڑ پورے کرانے بنا نہیں مانے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا "سے دیو تیرا بھلا بہت نٹ کھٹ ہے۔"

"کیا ہے پنڈت جی۔؟" بھٹل نے تجسس سے کہا۔

"کیا بھلا؟" پنڈت آہ بھر کے بولا "اپنے ساجنا کو دیکھو"

لگبلا میں "نواگ لگ رہی ہے۔" سے کی بکڑن پوری ہے۔

"پھر اپنا ہی بھی تو بولو۔" بھٹل نے تندہ سے کہا۔

"رام جی سے پوری چودہ گانٹھیں نہ کھالیں تب تک منہ پیچھے کیا رہا۔ کیا اپنے کرے کوئی۔" پنڈت بے چارگی کے انداز میں بولا۔ جوگی کا کام پیچھے کرتے رہتا ہے۔ نہیں دم ہے تو پیچھے کر لے پھر اپنی بھی۔"

وہ کوئی بڑا قیافہ شناس اور جہاں دیدہ شخص تھا مگر قیافہ کوئی یوں ہی تھوڑا ہی لگتا ہے۔ میری آنکھوں، میرے چہرے میں دوسروں سے جدا ضرور کوئی ایسی بات ہوگی ضرور کچھ لکھا ہوگا جو پنڈت نے آسانی سے افند کر لیا۔ جرمن زبان وہی بڑھ سکتا ہے جو اسے جانتا ہو مگر کانڈ پر کچھ لکھا ہو تبھی تو۔ بھٹل اسے نمسکار کر کے آگے بڑھ گیا۔ پنڈت سے مزید پوچھنا اور اسے بتانا بھی کیا تھا۔ لوگ اس سے ہمدردی کا اظہار کیوں کرتے ہیں جو کسی ہم دردی کا خواباں نہ ہو۔

سارے راستے پنڈت کی باتیں میرے کانوں میں جھپٹی رہیں۔ میں تو کسی سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ سب کچھ خود تک محدود رکھتا ہوں لیکن یہ آنکھیں، یہ چہرہ، کہاں چھایاں۔ اگر ان سے ایسی ہی وحشت برستی ہے تو لوگ کیوں اور کیا جانتا چاہتے ہیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ مجھے تو اپنے آپ سے اور پیڑاری ہونے لگتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ نوازش کیسی گراں گزرتی ہے۔ اس سے تو ٹھنڈک کے بجائے جسم و جان میں اور تپش ہوتی ہے۔ یہ سلوک تو بھیک کے مانند لگتا ہے۔

چوک سے ٹانگے میں سوار ہو کے ہم مسافر خانے لوٹ آئے۔

منیجر عبدالبساط ہمارے انتظار میں باہر ٹھل رہا تھا۔ جرو

اور زور ابھی اس کے ساتھ تھے۔ شام کو شہر جاتے وقت بھٹل نے عبدالبساط کو رات کا کھانا ساتھ کھانے کی دعوت دی تھی۔ رسی رودتھ کے بعد وہ آمادہ ہو گیا تھا۔ ہماری عدم موجودگی میں اس نے عمارت کے کئیوں حصے میں ایک ہوٹل کے مالک صدیق باورچی کو احکام دے رکھے تھے کھانا تیار ہو چکا تھا اور دھڑکی میز پر دسترخوان سجایا ہوا تھا۔ سلمیٰ کے لیے ایک طشت اور پیچ دیا گیا۔ اتنے کدورت میں اتنی اقسام کے خوش ذائقہ کھانے تیار کر لیتا بجائے خود ایک کمال تھا۔

صدیق باورچی بھی موجود تھا۔ دعوت ہماری جانب سے تھی۔ سرگرم وہ دونوں تھے۔ کھانے کے بعد ان کی مسکوت کا عقدہ کھلا جب صدیق نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ کھانے کے ساتھ وہ باتیں بھی خوب جانتا تھا۔ محل کی پوری ٹوٹی تار کے کہنے لگا "بہتر ہے، بندہ پورا آپ اپنی جوتی اتار لیں۔ خادم کی تو کسی کام کی نہیں ہے۔" بھٹل کے اصرار پر وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "بہت سے دقت آئیں گے عالی جاہ! یہاں نہیں تو وہاں تو اگلا پیچھا سارا حساب کتاب ہو گا۔" وہیں ایک دوسرے کو قائل معقول کر لیں گے۔"

کھانے کے دوران میں عبدالبساط مسافر خانے کی تعمیر کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ اس کا دعو تھا کہ تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس عمارت کو ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے مسافر خانے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ فروشی اور پہلی منزل کے چاروں طرف ہر کمرے پر پیتل کی تختیاں آویزاں تھیں۔ تختیوں پر ان صاحب حیثیت لوگوں کے نام کندہ تھے جنہوں نے ایک کمرے کے تعمیری مصارف کے بعد دیرا اس سے زیادہ رقم عطیہ کی تھی۔ کھانے کی میز سے اٹھ کے ہم صحن میں آکے بیٹھ گئے۔ تب بھٹل نے ہزار روپے جیب سے نکال کے عبدالبساط کے سامنے رکھ دیے۔ عبدالبساط پر حیرانی طاری ہوئی مگر اس نے معذرت کر لی کہ وہ ایسے کسی شخص کی وصولی کا مجاز نہیں۔ مسافر خانہ شہر کی ایک خاص برادری نے بنایا ہے اور متوالی سے بات کر کے ہی وہ اس رقم کی قبولیت کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہے۔ بھٹل نے وضاحت کردی تھی کہ اس کا مقصد کسی کمرے پر اپنے نام کی تختی آویزاں کرانا نہیں ہے۔ حالت سفر کی وجہ سے وہ فی الحال زیادہ رقم نہیں دے سکتا۔ متوالی آمادہ ہو جائے تو کھر پیچ کے مزید رقم بھی بھجوائی جاسکتی ہے۔

عبدالبساط مجلسی قسم کا ایک خوش باش اور ہر عزم نوجوان تھا۔ مسافر خانے میں روز ہی بے شمار مسافر آتے جاتے تھے مگر کچھ لوگ کسی جواز کے بغیر مرغوب ہو جاتے

نہیں تھے۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے ایک کپڑے

بازی گری

بازی گری

اور زور ابھی اس کے ساتھ تھے۔ شام کو شہر جاتے وقت بھٹل نے عبدالبساط کو رات کا کھانا ساتھ کھانے کی دعوت دی تھی۔ رسی رودتھ کے بعد وہ آمادہ ہو گیا تھا۔ ہماری عدم موجودگی میں اس نے عمارت کے کئیوں حصے میں ایک ہوٹل کے مالک صدیق باورچی کو احکام دے رکھے تھے کھانا تیار ہو چکا تھا اور دھڑکی میز پر دسترخوان سجایا ہوا تھا۔ سلمیٰ کے لیے ایک طشت اور پیچ دیا گیا۔ اتنے کدورت میں اتنی اقسام کے خوش ذائقہ کھانے تیار کر لیتا بجائے خود ایک کمال تھا۔

صدیق باورچی بھی موجود تھا۔ دعوت ہماری جانب سے تھی۔ سرگرم وہ دونوں تھے۔ کھانے کے بعد ان کی مسکوت کا عقدہ کھلا جب صدیق نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ کھانے کے ساتھ وہ باتیں بھی خوب جانتا تھا۔ محل کی پوری ٹوٹی تار کے کہنے لگا "بہتر ہے، بندہ پورا آپ اپنی جوتی اتار لیں۔ خادم کی تو کسی کام کی نہیں ہے۔" بھٹل کے اصرار پر وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "بہت سے دقت آئیں گے عالی جاہ! یہاں نہیں تو وہاں تو اگلا پیچھا سارا حساب کتاب ہو گا۔" وہیں ایک دوسرے کو قائل معقول کر لیں گے۔"

کھانے کے دوران میں عبدالبساط مسافر خانے کی تعمیر کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ اس کا دعو تھا کہ تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس عمارت کو ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے مسافر خانے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ فروشی اور پہلی منزل کے چاروں طرف ہر کمرے پر پیتل کی تختیاں آویزاں تھیں۔ تختیوں پر ان صاحب حیثیت لوگوں کے نام کندہ تھے جنہوں نے ایک کمرے کے تعمیری مصارف کے بعد دیرا اس سے زیادہ رقم عطیہ کی تھی۔ کھانے کی میز سے اٹھ کے ہم صحن میں آکے بیٹھ گئے۔ تب بھٹل نے ہزار روپے جیب سے نکال کے عبدالبساط کے سامنے رکھ دیے۔ عبدالبساط پر حیرانی طاری ہوئی مگر اس نے معذرت کر لی کہ وہ ایسے کسی شخص کی وصولی کا مجاز نہیں۔ مسافر خانہ شہر کی ایک خاص برادری نے بنایا ہے اور متوالی سے بات کر کے ہی وہ اس رقم کی قبولیت کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہے۔ بھٹل نے وضاحت کردی تھی کہ اس کا مقصد کسی کمرے پر اپنے نام کی تختی آویزاں کرانا نہیں ہے۔ حالت سفر کی وجہ سے وہ فی الحال زیادہ رقم نہیں دے سکتا۔ متوالی آمادہ ہو جائے تو کھر پیچ کے مزید رقم بھی بھجوائی جاسکتی ہے۔

عبدالبساط مجلسی قسم کا ایک خوش باش اور ہر عزم نوجوان تھا۔ مسافر خانے میں روز ہی بے شمار مسافر آتے جاتے تھے مگر کچھ لوگ کسی جواز کے بغیر مرغوب ہو جاتے

نہیں تھے۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے ایک کپڑے

بازی گری

بازی گری

بازی گری

بازی گری

بازی گری

بازی گری

بازی گری

بازی گری

بازی گری

بازی گری

بازی گری

بازی گری

بازی گری

ہیں۔ ایک پر میں عبدالباسط ایسا مکمل مل گیا تھا جسے برسوں کی شناسائی ہو۔ گو بھٹل کی مراد مسافر خانے کی تعمیر میں اعانت کے سوا کچھ نہ تھی مگر یہ سخاوت چاہہ وحشت کا مظہر تھی۔ دولت سب سے بڑا وصف ہے جس کے پاس نہ ہو اس پر اس کا جاودہ اور کاری ہوتا ہے۔ بھٹل کے عطیے سے مسافر خانے کے کم از کم دو کمرے اور تعمیر ہو سکتے تھے۔ یقیناً عبدالباسط پر بھٹل کی اس دریا ولی داد وودش کا اثر بھی کرا ہوتا ہے۔ رات گئے گھر کے لیے رخصت ہوتے وقت اس نے ازخود بھٹل سے وعدہ کیا کہ وہ مولوی صاحب کی ٹوہ میں رہے گا اور ان کے بارے میں ہونے والی معلومات سے ہمیں مطلع کرتا رہے گا۔ اگر واقعی مولوی صاحب کا تعلق مراد آباد سے ہے تو وہ انہیں کہیں سے بھی دھونڈ نکالے گا۔ ہم میں سے کسی نے اس کی عزم شکنی نہیں کی کہ اس نے دنیا ہی کتنی دیکھی ہے۔ دنیا کا نظر سے بڑی اور دست رسائی سے کہیں سوا ہے اس میں بہت سمندر بہت دریا بہت پہاڑ بہت تھرا اور دیواریں ہیں۔

عبدالباسط نے سہیلی کے کمرے سے ملحق ایک اور کمرے کا بندوبست کروا دیا تھا۔ سہیلی نے پرسکون رات گزار دی ہوگی۔ صبح جب ہم اس کے کمرے میں گئے تو بڑی شگفتہ و ترمناظر نظر آ رہی تھی۔ وہیں سب نے ناشا کیا۔ نوبے کے قریب بھٹل اور میں شہر کی طرف نکل پڑے۔ امدادیہ مدرسہ مدرسہ فلاح و ارین میں مولوی صاحب نے کچھ عرصے قرآن پاک کی تعلیم دی تھی۔ جامعہ نعیمیہ میں ان کے پرانے ساتھی حافظ شفیع الدین کا نام بھی ہمیں کسی نے بتایا تھا۔ مولوی صاحب کے محلے ان کے بڑے دو دروازے کے رشتے دار، شاگردوں کے علاوہ جس کنبی کے برتنوں کے نمونے لے کر مولوی صاحب نے شہروں شہروں کی پیشانی شروع کی تھی جس سے سم کی لوگ شناسائی کرتے رہے، ہم وہاں وہاں جاتے رہے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے امروہہ گریٹ کے سلام ہونٹ میں لکھایا۔ مراد آباد شراعتا بڑا نہیں ہے تاہم رات آٹھ بجے تک کوچہ گردی کے بعد بھی بہت سہرا جگہیں اور لوگ رہ گئے۔ دوسرے دن پھر تیسرے دن دوپہر کو کہیں یہ قہلی ہوئی کہ شہر میں مولوی صاحب کے مزید شناساؤں سے مل کے کوئی نئی بات معلوم ہونے کا امکان نہیں ہے۔ بعض جگہوں سے ہمارا کیا بار گزر ہوا۔ کئی آدمی پہچانے اور روک روک کر سلام دعا کرتے حال احوال پوچھنے لگے تھے۔ مولوی صاحب کے بارے میں زبان کھولنے سے پہلے لوگ عموماً اپنا تجسس دور کرتے تھے۔ وہ ہم سے طرح طرح کے سوالات

کرتے کہ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں وغیرہ۔ مولوی صاحب کی کوئی امانت لٹانے کا ایک ہی موثر و معقول غدر بھٹل کے پاس تھا۔ امانت ہی کی بات تھی۔ ہمیں لٹانی تھی یا مولوی صاحب کو۔ مراد آباد شہر ترک کیے ہوئے مولوی صاحب کو دس برس سے اوپر ہو چکے تھے۔ ابھی تک شہر میں انہیں بہت سے لوگ جانتے تھے۔ ان کی راست بازی، معاملہ فہمی اور خوش اطواری تقریباً سبھی پر نقش تھے۔ کسی کی پیشانی ان کے ذکر سے شکن آلودہ نہیں ہوتی۔ شاید کسی کے سینے میں ان کے لیے کوئی عناد نہیں تھا۔ مولوی صاحب کے محلے کے بعض لوگوں کو ان کی حد درجہ کنارہ کشی اور گوشہ گیری سے شکوہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب ہر کس و ناکس کے قریب نہیں آتے تھے۔ منڈی چوک میں مسلم پبلک لائبریری کا لائبریرین کہتا تھا کہ انہیں تاریخ کے ساتھ قصے کہانیوں کی کتابیں پسند تھیں۔ اخبار و رسائل سے بھی دلچسپی تھی۔ مولوی صاحب پر لائبریری کی تین کتابیں ابھی تک قرض تھیں۔ جامعہ نعیمیہ میں ان کے دوست حافظ شفیع الدین نے مولوی صاحب کی بذلہ سہیلی کے بہت سے واقعات سنائے۔ بھٹی محلے کے حکیم سراج الحق کا کہنا تھا کہ مولوی صاحب کو شاعری کا بھی اچھا ذوق تھا۔ اساتذہ کا منتخب کلام حفظ تھا۔ میر کوہ عشق کی حد تک پسند کرتے تھے۔ فارسی اور عربی میں غیر معمولی اور اک تھا۔ انگریزی میں بھی کچھ شہد ہوئی تھی۔ موزوں طبع تھے اور کچھ کہنا بھی شروع کروا تھا۔ ممکن ہے چپکے چپکے کہتے رہے ہوں لیکن شاعری عشق اور مشک کی مانند ہے، زور کی طرح بھی۔ ان کا چھپانا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کی طبیعت کو قرار نہیں تھا اس لیے وہ جامعہ قاسمیہ کی اعلیٰ ترین اساتذہ حاصل نہ کر سکے۔

محلہ تھما کو والان کے شیخ محمد یونس تاجر سے ان کے مراسم خصوصی تھے۔ مولوی صاحب کے ذکر پر شیخ یونس کی آواز پر مراکتی، کہنے لگے، اکثر ہمارے درمیان مذہبی مباحث میں تیزی آ جاتی تھی۔ مولوی صاحب حد سے زیادہ تجاؤز کر جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے یقین میں آلودگی کا لگنا ہوتا تھا باوجودیکہ صوم و صلوة کے پابند تھے۔ دیگر ملک کے علما میں نشست و برخاست تھی۔ جامعہ نعیمیہ بھی جاتے تھے۔ شاہ بلانی کے مزار پر سماع کی محفلوں میں دعوت ملتی تو حضور جاتے تھے۔ نذر دیناز خود نہیں کرتے تھے لیکن معترض بھی نہیں تھے اور شرکت میں بھی اجتناب نہ تھا۔ کہتے تھے، سب کا مقصد ایک ہے، خدا سے قرب، رسول سے محبت، اظہار

بازی گر 6

کے طریقے مختلف ہیں۔ ہر شخص اپنے مسلک اور فرقے سے نسبت درست سمجھتا ہے اور درست کون ہے، اس کا فیصلہ کون کرے۔ ہر شخص کی نسبت اس کے والدین خاندان اور برادری والے طے کرتے ہیں۔ وہ دوسرے ملک کے خلاف اسے مسلسل ہنگام کرتے رہتے ہیں۔ مطلقاً، مشاہدے اور تحقیق و تفتیش کا موقع ہر کسی کو نہیں ملتا۔ سب اپنی مخصوص تربیت، خاندانی عقائد اور عادات سے مشروط ہیں۔ کوئی بھی اپنے مسلک سے جدا ہونا نہیں چاہتا، برادری اور گھر میں معنوب ہونے کا خوف اس پر غالب رہتا ہے۔ شیخ صاحب کا مولوی صاحب سے اختلاف معمول بن گیا تھا۔ شیخ صاحب کو اختلاف تھا کہ مولوی صاحب ہر سال ساتویں حرم کو اپنے ایک بزرگ سید علی شیدا کے ہاں عاشرہ کی مجالس میں شرکت کرنے آموہے کیوں جاتے ہیں۔ شیخ کے توسط سے محلہ خٹیرا کے ایک پرہیزگار خاندان میں مولوی صاحب کی شادی کی بات پکی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب کو لڑکی دیکھنے پر اصرار تھا۔ مراد آباد کے نقہ ماحول میں یہ خواہش نہایت معیوب تھی اور اس کی تکمیل اتنی ہی ناممکن۔ شیخ نے ہر طرح لڑکی کی خوش چہرگی، خوش قامتی، تندرستی، تعلیم، سلیقہ اور سیرت سے مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن مولوی صاحب اپنی ضد پر قائم رہے۔ آخر شیخ اپنے عزیز و محترم کا گھر بنانے کے لیے ایک غیر شرعی، غیر روایتی اقدام کیا۔ لڑکی کے گھر والوں کو اپنے ہاں مدعو کر کے کسی طور پر لڑکی کی جھگ دکھادی۔ شادی سے چند دن پہلے لڑکی کو یرقان ہو گیا اور مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ مولوی صاحب نے پھر ہمیشہ کے لیے شادی کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس سانحے نے انہیں بہت آرزوہ کروا دیا تھا۔ بہت دنوں بعد کہیں ان کے چہرے کی تابانی واپس آئی۔

کڑش چھ ماہ میں مولوی صاحب تین بار مراد آباد آئے تھے۔ شیخ صاحب کے بڑے بھائی حاجی شیخ محمد یوسف کے پاس مولوی صاحب کی والدہ مرحومہ کے زیورات کی امانت ایک زمانے سے محفوظ تھی۔ حاجی صاحب کا زیادہ وقت عربستان میں گزرتا تھا۔ جب بھی مولوی صاحب اپنی امانت واپس لینے کی غرض سے مراد آباد آئے، حاجی صاحب سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔ تین سنیٹے پہلے حاجی صاحب مراد آباد میں تھے۔ مولوی صاحب چند گھنٹے بھی نہیں ٹھہرے، اپنی امانت لے کر واپس چلے گئے۔ اس بار انہوں نے مسافر خانے میں قیام نہیں کیا۔ کرنا بھی نہیں چاہے تھے۔ کورا تو ان کے ساتھ ہی ہوئی، کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ کورا کو انہوں نے کہاں

بازی گر 6

ٹھہرایا تھا۔ حاجی محمد یوسف کو بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ مولوی صاحب ان کے پاس تھا آئے تھے۔ مراد آباد کے مولوی صاحب چیدہ چیدہ لوگوں ہی سے ملتے تھے۔ دس سال کے عرصے میں انہوں نے کچھ لوگوں سے حساب فہمی کی تھی۔ ایک مختصر مکان، محلہ مغل پورہ کمنہ کی دو دکانیں اور حال میں مراد آباد سے سات میل دور ہر علا ہستی میں واقع ایک قطعا اراضی فروخت کروا دیا تھا۔ مولوی صاحب کو ہمیشہ بجلت درپیش ہوتی تھی۔ شہر کے کسی دینی و سماجی اجتماع، کسی تقریب وغیرہ میں انہوں نے کبھی شرکت نہیں کی۔ دعوت کے لیے وہ معذرت کر لیتے تھے۔ تعزیت اور عیادت کے لیے شاید کسی کے گھر نہیں گئے تھے۔ عرصہ گزرا، مسافر خانے کے اہل کاروں کے ذریعے شہر میں مولوی صاحب کی جان پہچان والوں کو بھگ مل گئی تھی کہ مسافر خانے میں کوئی عورت بھی ان کے ساتھ مقیم ہے پھر شہر میں بہت دنوں تک چرچے ہوتے رہے۔ بعض احباب کے انتشار پر مولوی صاحب نے صرف اتنا بتایا کہ ان کا قیام بیش تر جنوبی ہندوستان کے شہر بنگلور میں رہتا ہے۔ وہاں عمارت سازی کا سامان بنانے والے ایک کارخانے میں شراکت داری ہے۔ کارخانے کی چیزوں کی کھت کے لیے وہ مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہیں اور اس طرح تحقیق و ترویج کا کام بھی بے قدر استطاعت انجام دیتے ہیں۔ اپنے ساتھ موجود عورت یعنی کورا کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ وہ ایک بے آسرا لڑکی، ان کی منہ بولی بیٹی ہے اور اب انہی کے ساتھ رہتی ہے۔ مراد آباد میں معدومے چند ان کے قریب ترین رفیقوں کو گلہ تھا کہ مولوی صاحب ان کے گھروں میں اپنی بیٹی کو کیوں نہیں لاتے اور وہ مسافر خانے میں کیوں قیام کرتے ہیں اور ہر بار انہیں واپسی کی اتنی جلدی کیوں ہوتی ہے۔ وہ مولوی صاحب سے ناراضگی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ہر مرتبہ مولوی صاحب نے آئندہ کے لیے وعدہ کیا تھا مگر یہ وعدہ بھی وفا نہیں ہوا۔ مولوی صاحب کے مزاج میں تبدیلی آ جانے پر بھی شفیق تھے۔ اب لوگوں نے ان سے زیادہ کہنا سنا چھوڑ دیا تھا۔ جتنا وقت گزرتا جا رہا تھا، مولوی صاحب ان سے اوٹل ہوئے جارہے تھے۔ کوئی آٹھ دس برس پہلے مولوی صاحب اپنے ایک ہم جماعت، درینہ دوست، جامعہ قاسمیہ کے سابق مدرس حافظ عبدالحق ٹھہرایا سادات والے کے گھر کچھ عرصے ٹھہرے تھے۔ لوگوں کو یاد نہیں تھا کہ اس وقت ان کے ساتھ کوئی عورت تھی یا نہیں، لازماً ہوگی۔ یہی ہو سکتا ہے، حافظ صاحب نے اپنے دوست کی تائید کے مطابق

92

کتابیات پہلی کیشن

8

کتابیات پہلی کیشن

دنیا کے

6

حیرت انگیز علوم

بھی سہلی کو صبح سے شام تک اسے گھر لے گیا تھا۔ روز مغرب کے بعد وہ آٹے میں سوار ہوئے سول لائسنز کی طرف نکل جاتے مراد آباد سے مشرق کی جانب بیس میل دور ریاست رام پور میں سالانہ نمائش لگی ہوئی تھی۔ ایک بار مجھے بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہندوستان بھر سے لوگ آتے تھے زور اور جہود و مرتبہ سہلی کو نمائش دکھانے لے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے سرکس، مداروں کے کرب موت کی چھلانگ اور نوٹنگی کے کھیل متاثر دیکھے تھے اور جانے کیا کیا سامان خرید ا تھا۔ عبدالباسط بھی ان کی رہ نمائی کے لیے ساتھ تھا۔

بھٹل کی سیری نہیں ہوئی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ میرا مشورہ قبول کرے اور میرے لیے بھی لازم نہیں تھا کہ میں اپنی زبان بند رکھوں۔ میں نے بہت منع کیا کہ اب مزید جگہیں کھنڈے سے کچھ حاصل نہیں مگر ایک رات مراد آباد بھر کے وہ پھر اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ رام پور، شاہ جہان پور، گمری سادات اور بریلی، فیض آباد کے رستے میں آتے تھے لیکن مراد آباد سے نزدیک فیض آباد سے دور تھے۔ یہی بہتر تھا کہ سہلی مراد آباد میں بھری رہے۔ پہلے رام پور، بریلی پھر شاہ جہان پور کے بعد ہم نے گمری سادات میں دم لیا۔ گمری سادات کے معزز شہری حافظ عبدالحق کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

وہ ایک اوسط درجے کی کوہلی تھی۔ زبانش و آرائش میں کسی نواب کی کوہلی کی مماثل۔ دوپہر کا وقت تھا۔ حافظ صاحب کسی فریبی بستی میں گئے ہوئے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی عبدالستین نے ہمارے لیے بینک کھلوادی۔ بہت دنوں بعد بھٹل کے لیے حقے کا انتظام بھی ہو گیا۔ اتنی بستیوں، نگلی کوچوں کی خاک چھانے پر گمری سادات آ کے پہلی بار کہیں ایسا لگا جیسے یہیں آنے کی دیر تھی۔ مراد آباد کے لوگوں کی طرح اوجیز عمر عبدالستین بلا کا باؤتی تھا۔ ایک سوال کے دس جواب دیتا تھا اور خود سو سوالوں کے لیے پوچھ چیں رہتا تھا۔ ایسے لوگ جلد قابو میں آ جاتے ہیں۔ بھٹل نے مولوی صاحب کا نام نہیں لیا۔ ایک ضروری کام کے سلسلے میں حافظ عبدالحق سے ملاقات کو اپنی آمد کی وجہ بتایا تھا۔ عبدالستین کی تشویش بھائی تھی کہ اس نے ہمیں دیکھا تھا نہ کبھی اپنے بھائی کی زبانی ہم دور افتاد گالے کے بارے میں کچھ سنا تھا لیکن ایک مذہب شخص کا جو تیرہ ہوتا ہے، دور سے آنے والے بڑے بھائی کے ملاقاتیوں سے چھوٹے بھائی کی بازی پر اس آداب کے خلاف تھی۔ روٹیل کونڈی عموماً تکلیف اور صنعت نہیں

میل دور تحصیل امرہہ جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب کے مرلی سید علی شیدا کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے بھائی اور بیٹوں نے مولوی صاحب کا ذکر نہایت عزم و احترام سے کیا۔ وہ مولوی صاحب کو گھری کا کوئی فرد سمجھتے تھے۔ رات کا کھانا کھلائے بغیر ان لوگوں نے ہمیں نہیں آنے دیا۔ سید علی شیدا کے خاندان والوں کے یہ قول محرم کی ساتویں کو وہ مولوی صاحب کا شدت سے انتظار کرتے ہیں لیکن مدت گزر گئی، مولوی صاحب نے امرہہ کا رخ نہیں کیا اور ان کی خیریت کیا، اطلاع بھی نہیں ملی۔

صبح ناشتے پر سہلی، زور، جہود اور فیض الباسط کے پاس کچھ دقت گزار کے ہم پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس دفعہ بھٹل نے مختصر سامان بھی ساتھ لیا تھا۔ ٹکینے، بندوق، بوند، مساران پور سے ہوتے ہوئے ہم میرٹھ، بلند شہر، خورجہ اور ہاپوڑ کی طرف آ گئے پھر مراد آباد میں ایک رات قیام کر کے چندویں اور علی گڑھ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مراد آباد کے اطراف کے ان شہروں میں پورا عشرہ گزر گیا۔ جامعہ قاسمیہ سے معلوم ہوا تھا کہ ابتدا میں مولوی صاحب مراد آباد سے قریب کی ان جگہوں پر کثرت سے دورے کرتے تھے۔ بعد میں جامعہ قاسمیہ کی جانب سے مختلف شہروں میں مدارس کے معیار اور تنظیمی تربیت کا کام بھی کچھ عرصے کے لیے انہیں سونپ دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کو قریباً سبھی پہچانتے تھے۔ بعض لوگ ان سے رابطہ خاص کے مدعی تھے لیکن مراد آباد سے رخصت ہونے کے بعد مولوی صاحب نے اس پاس کی کسی جگہ کو قصد نہیں کیا تھا۔ کورا کی وجہ سے مولوی صاحب کو جان پہچان کے علاقوں سے احتیاط ہی کرنی چاہیے تھی۔ شناسا بھی کبھی زندگی بہت عذاب کر دیتے ہیں۔ کسی نے کہا تھا، میرے جانے والے میرا زنداں ہیں۔ مراد آباد بھی مولوی صاحب مجبوراً ہی آتے ہوں گے۔ جب ہاتھ بہت تنگ ہوتا ہوگا۔ مزہ بادبی سے نیچے یافت کی امید ہو سکتی تھی۔ لگتا تھا، وہ اپنی چیزیں بیچتے رہے ہیں۔ اب تک شاید انہوں نے کسی سے فرض نہیں لیا تھا لیکن تک تک اجڑانے خالی ہو جاتے ہیں۔ اس وقت تو ان کے پاس پیسوں کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ نواب ثروت یار نے زرفند کے علاوہ کورا کو جو اہر کے خفوں سے کیا نہیں نوازا ہوگا؟ ہمیں یہاں تیرہ دن ہو گئے تھے۔ سہلی بھی ایک کمرے میں خود کو محسوس تصور کرنے لگی ہوگی۔ مسافر خانے میں ہر طرح کا آرام تھا۔

ملازم جہود اور زور کی خبر گیری کے لیے ذرا ذرا سی آہٹ پر مستعد رہتے تھے۔ درمیان میں ایک دن عبدالباسط

احتیاط کی ہو، کورا کو اپنے گھر تک محدود رکھا ہو اور مولوی صاحب کے ساتھ ان کی موجودگی کا ذکر عام نہ ہونے دیا ہو لیکن حافظ صاحب نے کورا کو کوٹھری میں بند نہیں رکھا ہوگا۔ گھر میں ایک اجنبی لڑکی کی موجودگی پڑوسیوں سے چھپی نہیں رہ سکتی لیکن پڑوسیوں کے قوت و تردد کے لیے مولوی صاحب کے گرد و پیش سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ واللہ علیہ حافظ عبدالحق، اب مراد آباد میں نہیں تھے۔ وہ زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے مستقلاً اپنے آبائی شہر چلے گئے تھے۔

مراد آباد میں دوسرے دن جہود اور زور، سہلی کو شہر سمجھانے لے گئے تھے اور انہوں نے سہلی کے لیے کئی جوتوں کا کپڑا خریدا تھا، دیگر سامان بھی۔ ذریں جہاں گمری نیساں اور منیر علی کے گھر والوں کے لیے بھی انہوں نے سہلی کے مشورے سے بہت سی چیزیں اکٹھی کی تھیں۔ سہلی اپنے لیے کتابوں اور رسالوں کا ایک انبار بھی اٹھالائی تھی۔ مراد آباد میں قدیم جامعہ مسجد اور رام گڑھ دیر کے کنارے کے سوا کوئی قابل دید جگہ نہیں ہے۔ اسی دن شام کو زور، جہود اور سہلی کو فیض الباسط کے دائیں جانب شہر کے سرسبز علاقے سول لائسنز کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ یہ مراد آباد شہر کا حصہ ہی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہاں چاروں طرف باغات اور صاف شفاف سڑکیں ہیں اور بڑے بڑے افسروں، دولت مندوں اور گوروں کی کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ شہر کے گلی کوچوں کی خاک چھانے کے بعد رات کو ہم مسافر خانے واپس پہنچے تو زور اور جہود نے دن بھر کی روداد سناٹی۔ سہلی بھی ان کی سرخوشی میں شامل تھی۔ عبدالباسط نے اپنے کسی عزیز کے ہاں سے سہلی کے لیے سلاخی مشین عاریتاً منگوائی تھی۔ یوں مطالعے کے علاوہ سہلی کو ایک اور مصروفیت ہاتھ آ گئی تھی۔ سینا پروانا اسے اچھا ہی آتا ہوگا۔ جہود اور زور کے پاس بھی اس کی دل جوئی، دل داری کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ دونوں میں ایسا لگتا تھا جیسے سہلی کے سراپا میں کوں نہیں پھونسنے لگی ہیں۔

تیسرے دن سہلی کو زور، جہود اور سہلی کو مسافر خانے چھوڑ کے بھٹل مراد آباد سے تیس میل دور کے فاصلے پر تحصیل سنبھل کے لیے روانہ ہو گیا۔ معلوم ہوا تھا کہ کچھ دنوں تک سنبھل کے ایک مدرسے میں بھی مولوی صاحب نے درس و تدریس کا کام کیا تھا۔ واپسی کی گاڑی نہ ملنے کی وجہ سے رات کو ہمیں شہر کی ایک سرائے میں ٹھہرنا پڑا اور دوسرے دن صبح دس بجے مراد آباد واپسی ممکن ہو سکی۔ چند گھنٹے آرام کے بعد ہم مراد آباد سے مغرب کی جانب میں

پانسہ پھینکنے۔ قسمت کا حال معلوم کیجئے

ناش کے پتوں سے قسمت شناسی

ماتھے کی لکیریں کیا کہتی ہیں!

خال اور تل..... کردار بتاتے ہیں!

شگون..... سعد و نحس!

خواب..... مستقبل کے پیامبر!

قیمت 25 روپے ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ پندرہ روپے
شگنی مٹی آرڈر سال کریں

کتابیات کی کتابت
کتابیات کی کتابت
72200
502552-5895313
502552

kitabiat@hotmail.com
kitabiat@yahoo.com

کورأت۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی کو سب کچھ یوں ہی نہیں مل جاتا جب تک خدا کا فضل شامل نہیں ہوتا۔“

بھل حق کو گزانا اور سہلانا رہا۔ دھوپ اتر چکی تھی۔ عبدالتین کی بار زبان خانے کی طرف گیا اور جلد واپس آگیا۔ یہ تو طے ہو چکا تھا کہ مولوی صاحب کا ذکر عبدالتین کے لیے کش مکش کا باعث ہے۔ موضوع کی تبدیلی سے اس کی گفتگو کیسی بھال ہو گئی تھی۔ مولوی صاحب کا ذکر مرحوب خاطر ہو تا تو دیگر زبانتین باندوں کی طرح وہ گل افشانی سے گریز نہ کرتا۔ وہ تو دریا بہا رہا۔ یہ پہلو تھی اس بات کی غماز تھی کہ وہ مولوی صاحب کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہے اور اس امر کی علامت یہ بھی تھی کہ پردہ پوشی کی کوئی مصلحت اسے درپیش ہے۔ ممکن ہے یہ سب میرا وہم و قیاس ہو، بھٹل نے کچھ اور اندازہ لگایا۔ میرے دماغ میں تو ایسے ہی جالے بڑے شروع ہو جاتے تھے۔ بہر حال بھٹل نے عبدالتین کو کچھ دیر کے لیے مطمئن کر دیا تھا۔ عبدالتین کو کیا معلوم تھا کہ اس نے ہمیں کتابے آرام کروا دیے۔ اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ ہمارے سینوں میں کیسا تلاطم برپا ہے۔ بہو پ بھرنے کی ہمیں خوب مہارت ہو گئی تھی۔ سب سے بڑے بہو بھرنے تو ہم خود تھے۔

اب سب کچھ حافظ عبدالحق کی آمد پر منحصر تھا۔ ہمیں آئے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ میری نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کسی وقت بھی عبدالحق آجستے تھے۔ شام ہو گئی۔ عبدالتین نے چائے منگوایا اور کہنے لگا ”صاحب! ہم ریمائی لوگ ہیں، گھبرا سادات میں چائے کا ایسا رواج نہیں ہے۔ یہ شہر ہے بھی نہیں، قصبہ بھی اوسط درجے کا ہے۔ مراد آباد میں بھائی صاحب کو چائے کی عادت پر لگی تھی۔ انہی کی وجہ سے حویلی میں صبح و شام چائے پنی ہے یا مہمانوں کی آمد پر۔ آپ ہمیں والے ہیں۔ سنا ہے، وہاں تو لوگ چائے کے بہت ریا ہیں۔“

”وہ جھل ہی اور ہے۔“ بھٹل کی آواز کھوی گئی۔

”کئی بار ارادہ کیا، جا کے دیکھ تو آئیں، کیا ہمارے ہیں لیکن یہ زمینیں چین ہی لینے نہیں دیتیں۔ کام ہے کہ ہر سال بڑھتا جا رہا ہے۔“

بھٹل نے اسے ہمیں آئے اور گھر نہ ہرنے کی دعوت دی اور کہا کہ اسے وہاں کسی قسم کی اجنبیت نہیں ہوگی۔

”آپ کا بہت شکر ہے، دیکھئے، آپ سے ملاقات ہوئی ہے تو اب کے شاید آتا ہو ہی جائے۔ سمندر کے قصے سن رکھے ہیں، ابھی دیکھا نہیں۔“ ہمیں تو لوگ بتاتے ہیں، سارا سمندر

خوابانہ انداز میں بولا ”غریب خانے کا یہ حصہ مراد ہے اور مہمانوں کے لیے مخصوص ہے۔ جب تک چاہیں، قیام فرمائیں۔ یقین کیجئے دلی مسرت ہوگی۔“

”پھر تو ہم یہیں دھرے ہیں بھائی۔“ بھٹل نے کسل مندی سے کہا ”آپ کو سامنے کا کوئی کام ہو تو ہر جات کرو۔“

”مہمان کی خدمت سے بڑا کیا کام ہو سکتا ہے۔“ عبدالتین نے بے ساختہ کہا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا، جناب کی کیا خاطر پردات کروں۔“

”سب سے بڑی خاطر تو آپ نے کروئی۔“ بھٹل نے حقے کی نئے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا ”تہا کو میں بڑا سواد ہے۔“

”مراد آباد کا ہے۔ شیخ شمس الدین، منظور الحق کے ہاں کا۔ بھائی صاحب کے پرانے مراسم ہیں۔ خاص طور پر ان کے لیے آتا ہے۔“

”ادھر تو ایک چھدا خاں بھی مشہور ہے۔“

”ہاں جناب!“ عبدالتین پھر کسمانے لگا ”معلوم ہوتا ہے، مراد آباد سے جناب کا کوئی تعلق ہے؟“

”نام سنا ہے چھدا کا۔“ بھٹل نے استفسار سے کہا ”مراد آباد بھی ایک دور آباد رہا ہے۔“

”اب کیا جناب مراد آباد سے ہوتے ہوئے آ رہے ہیں؟“

”ہاں، ادھری پتا چلا کہ حافظ صاحب گھبرا سادات جا کے بس گئے ہیں۔ اپنا سامان بھی مسافر خانے میں پڑا ہے۔“

”بھائی صاحب نے تو عرصہ ہوا، مراد آباد کو خیر آباد کہہ دیا ہے۔ زمینوں کی جب تک خود کچھ بھال نہ کرو، کاشت کار کام نہیں کرتے۔ بھائی صاحب کے آجانے سے بہت برکت ہوئی ہے۔ زمینیں بڑھیں، جانوروں بھی اور جانے کیا کیا۔ یہ حویلی دیکھئے، انہیں اعظم مرزا دلا اور بیگ نے دی اور بچے پور سے کاری کروں کہ بکوا کے بڑے چاؤ سے بنائی تھی۔ اولاد

فرزند سے محروم تھے۔ لڑکیاں گھروں کی ہو چکی تھیں، بیگم صاحبہ کی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ مرزا صاحب کے انتقال کے بعد حویلی اجڑ گئی۔ دامادوں میں چپقلش ہوئی۔ بھائی صاحب نے محل صفائی کرادی اور حویلی کے منہ سانگے دام ادا کر دیے۔ یہ تین سال پہلے کی بات ہے۔ مرمت اور رنگ و روغن کے بعد کہیں حویلی کی یہ صورت نکلی ہے۔ بھائی صاحب نے مراد آباد سے آکے دن کو دن سمجھا نہ رات

سادات میں مولوی صاحب کی موجودگی کی اگر کوئی بعید ترین امید بھٹل کے دماغ میں نمودار ہو گئی تو مختصر خیال چاہیے تھی۔ ستاروں کو اپنی رفتار سے غرض ہوتی ہے۔ عبدالتین کی بے قراری سے ایک بات ضرور طے ہو گئی کہ مولوی صاحب سے اس کے خصوصی روابط رہے ہیں۔ اس نے نسبتاً تحمل سے تکرار کی کہ ہم مولوی صاحب کو کس طرح جانتے ہیں؟“

”تھوڑی بہت جان کاری ہے۔“ بھٹل نے بھی بظاہر سادگی سے کہا ”کدھری رہتے ہیں آج کل؟“

”کب سے جانتے ہیں جناب ان کو؟“ عبدالتین نے بہ تجلت پوچھا۔

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“ بھٹل نے حقے کا کش لیتے ہوئے پوچھا ”ٹھیک سے تو ہیں وہ؟ پہلے ادھری مراد آباد میں ہوتے تھے۔“

”جی ہاں، ان کا تعلق مراد آباد سے ہے اور الحمد للہ خیریت سے ہیں لیکن جناب نے انہیں کب سے نہیں دیکھا؟“

”ہائم ہو گیا اب تو۔“ بھٹل نے ذریعہ سے کہا۔ ہر شخص کی حدود ہوتی ہے۔ کون کتنا خود پر قدرت رکھتا ہے، اس کا پتا نہ۔ کتنا غم، کتنی خوشی، کتنی احتیاط، کتنی برداشت، کتنی اذیت نہ سکتا، کتنی دے سکتا ہے۔ عبدالتین کی ذات بس پہلے دو سرے در سے پرے تھی۔ بہت سے توسل پر آئینہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے ضبط نہیں ہوا، ”کیا جناب مولوی صاحب کے سلسلے میں بھائی صاحب کے پاس آئے ہیں؟“ اس نے بے کلی سے پوچھا۔

بھٹل کے لیے اس سوال کا جواب مشکل تھا۔ جب تک حافظ عبدالحق نہ آئیں، ایک ہی جواب مناسب تھا کہ وہ صریحاً انکار کر دے۔ اس نے یہی کہا۔

عبدالتین کے چہرے پر سکون کے آثار ہویدا ہوئے، ”میں نے عرض کیا ہے، بھائی صاحب کو شام تک واپس آ جانا چاہیے لیکن دیر بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے بتائیے، میں کسی کام آ سکتا ہوں؟“

”آپ بہت کام آ سکتے ہو، اپنے کو ایسی جلدی نہیں ہے۔ حافظ صاحب آجائیں گے تو سامنے بات کریں گے، ہاں اگر آپ کو کوئی کام ہو تو ہم چلے جاتے ہیں۔ لوٹ کے آجائیں گے۔“

”کیا جناب! کہا فرما رہے ہیں آپ! یہ گھر آپ کا ہے۔ مہمان تو باعث خیر و برکت ہوتے ہیں۔“ عبدالتین منذرت

کرتے۔ بہت متواضع، جرات مند اور صاف گو ہوتے ہیں لیکن عبدالتین دو دلیل کھنڈوں سے کچھ مختلف ثابت ہوا۔ لیے میں نزاکت اور طرح داری کھنڈ جیسی تھی۔ ہمیں شر کے متعلق پوچھنے لگا کہ سنا ہے ولایت کے شہروں کا مقابلہ کرنا ہے۔ اپنا اضطراب دور کرنے کے لیے اس نے ناشائستگی سے ہمارے مشاغل، ہماری حیثیت اور دیگر کوائف جاننے کی کوشش کی۔ بھٹل کو ان سوالات سے واسطہ پڑنا رہتا تھا۔ سو جواب اذیت تھے۔ ہمیں شہر میں آباد اجداد کی آمدنی سے گزر اوقات، یعنی عمارتوں کی تعمیر اور شکار وغیرہ کی مصروفیات، ان وضاحتوں سے بھی ہماری آمدنی کو نیت واضح نہیں ہوتی تھی تاہم شش و شنب کے باوجود عبدالتین نے ہم انہیں مہمانوں کے لیے دیدہ و دل کی ارزانی میں کوئی غل نہیں کیا۔ بالائی اور خشک میوے کی آمیزہ رسا دل اور خاص دان میں نفاست سے بنی ہوئی پان کی گلدیریاں اس نے ہمیں کھلائیں۔ حقے ہی سے بھٹل کی آنکھوں میں سرور کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

اختی دیر میں عبدالتین کے احوال کے اعتماد اور بیان کے زور سے ہمیں ان دونوں بھائی کی خوش اخلاقی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ ایک بھائی کا انتقال ہو چکا تھا۔ باقی دونوں بھائی اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ گھبرا سادات کے علاوہ رام پور کے اطراف میں بھی ان کی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک (کھنے کی کاشت) سبزیوں کے کھیت، پتی شکر بتانے کے دو کھنڈ سال، دو کھوں اور ہیمینوں کا باڑا، امرود اور آم کے باغ سے ظاہر ہے، انہیں معقول آمدن ہوتی ہوگی۔ خوش سمنی بھی داد و ستاس کے مانند ہے۔ بڑی حد تک لاف و گراف سے آلودہ عبدالتین کی باتیں بھٹل نے نہایت اہتمام سے سنیں۔ جب ہمارے اور اس کے درمیان بے گنجی کا تاجب کسی طور پر کم ہوا تو بھٹل نے مولوی صاحب کا ذکر چھیڑا۔

جیسے کسی نے چنگی بھری یا رت اڑ کے عبدالتین کی آنکھوں میں چلی گئی۔ ایک محلے کے حیرت زدہ سکوت کے بعد وہ دگرگوں آواز میں گویا ہوا ”آپ انہیں کس طرح جانتے ہیں؟“

میرے کان بھی کڑے ہو گئے تھے۔ بھٹل نے مسکرا کے کہا کہ جو حافظ عبدالحق کو جانتا ہے، مولوی صاحب سے بھی واقف ہوگا۔

یہ جواب شانی نہیں تھا لیکن عبدالتین نے ایک بردبار، پرہیزگار شخص کے طور پر اپنے لیے کس خوش اسلوبی قائم رکھی۔ وہ مولوی صاحب کی تعریف و توصیف کرنے لگا۔ گھبرا

کے کنارے کنارے بسا ہوا ہے۔
”پھر ساتھ ہی چلا اپنے!“ بھٹل نے خروانہ انداز میں کہا۔

”کیا صاحب، بھائی صاحب مان جائیں گے۔ تو یہ کیجئے۔“ عبدالتین بھٹلے ہوئے بولا۔ وہ تو ابھی تک مجھے پیچھے نہیں چھوڑے ہیں، نا تجربہ کار، نا پختہ اور ہے بھی کچھ ہی۔ ان کے آگے تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ ان کے لیے میں اولاد، وہ میرے لیے باپ کے مانند ہیں۔“
”آپ نے ادھری مراد آباد میں پڑھائی نہیں کی؟“ بھٹل نے آچشتی آواز میں پوچھا۔

چند سال کے لیے میں بھی وہاں رہا ہوں۔ جامعہ قاسیہ میں پڑھتا تھا لیکن صاف بات یہ ہے، ایک تو مجھے دینی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، دوسرے والدہ کی تیار کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑ کے واپس آنا پڑا۔ مشیت خداوندی دیکھئے، مٹھلے بھائی جان بھٹلے جتنے تھے کہ اللہ نے والدہ سے پہلے انہیں اپنے پاس بلالیا۔ پھر تو مراد آباد واپس جانا ممکن ہی نہیں رہا۔“

”اپنے مولوی صاحب بھی تو ادھری پڑھاتے تھے؟“
”کون! مولوی شفیق صاحب! جی، جی ہاں“ عبدالتین نے تذبذب سے دہرایا، ”وہ بھی جامعہ قاسیہ میں مدرس رہے ہیں۔“

”بعد کو تو انہوں نے چھوٹا موٹا دھندا شروع کر دیا تھا۔“
”بھٹل نے جیسے خود کھائی کی“ برتنوں کے نمونے شہر شہر لے جانے لگے تھے۔“

”مراد آباد کے بیشتر لوگوں کا یہی کاروبار ہے۔“
عبدالتین سرسری انداز میں بولا۔
”آج کل کیا کرتے ہیں؟“ بھٹل کی آواز میں کسی قسم کا ٹکڑ نہیں تھا۔

”واللہ اعلم“ عبدالتین بے گامگی سے بولا۔
”یہاں تو آتے رہتے ہوں گے؟“

عبدالتین نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد چونک کے جواب دیا، ”جی ہاں، کبھی کبھار، ان کا ایسا ہی ہے، آج یہاں کل وہاں۔“

”پر میں پچیس روز پہلے تو ادھری ضرور آئے ہوں گے۔ مراد آباد سے پتا چلا تھا کہ آگے گمری سادات جانے کا بولتے تھے۔“

”جی، جی ہاں۔ آئے تھے“ عبدالتین بے اعتنائی سے بولا، ”اصل میں ان دنوں میں زمین کے ایک مقدمے کے

لسلے میں بریلی گیا ہوا تھا۔ یہاں آگے معلوم ہوا، تشریف لائے تھے۔ میرے پیچھے آئے اور پیچھے ہی چلے گئے۔“

”شادی کی یا ابھی تک لٹھوڑے ہیں؟“
”کچھ صحیح نہیں معلوم“ عبدالتین کا چہرہ کھینچنے لگا۔ بھٹل نے اسے مزید زیر بار نہیں کیا۔ زیادہ جتن سے کچھ حاصل ہونے کی توقع نہیں رہی تھی۔ لگتا تھا، اس سے زیادہ کہ عبدالتین کو یار ابھی نہیں ہے۔ اس نے ایک گوشہ اماں دھونڈ ہی لیا تھا کہ لا علی کا اٹھار گرتا رہے۔
بھٹل حقے میں مصروف ہو گیا۔ باقی حافظ عبدالخالق کی واپسی پر اٹھائے رکھنا ہی مناسب تھا۔

اب کوئی ابہام نہیں رہ گیا تھا۔ ہمیں ہر طور حافظ صاحب کے آنے تک دہیں بنے رہنا تھا اور اس دوران میں عبدالتین پر چھائی ہوئی دھند دور کرنا بھی ضروری تھا کیونکہ ہم اسی کے کھر بیٹھے تھے۔ مینار کی خوش نوودی سے مسمان کی خوش وقتی مشروط ہے، دل جمع بھی اور ہماری حیثیت تو یوں بھی مسائل کی تھی۔ بھٹل نے کچھ دیر بعد اس سے پان کی فرمائش کی۔

بھٹل کی صدار غلاظ و بچاں عبدالتین گھر اس گیا۔
”کدھری کوٹنے بابا! کچھ یاد آگیا کیا؟ کوئی کام وام؟“
بھٹل نے سادگی سے کہا۔

”نہیں، نہیں جناب!“ عبدالتین سیدھا ہو کے بولا۔
”آپ کیا فرما رہے تھے؟“
”پان مل سکتا ہے؟“

”ضرور ضرور، کمپن نہیں، میں تو بھول ہی گیا۔“ وہ ندامت سے بولا اور دھندھا مونڈھے سے اٹھ۔ وہ ملازم کو بھی آواز دے سکتا تھا لیکن اٹھنے کے لیے بس جیسے وہ کسی کدھر کا فتنہ تھا، ”پان کے بغیر چائے کا لطف ہی ادھورا ہے“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور خاصی دیر بعد واپس آیا۔ چہرے سے گردوغبار دھو کے آیا تھا۔ آواز میں کوئی کرہ پڑی ہوئی نہیں تھی، خاص دان بھٹل کے سامنے رکھ کے آراستہ لمبے میں کہنے لگا، ”ننان خانے میں یاد دلایا، بھائی صاحب کے آنے میں رات بھی ہو سکتی ہے۔ کھانے کا وقت تو دیے بھی ہو جائے گا۔ جناب کا کوئی پرہیز ہو یا کوئی خاص چیز پسند ہو تو کسی کھٹک کے بغیر فراہم۔“

”گھر میں جو ہوگا کھائیں گے۔“
”پھر بھی جناب!“ وہ جھٹکتے ہوئے بولا۔
”اسنے کو دو پانی کی ضرورت کم پڑتی ہے۔“

عبدالتین ایسا دیر فہم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ منہم

کشتانی میں اسے لمحے لگ گئے اور وہ کھل کھلا پڑا ”بھتر ہے باب! اُخدا کرے کبھی نہ پڑے۔ یہ تو بت اچھی بات ہے، پھر مجھ پر چھوڑ دیجئے۔“

”سارا آپ پر ہی ہے۔ مسمان تو آدمی نیل میں ہوتا ہے۔“

”بالکل، بالکل نہیں“ عبدالتین شوخی سے بولا۔
”ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ مسمان کھلے رہتے ہیں۔ اتنا کھٹک نہیں کیا جاتا۔ کھنٹو تو یہاں سے ویسے بھی دور ہے۔“
”پر ہمیں اور بھی دور ہے۔“ بھٹل نے مسکرا کے کہا۔
”وہاں کا تو معلوم نہیں کیا دستور ہے؟“ عبدالتین نے برجستگی کی کوشش کی، ”میں تو جناب اپنے گاؤں کی بات کرتا ہوں۔“

”گاؤں، کھیت، کھلیان سے کیا ہے بادشاہ سلامت! ان کے سچ بھی بڑے کل دو تھکے، راجے ہمارا بے دیکھے ہیں ہم نے۔ اور آپ کیا کسی سے کم ہو۔“

”کیا فرما رہے ہیں آپ!“ عبدالتین کا جسم دہرا ہو گیا۔
”ہم کو اس حوٹلی سے مت دیکھیے، اس کا قصہ تو آپ کو بتایا ہے، ہم تو تیرا کئی کسان ہیں، مزدور ہیں۔“
”سارا تو من کا کھیل ہے باوصاحب!“

عبدالتین کی آواز تھمتانے لگی، ”بے شک سب دل سے ہے۔ دل ہے تو سب کچھ ہے، دل نہیں تو کچھ بھی نہیں۔“

”رات ہو گئی۔ بیٹھک میں قد ملیں روشن کر دی گئیں۔ عبدالتین نے حقہ تازہ کر دیا تھا۔ ملازم نے کب سے تخت پر دسترخوان بچھا رکھا تھا۔ عشا کی اذانیں گونجتی رہیں اور عبدالتین دیر تک غائب رہا۔ دیواری گھڑی نے نو بجائے تھے کہ دو ملازموں نے دسترخوان پر نام چینی کے ڈونگے رکھنے شروع کر دیے۔ عبدالتین نے درے انہیں احکام دیتا رہا۔

مقطر کی پٹنی، سر کے میں بھی کیا یاز گرم کباب، گرم پراٹھے، ٹھنڈا پانی۔ یہ لاؤ لاؤ۔ کسی طے شدہ دعوت کی طرح عبدالتین نے اہتمام کیا تھا۔ عمارت کے اندرونی حصے کی جانب سٹیج میں منہ ہاتھ دھو کے ہم دسترخوان پر آ گئے۔ ہم نے دوپیر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ابھی تک جھوک نہیں تھی۔ بھٹل کو بھی نہیں ہوگی۔ عبدالتین نے دسترخوان پر کھانوں کی دکان لگائی ہوئی تھی۔ جھوک بھی اسی نے مثالی تھی۔ میرا دل تو اڑا جا رہا تھا۔ کچھ اچھا بھی نہیں لگ رہا تھا۔ میرے قوتی میں آتا تھا، حافظ عبدالخالق تو جب آئیں گے، آئیں گے۔ عبدالتین بھی اسی گھر کا فرد ہے۔ یہ بھی بہت کچھ

جانتا ہوگا۔ نہ جانتا ہوتا تو مولوی صاحب کے نام پر اس کی آواز کیوں اٹھنے اڑنے لگتی۔ یہ سیدھی طرح زبان نہیں کھولتا تو ٹھیک ہے، چاقو کی ایک جھٹک ہی کافی ہوگی۔ ممکن ہے حافظ عبدالخالق کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یہاں ہماری کون سی رشتے داری ہے اور کون سا بار بار نہیں یہاں آتا ہے۔

ہم نے چند ہی لمحے حلق سے اتارے تھے کہ باہر گلی میں گھوڑے کی ٹانگیں سنائی دیں۔ ساتھ ہی آگے کی پوں پوں اور مختلف لوگوں کا شور ”بیچے بھائی صاحب آگئے“ عبدالتین معذرت کر کے دسترخوان سے اٹھ گیا۔ وہ دروازے سے باہر نہیں جا سکا تھا کہ آگے پیچھے کی ٹونڈ، چست و چالاک آدمی بڑے بڑے تھیلے، کچیں باڑی کا سامان، گنے اور بزنوں کے کٹھے اور بوریان ہاتھوں میں اٹھائے کاندھوں پر لٹکائے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں بندوق بھی تھی۔ ان کے عقب میں درمیانے قد، کٹھے ہوئے جسم، اونچی باڑھ کی ٹوپی، شہروانی اور رنگ مری کے پاجامے میں ملبوس، بچپن سے ساٹھ سال کی عمر کا ایک شخص دروازے پر کھائی دیا۔ چہرے کی رنگت آنے سے مشابہ تھی۔ ترشی ہوئی داڑھی میں سیاہ بالوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ سب کی نگاہوں کا مرکوز ہی تھا۔ حافظ عبدالخالق وہی ہو سکتا تھا۔ سامنے تخت پر ہم دو اجنبیوں کو دیکھ کے وہ متعجب ہوا اور کھٹکتی ہوئی آواز میں اس نے ہمیں سلام کیا۔ میں اور بھٹل تخت سے اتر آئے۔

”بہت دیر ہو گئی“ عبدالتین نے شکایتی لہجے میں کہا۔
”کیا بتائیں، صاحب بہادر کھٹک صاحب بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ کہیں سے بھٹک مل گئی۔ بس بلوالیا۔ نواب راشد علی خاں کے ساتھ شکار پر جا رہے تھے۔ بہت منع کیا، کچھ نہیں سنی اور اتفاق دیکھو، پچھلے دنوں کتنی بار گئے، ہرن نظری نہیں آئے۔ آج پورے چھ ہاتھ لگے“ حافظ عبدالخالق فخریہ انداز میں بولے۔

”ہرن لائے ہیں؟“ عبدالتین نے اشتیاق آمیز حیرانی سے کہا۔

”نواب صاحب نے پورے دو عطا کر دیے۔ ہرن کے علاوہ بھی آج بہت کچھ ہے۔ نواب صاحب کے ساتھ شکار کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ نشانہ تو کمال کا ہے۔ کئی بار تمہارا خیال آیا، تم بھی ساتھ ہوتے۔ نواب صاحب بہت پوچھتے تھے۔ تمہارے نشانے کے تو بڑے قائل ہیں۔“
”چلے پھر سہی“ عبدالتین نے کشادہ دلی سے کہا، ”مجھے تو

فکر:۔۔ نے گئی تھی۔ ایسی کیا بات ہوئی۔ اتنی دیر تو آپ نے کبھی نہیں لگائی۔

”بجوری تھی۔ کلک صاحب کی زبان سے میرا نام نکل گیا تھا۔ نواب صاحب نہیں مانے، کہنے لگے، حافظ کو بھی ساتھ لے لو۔ میں نے عرض کیا، گھر کمرہ کے نہیں آیا ہوں، کہنے لگے، ہر کارہہ مجھوادیے ہیں۔ عرشی صاحب بھی ساتھ تھے۔ راستے بھر شعر شاعری ہوئی رہی۔ کیا اہتمام تھا۔ پورا لاؤ لشکر، بیس، بیچیں کے قریب نفری ہوئی، ہر چیز کی افراط۔“

”میرا مہمان دوسرے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ عبدالستین کو آخر ہمارا خیال آگیا۔

”میں دیکھ رہا ہوں“ حافظ عبدالخالق کی حیرت بھری نظر میں ہم پر مرکوز ہو گئیں ”جناب کی تعریف!“

اس سے پہلے کہ حافظ صاحب کچھ کہتے یا عبدالستین زبان کھولتا، بھٹل نے دھیمی آواز میں کہا ”اب آپ کو یاد نہیں ہوگا۔ بیچ میں برس ہو گئے۔ مراد آباد میں کبھی آنا سامنا ہوا تھا۔“

حافظ عبدالخالق کے چہرے پر کشش کے آثار نمودار ہوئے ”یہ خدا! مجھے یاد نہیں“ اور میری یادداشت ایسی کمزور بھی نہیں ”حافظ صاحب! بھی ہوئی آواز میں بولے ”کہاں سے تشریف لائے ہیں جناب!“

”بیمنی سے آئے ہیں صاحب!“ بھٹل نے کہا ”ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔“

”ضرور“ حاضر ہوں جناب! سر کی ضرورت تو نہیں ہے؟“ حافظ عبدالخالق خوش گواری سے بولے۔

”ہاں صاحب!“ بھٹل نے تھکے لیے میں کہا ”ایسا ہی ہے پر تھوڑی دیر کے لیے۔“

”خدا خیر کرے“ حافظ صاحب ہلکیں جھپکے لگے۔

”پہلے مراد آباد گئے تھے۔ ادھری لوگوں نے بولا، آپ نگہا سادات لوٹ گئے ہو۔“

”ایسی کیا بات ہے جناب!“ حافظ صاحب تردد سے بولے۔

”نہیں یہی کرنا چاہیے تھا گھر چل جائے، مجھے یاد نہیں پڑتا، جناب سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔“

”ابھی آپ تھکے ہوئے لوٹے ہو۔“ تھوڑا ٹھکانے سے ہوجاؤ۔ یاد آجائے گا سارا“ بھٹل نے دسترخوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ صاحب کو ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔

”معاف کیجئے، بڑی کوتاہی ہوئی۔ میرا تو ماشاء اللہ دسترخوان سما ہوا ہے۔ بسم اللہ، بسم اللہ۔ مجھے نہانے اور کپڑے بدلنے میں کچھ دیر ہوجائے گی۔ نہانے بغیر تو جین نہیں آئے گا۔ اب کھانا جاری رکھئے، بسم اللہ۔“

”ہم بعد میں نکلیں گے، بھٹل بیٹے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

”نہیں جناب! یقین کریں، بھوک بھی ایسی نہیں ہے۔“

راستے بھر کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے ہی رہے ہیں۔ اب زیادتی ہو جائے گی“ حافظ نے لجاہت سے کہا۔

”میں بعد میں نکلیں گے، بھوک بھی ایسی نہیں ہے۔“

”نہیں جناب! یقین کریں، بھوک بھی ایسی نہیں ہے۔“

راستے بھر کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے ہی رہے ہیں۔ اب زیادتی ہو جائے گی“ حافظ نے لجاہت سے کہا۔

”میں بعد میں نکلیں گے، بھوک بھی ایسی نہیں ہے۔“

”نہیں جناب! یقین کریں، بھوک بھی ایسی نہیں ہے۔“

راستے بھر کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے ہی رہے ہیں۔ اب زیادتی ہو جائے گی“ حافظ نے لجاہت سے کہا۔

فقہانوں کا طشت بھیل کے سامنے رکھا۔

”یہ کیا ہے؟“ بھٹل نے سرخوشی کے انداز میں صدا بلند کی۔

”بھائی صاحب کو بہت پسند ہے“ اس کا مطلب ہے، وہ اب آیا ہی چاہتے ہیں۔ حج پر گئے تھے تو بس اس قوتے کی عادت پڑ گئی“ عبدالستین جھک کے بولا۔

”ملازم نے طشت سے نجان اٹھا کے سب کے سامنے رکھنے شروع کر دیے تھے کہ محن کی جانب سے ہماری قدموں کی آہٹ سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے حافظ صاحب کو نجی آواز میں سلام کرتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے انہوں نے طبل کے کرتے پر سفید شال اوڑھ رکھی تھی۔ سر پر ٹوپی نہیں تھی۔ خاصے سننے والے لگ رہے تھے۔ آتے ہی معذرت کی کہ عشا کی نماز میں وقت لگ گیا۔ بڑے بھائی کو دیکھ کے عبدالستین بالکل گونگا ہو گیا تھا ”رات مہمانوں کے لیے تم نے کیا انتظام کیا ہے“ حافظ صاحب نے فکر مندی سے پوچھا۔

”بالائی کمرے کی صفائی کرا دی گئی ہے“ عبدالستین نے تن دی سے جواب دیا۔

”پر شاید ہم رات بھر کے لیے آپ کو تکلیف دیں۔“

بھٹل نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اسٹیشن سے چلا تھا کہ ترکے میں مراد آباد کی کوئی گاڑی جاتی ہے۔“

”کیا جناب!“ حافظ عبدالخالق کے لیے میں شکوہ نمایاں تھا ”ٹھیک پانچ بجے گاڑی ضرور جاتی ہے لیکن آپ رات کیوں بے آرام کرتے ہیں۔ ایسا ہی ہے تو صبح دس والی سے چلے جائیے اور میں تو کموں گا کہ کچھ اور قیام کیجئے۔ ہے تو یہ دیرسات ہی۔“

بیمنی والوں کا دل کہاں لگے گا لیکن اچھی کھلی سرسبز جگہ ہے۔ اطراف میں دل کش مقامات ہیں۔“

”جگہ سے زیادہ آدمی کی بات ہوتی ہے۔ آدمی دل کے کھلے ہوں اور چھاؤں والے ہوں“ بھٹل نے بیچ آواز میں شکریہ ادا کیا اور غدر کیا کہ مراد آباد کے مسافر خانے میں ہمارے مین سامھی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔

”ابھی تو آپ سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی، صحیح تعارف بھی نہیں ہوا اور آپ جانے کی بات کرنے لگے۔“

”بات کوئی لمبی نہیں ہے۔“

”پھر بھی جناب! ایک رات تو قیام کیجئے۔ رات کو کہاں سفر کیجئے گا“ حافظ صاحب نے ہم دردانہ لہجے میں کہا اور فغان میں قوتہ اندھیل کے بیٹھل کو پیش کیا۔

”سفری لٹنا ہے، کہنے بھر کا۔“

”پورا اٹھنا بھی کہاں“ درمیان میں صرف ملک اور رام پور چند منٹ کے لیے گاڑی ٹھہری ہے۔ لیکن بس آپ صبح ہی کو چاہیے گا“ حافظ صاحب نے حتمی طور سے کہا۔

”جیسا آپ کا حکم ہو“ بھٹل نے سر جھکا لیا۔

”میرزاں صرف درخواست کر سکتے ہیں۔“

”پر مہمان بن بلائے نہ ہوں تبھی صاحب“

”مہمان تو مہمان ہی ہوتا ہے جناب! میں بلائے کا اور لحاظ کرنا پڑتا ہے“ حافظ صاحب نے لچکتی چچکتی آواز میں کہا پھر سنجیدگی سے بولے ”بہتر ہے“ آپ اپنا مدعا بیان فرمائیں۔

”کیسے زحمت کی ہزاروں کوس دور سے اس جنگل، بیابان کا رخ کرنے کی۔ اور ہاں، بہتر ہوگا پہلے مجھے کچھ یاد دلانے، کب اور کن حالات میں مراد آباد میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی؟“

بھٹل نے حقے کا ایک گھراٹا لیا ”بات ذرا۔“ اس نے عبدالستین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”چلیں، سویرے بات کریں گے۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ آپ کے سونے کا بھی ٹائم ہو گیا ہوگا۔“

بھٹل کا اشارہ واضح تھا۔ دونوں بھائی سمجھ گئے اور عبدالستین شائستگی سے بولا ”اب بھائی صاحب موزوں ہیں، انہی کا انتظار تھا، اب آپ کو؟“ اب کھل کے بات کیجئے۔ میں ذرا اوپر جا کے آپ کا کراؤ وغیرہ دیکھتا ہوں۔“

”کسی نے اسے نہیں روکا۔ عبدالستین موزوں سے اٹھ گیا اور دیکھتے دیکھتے او بھل ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بیٹھک میں دیر تک گھڑی کی ٹک ٹک اور حقے کی گڑ گڑاہٹ گونجتی رہی۔ حافظ عبدالخالق کی تجسس نگاہیں بھٹل پر جمی ہوئی تھیں۔ بھٹل نے پہلو بدل کے خاص دان حافظ صاحب کی طرف پڑھایا۔ حافظ صاحب نے گھوری اٹھا کے خاص دان بھٹل کو واپس کر دیا۔ بھٹل نے بھی ایک گھوری منہ میں رکھ لی۔

”دیکھو صاحب! ہم جانے کدھری سے چلتے ہوئے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہماری بات ذرا دھیان سے اور ٹھنڈے ہو گئے سنو۔“ اس مختصر تمہید کے بعد بھٹل نے سمنی ہوئی آواز میں کہا ”ہم کو آپ سے مولوی شفیق کے بارے میں پتا کرنا ہے۔“

بھٹل کی جانب سے ایسی کوئی ابتدا حافظ عبدالخالق کے سامان و گمان میں نہ تھی۔ وہ موزوں پر اٹھ چل پڑے ”مولوی شفیق!“ وہ حیر سے بولے۔

”آپ کا ان کا بہت ساتھ رہا ہے“ بھٹل نے سر دلیجے

کتابیات پبلی کیشنز

میں کہا "ہم کو بتاؤ، بڑے صاحب! وہ کدھری چھپے ہوئے ہیں؟"

"آپ؟ آپ کون ہیں؟" حافظ صاحب اضطرابی انداز میں بولے۔

"ہم کوئی بھی نہیں، دروازے پر سوال کرنے والے لوگ سے نام بتا کر پوچھتا ہے اور مٹھی کھولنے کو یہ آپ کی کوئی شرط ہے تو ہم باپ دادا سے اپنا آکا پچھا سارا بول دیں گے۔"

"کیا، کیا فرما رہے ہیں آپ؟" حافظ صاحب بدحواس ہو گئے۔

"اپنا مولوی صاحب کا ایک پرانا بل پڑا ہوا ہے۔ بل بھی ان کا ڈالا ہوا ہے۔ ابھی ٹائم بہت ہو گیا ہے صاحب! بھلنے نے پتہ چلی آواز میں کہا۔

"مگر مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں؟" حافظ صاحب کسی قدر سراپستگی سے بولے "کیا کیا آپ صرف اسی کام کے لیے آئے ہیں؟"

"اپنے پاس بہت دنوں سے اس کے سوائے کوئی کام نہیں ہے۔" بھلنے نے ٹھوڑی کھجائے ہوئے کہا "دیکھو صاحب! آپ حافظ ہو، نمازی اُدی ہو، اپنے کو اس خواری سے نکالو۔"

"کیسی خواری، کیا بات ہے جناب! حافظ صاحب نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنی ناتوانی اور بے چارگی کا اظہار کیا "میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ چاہو تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔"

"کاش ایسا ہو لیکن آخر کس وجہ سے آپ کو مولوی شفیق کی تلاش ہے؟" حافظ صاحب کی آواز غلغلے میں اٹک رہی تھی۔

"اپنی ایک چیز مولوی صاحب کے پاس ہے۔ ان کو بولو، اس کو لوٹاؤ۔" بھلنے نے سرگرائی سے کہا۔

"کیسی چیز؟" حافظ صاحب منتشر لہجے میں بولے "مولوی شفیق سے میرے اچھے مراسم ہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ایک سچے اور کھرے آدمی ہیں۔ دین دار، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور امین۔ مجھے شبہ ہے، آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"دور کر دو نا صاحب پھر" بھلنے کے لہجے میں سختی آگئی۔

"بہ خدا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، حافظ عبدالحق کی حالت غیر متوقع طور پر بیماری ہو گئی۔"

ہے آپ کے لیے۔ تھوڑی دیر کے لیے مولوی صاحب کو پرے کر کے دھیان دو گے تو سارا کالا سفید سمجھ میں آجائے گا۔"

"اگر، اگر آپ کی مراد مولوی صاحب کے اور آپ کے درمیان کسی پر خاش میں میری دخل اندازی سے ہے تو میں واضح کر دوں" حافظ صاحب نے رکھائی سے کہا "میں کسی کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ خصوصاً مولوی شفیق کے کسی معاملے سے میں الگ ہی رہتا چاہوں گا۔"

"اس کا کارن ان کا آپ سے پرانا ناتا ہے نا؟"

"جی ہاں" حافظ صاحب جربز ہو کر بولے "یہی سمجھتے۔"

"تو ہماری تو آپ سے کوئی ذور بندھی نہیں ہے۔"

"جی، جی صاحب! حافظ صاحب سنبھلے ہوئے گئے پھر سنبھل کے بولے "مگر فریق کوئی غیر نہیں، مولوی شفیق ہیں۔"

"آپ کو ذرا ہے کہ ان کا گھانا ہو جائے گا؟"

"میں میں نے یہ کب کہا؟"

"پھر کیا ہے؟ آپ کیوں گھبراتے ہو؟"

"گھبرانے کی کیا بات ہے؟" حافظ صاحب جہن چٹا کے بولے "یہ کام میرے مزاج کے خلاف ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ مجھے اس کی ہمت نہیں۔ اس طرح آدمی دوستوں کھودتا ہے۔ برا بن جاتا ہے۔ ممکن ہے، آپ حق پر ہوں مگر میں کوئی فیصلہ کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ فریقین میں کسی ایک سے قربت داری ہو تو منصف بھی معذوری ظاہر کر دیتا ہے۔"

"کیوں کر دیتا ہے؟" بھلنے نے دھتے لہجے میں پوچھا۔

"اس لیے کہ اس سے جانب داری سرزد نہ ہو جائے۔"

"ہم سے آپ کچھ نہیں کھوؤ گے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ! حافظ صاحب بھر بھری لے کے بولے "بس کیجئے جناب۔ میرے لیے آپ بھی نہایت محترم ہیں۔"

"ایک بات بولو صاحب! رستے میں ایک آدمی دوسرے آدمی کا گھٹا کھوٹتا ہے تو آپ دیکھتے ہوئے آگے چلے جاؤ گے، اس لیے کہ ان میں ایک آپ کا جاننے والا ہے، گھٹا کھوٹنے والا۔"

"آپ بات کیوں بڑھا رہے ہیں۔"

"اپنے کو جواب دو صاحب! حافظ صاحب نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"گھٹا دھانے والے کا ہاتھ روکو گے یا اس کی پیٹھ پر تھکی دو گے، مار ڈالو گے سو کر ادلاؤ، آگھ بچا کے بڑھ جانا بھی تھکی دینے سے کم نہیں ہے۔"

"مجھے مولوی شفیق پر پورا بھروسہ ہے۔"

"بھلنے نے جت نہیں کی کہ پھر پیش رفت میں کون سا خدشہ مانع ہے۔ اس نے سروش اٹھا کے چلم کی انگلی سے کپڑی اور پھونکیں مار کے فردوں کی۔ کوئلے جتنے لگے۔ اس وقت میں حافظ صاحب پتھر بنے بیٹھے رہے "ٹھیک ہے بڑے صاحب! بھلنے نے حقہ کھینچتے ہوئے کہا "ہم کو بولو، ہم کدھری جاؤ گے؟"

"میں میں کیا کہہ سکتا ہوں" حافظ صاحب بے رخی سے بولے۔

"آپ نے مولوی صاحب سے نہیں پوچھا کہ ان کے ساتھ وہ لڑکی کون ہے؟" بھلنے نے آہستگی سے کہا۔

"کون کون سی لڑکی؟" حافظ صاحب کی زبان لڑکھرائی۔

"جوان کے ساتھ آپ کے گھر آئی تھی۔ ادھری رہی تھی۔ اس گھر اس حویلی میں نہیں کیا؟"

"میں آپ کے ہر سوال کی جواب دہی کا پابند نہیں ہوں۔"

"بالکل نہیں، ہم آپ کے سوتیلے بھی نہیں گتے۔ پر ہم نے آپ سے پہلے ہی بولا تھا کہ ہم تو راج محل کی زنجیریں کھینچ آئے ہیں۔ آپ کے چپ رہنے کا مطلب ہے کہ آپ بہت کچھ جانتے ہو اور چھپانے کا مطلب بھی کھلا ہے کہ آپ اپنے لنگوٹے مولوی صاحب کے بارے میں خود بھی کھنکھاتے ہو۔ دیکھئے میں بڑے صاحب! آپ کا سرویہ بھی حساب سے بڑا ہے۔ سن ٹن بولنا چاہیے۔ دنگی دھانی گھر خوب چلتا ہوگا۔ کبھی رات کو سوچتے ہیں آپ نے ہر املا کے نہیں دیکھا کہ مولوی صاحب کو ہمارے آگے آنے میں کون سی بیڑی پڑی

ہے؟"

"کوئی ہوگی جناب! حافظ صاحب نے بے زاری سے کہا "اور دیکھئے، میرے محترم! مجھے اپنے بارے میں آپ کی کسی رائے، آپ کے کسی مشورے کی حاجت نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس طرح آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"اب تک یہی کیا ہے صاحب! شاید اب زیادہ نہ ہو، ہم کو آپ سے جو جانتا تھا، ہم نے جان لیا ہے۔"

"کیا، کیا جان لیا ہے؟" حافظ صاحب نے بھڑک کے کہا۔

"یہی صاحب کہ آپ کو ساری رام کتھا، سارے الٹ پھیر کا پتا ہے اور آپ ہم کو بھی پہچان گئے ہو کہ کون سی نسل کے کاٹ کھانے والے ہیں۔"

"میں بھلنے سے یہی کہنا چاہتا تھا کہ اب مزید اصرار و تکرار سے کیا حاصل ہے۔ اب اور کیا نہیں رہ گیا ہے۔ اتنی دور سے آنے والے انجنیوں کا مقصد جاننے، ان کا ماجرا سننے کی جستجو اور اضطراب اور ہی ہونا چاہیے تھا۔"

"مولوی صاحب سے اپنے دیرینہ تعلق کی نسبت سے تو حافظ صاحب کو جزئیات کی بے چینی ہو نا لازم تھا۔ شناساؤں کے درون خانہ احوال، کچے پختے کی ٹوہ کے لیے ہر ایک کان لگائے رکھتا ہے۔ حافظ صاحب نے حیرت و تجسس کے بجائے تردید و تشویش کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مولوی صاحب کی وکالت کا فریضہ انجام دے رہے ہوں۔ ان کے جواب بے محل تھے اور برہمی بے ساختہ نہیں تھی۔ لگتا تھا، ہم ان کے لیے انجینی نہیں ہیں، جیسے کبھی کسی آنے والے وقت میں ہماری آمد کا دور دراز امکان انہوں نے احتیاطاً دماغ کے کسی گوشے میں محفوظ رکھا تھا۔ بے شک انہوں نے مولوی صاحب کی تلاش کی وجہ جاننے کی بے کلی ظاہر کی تھی مگر بہت رچی۔ ان کی جانب سے اپنی وحشت چھپانے کی کوشش بھی مصنوعی لگتی تھی۔ بھلنے مجھ سے رائے طلب کرتا تو میں اسے ایک ہی اشارہ کرتا۔ گو نہ وقت موزوں تھا، نہ جگہ مناسب تھی لیکن میرے خیال میں اب چاقو اور سینچے کا مرحلہ آ گیا تھا۔ ہتھیار لوہار کی ضرب کی مانند ہے۔ سو دلیلوں کی ایک دیگل۔ ہتھیار کبھی کبھی تریاق بھی ثابت ہوتا ہے۔ بہت عرصے بعد، حبلیمر اور حیدر آباد کے بعد کہیں حاشئے میں بیٹھے ہوئے اس قصبے میں پھر کوئی ٹھکانا دستیاب ہوا تھا جہاں مولوی صاحب اور کورا کے بیروں کے نقش بیہوش تھے۔ یہ نقش ہمیں منزل تک لے جاسکتے تھے۔ میرے پاس بھی چاقو تھا۔ بھلنے کے خیال سے میں ہاتھ بکڑے بیٹھا رہا۔"

میرا جسم دھڑک رہا تھا۔

حافظ صاحب کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ قندیلوں کی روشنی میں یہ سرخی کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ انہوں نے جھڑکنے کے انداز میں ہٹھل سے کہا ”دیکھیے جناب! آپ مسمان کی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ بہتر ہوگا“ اب یہ باب بند کر دیتے۔ مجھے آپ کے اور مولوی صاحب کے کسی مناتے سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے اس بابت کوئی علم ہے نہ دلچسپی اور جہاں تک میرا حافظ کام کرتا ہے، میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔ مجھے آپ سے کسی واقف کاری کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے اٹھ جاؤں تو میں اٹھا جاتا ہوں۔“

”ہم ایسا کیسے بول سکتے ہیں“ آپ کا گھر ہے صاحب“ آپ ادھری کے حاکم ہو۔“ ہٹھل نے گھردری آواز میں کہا ”تسلی رکھو، ہم ادھری قبضہ جمائے کو نہیں آئے، یہی اٹھ جائیں گے پر آپ خالی ہاتھ لوٹا دو گے کیا! ہم کو بول دو صاحب! مولوی صاحب کو کدھری چھاپا ہے۔ اپنے لیے یہی جائداد، جاگیر، جان کے برابر ہے۔“

”یعنی، یعنی،“ آپ کا مطلب ہے۔ میں نے مولوی شفیق کو کیس چھاپا دیا ہے“ حافظ صاحب شرخ کر بولے ”آپ کو یہ بدگمانی ہے تو اسے دماغی فتور کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں قطعاً لاعلم ہوں“ حافظ صاحب جڑ سے گئے، کہنے لگے ”آپ اونچا سنتے ہیں کیا؟“

”میں دن پہلے مولوی صاحب ادھری تھے“ ہٹھل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

حافظ صاحب کے منتھے پھڑکنے لگے ”یہ“ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”اپنے کو چھوٹے صاحب نے بولا تھا۔“ انہوں نے ٹھیک بتایا ہے، آئے تھے، یقیناً آئے تھے۔ وہ کسی وقت بھی یہاں آسکتے ہیں، ٹھہر سکتے ہیں۔ یہاں کوئی بھی مہمان آسکتا ہے، جیسے آپ آئے ہیں۔“

”اب وہ کدھری کا بول کے گئے ہیں؟“ ”مجھے نہیں معلوم، نہیں معلوم، میں آپ سے کتنی بار کہہ چکا ہوں، یوں میں دفع الوقتی کے لیے کسی جگہ کا نام لے سکتا ہوں۔ کیا آپ یہی چاہتے ہیں۔ بس کیجئے، جتنا کہا جا رہا ہے، اتنا ہی سنئے۔“

”ٹھیک ہے صاحب!“ ہٹھل نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا ”پراچھا ہے، ایک بات جان لو صاحب! اتنی چھوٹی بھی

ہے۔ آنکھ چھوٹی کب تک چلے گی، پھر مولوی صاحب کو منہ چھپانے کو جگہ نہیں ملے گی اور ان کو بول دینا صاحب! اپنی لڑکی کو کچھ ہوا تو۔“ ہٹھل نے لمبے کے توقف میں خود پر قابو پایا اور دھیسے لہجے میں بولا ”اچھا نہیں ہوگا۔ بالکل بھی نہیں۔“

”بہتر ہے، یہ دھمکیاں آپ انہی کو دیتے گا۔ میں ان کا“ آپ کا قاصد نہیں ہوں۔ مجھے آپ کس خیال میں ڈال رہے ہیں۔ کون سے جرم کی سزا دے رہے ہیں۔“

”آپ ان کا بہت دم بھرتے ہوئے۔“ ”آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ بے شک وہ میرے نہایت معتبر دوست ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں“ حافظ صاحب نے زور دے کر کہا لیکن ان کا عزم نہ کسی لگتا تھا۔

”اسی واسطے آپ کو بولتے ہیں۔“ ”مولوی شفیق اپنا اچھا برا بھلا سے بہتر سمجھتے ہیں۔“

”پھر ایسا جھکا نہ کرتے۔“ ”ٹھیک ہے، وہ کبھی اس طرف آئے تو میں ضرور آپ کا پیغام انہیں منتقل کر دوں گا“ حافظ صاحب نے گلو خلاصی کے لیے مفاہمت کا لہجہ اختیار کیا ”اب آپ آرام کیجئے، اگر آپ کو صبح جانا ہے تو کچھ ویر کے لیے آرام کر لینا ضروری ہے۔ تاکہ والے کو میں ہدایت کر دیتا ہوں۔ میں تو شاید اٹھ نہ پاؤں۔ ملازم جاگ رہے ہوں گے۔ کوئی زحمت نہیں ہوگی آپ کو۔“

”ہم ابھی اور ادھری ٹھہرنا چاہتے ہیں۔“

حافظ صاحب کا عالم دگر ہوا، کسمپرسی کا سا عالم اور انہیں جو کہنا چاہیے تھا انہوں نے کہا ”ضرور، ضرور، شوق ہے۔“ ”اے کو ادھری شیش محل میں نہیں تو کسی کو ٹھہری“ کو نے میں جگہ دے دینا۔“

”نہیں، نہیں۔ آپ یہیں ٹھہریے مگر مگر“ حافظ صاحب ٹھٹکی ہوئی آواز میں بولے ”معاف کیجئے، ابھی تو آپ فرما رہے تھے آپ کو بہت غلت ہے، مراد آباد کے مسافر خانے میں آپ کے ہم سفر انتظار کر رہے ہوں گے۔“ ”سو کہ جائیں حرام کے“ ہٹھل نے منہ بگاڑ کے کہا ”ہم نے ارادہ بدل دیا ہے۔“

”جیسی آپ کی مرضی لیکن کوئی وجہ تو ہوگی؟“

”مولوی صاحب کسی نام بھی ادھری آسکتے ہیں۔“

”ان کے آسرے میں آپ ٹھہرنا چاہتے ہیں؟“

”آپ کو کیا اور کتنا بولیں“ آپ نہیں سمجھو گے صاحب!“ ہٹھل نے وکھتری آواز میں کہا ”ان سے اگلا کچھ

بازی کر

برابر کے بنا اپنی نہیں بچھے گی۔ بہت ٹائم لیا ہے انہوں نے بہت بچایا ہے اپنے کو، کتنے لوگ، کتنے گھر۔ جانے دو صاحب۔

”میں سمجھ رہا ہوں“ حافظ صاحب معذرت آمیز ملائمت سے بولے ”ضرور کوئی ایسی بات ہوگی لیکن جناب، ان کا کیا بھروسہ ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مالک و مختار ہیں۔ مینے کیا، سال گزر جاتے ہیں۔ اس طرح کب تک آپ ان کی راہ دیکھیں گے؟“

”آخر تک“ ادھر ہی گھر سے آپ نکال دو گے تو بارہا گلے میں، ادھر ہی ہستی میں آپ کے نزدیک ٹھکا ناکریں گے۔ آپ فکر نہ کرو، دانے دکنے کے لیے اپنے پاس تھوڑا بہت سارا ہے۔

”جی، جی ہاں“ حافظ صاحب کی آواز شکستہ ہو گئی، ”تذہب سے بولے“ میری مانتے تو کچھ عرض کروں؟“

”اب تک آپ ہی کی مانتی ہے۔“

”ایسا کیجئے، مجھے اپنا چارے دیتے، جیسے ہی انہوں نے یہاں کا رخ کیا۔ میں جناب کو اطلاع کر دوں گا۔“

”ہم نے ان کا دودھ چھٹ پی، میں پھوڑا تھا۔“

”کیا مطلب!“ حافظ صاحب جھٹکے بولے ”اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے!“

”ان سے پوچھئے بغیر آپ ہم کو لکھ دو گے؟“

حافظ صاحب کش کش سے دو چار ہوئے پھر قطعیت سے بولے ”نہیں، ان سے پوچھنا تو ضروری ہوگا۔“

”ان کا جواب جانتے ہوئے بھی؟“

”ممکن ہے، وہ آمادہ ہو جائیں، اطمینان رکھیں، میں آپ کی بے مانی آپ کی شدت کا سارا احوال ان کے گوش گزار کر دوں گا۔ میں ان پر پورا زور دوں گا۔ میں یہی کر سکتا ہوں۔“

بھٹل نے کچھ نہیں کہا اور بیٹھے کے جگ سے کٹورا بھر کے پانی پیا۔

بھٹک میں خاموشی چھائے دیر ہو گئی تو حافظ صاحب نے دہلی آواز میں ٹوکا ”تو پھر کھاتے کیا آپ نے؟“

”کیا پولیس صاحب!“ بھٹل نے سانس بھر کے کہا۔

”آپ کو میری عرض پر یقین نہیں آ رہا۔“

”آپ کو بھی ہمارے پاس نہیں آ رہا۔“ بھٹل نے بوجھلے میں کہا ”لگتا ہے بہت باندھ کے رکھا ہے آپ کو مولوی صاحب نے، طوطے کی طرح اپنی بولی دہرائی ہے۔ اپنے بارے میں کچھ نہیں بولا ہے، پر ہم پاگل خانے سے اٹھ گئے نہیں

آئے ہیں۔ بہت دھول چاٹ کے چکر کاٹ کے ادھر ہی پہنچے ہیں۔“

بھٹل نے حق کی ٹال نیچے میں اڑا کے واسطے کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں چاقو پڑا ہوا تھا۔ ایک ٹھٹکے پر چاقو کا چھکا کھل گیا۔

حافظ صاحب کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ مونڈھے پر ان کا جسم پھیرا ہوا۔ وہ اٹھنا چاہتے تھے لیکن مونڈھے نے جیسے انہیں جکڑ لیا تھا۔ ”یہ کیا جناب!“ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ ان کی بھٹی ہوئی آواز طعن میں ڈوب گئی۔

میرا سارا وجود دھٹکے لگا تھا۔ بھٹل بھی آخر اسی نتیجے پر پہنچا جو میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ اس نے خاصی دیر کوئی تھی۔ میں اب تک گونگا بیٹھا رہا تھا لیکن میں نے طے کر رکھا تھا۔ دونوں میں سے کسی ایک نے جنت تمام سمجھ کے بیٹھک سے اٹھنے کا ارادہ کیا تو میں خاموش نہیں رہوں گا۔

اس کا مطلب تھا کہ بھٹل نے حافظ صاحب کا شمار بھی مولوی صاحب کے ان واقف کاروں میں کر لیا ہے جن سے گزشتہ پندرہ دنوں کے درمیان ہم مراد آباد اور اطراف کی بستیوں میں مل چکے تھے۔ حافظ صاحب کسی طور بھی ان لوگوں کے زمرے میں نہیں آتے تھے۔

چاقو پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بھٹل نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا مگر کسی معمول کی مانند میں نے اس کے اشارے پر عمل کیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے نیچے میں جکڑ لیا اور کچھ اور سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ کسی تاخیر کے بغیر چاقو سے میری کلائی پر لکیر کھینچ دی۔ بس ایک آن کے لیے رگ دوپے میں بجلی سی چپکٹی تھی اور کلائی میں چنگاریاں لپکی تھیں۔ میں نے اپنی سکاری سینے ہی میں کھونٹے رکھی۔ بھٹل نے کبھی اور بھٹل کے درمیان سات آنچ کے قریب لکیر کھینچ کے کھال کھول دی تھی۔ حافظ صاحب کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ انہوں نے یہ مشکل تمام کہا۔ اسی وقت بھٹل نے اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی پر بھی میری کلائی جیسی ایک دھاری ڈال دی۔ دونوں کا خون ٹھٹکتے ٹھٹکتے بننے لگا۔

بھٹل نے چاقو بند کر کے جیب میں واپس رکھا تو سینے میں انکی ہوئی حافظ صاحب کی سانسیں کسی قدر بحال ہوئیں اور وہ بے تحاشا شور مچانے لگے ”یہ کیا، یہ کیا، کیا آپ نے؟“ ان کی لڑتی ہوئی صدا میں بیٹھک میں گونج رہی تھیں۔ دونوں

بازوی گزر 5

22

کی طرح ادھر ادھر منڈلاتی ہوئی ان کی نظریں میز پوش رنگیں اور انہوں نے اس کے کونے سے پہلے میری پھر بھٹل کی کلائی سے اٹھا ہوا خون بند کرنے کی کوشش کیا۔ پھر انہوں نے اپنی شال بھاڑ دینا چاہی۔ اسی اثنا میں بھٹل نے اسے چاک ڈھکا ہوا کٹڑا ان کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے اسے چاک کر دیا۔ بھٹل نے انہیں روکا اور چلم کی راہ چنگی میں بھر کے میرے اور اپنے زخم پر پھیر دی۔ گرم راکھ سے مر جیسی سی بھر گئیں ”آرام سے بیٹھ جاؤ صاحب!“ بھٹل نے ٹھہرے ہوئے لمحے میں کہا۔

”یہ کیا کیا آپ نے؟“ حافظ صاحب پر دہشت طاری تھی۔

”ٹوکا سے صاحب“ بولتے ہیں خون بہت کام کی چیز ہوتا ہے، جلدی اثر دکھاتا ہے۔“

”یہ تو بہت بہت زیادتی ہے۔“

”اپنے ساتھ ہی کی ہے صاحب۔“

حافظ صاحب کی چیخ پکار پر پہلے ایک ملازم بھاگا ہوا آیا، پھر دوسرا، تیسرا، اُسے جلدی کو لایا، پھٹکری، روٹی لاؤ۔

اس پر تھے گھر میں؟ کس کی لائین والی الماری میں دیکھو، وہ بے درپے احکام دیتے۔ ٹھوڑی دیر میں دو اور آدمی آئے۔ ان میں ایک تینیس چوبیس سال صحت مند نوجوان بھی تھا۔ حواس باختہ عبدالتین بھی ان کے پیچھے بیٹھک میں داخل ہوا۔ میز پوش کا بڑا حصہ خون میں رنگ گیا تھا۔

عبدالتین وجہ جاننے کے لیے متوش تھا۔ حافظ صاحب نے اسے جھڑک دیا۔ جگ کے پانی میں روٹی بھگو کے انہوں نے ایک معمر ملازم کی مدد سے بھٹل کی کلائی دھوئی۔ بھٹل نے سوت کے چاقو چلایا تھا۔ لکیر زیادہ گہری نہیں تھی، میری نہ اس کی لیکن خون بری طرح پھوٹ رہا تھا۔ حافظ صاحب نے اسپرٹ میں ڈوبی روٹی زخم پر رکھی تو نہ میں نے اف کی نہ بھٹل نے۔ حافظ صاحب کو قرار نہیں آیا، انہوں نے حامد نامی ملازم کو ڈاکٹر پست کو بلانے کی ہدایت کی اور کہا ”میرا نام لینا، جتنی جلدی ہو سکے، آجائیں۔ دیر نہ کریں۔ جس حالت میں ہوں، اٹھ جائیں۔ سورے ہوں تو جگ دینا، میرا نام لینا۔“ بھٹل نے ملازم کو منع کر دیا تھا لیکن حافظ صاحب ملازم حامد کے یس و پیش پر بے طرح برس پڑے۔

بھٹل کی ترغیب پر حافظ صاحب نے باقی ملازموں کو اہلیں چلے جانے کا حکم صادر کر دیا تھا۔ ملازم چلے گئے لیکن باہر سے آنی ہوئی آہٹوں اور سرگوشیوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھک کے آس پاس ہی ہیں۔ عبدالتین اور نوجوان وہیں

بازوی گزر 6

23

کتابیات پبلی کیشنز

بٹھے رہے۔ ہم دونوں کے سکون سے حافظ صاحب کی کشیدہ تخی میں غائب فرق آیا تھا، ہر چند ان کی چشم در چشمی، ذہنی انتشار کی جھڑی کر رہی تھی۔ انہوں نے سرزنش کے انداز میں نوجوان سے نکتے، قوبے اور پان کا انتظام کرنے کی فرمائش کی۔ نوجوان ان کا بیٹا یا بیٹیجی یا ہوسکتا تھا۔ وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ بیٹھک کے باہر بیٹھتے ہوئے ملازموں کو حکم منتقل کر کے نور اوپس آ گیا۔ وہ اور عبدالتین حادثے کا سبب جاننے کے لیے بے تاب تھے اور حافظ صاحب سے کچھ پوچھنے کا انہیں حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ بار بار کرسی کے ڈنڈے سے سر نکاتے اور ہڑ ہڑا کے سیدھے ہو جاتے اور ان کی بھڑکی ہوئی نظریں ہم پر آکے ڈھیر ہو جاتیں۔

پندرہ منٹ سے کم وقت میں گاڑن میں لمبوس افتال و خیراں اوچر ڈاکٹر پست نے بیٹھک میں قدم رکھا۔ ملازم حامد نے جانے کیا کیا حاشیہ آرائی کی ہوگی ”خیریت تو ہے حافظ صاحب؟“ ڈاکٹر پست نے آتے ہی پوچھا۔ اس نے سوال حافظ صاحب سے کیا تھا اور نگاہیں ہم دونوں کو زور پر لیے ہوئے تھیں۔

حافظ صاحب نے ناوقت زحمت پر جیسے تیسرے ڈاکٹر سے معذرت چاہی اور بے تجلت ہماری جانب اشارہ کیا۔

بھٹل نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے مرہم پی پی سے انکار کر دیا تھا مگر عبدالتین اور حافظ عبدالحق کے اصرار پر چپ ہو گیا۔ ڈاکٹر اپنا بسکا ساتھ لایا تھا۔ وہ ٹانگے لگاتا چاہتا تھا۔

بھٹل نے اجازت نہیں دی۔ زخم گہرا ہوتا تو ڈاکٹر باز بھی نہ آتا۔ ہم دونوں کی کلائیوں پر ایک جیسی لکیر اس کے لیے حیرت و فکر کا باعث ہوئی چاہے تھی مگر اس نے برابری کا ثبوت دیا۔ جب تک وہ مرہم پی پی سے فارغ نہیں ہو گیا، زخم کی وجہ کے بارے میں اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

”آپ ہی پوچھیں ڈاکٹر صاحب!“ حافظ صاحب ہراساں آواز میں بولے۔

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر بھٹل سے مخاطب ہو، بھٹل نے بے نیازانہ کہا ”کچھ نہیں صاحب! آپ نے دیکھ ہی لیا۔ معمولی دھاری ہے۔“

ڈاکٹر مطمئن نہیں ہوا۔ ہوتا بھی کیسے۔ دونوں لکیروں کی پیمائش یکساں تھی اور بھٹل نے نسوں کا خیال رکھا تھا۔ ”میں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا“ ڈاکٹر پست کدورت سے بولا۔

”اب تو دیکھ لیا صاحب!“ بھٹل نے ہنس کے کہا۔

”مگر یہ تو۔ یہ تو۔“ شاید ڈاکٹر کو احساس ہوا کہ ہمیں

بہر حال حافظ صاحب کے مہمان کی حیثیت حاصل ہے۔ سو اس نے اپنے لیے کئی ناگواری دور کرنے کے لیے کچھ توقف کیا۔
 ”کیا صاحب!“ بٹھل نے سرسری لہجے میں کہا ”تھوڑا جا تو کارب تھا۔ لگتا ہے“ ادھر کسی نے خون نہیں دیکھا۔“
 ”دیکھا ہے سب نے میاں جی! پر اس طرح سے نہیں“

ڈاکٹر کللاتی آواز میں بولا۔
 ”بھئی پائیم ملا تو پولیس گئے صاحب!“ بٹھل نے بات بڑھانے سے اجتناب کیا اور کسمکے بولے ”اپنے کو دکھ ہے“ انہوں کی نیند اکارت ہوئی۔ ہم نے آپ کو بلانے سے منع کیا تھا۔ اب آپ گھر جاؤ صاحب!“
 ڈاکٹر نے خشکیوں نظروں سے حافظ آباد صاحب کو دیکھا۔ حافظ صاحب کا بیجان انگیز سکوت بالائے ستر تھا۔ پنا کام بھی ہے مہاشے“ ڈاکٹر پشت کی آوازیں ترشی کے ساتھ نگوٹ بھی عود کر آئی کہنے لگے ”ڈاکٹر اور کھڑی کا کیا سہ بندہ“ فوجی اور ڈاکٹر کے لیے گھڑیاں نہیں تھیں۔
 ”ادھر کی بیسی“ بٹھل نے آگے دکان کھولو تو پوچھیں گے صاحب!“ بٹھل نے بددلتے ہوئے کہا ”دیوار“ کلائی پر گھڑیاں لٹکاتے ہوئے نہیں۔“

اتنی دیر میں ملازم قہو لے آئے۔ خاص دان میں تازی گھوڑیاں اور تازی قہہ“ چاقو اور خون کی بات تھی۔ ملازم اندر آنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہوں گے ڈاکٹر نے شکن آلود پشیمانی سے ایک فغان یا اور اٹھنے سے پہلے صندوق پر گولیاں ہمارے حوالے کیں، نسخہ لکھا، احتیاطی تدبیریں تجویز کیں اور رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد عبد المتین اور نوجوان تادیر موندھوں پر بیٹھے ہلو بدلتے رہے۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ عبد المتین نے جھجکتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کا اٹھ جانے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

”تم لوگ جاؤ“ حافظ عبد الحاق چلتی آوازیں بولے ”مجھے مہمانوں سے کچھ بات کرنی ہے۔“

وہ دونوں بادل ناخواستہ موندھوں سے اٹھے اور بھاری قدموں سے باہر چلے گئے۔ اس وقت ڈیڑھ سے اوپر ہو چکا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور کہیں سے کتے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ صحن کی جانب بھی اندھیرا ہو گیا تھا لیکن بھی جاگ رہے ہوں گے اور بیٹھک سے ابھرے والی کسی آہٹ کے شہر ہوں گے۔ ان کا مالک چاقو بردار

اجنبیوں کے ساتھ تنہا بیٹھا تھا۔ میری کلائی میں ہلکی ہلکی کک ہونے لگی تھی۔ بٹھل تو قہہ گزرا نا اور بیان چیتا رہا۔
 بہت دیر میں کہیں حافظ صاحب کے جسم میں جنبش ہوئی، جیسے انہوں نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو اور کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہوں۔ ایک لمبی ان کے سر پر اٹھیں۔ انہوں نے سر اٹھایا۔ ان کی چلتی بچتی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں اور ان کے چہرے پر اندرونی غلغلہ کی درشتی ہو رہی تھی ”چھا لو ہم اپنا زجر جس بانو کو مولوی شفیق کے پاس لائے تھے؟“

میری رگوں میں خون رگ گیا، زجر جس بانو سے ان کی مراد کورای تھی ”جی جی ہاں“ میں نے اضطرابی انداز میں سر ہلایا۔

”اور تمہی کو سزا ہوئی تھی“ وہ آدمیوں کے خون کے جرم میں؟“ حافظ صاحب بے رحمی سے بولے۔
 میں نے کھڑی ہوئی سانسوں سے کہا ”لیکن، لیکن میں نے وائس تو ایسا نہیں کیا تھا۔“

”معلوم ہے“ لڑکی کو بد معاشوں کے جنگل سے بچانے کے لیے تم یہ اتنا درجہ کا قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔“ حافظ صاحب کو بہت کچھ معلوم تھا۔ میں نے اپنی وحشت پر قابو پانے کی کوشش کی ”میں کیا کر سکتا تھا“ میں نے کئی چپٹی آوازیں کہا ”ہمیں مولوی صاحب دریائے بھلی کی سیر کرانے لے گئے تھے“ غنڈوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کے پاس ہتھیار بھی تھے۔ میرا کوئی دماغ خراب نہیں ہوا تھا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ سب تسلیم کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے سات سال کی سزا سنائی۔

”اگر مولوی شفیق اس وقت موجود نہ ہوتے تو لڑکی کا کیا حال ہوتا؟ تم تو گرفتار ہو گئے تھے؟“

”لیکن میں ان غنڈوں کو ختم نہ کرنا تو وہ ہم پر حاوی آجاتے۔ نہ جانے کب سے وہ ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ اس کے لیے مولوی صاحب کا اور میرا خون بھی کر سکتے تھے۔“

”مگر میں کچھ اور کہہ رہا ہوں“ حافظ صاحب کا انداز تنبیہی تھا، کہنے لگے ”جو نہیں ہوا“ اس کی ہولناکی تصور کی جاسکتی ہے۔ جو کچھ پیش آیا، ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ مولوی شفیق اس وقت لڑکی کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوئے۔ یقیناً ہمارے علم میں ہوگا وہ ایک مجدد آدمی تھے۔ ان کا کوئی باقاعدہ گھر نہیں تھا، گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ ایک نوجوان لڑکی کی ذمہ داری اچانک ان پر آن پڑی تھی اور لڑکی بھی کیسی چندے آفتاب، چندے ہاتھاب۔ اس

شہزادی کو بد نگاہوں سے بجائے رکھنا مولوی شفیق کے لیے کوئی آسان نہیں تھا۔ تم تو ایک مرتبہ سپروں کے راستے سے ہٹ گئے۔ مولوی شفیق کے ساتھ تو وہ ہر دم موجود تھی۔ اس کے بعد مولوی شفیق صاحب کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ وہ اسے چھپائے چھپائے پھرتے رہے، نہ ان کا کاویا رہا، نہ گھر۔ لڑکی کی نگہداشت اس کی تربیت ہی کا مقصود بن گئی۔ انہوں نے زجر جس بانو کے لیے یہی کچھ ترک کر دیا۔ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ انہوں نے لڑکی پر کوئی آج نہیں آنے دی۔

”ظاہر ہے“ میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا ”ان کا بہت احسان ہے۔“

”صرف احسان نہیں“ حافظ صاحب بے چینی سے بولے ”میری بات توجہ سے سنو عزیز من! انہیں خدا نخواستہ موت کی سزا بھی ہو سکتی تھی۔ ہو سکتی تھی نا؟“ میں ان کی صورت دیکھا، مجھ سے کچھ کہا نہیں جاسکا۔

”سات سال کے بجائے تھیں عمر قید بھی ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سزا بھگتنے کے بعد تمہاری توجہ لڑکی کی طرف سے ہٹ جاتی اور تم ایک پرانی، تکلیف دہ داستان سمجھ کر سب کچھ بھلا دیتے۔ اس مدت میں۔“

”میں“ میں اسے بھلا دیتا کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ میں نے حافظ صاحب کو آگے کوئی ہرزہ سرائی نہیں کرنے دی۔ ”اس کے لیے میں نے گھر بھائی، بھینس، مان باب۔ اس کی دج سے میں نے سات سال۔“ میری آواز ہی نے ساتھ نہیں دیا۔

”مقتصد یہ ہے برادر مر!“ حافظ صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں وضاحت کی ”کچھ بھی ممکن تھا۔ اس عرصے میں مولوی شفیق کو بھی کوئی حادثہ پیش آسکتا تھا، تمہیں بھی۔ درمیان میں ایک زمانہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مولوی شفیق کسی معقول جگہ زجر جس بانو کی شادی کر دیتے۔ ہر لڑکی کو بہر حال ایک نہ ایک دن اپنا گھر سامنا ہوتا ہے“ اور اس چاند جیسی لڑکی کے لیے رشتوں کی کیا کمی تھی۔ جیل جانے کے بعد تم علانہ زجر جس بانو سے دستبردار ہو گئے تھے۔ تم زندان میں بس اس کی سلاحتی کے لیے رعایتیں ہی کر سکتے تھے۔ وہ تم نے ضرور کی ہوں گی۔“

”آپ۔“ آپ۔ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ میں نے بڑبائی انداز میں کہا۔

حافظ صاحب نے ہاتھ اٹھا کے مجھے خصل کی تلقین کی اور تندی سے بولے ”میں کہنا چاہتا ہوں کہ سزا ہو جانے کے بعد

تمہارا اس پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ بعد میں سب کچھ مولوی شفیق ہی کو زجر جس بانو کے لیے سوچنا اور کرنا تھا۔“
 ”انہوں نے بہت کچھ کیا۔ کوئی بھی شاید اتنا ایثار نہ کیا تھا“ میں آپ کو کیا بتاؤں، جیل سے آزاد ہونے کے بعد میں نے جگہ جگہ ان کی تلاش کی، تقریباً ان ساری جگہوں پر جہاں ان کے ملنے کا امکان تھا۔ وہ کہیں نہیں ملے۔ جن خدشات کا آپ ذکر کر رہے ہیں، خوش قسمتی سے وہ پیش نہیں آئے یا اتفاق سے وہ سب کچھ نہیں ہوا“ آپ کے یہ قول جن کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ سات سال کے عرصے میں ہم تینوں تلاش اس لیے کی تھی کہ ان کا سارا بن سکوں! انہیں باور کراسکوں کہ اب برا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ اطمینان سے بیٹھیں، میں ان کے مصائب کی غلطی کے لیے اگیا ہوں۔ جس طرح میں نے انہیں تلاش کیا تھا، انہوں نے مجھے کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے ایک وفد بھی پلٹ کر میری خبر نہیں لی کہ مجھ پر کیا گزری؟ میں کس حال میں ہوں۔ میں نے کون سا گناہ کیا تھا، ایک طرح سے تو میں نے مولوی صاحب کی جان بھی بچائی تھی۔ وہ تو چشم دید گواہ تھے۔ آپ کے کہنے کے مطابق وہ تو بہت صادق بہت امین آدمی ہیں۔“

”اس میں کوئی شک نہیں“ حافظ صاحب نے بظاہر مشفقانہ انداز میں کہا ”ذرا سوچو“ جس لڑکی کے لیے مولوی صاحب نے اتنا وقت برباد کیا ہے، جس کی عزت و عصمت، جس کی خوشی و خوشنودی کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو بھلا دیا، اس سے ان کی وابستگی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے جو بہتر سمجھتے ہیں، انہیں وہی کرنا چاہیے۔ انہیں لڑکی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ وہ تمہارے تنخواہ دار تو نہیں تھے۔ کوئی کاغذ پتا بھی تمہارے ان کے درمیان ملے نہیں ہوا تھا۔“

”کاغذ پنے کی کیا بات ہے؟“ مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا، میں نے برسرِ شکی سے کہا ”کاغذ پتا بھی ہو سکتا تھا۔ اس وقت نہیں تو بعد میں مگر انہوں نے اس کا موقع ہی کہاں دیا۔ جیل جانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میری موت ہو گئی ہے۔ ورنہ جیل سے کسی وقفے روزے کا بھی بندوبست ہو سکتا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر کچھ لوگ راستے کا پتھر بن جاتے ہیں تو سوائے دار لوگ بھی راستے میں ملتے ہیں۔ جیل میں مجھے ایسے مہربان مل گئے تھے جو سارا انتظام کر دیتے۔ وہ اس کی حفاظت بھی مولوی صاحب سے بہتر کر سکتے تھے مگر مولوی صاحب کو بھی میری یاد نہیں آئی۔

انہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ میں اس سے الگ نہیں ہوں۔ جیل آنے سے انہیں کوئی روکتا تو نہیں اور وہاں جا کے وہ مجرم تو نہیں بن جاتے "ناپاک تو نہیں ہو جاتے۔" تم نے عدالت میں لڑی اور مولوی شفیق کے ذکر سے غالباً اجتناب کیا تھا۔ جہاں تک مجھے بتایا گیا ہے، اس رات چند ایک بد معاش فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے ایسی صورت میں مولوی صاحب کو فوراً نکلنے سے چلے جانا چاہیے تھا۔

"مگر بعد میں سہی" میں نے پھری ہوئی آواز میں کہا "ایک سال، دو سال بعد۔" یہ معلوم ہونے کے بعد کہ تمہیں کتنی لمبی سزا ہو گئی ہے، ان کے جیل آنے سے کیا حاصل تھا۔ تمہیں رہائی تو نہیں مل سکتی تھی۔ اس انٹک شوٹی سے تمہیں اور اذیت ہی ہوتی۔ میں نہیں کہہ سکتا لیکن شاید پھر مولوی شفیق کا گلے کی طرف جاننا بھی نہیں ہوا۔ شروع کے دنوں میں تم ان کی کس کسش کا اندازہ کر سکتے ہو۔ پھر شاید انہیں روز و شب کی گردوش سے مصلحت ہی نہیں ملی یا ہو سکتا ہے بھی انہوں نے تم سے نہ ملنے کا کوئی فیصلہ ہی کر لیا ہو۔ ممکن ہے، انہیں یہ اندیشہ ہو کہ اس رات ناکام ہو جانے والے بد معاش مسلسل تمہارے سلسلوں کی ناک میں ہوں گے۔ جیل میں تم سے ملنے کو کون آتا ہے، تمہارا کون لوگوں سے رابطہ ہے، تمہارے جیل جانے کے بعد لڑکی پھر کہاں چلی گئی؟"

حافظ صاحب کو اپنی کٹ جتنی کا کچھ احساس ہوا اور وہ نرمی سے بولے "دیکھو بھائی! مولوی شفیق شروع سے ایک لالچالی، کسی جگہ جم کے نہ رہنے والے، کسی حد تک خود سزا اپنے خول میں مت شخص تھے ہم لوگ انہیں بت لوکتے سمجھاتے تھے۔ زرجس بانو کے بعد میں نے ان میں نمایاں تبدیلیاں دیکھیں۔ پہلی بار وہ سنجیدہ اور فکر مند شخص نظر آئے۔ میں آپ کو یہی بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ زرجس بانو کی انہوں نے دل و جان سے حفاظت بلکہ خدمت اور پرورش کی ہے۔ لڑکی نے اپنے شعور کی عمر ان کے ساتھ گزارا ہے۔ انہوں نے استطاعت سے زیادہ اس کا خیال رکھا ہے۔ اسے علم کے زور سے آراستہ کیا ہے، اس کی ذہنی تربیت کی ہے۔ اسے انہوں نے پھولوں میں رکھا ہے۔" "مگر اسے ان سے کون چھین رہا ہے؟" میں نے جھپٹی آواز میں کہا "میرے مل جانے سے مراد یہ کہاں ہے کہ مولوی صاحب کا باب ختم ہو گیا اور وہ اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس طرح وہ ان سے دور تو نہیں ہو جائے گی۔"

حافظ صاحب مجھے گھورنے لگے اور جزیروں کے بولے "ہاں، ہونا تو نہیں چاہیے لیکن شاید مولوی شفیق اس طرح نہیں سوچتے۔ زرجس بانو تو ان کے لیے بیٹی کے مانند ہے، بیٹی سے کیس زیادہ۔ ہر باب اپنی اولاد کے برے بھلے میں احتیاز کا حق رکھتا ہے۔ تمہارے ساتھ وہ رہی بھی کتنے دن ہے میاں! چند دن، ممکن ہے، کچھ زیادہ لیکن مولوی صاحب کی اور اس کی رفاقت کو ایک جگہ ہو رہا ہے اور یوں دیکھو تو زرجس بانو سے بہ باطن تمہارا تعلق بھی اتنی ہی دور کا ہے جتنا مولوی صاحب کا۔ وہ کوئی تمہاری سگی ذات برادری وغیرہ کی تو نہیں ہے۔ تمہارے اور اس کے مابین خون کا تو کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

میرا سر گھومنے لگا تھا۔ حافظ صاحب جانے کیسی باتیں کر رہے تھے۔ جی میں آتا تھا، ان کی زبان سننے لوں۔ دوسرا کتنی آسانی سے فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔ انہیں کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ مسلسل اپنے خطاب کی توہن کر رہے ہیں۔ "وہ نہیں جیسے مجھ سے کوئی بدلا لے رہے تھے یا مجھے آزار پہنچانے کی کوششیں۔ انہوں نے ٹھان لی تھی۔ جانے وہ مجھے کیا سمجھ رہے تھے اس پر اپنے استحقاق کے لیے اب مجھے ولیدین دینے کی سمجھ سے کیا ہوتا ہے جناب! وہ بے رخی سے بولے "میں تو ضرورت پر جی تھی۔ میں ان سے کیا کہتا کہ میرا وجود باجس مولوی صاحب کے معاملات کی وضاحت کر رہا ہوں، وکالت خود ایک دھکیل ہے۔ مولوی صاحب نے اتنا وقت اس کے لیے ساتھ کہاں گزارا ہے جتنا میں نے بتایا ہے۔ میرا تو کوئی لڑکا اس کے خیال کے سوا نہیں گزرا۔ جیل سے باہر آئے گا تو مولوی صاحب کو سامنے میں نے جیل کی زندگی گزارا ہے۔ وہ مسلسل میرے سامنے میں کیا لاج آتی ہے؟"

رہی ہے، میں تو مسلسل اس کے ساتھ رہا ہوں۔ جس پر مجھ "جی، بیٹی! ملے تو حافظ صاحب نے سہلا کے تانید کی پھر طرح گزرا ہے، اسے بھی تو وقت کی پیمائش میں شام کا لوج سپاٹ ہو گیا "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ظاہر ہے وہ چاہیے۔ کبھی ایک لمحہ ایک جگہ سے بڑا ہوتا ہے۔ کوئی سی ضرورت نہیں سمجھتے یا مناسب خیال نہیں کرتے۔ میں کے خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں تھا کہ یہی کتنا ہوں، آپ مابین یا نہ مابین، حق بھی یہی ہے کہ آدمی، آدمی کی آنکھوں میں روشن رہتا ہے۔ کوئی بیٹے میں ایسی لڑکی کے سلسلے میں کوئی بھی قدم اٹھانے اور اچھا برا جاگزیں ہو جاتا ہے کہ ایک دوسرے کا احتیاز بانی نہیں رہتے یا اختیار ہے۔ زندگی دینے والا تو خدا ہے لیکن سبب بھی حافظ صاحب بہت پھر آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انہیں کچھ پتا نہ تھا کہ مولوی صاحب کی ذات زرجس بانو کے لیے سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ بڑے لکھے آدمی ہوں گے۔ زندگی کا سبب بنی ہے۔"

سطروں کے درمیان کا دھنا انہیں نہیں آتا تھا۔ لگتا "ساری تو نکاری، تمہا پھری، جھوڑو صاحب! ہم آپ کو بس ترازو کے سامنے بیٹھے رہے ہیں، وہ حاضری کو قہرمت، وہ نہیں بولتے۔ ہم لڑکی کا دھیان جھوڑوس گئے، اگر لڑکی تھے۔ ان سے شاید کبھی کوئی جدا نہیں ہوا تھا۔ اس دھوم بول دے۔ ہمارے سامنے نہیں تو اپنے کو آپ پر مجھوسا انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا جو سورج کے طلوع و غروب کی، آپ لڑکی سے خود پوچھو، وہ مولوی صاحب کے پاس نہیں ہوتی۔ انہیں وہ زبان ہی نہیں آتی تھی جو صوبہ کو چاہتی ہے اپنے لاڈلے کے پاس یا دونوں کے؟" ویرت سے ماورا ہے ایسے آدمی سے مزید بات کرنا۔ حافظ صاحب کوئی جواب نہیں دے سکے اور واضحی ہی تھا۔ میں نے شکستہ آواز میں کہا "میں آپ کو بتاؤں، سبب لالچ تو ہے۔ گئے پھر لالچوں کے تذبذب کے بعد بولے

حافظ صاحب اس کے لیے اچھا نہیں کر رہے۔ وہ اس سے کیسا ہی سلوک کر لیں لیکن وہ اچھا نہیں کر رہے، وہ کیا سمجھتے ہیں۔ اس طرح وہ خوش رہے گی؟ مجھے دور رکھ کے وہ اسے خوش رکھ سکیں گے؟" "تو تم کہتے کہہ سکتے ہو؟" حافظ صاحب ناراضی سے بولے "تم اس کی خوشی و ناخوشی کے بارے میں کس قدر ادر کیا جانتے ہو؟"

"میں جانتا ہوں،" اچھی طرح جانتا ہوں۔ "یہ تمہاری عمر بول رہی ہے۔" "آپ کو کیا معلوم، مولوی صاحب نے اسے کس آسے میں زندہ رکھا ہے، جس دن اس کی امید ٹوٹے گی، وہ نہیں رہے گی۔"

حافظ صاحب سر جھٹکنے لگے اور بٹھل کی جانب دیکھتے ہوئے برہم آواز میں بولے "آپ تو میری بات سمجھ رہے ہیں؟"

"آپ نہیں سمجھ رہے ہو،" بٹھل نے بھڑک کے کہا۔ حافظ صاحب کا چہرہ لال ہونے لگا "میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کوئی بدلا لے رہے تھے یا مجھے آزار پہنچانے کی کوششیں۔ انہوں نے ٹھان لی تھی۔ جانے وہ مجھے کیا سمجھ رہے تھے اس پر اپنے استحقاق کے لیے اب مجھے ولیدین دینے کی سمجھ سے کیا ہوتا ہے جناب! وہ بے رخی سے بولے "میں تو ضرورت پر جی تھی۔ میں ان سے کیا کہتا کہ میرا وجود باجس مولوی صاحب کے معاملات کی وضاحت کر رہا ہوں، وکالت خود ایک دھکیل ہے۔ مولوی صاحب نے اتنا وقت اس کے لیے ساتھ کہاں گزارا ہے جتنا میں نے بتایا ہے۔ میرا تو کوئی لڑکا اس کے خیال کے سوا نہیں گزرا۔ جیل سے باہر آئے گا تو مولوی صاحب کو سامنے میں نے جیل کی زندگی گزارا ہے۔ وہ مسلسل میرے سامنے میں کیا لاج آتی ہے؟"

رہی ہے، میں تو مسلسل اس کے ساتھ رہا ہوں۔ جس پر مجھ "جی، بیٹی! ملے تو حافظ صاحب نے سہلا کے تانید کی پھر طرح گزرا ہے، اسے بھی تو وقت کی پیمائش میں شام کا لوج سپاٹ ہو گیا "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ظاہر ہے وہ چاہیے۔ کبھی ایک لمحہ ایک جگہ سے بڑا ہوتا ہے۔ کوئی سی ضرورت نہیں سمجھتے یا مناسب خیال نہیں کرتے۔ میں کے خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں تھا کہ یہی کتنا ہوں، آپ مابین یا نہ مابین، حق بھی یہی ہے کہ آدمی، آدمی کی آنکھوں میں روشن رہتا ہے۔ کوئی بیٹے میں ایسی لڑکی کے سلسلے میں کوئی بھی قدم اٹھانے اور اچھا برا جاگزیں ہو جاتا ہے کہ ایک دوسرے کا احتیاز بانی نہیں رہتے یا اختیار ہے۔ زندگی دینے والا تو خدا ہے لیکن سبب بھی حافظ صاحب بہت پھر آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انہیں کچھ پتا نہ تھا کہ مولوی صاحب کی ذات زرجس بانو کے لیے سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ بڑے لکھے آدمی ہوں گے۔ زندگی کا سبب بنی ہے۔"

سطروں کے درمیان کا دھنا انہیں نہیں آتا تھا۔ لگتا "ساری تو نکاری، تمہا پھری، جھوڑو صاحب! ہم آپ کو بس ترازو کے سامنے بیٹھے رہے ہیں، وہ حاضری کو قہرمت، وہ نہیں بولتے۔ ہم لڑکی کا دھیان جھوڑوس گئے، اگر لڑکی تھے۔ ان سے شاید کبھی کوئی جدا نہیں ہوا تھا۔ اس دھوم بول دے۔ ہمارے سامنے نہیں تو اپنے کو آپ پر مجھوسا انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا جو سورج کے طلوع و غروب کی، آپ لڑکی سے خود پوچھو، وہ مولوی صاحب کے پاس نہیں ہوتی۔ انہیں وہ زبان ہی نہیں آتی تھی جو صوبہ کو چاہتی ہے اپنے لاڈلے کے پاس یا دونوں کے؟" ویرت سے ماورا ہے ایسے آدمی سے مزید بات کرنا۔ حافظ صاحب کوئی جواب نہیں دے سکے اور واضحی ہی تھا۔ میں نے شکستہ آواز میں کہا "میں آپ کو بتاؤں، سبب لالچ تو ہے۔ گئے پھر لالچوں کے تذبذب کے بعد بولے

"میں سمجھتا ہوں،" یہ ایک معقول بات ہے۔ "پنے کو اس کھن چکر سے نکالو صاحب! ہم آپ کو زبان دیتے ہیں، ہم ایسے ہی لوٹ جائیں گے۔" "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،" حافظ صاحب نے گہری سانس لی "ایسا ممکن ہے، بشرطیکہ مولوی شفیق صاحب اس طرف آجائیں۔"

"ہم آپ سے اب نہیں پوچھیں گے کہ ابھی وہ کدھری ہیں، سارا ہم آپ ہی پھوڑتے ہیں۔ آپ خدا والے آدمی ہو۔"

"میں کیا، میری بساط کیا؟" حافظ صاحب کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے "میں اس کا نہایت عاجز بندہ ہوں، خدا اچھے معاف کرے۔ آپ مجھ پر بڑی ذمہ داری ڈال رہے ہیں۔ فرض کیجئے، بار میاں سے زرجس بانو کی ذہنی و فکری ناواقفگی کا کوئی شبہ ہی مولوی صاحب کے اعتبار کا باعث ہو اور وہ اپنی دانست میں زرجس بانو کا یہ فعل، یہ امید، ناواقفگی پر محمول کرتے ہوں، اور قلب مابینیت کی توقع رکھتے ہوں، کیوں کہ وقت بڑے بڑے ذہن مند مل کر دیتا ہے۔ کسی نہ کسی دن زرجس بانو کی آپ پر اس پر جانے گی۔ اس صورت حال میں آپ ہی فرمائیے، وہ مجھے کیا، کسی کو بھی لڑکی کا عندیہ جاننے کا موقع نہیں دیں گے اور اگر انہوں نے یہ موقع فراہم بھی کر دیا یا میں اپنے طور پر زرجس بانو سے سلسلہ جنسائی میں کامیاب بھی ہو گیا اور اس کی جانب سے واقعی مجھے کوئی ایسا اشارہ بھی مل گیا جس کی بابت آپ یقین کا اظہار کر رہے ہیں، تو اس طرح زرجس بانو سے مولوی شفیق کی دستبرداری کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ کہاں ہوا کہ وہ زرجس بانو سے بری الذمہ ہو جائیں گے یا میں انہیں آزاد کر پاؤں گا۔ نتیجہ تو وہی رہا۔ سمجھ رہے ہیں آپ؟ مولوی شفیق ایک ضدی شخص ہیں پھر میں آپ سے کیا کہہ سکوں گا اور آپ کے لئے کیا کر سکوں گا؟"

"آپ پھر الگ ہو جانا، ہم ان کو دیکھ لیں گے۔ اتنا جان کے آپ کو ان کے ٹھکانے کے بارے میں بولنے میں اتنی اپنا بھی نہیں ہوگی، ایسا بل نہیں کھاؤ گے آپ پھر آپ کو ہم سے بول دینا چاہئے صاحب!"

"میرے لئے پھر بھی یہ ایک مشکل مرحلہ ہوگا۔" "سمجھتے ہیں صاحب! بہت ٹھنک ہوگا، پر آپ ایک تھوڑا بول کے دو آدمی کو بچاؤ گے، ایک لڑکی کو، دوسرے لاڈلے کو۔ ہم آپ کو بولنے ہیں لڑکی بھی ایسے زیادہ دونوں تک نہیں سمجھنے کی، اور یہ شکر ابھی، آپ اس کو دیکھ رہے ہو

نا! اس کے پر کئے ہوئے ہیں۔ ایک دم آدھا ہے۔ یہ آدھا بھی نہیں رہے گا جس دن۔ جس دن۔ ”بھٹل کی آواز بھاری ہونے لگی۔ ایک لمحے ٹھہر کے اس نے کہا ”اور کیا کیا بولیں آپ کو کڑی سے کڑی مل کے بڑا خرابا ہوا ہے۔ سچ میں ایک دو نہیں، بہت لوگ، بہت گھر ٹپک ہوئے ہیں اور جیل، کوئلے کی کان نہیں ہوتی صاحب کہ ہر کوئی ادھر کی سے کالا ہی ہو کے نکلے۔ ادھر کی اس نے اوپر کے درجے تک پہنچائی کی ہے۔“

”آج۔۔۔ چھا“ حافظ صاحب کی آنکھوں میں حیرت اٹھ آئی ”میں یہی سوچ رہا تھا بلکہ پوچھنے والا ہی تھا، گفتگو ہی سے اندازہ ہو رہا تھا۔ کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے میاں آپ نے؟“

میں نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ میں نے ایم اے کیا ہے۔ ”خوب، خوب، ماشا اللہ۔ یہ تو آپ نے کمال کر دیا۔ یقین نہیں آتا۔ سچ ہے، علم کے حصول کی خواہش ہو تو دور کھلتے جاتے ہیں۔“

”ادھر کی جیل سے چھوٹ کے اس کو اپنے اڑے پہ آنا چاہئے تھا، یہ یہ کسی کو بولے بنا سیدھا مولوی صاحب کو ٹھونسنے نکل گیا“ اپنے پاس تو بہت بعد میں لوٹا، ”بھٹل نے مختصر حافظ صاحب کو بتایا کہ ستوں ستوں بے شمار ہستیوں کی خاک چھانتے ہوئے آخر جیسلمیر شہر میں ہم نے وہ محلہ اور وہ گھر دریافت کیا جہاں مولوی صاحب نے کچھ عرصے قبل قیام کیا تھا مگر مولوی صاحب وہاں سے جا چکے تھے۔ بھٹل نے جیسلمیر میں مولوی صاحب کے بڑی منیر علی اور رانا ماہ تاب کی روداد سے پلوحی کی اور کہا کہ بہت دنوں بعد ہمیں مراد آباد کے مسافر خانے کے روزنامچے سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے سکونت کے خانے میں حیدر آباد دکن کا پتہ لکھوایا ہے۔ ہم نے حیدر آباد کا رخ کیا مگر مولوی صاحب وہاں سے بھی کسی اور طرف نکل چکے تھے۔ اب بھی ہم حیدر آباد سے آرہے ہیں۔“

”آپ حیدر آباد سے آرہے ہیں؟“ حافظ صاحب بوکھلا

سے گئے۔

بھٹل نے یہ شد و مد ایک بار پھر اپنے عزم کی تجدید کی کہ دشت نوروی تو مولوی صاحب کے گریبان پر جا کے تنم ہوتی ہے۔ اس نے حافظ صاحب کو بتایا کہ حیدر آباد میں مولوی صاحب نواب ثروت یار کے ہاں مسمان ہوئے تھے۔ ہماری آہ و زاری پر نواب نے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی حیدر آباد میں مولوی صاحب کی واپسی ہوئی، وہ ہمیں خط کے ذریعے

مطلع کر دے گا۔ مولوی صاحب کے حیدر آباد آنے پر اپنا وعدہ نبھانے، دوسرے لفظوں میں ہمیں خط لکھنے سے پہلے اس نے ہمت جانا کہ کیون نہ مولوی صاحب کے سامنے ہمارا ذکر چیمبر کے دیکھے۔ ہمارے بارے میں مولوی صاحب کی رائے جاننے کے بجائے وہ ہم سے کئے ہوئے وعدے کی تکمیل کا ترجیح دیتا تو ہم نے مولوی صاحب کو جالیا ہوتا۔ نواب کے قول، ”اس کی زبانی ہماری آمد کا احوال سن کے مولوی صاحب گنگ رہ گئے اور دوسرے دن کسی کو مطلع کئے بغیر وہاں سے چلے گئے۔ ان کے یوں چلے جانے سے نواب بہت دل برداشتہ تھا۔ ایک دن پہلے اس کی والدہ نے مولوی صاحب سے کورا کو اپنے گھر کی ہونہارنے کی خواہش ظاہر کی تھی، نواب کو گمان تھا کہ مریدین خاندانی رابطہ و ارتباط کے پس منظر میں رشتے سے برلا انکار کا حوصلہ مولوی صاحب کو نہیں ہو اسی لئے انہوں نے چپ چاپ نواب کے گھر سے چلے مناسب سمجھا۔ نواب کو دوبارہ مولوی صاحب کی حیدر آباد کا یقین نہیں تھا مگر اس کی توقع کے خلاف اور اس کی آرزو کے عین مطابق مولوی صاحب دوبارہ حیدر آباد پہنچ گئے، بار نواب نے ایٹائے وعدہ کیا اور بھی خط لکھ کے ہم حیدر آباد میں مولوی صاحب کی موجودگی کی اطلاع سے شاد کیا۔“

”یعنی، یعنی نواب ثروت نے بذات خود آپ حیدر آباد آنے کی دعوت دی؟“ حافظ صاحب مضطرب میں بولے۔

بھٹل نے اقرار میں سر جھکا لیا اور نواب ثروت ہاں پیش آنے والے واقعات خاصی تفصیل سے بیان حافظ صاحب مبسوت ہو کے سنتے رہے۔ ان کی پلکیں ہر ہو گئی تھیں۔ جب بھٹل نے نواب کی موت کی خبر سنائی کی حالت اور غیر ہوشی ”کیا کیا کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ ثروت کا انتقال ہو گیا؟“

جواب میں بھٹل سرود آہی بھر سکتا تھا ”اور“ اور ”شفیق۔۔۔؟“

بھٹل نے انہیں بتایا کہ نواب ثروت کے ایک ر خدمت کار کو اپنے آقا کے انتقال سے ایک روز پہلے آیا کہ آقا کے حادثے اور جاں بہ لہی کی کیفیت کی مولوی صاحب کے گوش گزار بھی کرنی چاہئے، اسی کو صاحب کا گھر معلوم تھا۔ خدمت گار کے رخصت ہونے مولوی صاحب نے رخت سخر باندھ لیا۔ انہوں نے محسن نواب ثروت کی عیادت کرنے میں بھی وقت ضا

کیا۔ دوسرے دن رات کو ہم ان کے گھر پہنچے تو ایک روز پہلے وہ وہاں سے جا چکے تھے۔

”جا چکے تھے کہاں کہاں؟“ حافظ صاحب بدحواسی سے بولے۔

”یہی جاننے کے لئے ہم ادھر کی آئے ہیں۔“

”مجھو وہ وہاں تو نہیں آئے۔“

”آئے نہیں تو آجائیں گے صاحب!“

ایک عالم ہیجان کے بعد حافظ صاحب کے دست و بازو اکڑ سے گئے وہ توبت بن گئے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر بھٹل کی جزئیات بیانی کی وجہ اب کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بھٹل نے سے شغل کرتا رہا پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا ”ہم تو ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ گھر اگھ رہا ہے، کسی دن بی بی بھی کھل جائے گی۔ اب ہمیں تو آگے مثال بھر میں، اور زیادہ بھی، ایک دن کسی کو نے میں تو مولوی صاحب کو ہاتھ لگنا ہی ہے پھر کیا ہو گا صاحب؟“

”وہ یہاں آئے تو میں ان سے بات کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیے، میں ضرور ان سے بات کروں گا“ حافظ صاحب کی زبان ہمک رہی تھی ”بے شک وہ میں پچیس روز پہلے یہاں آئے تھے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ وہ مجھے بھی حیدر آباد ہی کا پتا کے گئے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ حیدر آباد میں مستقل سکونت کے لئے نواب ثروت یار نے بہت اصرار کیا ہے، ہر طرح کی اعانت کا یقین دلایا ہے۔ گوگو کی حالت یہی۔ کہتے تھے کہ حیدر آباد جا کے صورت حال کا جائزہ لیں گے اور جیسا کچھ بھی ہوا، بذریعہ خط مجھے آگاہ کریں گے، ابھی تک ان کا کوئی خط نہیں آیا ہے۔ انہوں نے نواب ثروت یار کے بارے میں بہت کچھ بتایا لیکن زنجب باؤ سے نواب کی دل چسپی کی بات مجھ سے مخفی رہی۔ اس کا سبب غالباً یہی ہو گا کہ میں نے بھی ایک مرتبہ اشارہ اپنے بیٹے عبدالحمید کے لئے ان سے بات کی تھی۔ ابھی ابھی جس بچے کو آپ نے دیکھا ہے، جو یہاں بیٹھا ہوا تھا، اسی کے لئے ہمارے ہاں عمو انبی برادری میں شاداں ہوتی ہیں لیکن مولوی صاحب کی پریشانی دیکھ کے میں نے زبان کھولی تھی۔ دوسرے، بی بات یہ ہے کہ زنجب باؤ مجھے پسند بھی بہت ہے۔ کون اسے اپنے گھر کی زینت بنانا نہیں چاہے گا؟ مولوی صاحب نے انکار کیا نہ اقرار، چپ ہو گئے پھر کچھ سوچ کے بولے ”دیکھو حافظ! دوبارہ مت کہنا۔ جب کوئی صورت بی تو میں خود تمہیں اشارہ کر دوں گا۔ اگر تمہیں عبدالحمید کی شادی کی بہت جلدی ہے تو انتظار بھی مت کرنا“ جہاں موزوں رشتہ ملے، ہم اللہ

کر دیتا۔ صورت نے اور سازگار حالات کی بات میری فہم سے بالا تر تھی۔ میرے ان کے درمیان کسی قسم کا تکلف نہیں ہے۔ عبدالحمید ان کے لئے اولاد کے مانند ہے۔ میں کوئی سوال کر کے انہیں شکست میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ کئی بار میں نے ترغیب دی، پہلے ماس، اب تک خانہ بدوشی میں گزراؤ گے۔ اس دہروری کی ضرورت کیا ہے میرا تمہارا معاملہ غیروں کا نہیں۔ نگریا سادات شریفوں کی ہستی ہے، بہت پر سکون ہے۔ پلو میں ریاست رام پور، اس سے میں میل پرے تمہارا مراد آباد ہے۔ نینی تال، بریلی، سبھی نزدیک ہیں۔ دلی بھی ایسی دور نہیں۔ یہاں رہ کے زمینوں کا کام سنبھالو، اللہ برکت دے گا۔ مولوی شفیق نے ہر بار پورے غور و خوض سے مشورے سے، تائید بھی کی لیکن عمل نہیں کیا۔ ہفتوں، مہینوں میں قیام کیا۔ یہاں سبھی ان کی بے انتہا عزت کرتے ہیں۔ بچے چھوٹے اب کہہ کر پکارتے ہیں۔ بڑے القاب و آداب سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ایک بار تو عرس تک رہے، زمینوں پر میرے ساتھ ذوق و شوق سے جانے لگے لیکن پھر دل اٹھ گیا۔ مجھے ان کی مالی حالت کا بھی علم ہے۔ مجھے کتنا نہیں چاہئے، محض عرض حال مراد ہے، متعدد دفعہ انہوں نے کھل کے کہہ بھی دیا۔ انہیں کرنا بھی یہی چاہئے تھا۔ خدا گواہ ہے، میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ایک مرتبہ جیسلمیر سے بھی پریشانی کا خط لکھا تھا۔ مجھے معلوم ہے، انہوں نے اپنا سب کچھ بچا رہا ہے۔ شاید اب کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ شروع شروع میں تو انہیں بہت قوت تھا۔ بعد میں اس خیال سے یہ بند و نصاب کم کر دیے کہ کہیں ناگوار خاطر نہ ہو جائے۔ تنگی میں آدمی اور حساس ہو جاتا ہے۔ ایک نہ ایک دن لازماً انہیں اپنی دوش بدی پڑے گی لیکن میرا اندازہ اب تک غلط ہی ثابت ہوا ہے۔ جانے کس اوچھڑ میں ہیں۔ پہلے تبت کے لوگوں کی طرف سے فکر مند تھے۔ خیر ابتدا ہی سے زنجب باؤ کو برقع پہنا دیا تھا۔ برقعے میں وہ خاصی محفوظ ہو گئی تھی۔ اب تو بہت دقت گزر گیا۔ تبت میں لڑکی کے قبیلے کے لوگ کب کے ٹامہد ہو چکے ہوں گے۔ اب اس جانب سے بھی بظاہر انہیں کوئی ایسی فکر لاحق نہیں ہوئی چاہیے۔ گزشتہ مرتبہ انہوں نے کسی ایسے اندیشے کا ذکر بھی نہیں کیا۔“

”آپ کی مرضی ہو تو کچھ بولیں صاحب؟“ صاحب کے چپ ہوتے ہی بھٹل نے کہا۔

”ضرور، ضرور، کیا بات ہے؟“ حافظ صاحب چونک پڑے۔

”اب تک جو کچھ دھن دولت انہوں نے کھیا ہے، جو

سے نہیں اٹھا۔ جمو اور زورا نے پہلی ہی نظر میں زخم کی نوعیت بھانپ لی ہوگی۔ زخموں کی ویسے بھی انہیں اچھی پہچان تھی۔ چاقو کی لمبی ستواں لکیر کسی جگہ نہ لگی نہ گہری زخم جیسے تراشا کیا ہو۔ ایسی ہی ایک پٹی بٹیل کی کلائی پر بندھی تھی۔ یہ یکساں جمو اور زورا کے لئے کسی پٹی سے کم نہ ہوگی۔ سسلی کی وجہ سے وہ زیادہ جھیل نہیں سکتے تھے۔ اوہر بٹیل نے انہیں پہلے جھڑک دیا تھا۔ انہیں اپنے اضطراب کا اظہار مؤخر کرنے میں بہت محنتیں ہوری ہوگی۔ ڈاکٹر پنت کی گولیوں کا اثر تھا یا زخم کی صفائی اور نئی پٹی کا کرشمہ رنڈ رنڈ تیلن کم ہوتی گئی۔ گولیوں میں یقیناً کوئی کوئی خواب آور بھی تھی۔ کچھ ہی دیر میں سر بھاری ہونے لگا۔ میں دوبارہ اوپر کی برتھ پر چلا آیا پھر کون کون سے اسٹیشن آئے، کہاں گاڑی ٹھہری مجھے کچھ خبر ہی نہیں رہی۔ سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا جب انہوں نے مجھے جگایا اور بتایا کہ لکھنؤ شہر بھیا ہے۔

ہاڈوا ایکس پریس فیض آباد نہیں جاتی تھی۔ جمو کو فیض آباد جانے والی گاڑیوں کا علم تھا۔ فیض آباد تو خیر اس کا آبائی شہر تھا، لکھنؤ کے گلی کوچوں سے بھی اس کی واقفیت کم نہیں تھی۔ ہسٹل کے دوست، لکھنؤ کے دادا کہیں خاں مرحوم سے اس کے اور بڑے بھائی جامو کے خاص مراسم تھے۔ کین خاں کی موت بھی ہماری، بلکہ میری وجہ سے ہوئی تھی۔ نہ ہم ابا جان کی تلاش میں تبت کا رخ کرتے۔ نہ ہسٹل کو اڈا سنبھالنے کے لئے اسے نکلتے بلانا پڑا۔ ہسٹل کی موجودگی میں نکلتے کے اڑے پر قبضہ جمانے کا سودا رتنا کے دماغ میں بھی نہیں سا سکتا تھا۔ زیادہ دنوں کی بات نہیں تھی۔ لکھنؤ شہر آکے ہسٹل کو کہیں خاں بہت ستارہ ہوگا۔ مجھے یاد تھا، ایک روز رات کو وہ فیض آباد کے اڑے پر گر جتا پرستا آیا تھا کہ جامو کے چھوٹے بھائی جمو نے روشن نالی طوائف لکھنؤ سے اغوا کر لی ہے۔ زہر کی حویلی اس کی خالہ کے کاناڑے سے واگزار کرانے کے لئے ہسٹل نے کہیں خاں ہی کو خط لکھا تھا۔ رتنا نے شب خون مارا تھا ورنہ کہیں خاں اس آسانی سے پیا پونے والا نہیں تھا۔

اسٹیشن سے باہر آکے ہم تانگے میں سوار ہو گئے۔ رات کے وقت لکھنؤ کی روٹن ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ آسمان صاف تھا۔ ہوا میں گرمی کی ہلکی ہلکی آمیزش تھی۔ تینے روٹن ہو گئے تھے اور سڑکوں پر خوب چل پھل تھی۔ حضرت گنج کا علاقہ تو دیکھنے کی چیز ہے۔ جمو ہمیں جدید طرز سے آراستہ ایک چمکتے ہوئے ہوٹل میں لے آیا۔ پردہ نشین

خواتین کے ساتھ بیٹھنے کے لئے ہوٹل میں کہیں بھی بنے ہوئے تھے۔ ہسٹل اور سسلی کو دیاں بٹھا کے جمو اور زورا فوراً باہر آ گئے۔ میں انہیں مسلسل یقین دلاتا رہا کہ اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے، وہ مانے نہیں اور ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ڈاکٹر سری و استو کے مطب میں آکے ہی انہوں نے دم لیا۔ مطب میں مریضوں کی بھیڑ تھی مگر جانے جمو نے کیا انداز پر کیا جادو کیا کہ ڈاکٹر کے روپ رو ہونے میں ہمیں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے سوئی لگا کے اور نئی پٹی باندھ کے ہمیں جلد ہی رخصت کر دیا۔ گھبرا سادات کے ڈاکٹر پنت کے نسخے میں اس نے بس ایک دو کا اضافہ کیا۔ ڈاکٹر کے جتیس پر جمو جو سے پہلے بول پڑا۔ وہ شیشے اور تین لگ جانے ہی کا کوئی عذر کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر کو اس نے مطمئن کر دیا لیکن مطب سے نکلتے ہی اس نے اور زورا نے مجھے ٹھوکے مارنے شروع کر دیے۔ میں انہیں کیا بتا تا کیوں اوہراوہر کے جیلوں سے ان کی تشویش نہ ہوتی۔ میں نے مختصر اصل بات بتادی۔ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ انہیں مجھ پر اپنے آپ سے زیادہ اعتبار تھا۔

آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے۔ کم کو بھوک نہیں تھی لیکن یوں کرسیاں توڑ کے ہوٹل سے اٹھ جانا وضع کے خلاف تھا۔ بیرے سے صرف چائے لانے کو اٹھ گیا تھا۔ وہ کیک چمچاؤں، نمکین بکٹ اور سمو سے بھی اڑا لایا۔ چائے ختم کرتے ہی ہسٹل پر نکل آئے۔

جمو کی معلومات کے مطابق ساڑھے دس بجے۔ قریب کوئی گاڑی فیض آباد کی طرف جاتی تھی۔ جمو کی راہ تھی کہ کیوں نہ رات لکھنؤ میں گزاریں۔ صبح سو بچی کی گاڑی سے بیٹھنے میں ڈھائی تین بج تھیں۔ اس وقت حویلی کیمنوں کو بے آرام کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ ہسٹل تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ رات کسی ہوٹل میں گزارنی پڑتی۔ مراد کے مسافر خانے کی بات اور تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں سسلی کا ٹھہرا اچھا نہیں لگتا تھا شاید اسی لئے ہسٹل نے؟ مشورہ مسترد کر دیا۔ گاڑی کی روانگی میں خاصا وقت تھا۔ تانگے والے کو روکے رکھا تھا۔ اس دوران ہم سارا شہر کی کچھ اور جھلک دکھا سکتے تھے۔ گوشتی پر جانے کا نہیں تھا۔ ہسٹل نے کوچوان کو سیدھے اسٹیشن چلنے کا حکم کر دیا۔

ابھی اسٹیشن دور تھا کہ تانگے کو رک جانا پڑا۔ رستہ بند تھا۔ بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ شور غل بھی بہت تھا۔

زورا حارٹے کی نوعیت جاننے کے لئے تانگے سے اترتا چاہتے تھے، ہسٹل نے روک دیا۔ اتنی دیر میں ہمارے پیچھے بھی مختلف گاڑیاں کھڑی ہو گئی تھیں۔ واپسی کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ سپاہی بھی اڑتے ہوئے سورج پر پہنچ گئے تھے اور سپاہیاں بیٹھ گئی تھیں۔ سپاہیوں کی دخل اندازی سے ہسٹل ڈھچکئی۔ جمو کے پیچھے پر انتشار کی حالت میں بھاگتے ہوئے ایک راہ گیر سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ دو آدمیوں کو چھرا ٹھونچ دیا گیا ہے۔ تماشاخیوں کو بھاننے کے لئے پولیس کو لا بھی چلائی پڑ گئی۔ اسی لمحے ایک شخص لوگوں کی بھیڑ کاٹتا، گرتا پڑتا ہمارے تانگے کے بائیں حصے سے ٹکرایا۔ وہ آگے جانا چاہتا تھا کہ اس کی نظر جمو پر پڑ گئی اور اس نے سرخوشی کے عالم میں نعرہ بلند کیا۔ جمو بھی اسے دیکھ کر چیخ پڑا "ارے آتیا ہا!"

اتنا ہی تانگے کی لگام تھام کے ٹھہر گیا "جمو استاد! قسم اللہ کی کیا دیکھ رہا ہوں" وہ دیوانہ واری سے بولا اور اس کی جھپٹتی آنکھوں سے ہسٹل بھی روپوش نہ رہ سکا۔ "بائیں استاد! استاد! ہسٹل اپنے آقا بھی ہیں غلام واری۔"

میں نے اسے نیلے بھی دیکھا تھا۔ پینتیس سے چالیس کے درمیان عمر، لمبے قد، چہرے جسم اور سانوفی رنگت کا آقا پہلے کہیں خاں کے اڑے کا خاص آدمی تھا۔ بازار کا علاقہ اس کے پاس تھا۔ چاقو پر اس کی گرفت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس نے ہسٹل کے پیچھے چھو کے ہاتھ لگائے۔ "زبے نصیب، زبے نصیب، آج تو اس گہری کے دن پھر گئے"

"کیا ہے ہیرا لے، بہت مستی میں دکھائی دیتا ہے" ہسٹل نے تانگے میں بیٹھنے بیٹھے صدا لگائی۔

"مستی تو آقا، آپ کے دیدار سے ہو گئی۔ ہائے، کتنے دنوں بعد سرکار کو اس گاؤں کا خیال آیا۔ کہیں خاں کیا گئے، آقا نے بھی لکھنؤ سے کنارہ کر لیا" آقا بیا ہاتھ لہرا کے بولا۔

"اب کون ہے رے اوہری؟" ہسٹل نے بلند آواز سے پوچھا۔

"کون ہو تا عالم بنا! کہیں خاں کے جانے کے بعد سب لٹ لٹا گیا، وہی اپنے استاد، خدا عمار اور دراز کے اور بلاؤں سے محفوظ رکھے، وہی شمشاد استاد ذرا اڑے کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔"

استاد شمشاد خاں، کہیں خاں کا استاد تھا۔ کہیں خاں کے رخصت ہو جانے کے بعد اسے مجبوراً اڑے کی چوکی پر بیٹھا پڑا ورنہ وہ کب کا گوشہ نشین ہو چکا تھا۔

"ابھی تک دی گدھ چلا رہا ہے" ہسٹل نے تعجب سے

کہا "اب تو دن بہت ہو گئے۔"

"اس انوکھے لاڈلے بنے خاں کی نوک پلک سنو ار رہے ہیں۔" کانٹا، چھانٹی پوری نہیں ہوا تھی۔ کہنے کو بنے خاں ہی اڑے کے بادشاہ سلامت ہیں مگر بنس دیکھنے کے۔ کہیں خاں جانی کا رنگ بھانے کو بہت نرت بھادو کھانا پڑے گا۔ یہ لکھنؤ ہے، میاں ایک سے ایک سورا خاندانی پڑا ہوا ہے۔ میں تو کہتا ہوں، کچھ دن کے لئے آقا ہی راج سٹھکان پر بیٹھ جاتے تو سارے دلدر دور ہو جاتے۔ کلف گئے کپڑوں سے تو اڑا نہیں چلتا" آقا بیا کی آواز شور میں دب جاتی تھی۔ ہسٹل کا تیور دیکھ کر جمو نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا کہ سر دست استاد شمشاد خاں کے پاس حاضری ممکن نہیں، ہمیں جلد سے جلد فیض آباد پہنچنا ہے۔ وہ تو گاڑی بدلنے میں کچھ وقت تھا اور لکھنؤ میں کچھ ضروری کام بھی تھا ورنہ شہر کی طرف آتے ہی نہیں۔ استاد شمشاد خاں کو سلام کہنا اور کہنا کہ شاید لکھنؤ جلد ہی آتا ہو۔

"واہ سرکار!" آقا بیا شکایتی لہجے میں بولا "استاد کو خبر ہو گئی تو کیسے حیران و پریشان ہوں گے کہ اپنے دلدار اتنے قریب آکے ملے بغیر چلے گئے"

"آئیں گے رے جلدی۔ کوئی مجبوری ہے۔ جیسا استاد جمو نے بولا ہے، ایسا ہی استاد شمشاد کو باکے بول دینا" ہسٹل نے اٹھ کے کہا۔

"جان کی اماں باؤں تو زبان کھولوں" آقا بیا ہاتھ جوڑ کے بولا "استاد شمشاد کو بہت ملال ہوگا، کمریں مل آجائے گا۔"

پیچھے کی گاڑیوں نے واپس ہونا شروع کر دیا تھا اس لئے کچھ گفتگو نہیں ہوئی اور ہمارے تانگے کو بھی واپس ہونے کی جگہ مل گئی۔ جمو اور زورا تانگے سے اتر گئے تھے۔ آقا بیا دور تک ساتھ ساتھ چل رہا۔ پولیس کی نفری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آقا بیا کی زبانی معلوم ہوا کہ بازار میں ان دنوں کسی چاندنی بانو کی دوشیزہ کا طوطی بولتا ہے۔ حسن و جمال میں یکساں، رقص کے فن میں بے مثل ہے۔ آواز بھی خوب بانی ہے۔ خاں پور کا کوئی سرکش نوجوان جنون کی حد تک چاندنی بانو کا طلب گار تھا اور ساری آباؤی دولت اپنے مقصود پر پھٹاؤ کر چکا تھا۔ چاندنی بانو کی نگراں تارا بیگم نے نوجوان سے ساری شرطیں پوری کر لینے کے باوجود وعدہ وفا نہیں کیا اور مزید ستم یہ کیا کہ بالا خانے پر کرائے کے ایک شورہ پشت بازار کے معاملات کے مشاق اور ایسی صورت حال سے نمٹنے کے ماہر ہیرا لال سے مدد چاہی۔ ہیرا لال، چاندنی بانو اور

نوجوان کے درمیان دیوار بن گیا اور اس نے بھرے بازار میں نوجوان کو ذلیل و خوار کیا۔ نوجوان بہت دنوں سے ہیرا لال کی تاک میں تھا۔ وہ اڑے پر استاد شمشاد خاں کے پاس بھی دہائیاں دیتا ہوا آیا تھا۔ شمشاد خاں نے بازار کے معاملات میں اس قسم کی مداخلت سے صاف انکار کر دیا تھا۔ آج نوجوان اور ہیرا لال کی مڈ بھڑ ہو گئی اور نوجوان نے بے دریغ ہیرا لال کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ زخمی ہیرا لال بھی نہتا نہیں تھا۔ لڑکھڑاتے، ڈگدگاتے ہوئے اسے چاقو نکالنے اور نوجوان پر اوچا تر چھوڑا اور کرنے کا موقع مل گیا۔ دونوں خون میں لت پت ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ وہی پرانی کمائی تھی۔ آٹاپا اتنا ہی جان سکا تھا کہ پولیس آگئی اور اس نے واردات کی جگہ سے بھاگ نکلنے میں غایت جالی۔

بہت وعدے و وعید اور اصرار و تکرار کے بعد آٹاپا ہم سے جدا ہوا۔ اسٹیشن پہنچ کے معلوم ہوا کہ گاڑی کی روانگی میں ابھی سوا گھنٹا باقی ہے۔ جمو ٹکٹ خریدنے چلا گیا۔ ہم چاروں انتظار گاہ میں آگئے۔ منہ ہاتھ دھوئے اور جانے لے گئے تازہ دم ہونے میں آدھ گھنٹے کے قریب وقت چپکے سے نکل گیا۔ آٹاپا نے پاؤں کا پڑا ساتھ کر دیا تھا۔ بہت خوشبودار مایاں تھے۔ جمو بھی واپس آگیا تھا۔ اپنے بڑے بھائی جامو کے ٹکٹے چلے جانے کے بعد جمو ہی فیض آباد کے اڑے کا گھراں تھا۔ دونوں بھائی چاقو کے بہترین طاق تھے۔ لکھنؤ میں بھی ان کا شہرہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آٹاپا جمو کو دیکھ کر بچنے، پھرنے لگا تھا۔ میرے اور بھیل کے ساتھ جمو نے اپنے روز و شب کا بہت خون کیا تھا۔ کوئی کب تک کسی کے لیے اتنا وقت نثار کر سکتا ہے جہاں اس کی پذیرائی ہوتی ہو؟ جہاں لوگ اس کی آغوشیں پہنچتے ہوں۔ حلقہ بھی گھر کے مانند ہوتا ہے۔ بار بار نہیں بنایا جاسکتا۔ جمو تو فیض آباد کے اڑے کا حاکم تھا۔ گھر جانے، اپنے ٹکٹے پر واپس جانے کی ایک اضطرابی سمرت اس کے چرے سے عیاں تھی۔ اس کی رفتار و گفتار میں عجب بے ثباتی ہی نظر آتی تھی۔

گاڑی کی روانگی میں چند منٹ باقیں منٹ رہ گئے تھے کہ بھیل نے اٹھ جانے کا اعلان کیا۔ قلمی نے سامان اٹھایا تھا۔ سلیٹی بھی برقع اوڑھ کے تیار ہو گئی تھی۔ ہم باہر نکلا ہی چاہتے تھے کہ اچانک درد اڑے پر شور ہوا اور اسی لمحے درد اڑے کھول کے کئی آدمی اندر در آئے۔ سب سے آگے استاد شمشاد خاں تھا۔ بھرا ہوا جسم، میانہ قد، چست ہوئی کدم گوں رنگت، پچن کے سفید کرتے اور پاجامے پر بھورے رنگ کی واسکٹ، سر پر دلیا، ایک ہاتھ میں چاندی کا کڑا، گلے میں مختلف پتھروں کی

مالا، کانوں میں سنہری دیا۔ اس سن رسیدگی میں جوانوں کی سی آن بان تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جیسے تم نے روشن تھے۔ ”بھیل بھائی! بھیل بھائی!“ وہ سر جھٹکتے اور ہاتھ پھیلائے ہوئے آیا اور بھیل سے لپٹ گیا۔ ”اب آخری وقت میں یہ دن بھی دیکھنا ہو گا۔ یہ انصاف نہیں ہے۔“ وہ بھیل کو جھنجھورتے ہوئے بولا ”بھلا داپنے دیوانے کو۔“

بھیل نے بھی اسے بھڑکایا۔ ”آٹاپا نے جھٹل پنا کیا؟“ سارا بول رہا تھا اٹھائی گبرے کو۔ ”بھیل نے شمشاد خاں کی پیشانی چومتے ہوئے کہا ”کیوں چلے آئے تم؟“

”کیسے نہیں آتا۔ لکھنؤ میں استاد بھیل آئے اور شمشاد خاں چوکی پر اینڈ تار ہے۔ پیا تو سوری اولاد چاندی کے پورے سوا حق دار ہے۔“

”کیا پولیس شمشاد خاں! ضرور آتے پر۔“ بھیل نے سلیٹی کی جانب دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا ”بہتر آگھوں پر۔“ شمشاد خاں سینے پر ہاتھ مار کے بولا ”بیٹا شمشاد خاں نہیں ہے کیا؟“

”بہت چکر کاٹ کے آ رہے ہیں بھائی!“ بھیل نے بوجھل آواز میں کہا۔

”گر گھر آ رہے ہو۔ لکھنؤ میں شمشاد خاں زندہ ہے بھیا صاحب! مرا نہیں ہے۔ اپنے کو تو ایسے ہی تمہارا انتظار تھا۔“ شمشاد خاں نے اپنے ساتھ آنے والے اڑے کے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ سامان اٹھا کے تاکے میں رکھیں۔ بھیل کا ہاتھ پکڑ کے شمشاد خاں انتظار گاہ سے باہر آگیا۔ بھیل نے اسے سمجھانا چاہا، وہ جلد ہی دوبارہ لکھنؤ آنے کا وعدہ کرتا رہا مگر شمشاد خاں نے ایک نہ سنی۔ اس کی چوڑی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ کہنا سننا لا حاصل ہے۔ کسی کو بھی اتنے اصرار کے بعد انکار کی مجال نہ ہوتی۔

سے غاصے لوگ موجود تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ جو آتا، پہلے بھیل کو پھر شمشاد خاں کو سلام کرتا۔ کوئی بھیل کے پیر جھوٹا، کوئی ہاتھ چومتا، آٹاپا بھی نظرس جھکائے ہاتھ بانٹھے، بھیل کے سامنے آکھڑا ہوا۔ بھیل مسکرانے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ آٹا موتیا کے ہار لایا تھا۔ سب کے گلوں میں اس نے ہار ڈالے۔ دیکھتے ہی دیکھتے والان اور محن بھر گئے۔ والان میں ستون کے ساتھ ساوا۔ اور چائے کی پیالیاں رکھ دی گئی تھیں۔ بھیل کے لیے بے طور خاص قلعی کی ہوئی قرچی، منقش نیچے اور چلم اور زر نارنگ کے حقے کا بھی بندوبست کر دیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے اور شمشاد خاں کے احکام ختم نہیں ہو پاتے تھے پھر کہیں سے کہیں خاں کا جانشین جو اس سال بنے خاں بھی آگیا۔ ٹھٹھا ہوا قد، بادای رنگت، کانوں میں مختصر سی سنہری پائی، ہاتھوں میں کڑا، سفید براق لباس اور کالی واسکٹ۔ وہ ایک جامہ زیب نوجوان تھا۔ اڑے کا آدمی معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ بے خاں نے جبکہ کے سلام کیا، بھیل کے پیر چھوئے، ہاتھ کو بوسہ دیا۔ بھیل نے اسے پاس ہی بٹھالیا۔ تھوڑی دیر میں دسترخوان سجادیے گئے۔ جانے کس طرح اتنی جلدی اتنے لوگوں کے لیے انہوں نے کھانے کا انتظام کر دیا تھا۔ بریانی، پٹلے شوربے کا سالن، لوی کا رائیڈ اور چائیاں۔ شمشاد خاں نے اسٹیشن جانے سے پہلے ہی کھانے کی تیاری کا حکم دے دیا ہو گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ہمیں اڑے سے لے کر ہی آئے گا ورنہ اتنے کم وقت میں تو یہ اہتمام ممکن نہیں تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہوتے بارہ بج گئے اور پھر جیسے ہی دسترخوان اٹھائے گئے، محن کے کسی گوشے سے یکایک ذرق برق لباسوں میں لمبوس، سولہ کنگھار کیے ہوئے بھنڈیلے سازو سامان کے ساتھ نکل آئے۔ ان میں اور تپانے گانے والی عورتوں میں کوئی فرق تھا تو سوائف آمیز ناز واداکا۔ پہلی نظر میں تو کوئی بھی دھوکا کھاسکتا تھا۔ انہیں اسے درمیان دیکھ کے پام درد شور سے گونجنے لگا۔ متانہ وار صدائیں، بیٹیاں اور آہیں۔ تخت کے سامنے آکے پہلے انہوں نے کورٹش بجالانے کے انداز میں تعظیم پیش کی۔ بھیل نے جیب میں ہاتھ ڈال کے انہیں کچھ نقدی نذر کی پھر وہ بے خاں کے سامنے اڑ گئے۔ ایک شوخ بھانڈے کھو ٹکٹ نکال کے درملا کی طرح گیندے کا ہار بنے خاں کی گردن میں ڈال دیا۔ ایک نے بڑھ کے بدن پکڑتے ہوئے بلا میں لیں۔ جب تک بے خاں نے ان کی حسب دل خاطر خواہ نذر نہیں گزار دی، وہ وہیں کھڑے اٹھیلیاں کرتے رہے۔ ان میں ایک سے بڑھ کے ایک تھا۔

سرتال کے یکے تھے، رقص کا اچھا مکھ تھا، نکل بھی کمال کے تھے۔ ان کی عشوہ طرازیوں، ناز خڑے، چٹک مک اور ٹھٹھکوں نے سب ہی کو ہنساتے ہنساتے لوٹ پوٹ کر دیا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب جب محفل شباب پر بھی، شمشاد خاں نے ہاتھ اٹھا کے انہیں روک دیا۔

اڑے پر چند ہی آدمی رہ گئے۔ بھیل، شمشاد خاں کے پاس بیٹھا۔ نیچے زور اور جھوک بے خاں پہلی منزل کے گنبد جیسے ایک کمرے میں لے آیا۔ کمرہ سجا ہوا تھا۔ صاف بستروں کے علاوہ ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ بھیل کے لیے کسی اور جگہ انتظام کیا گیا تھا۔ آدھی رات تو ایسے ہی گزر گئی تھی۔ صبح کی گاڑی سے روانگی کا اب کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ نیند کے لیے فراغت بھی شرط ہے، فراغت کے لئے بے حس۔ بے حس جبری بھی تو ہوتی ہے۔ ہم تینوں کو جلد ہی نیند نے لایا۔

صبح ناشتے کے بعد اڑے کے آدمیوں کے سامنے شمشاد خاں نے بلند آواز میں اعلان کیا کہ وہ اڑے پر نادر بیٹھنا نہیں چاہتا۔ اسے اب آزاد کیا جائے۔ بے خاں کی رگوں میں تازہ خوں رواں ہے، حوصلہ مند، جزیں اور معاملہ فہم ہے۔ جہاں تک بن پڑا ہے، بے خاں کی تربیت دل و جاں سے کی گئی ہے، شاید اب کوئی کسر نہیں رہ گئی۔ باقی تجربہ خود سب سے بڑا معلم ہے۔ شمشاد خاں نے کہا ”آرزو تھی کہ کہیں خاں مرحوم کے جانشین بے خاں کی چوکی پر بیٹھانے کی رسم اوائی کے موقع پر استاد بھیل بھی موجود ہو۔ کل جتنے کا دن ہے۔ اس دن کی ریت ہے“ استاد بھیل سے درخواست کی گئی کہ وہ کل اپنے ہاتھوں سے، بے خاں کو اڈا سپرد کرنے کی رسم ادا کرے۔

چاروں طرف سے سمرت کے اظہار میں اٹھنے والے نعرے بے خاں کی ہر دل عزیز کی کے غماز تھے۔ گویا اب کل تک بھی فیض آباد روانہ ہونے کی صورت نہیں تھی۔ اڑے سے اٹھ کے ہم سلیٹی کی خیر خبر لینے شمشاد خاں کے بھائی کے گھر چلے آئے۔ رہبری کے لیے شمشاد خاں نے ایک آدمی ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ حراہ آباد کے مسافر خانے میں قیام کے دوران میں سلیٹی کو جمو اور دورا سے مانوس ہو جانا چاہیے تھا۔ انہیں دیکھ کے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ سلیٹی نے بتایا کہ میزبانوں نے تو وعدہ کر دیا۔ اس قدر تکلف اور تواضع کہ گھر ہاٹ ہونے لگی ہے۔ میزبان خواتین کے ساتھ سلیٹی لکھنؤ کے خاص مقامات اور بازاروں کی سیر کے لیے جانے والی تھی۔ وہ حیدر آباد کے محل دو محلوں کے آداب

سے واقف تھی سوا سے لکھتو کے۔ اوسط درجے کے ایک خاندان کے سامنے نشست درخاست میں دشواری پیش نہیں آ رہی ہوگی۔ سائبان، ریشم، پھول، چند نرم و لطیف لفظ اور ایک نگاہ لطف بھی آدمی کے لیے خدا کے مانند ہیں۔ زندگی بڑھتی نہیں تو آسان ضرور ہو جاتی ہے۔ جمرو اور زورائے خدا حافظ کہتے ہوئے سہلی کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

بھٹل کو بتا کہ ہم تینوں اڈے سے نکل گئے اور حضرت شاہ میٹا کے مزار، بھول بھالیاں اور چھتر منزل ہوتے ہوئے دریائے گوتمی کی طرف چلے آئے۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے امین آباد کے ایک معمولی ہوٹل میں کھایا۔ کھانا البتہ معمولی نہیں تھا۔ کبھی پیدل، کبھی تانے پر بے سرو پا گھومتے گھاسٹے شام کو جمرو پھرچھے ڈاکٹر سری داستانو کے مطلب میں لے آیا۔ مجھے اب ایسی کوئی تکلیف نہیں تھی تاہم جمرو کی خواہش پر ڈاکٹر نے پٹی کی تجدید کر دی۔ سورج ڈوبتے وقت کس ہمارے واپسی ممکن ہو سکی۔

○☆☆○

اڈے پر گزشتہ رات سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ فرش دھوا جا رہا تھا، جھنڈیاں لگاٹی جا رہی تھیں۔ دیواروں، منڈیروں اور طاقتوں پر ترتیب سے چراغ رکھے جا رہے تھے۔ گلی میں صدقے کے لیے بندھے ہوئے کالے بکرے شور مچا رہے تھے۔ رات کے کھانے پر بھی کچھ کم اہتمام نہیں تھا۔ شمشاد خاں کے مشورے پر رات کے کھانے سے پہلے ہم نے کپڑے بدل لیے تھے۔ جمرو کا خیال تھا کہ آج مجھے کی محفل ضرور آراستہ کی جائے گی لیکن کھانا ختم ہوتے ہی شمشاد خاں چوکی سے اٹھ گیا۔ باہر تانے تیار کھڑے تھے۔ کچھ ہی دور جا کے ہمیں شمشاد خاں کے ارارے کا اندازہ ہو گیا۔ بازار کے سرے پر سب تانگوں سے اتر گئے۔

بازار میں دنیا ہی دوسری تھی، کسی میلے کا سامنا نہ ہو سکتی تھی۔ رنگ برنگے رزق برق لمبوسات، جھروکوں، جالیوں، دروازوں اور چٹمنوں سے تائیں اندر ہی تھیں۔ ہوا میں جیسے راگ کھلے ہوئے ہوں۔ یوں بھی شمشاد خاں کی آمد سے بازار میں اپڈیل سیج لگی تھی۔ کسی طرف سے بگڑے کسی جانب سے عطر کی پھریوں کی نذر گوئی گویا مٹھری میں لیے لپکا چلا آ رہا ہے۔ تصویر چائے کے کسی خاص دکان دار نے شمشاد خاں سے کچھ دیر ٹھہر جانے کی التجا کی۔ شمشاد خاں سلام کا جواب دیتا، سنی ان سنی کرتا اور لوگوں سے سرسری طور پر حال احوال پوچھتا ہوا تیز قدموں سے بڑھتا رہا۔

اور بازار کے وسط میں واقع ایک منزل عمارت کے سامنے آ کے ٹھہر گیا۔ بنے خاں نے کئی مار کے سرگوشی میں جمرو کو بتایا کہ یہ چاندنی کا بالا خانہ ہے۔ آج کل اسی کی حکومت ہے۔ ایمان سے جمرو استاد انظارے کی چیز ہے۔ بنے خاں کی آواز بھڑک رہی تھی، ہمک رہی تھی۔

”مطلب ہے، زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے بنے میاں۔“ جمرو نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

”کیوں جمرو بھائی؟“ بنے خاں پکلیں جھپکانے لگا۔

”یہ راج پات زیادہ راس نہیں آتا نارا بیگم کو۔ اس کا بچہ جلدی خالی ہو جاتا ہے۔“

”اب کے باہر سے نہیں، نارا بیگم کی اپنی بنائی سنواری بلبل ہے۔ نارا بیگم نے چپکے چپکے پروان چڑھایا ہے اور سنا ہے، خوب مانجھ کے ایک دم سے محفل میں آتا رہا۔“

پورے مکھن میں دھوم ہے۔

”نارا بیگم کی اپنی بیٹی ہے کیا؟“

”یہی سمجھ لو، بچپن سے اسی کے پاس ہے۔ بیٹی ہی کتنی ہے، جھوٹ چھوڑا جائے۔“

بالائی منزل کے ریشمی پردوں میں سرسراہٹ ہوئی اور کسی نے جھماکے کے دیکھا۔ شمشاد خاں نے اڈے کا ایک آدمی اپنی آمد کی اطلاع دینے اور بھیج دیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے دو سازندے، ایک نومند شخص کے ساتھ نیچے آ گئے۔

انہی کے جلو میں ہم نے میز چوں پر قدم رکھا۔ اوپر دروازے پر گونا گونا کٹاری، نکلے خرابے، جبر اور گلابی دوپٹے میں لپٹی، زیورات سے لدی چھندی، ایک ادھیڑ عمر خوش جمال عورت ہمارے استقبال کے لیے مضطرب کھڑی تھی۔ یہ نارا بیگم ہی ہو سکتی تھی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا، وہ خود بھی بازاری منتخب عورتوں میں سے ایک ہوگی۔ سرخم کر کے اس نے شمشاد خاں کو اور ہم سب کو باری باری آداب کیا اور کھٹکتی آواز میں بولی ”بندی تو سمجھ رہی تھی، اب کیا آتا ہوگا؟ اب تو شاید قاصد ہی آئے۔“

”بس کیا بتائیں ملکہ عالم، نکلتے نکلتے دیر ہو گئی۔“ شمشاد خاں نے لہک کے کہا۔

”خاں صاحب کو معلوم ہوگا کہ بندی جھرات کو محفل نہیں سجاتی۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہو کہ جھرات کو۔“

”اپنے کو معلوم ہے۔“ شمشاد خاں نے اس کی بات کاٹ کے کہا، ”کیا کریں، اوڑھ نکلتے کہ بادشاہ! اپنے جان جگر استاد، بھٹل کو واپس جانے کی جلدی ہے۔“

”خاں! آپ ہی ہیں استاد بھٹل!“ نارا بیگم چپکتی آواز

دعوت دی۔ ہم ہال کی طرز کے جھنگاتے ہوئے ایک کشادہ بیٹھو کرے میں داخل ہوئے کمرے کے تین اطراف عمارتیں بنی تھیں اور درمیان میں ریشمی پردے سرسرا رہے تھے۔ عمارتوں کے پار ایک طرف بڑی شہ نشین، دوسری جانب کچھ فاصلے پر بے شمار طاقتوں سے مزین درود دیوار۔ دیوار میں قریب قریب، متعدد کمروں کے منقش دروازے نظر آ رہے تھے۔ چھت، ستون اور دیواروں پر بچی کاری بہت مہارت سے کی گئی تھی۔ رنگ برنگے نقش و نگار میں جڑے ہوئے شیشے کے چھوٹے چھوٹے کنڈوں سے کسی شیش محل کا گمان ہوتا تھا۔ چھت کے وسط میں ایک بڑے فانوس کے علاوہ جا بے جا چھوٹے فانوس روشن تھے۔ ساری ترین دیواروں پر آرائش شاہانہ تھی۔ نواب، راجے ہی یہاں آتے ہوں گے۔ بھٹل اور شمشاد خاں سازندوں کے مقابل کی نشست پر پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ ”زور اور جمرو بنے خاں اور اڈے کے تین آدمی ان کے دائیں بائیں۔ کوئی سازندہ مدھم سروں میں ستارے چھپڑ خالی کر رہا تھا۔ خاص دان اور بیچان تیار تھے سازندوں نے کچھ ہی دیر میں ساز سنبھال لیے۔ نارا بیگم مہمانوں کے انداز میں بھٹل اور شمشاد خاں کے قریب بیٹھ گئی۔

”ایک بائیں جانب سے قلیبات کرتی، چھم چھم کرتی ہوئی تھیلے خال و خد، گھنڈی رنگت کی ایک نوجوان، دل کش لڑکی نے آ کے سازوں پر رقص شروع کر دیا۔“

”یہ، یہی چاندنی ہے کیا؟ کل اسی پر خون ہوا تھا؟“ جمرو نے بے باکی سے پوچھا۔

”نہیں جمرو بھائی!“ بنے خاں نے زبردستی سے کہا، ”یہ تو اس کی چھوٹ بھی نہیں ہے۔ یہ تو ذرا محفل گرمانے کا چوچلا ہے۔“

”پر یہ بھی بہت پناخا ہے بنے میاں۔“

”بھٹل گئے، نارا بیگم کا بالا خانہ ہے۔ کوئی ایسی ویسی تو یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتی۔ تصویر کی طرح بناتی ہے نارا۔ ایک نمبر کی بارکھ ہے۔“

لڑکی نے اپنا سر با سازوں سے ہم آہنگ کرنے کی اچھی مشق کی تھی۔ رفتہ رفتہ جیسے اس کے پاؤں، اس کے ہاتھ، اس کا سارا بدن ہی سازوں کے اشارے کا معمول بن گیا۔ وہ سازوں کا کوئی حصہ نہ گنی یا ساز اس کے سر بائیں مدھم ہو گئے۔ سب گم صم سے تھے لڑکی کو آکے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ نارا بیگم نے ہاتھ اٹھادیا۔ لڑکی نے نہیں دیکھا لیکن سازندوں نے ساز مدھم کر دیے تھے اور طبل نواز

اور چپکتی آنکھوں سے بولی ”بہت نام سنا تھا سرکار کا، آج دیر ابھی ہو گئے۔“ نارا بیگم نے شائستگی سے بھٹل کو دوبارہ آداب کیا اور ٹھٹک کے بولی ”زبے نصیب، بندی کے بخت چاہے، استاد بھٹل نے غریب خانے کا رخ کیا۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔“

بھٹل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر آ کے گزر گئی۔

”بندی ضرور حاضر ہوتی خاں صاحب!“ نارا بیگم معذرت خواہانہ لہجے میں بولی ”لیکن خدا گواہ ہے، کسی سے پوچھ لیجئے، زمانہ ہو گیا، بندی نے باہر کی محفل آرائی کا سلسلہ ترک کیا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں نواب صاحب منور عباس کے یہاں کوئی بڑا فرنگی افسر آتا تھا۔ نواب صاحب سے برسوں کے مراسم ہیں، بہت خیال کرتے ہیں ناچیز کا۔ بندی نے دست بستہ معافی مانگی۔ نواب صاحب کی عالی ظرفی ہے، نہ صرف بندی کی التجا قبول کی بلکہ فرنگی افسر کے ساتھ بے نفس نفیس تعریف لائے۔ انہوں نے کم ترین کا مان رکھا، بڑی عزت دی۔“

”اپنے کو کوئی گلہ نہیں ہے نارا بیگم۔“ شمشاد خاں نے بے پروائی سے کہا ”بہت چرچا ہوا تھا تمہارے انکار کا، ہم نے بھی سنا تھا۔“

”لوگوں نے بیگم ناوا، بات ذرا سی تھی۔“

”پر نواب صاحب کی بات اور ہے، ہم تو فقیر لوگ ہیں۔“

”سبحان اللہ۔“ نارا بیگم کھل کھلا پڑی۔ ”پھر ہم لوگ کہاں جائیں گے، معلوم ہوتا ہے، آپ پر تو وقت ہی نہیں گزرا۔ وہی جوج دج، وہی آن بان، کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ ماشاء اللہ وہی شوخی اور زندہ دلی ہے۔“

”اور تمہارا اپنے لیے کیا خیال ہے؟“ شمشاد خاں نے گنگناتی سے کہا ”وقت کو تو بچی ترنے پہنچے میں بار کھا ہے۔“

نارا بیگم کے رخساروں پر لالی دوڑ گئی۔ ”اب کیا رکھا ہے خاں صاحب! داستان ختم ہوئی۔ بس آپ کا حسن نظر ہے۔“

”اپنے پاس تو نظر ہے، باقی تو سارا تمہارے پاس ہے۔“

”کیا خوب! ذرا فوازی ہے آپ کی۔ اس دل جوئی سے جی کو بہت دلاسا ہوتا ہے لیکن۔“ وہ مل کھا کے بولی ”وقت کتنی رعایت دیتا ہے۔“

ہم ایک مختصر آراستہ و پیراستہ ڈیوڑھی جیسی گزر گاہ میں کھڑے تھے۔ شمشاد خاں کے نوکے پر نارا بیگم پشیمان ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کے اور ہاتھ پھیلا کے ہمیں اندر آنے کی

نے طلے سے ہاتھ اٹھالے تھے۔ لڑکی کے پیروں میں بھی پھر کوئی زنجیر کی پڑی۔
 ”کیا غضب کروا، کیوں روک دیا؟“ شمشاد خاں نے بیانی لہجے میں کہا۔
 ”جلدی بکنے لگتی ہے۔“ تارا بیگم اٹھلا کے بولی ”ابھی تو آموڑ ہے۔“
 ”کس سے سکھواری ہو؟“ شمشاد خاں نے اشتیاق سے پوچھا ”کوئی بڑا لگتا ہے۔“
 ”شکر ہے، بار خاطر نہ ہوا۔ بندی تو ذرا رہی تھی۔“ تارا بیگم مسکرا کے بولی ”دوروں ان کے گرد پوجو جی بابو کا نام شاید سنا ہو، وہ تو اب چار دیواری سے باہر نہیں نکلتے، کچھ عرصے کے لیے ان کے پاس بھیجا تھا، بڑی منت کی تھی، تب مانے وہاں جا کے یہ دیوانی ہو گئی۔“
 ”لگتا ہے عزت کے لیے بنی ہے۔“
 ”ابھی کیا دکھا ہے آپ نے، غضب دھانے والی تو اب آیا جا رہی ہے۔“
 ”اسی کے لیے تو اپنے بھٹل بھائی کو کھینچ کے لائے ہیں۔“
 ”استاد تو زمانہ دیکھتے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے اسے حاضر کرتے ہوئے بچ پوچھتے تو دل دھڑکتا ہے۔ خدا لا ج رکھے، میری التجا ہے، کوئی کوٹاہی ہو تو بچی سمجھ کے گرد کر دیجئے گا۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اسے محفل میں آئے۔“
 ”پر در کیا ہے تارا بیگم، جلہ کراؤ۔“
 ”کیا خاں صاحب، اب ایسی بھی کیا بے مہری۔ ذرا دم لیجئے، کچھ چائے وغیرہ نوش کیجئے، ایک زمانے بعد تو آپ نے غریب خانے کا رخ کیا ہے۔“
 ”وہ تو آنا بھی اپنے بھائی استاد بھٹل کی وجہ سے ہو گیا۔ کبکین کے جانے کے بعد اب کہیں آنے جانے کو جی نہیں کرتا۔“
 ”آپ نے کبکین خاں کا کیا ذکر چھیڑ دیا؟“ تارا بیگم افسردگی سے بولی ”آپ کے دکھ کا اندازہ ہے خاں صاحب، اب سی کا تراشا ہوا بہرا تھا۔ یہاں سب ہی گوربت قلع ہوا تھا۔ کسی کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ ایسا جوان جہاں بکریل، دل والا آدمی، میرا عریک تو نہ تھی۔ کبھی بھی یہاں آتے تھے اور کیا اعلیٰ ذوق پا تھا، اتنے شعر بات تھے کہ الاماں۔ ہر موقع پر ایک شعر حاضر ہاتے، کیا باکا شخص تھا۔ ان جیسا شاید ہی کمندو والوں کو کوئی ملے، آپ نے بہت اچھا کیا جو چوکی پر واپس آ گئے۔“

”بدل کا کیا کرس نہیں لگتا تارا بیگم!“
 ”نہیں کرکے گا مگر خاں صاحب، آپ چلے گئے تو جاہ کیسی لوٹ مار بچے جب تک کبکین خاں کی جگہ لینے کے قابل کوئی نہ مل جائے، میری تو یہی ہمتی ہے کہ آپ ہی بیڑہ رہیں۔“
 ”تمہیں تارا بیگم، اپنے خاں کو کل چوکی پر بٹھا رہے ہیں بھٹل بھائی کو اسی لیے روکا ہے۔ بنے کو کبکین بھی بہت کچھ تھا۔ اپنا تو یہ آخری دن ہے۔“
 ”کیا تمہے رہے ہیں آپ؟“ تارا بیگم تعجب سے بولی۔
 ”تارا بیگم، ٹھیک پٹ پٹانے لگی اور اس کی منتظر نگاہ آخریے خاں پر آ گئے تھیں۔“
 ”ارے واقعی! یہ تو سامنے ہی بیٹھے ہیں، کیسے الگ۔ اب تو شاید اپنے ہوش و حواس بھی گتے بند کی۔ آپ کے اور استاد کے سوا کسی اور پر غور ہی نہیں کیا۔“
 ”خاں کبکین خاں مرحوم کے ساتھ کئی بار آچکے ہیں۔ ماشاء اللہ اب تو کچھ اور ہی تیر رہیں۔ شزاروں کی طرح۔“
 ”جھروٹے بنے خاں کو سنی ماری تو بنے خاں کا جسم اکڑ گیا۔ اتنی دیر میں دو کم سن لڑکیاں ہاتھوں میں طشت اٹھا کرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ہمیں سلام کیا اور ہمارے سامنے طشت رکھ کے فوراً واپس چلی گئی۔ مٹھاپار خشک میوے، پھل، بھنا ہوا دھنیا، الائچی دانے اور نمک کے برتنوں میں چائے۔“
 ”یہ کیا ہے کیا ہے؟“ شمشاد خاں نے جھکتے ہوئے بولا۔
 ”کچھ بھی نہیں، بندی تو کچھ کر ہی نہ سکی۔“ ہر بنمرا کی شام زیارت کے لیے جاتی ہوں۔ برسوں کا معمول ہے۔ آج وہاں کچھ دیر ہو گئی۔ مہلت ہی نہیں ملی کہ کسی اجتناء اور باتوں کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ حکیم بھورے میاں پیساں آدمی بھیجا، انہی کی دوا بانو کے لیے شانی ہے۔ بڑی تھی، بندی نے کہا، بنیا آج تو خود کو سنبھالے رکھنا ہے۔“
 ”مہمان آنے والے ہیں۔“
 ”اب کیسی ہے وہ؟“ شمشاد خاں نے تشوش سے پوچھا۔
 ”اللہ کا کرہ ہے، طبیعت بحال ہے۔“
 ”نہیں خاں صاحب! اتنا تو مجھے بھی خیال ہے۔“
 ”تمہیں نہیں ہوگا تو اور کس کو ہوگا۔“
 ”کیا بتاؤں، جیسے کیسے بٹن کیے، کتنی آرزوؤں کے بعد یہ دن آئے ہیں کہ بانو کی لائق ہوئی ہے۔“
 ”اپنے اوپر بھی شاید اتنی نہیں کی ہے۔“

”سایا استاد ہے جس کے در پہ جا کے بھیک نہیں مانگی۔ کہاں نہ گئی۔ کوئی ایسے ہی تو نہیں بن جاتا صاحب!“ تارا بیگم کی آواز بھرانے لگی۔
 ”ہاں تارا بیگم، پائل آدھے آدھے کی بات ہے۔ آدھا اپنا ہوتا، آدھا دوسروں کا۔ جتنا آدمی اپنے کام آتا ہے، اتنا دوسروں کی بھی اس کو ضرورت پڑتی ہے۔“
 ”بجائے ہیں۔“ تارا بیگم سر ہلا کے بولی ”بے شک بانو میں خود بڑی صلاحیت تھی، میرا کام تو اچانا، اچا کرنا ہی رہا ہے۔ میں ہر لڑکی کو بانو نہیں بنا سکتی اس لیے ہر لڑکی بانو نہیں ہوتی لیکن اب احساس ہوتا ہے، بانو کو اتنا وقت نہ دیتی، اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔“
 ”نہیں تارا بیگم؟“ شمشاد خاں نے الجھ کے کہا۔
 ”چچا تارا کیا؟ بانو تو اب تمہارے لیے حکومت ہے۔ تمہارے خرچ کیے ہوئے وقت کا ایک ایک پل اور لائے ہوئے پیسے کی ایک ایک پائی، ہزار کے حساب سے واپس آئے گی۔ دیکھنا، بانو کتنی ثابت ہوگی۔“
 ”ذلت، مسکے بھی تو ساتھ لائے۔“
 ”کیا کیا مطلب، کوئی دکھ ہے تمہیں؟“
 ”نہیں، تب شکر ہے مولا کا۔“
 ”بولو بولو تارا بیگم! کیا بات ہے؟“
 ”کچھ نہیں خاں صاحب!“ تارا بیگم آہ بھر کے بولی ”بس دعا کیجئے، خدا بانو کو سلامت رکھے، اسے بلاؤں سے محفوظ رکھے، وہی تو اب تعبیر، وہی تو اب ایک امید ہے۔ نہ بانو کسی کو بار بار ملتی ہے نہ زندگی اتنی۔“ تارا بیگم جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ اس کی آواز ملن میں گھٹ گئی۔
 ”ہم کو بتاؤ تارا بیگم!“ شمشاد خاں نے قرار ہو گیا۔
 ”کیا بتاؤں خاں صاحب!“ تارا بیگم بایست سے بولی۔
 ”اس نے سامنے رکھی ہوئی نوع، یہ نوع چیزوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی چاہی اور خطرہ خاں اٹھا کے پہلے بھٹل کی طرف پھر شمشاد خاں کی طرف بڑھائی۔
 ”کوئی پریشانی ہے تارا بیگم؟ جی میں انکاؤ رہے گا۔“ شمشاد خاں نے اصرار کیا۔
 ”بندی کو ڈر ہے، زبان ہلکے نہ جائے۔“
 ”نہیں نہیں، کھل کے بولو۔“
 ”آپ نے کل کی بات کچھ نہیں سنا۔“ تارا بیگم کی آواز میں غصہ نمایاں تھا ”ہم پر تو قیامت کر گئی۔“
 ”کل کی بات؟“ شمشاد خاں سٹپا کے بولا ”آج چھا“
 ”آج چھا دی کل جو چھڑے نکل آئے تھے چچا میدان میں۔ اسی

”کی طرف اشارہ ہے یا تمہارا؟“
 ”جینا اچرن کرنا تھا اس مجنوں نے۔“
 ”یہ تو ہوتا رہتا ہے تارا بیگم، لڑکی کی بات تو نہیں ہے، سمجھو تو ایک دھوم مچ گئی ہے شہر میں چاندی بانو کی۔“
 ”فک! آپ اسے دھوم مچا سکتے ہیں۔ اپنی توجہ ان پر بن گئی، کس عذاب میں وقت گزرا ہے، یہی جانتے ہیں، ہر وقت ایک دھڑکا۔ وردیوار سے خوف آنے لگا تھا، ایک تو بازار کے انہوں میں بانو کی اٹھان سے کچھ کم ساپ نہیں لوٹے ہیں، اور حریہ مجنوں یہ فرماؤ، کتنے خانوں میں چھپائے رکھوں یہ بلا۔ جب سے محفل میں اتنا شروع کیا ہے، ڈنگل میں آگ لگ گئی ہے۔ نوابوں، نواب زاروں کی کوئی بھگت لے، بھگت ہی رہی ہوں۔ ایک سے ایک دعوے دار، پٹارے اشرفیوں کے بھرے لیے چلا آ رہا ہے اور کل بکا دی سنا رہا ہے، ٹھیک ہے، لیکن یہ کل کے جوڑے چھار، خبر ہے خاں صاحب، وہ بنیا زادہ کیسی کیسی دھمکیاں دیتا تھا، کتا تھا کہ ایک دن سارے بالا خانے کو دیاسلائی دکھا دوں گا، تیرا بھیک دوں گا، سندور کھلا دوں گا۔ ایک مرتبہ تو اس ناخیار نے مجھ پر بھی ہاتھ اٹھا دیا۔ ایسی ذلت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ کیا کیا امیدیں لگائی تھیں اس بانو سے کہ اب بچت ہو کے کئے کی مگر یہ بد نظر شدے، سٹپے، یہ مجھے چپن نہیں لینے دیں گے نہ اس بچی کو۔ آپ کے پاس قاصد بھیجا تھا، آپ نے بھی خبر نہیں لی۔“
 ”تمہارے سر کی قسم، اپنے پاس کوئی سو رکھنا نہیں پہنچا۔ لینے کو کچھ نہیں معلوم۔“
 ”آنا گیا ہے، کھلو اٹھا، اس سے پوچھ گئے۔“
 ”اس حرام زادے نے کچھ نہیں بتایا۔“
 ”شہر تھا، ایسا ہی ہوا ہوگا بھلا آپ کو معلوم ہو اور لوٹ کے نہ پوچھیں، یہ اندھروں کیسی نہیں ہوا تھا۔“
 ”آغا تو کبھی دیکھ لوں گا، بہت مستی کرنے لگا ہے۔“
 ”اس نے سوچا ہوگا کہ اتنی ہی بات آپ کو کیا بتائے۔ اسے کیا خبر کہ بندی کس عالم سے دوچار ہے۔“
 ”پر آغا کو کتنا چاہیے تھا۔“
 ”یہ اس کی شکایت نہیں ہے، بندی میں اتنا حوصلہ نہیں۔ اسے میری طرف سے بدگمان نہ کر دیجئے گا، علالتے کا تھانے دار رہے۔“
 ”نمبر ایک حرامی ہے، تم فکر نہ کرو۔ بنے خاں کو بولتے ہیں کہ ادھر کی طرف ایک آدمی اور بڑھارے۔ اب ذرا کوئی بات ہو، تم سیدھی بنے خاں کے پاس آدمی بھیجو، لیکن تارا بیگم!“ شمشاد خاں نے آنکھیں چڑھا کے کہا ”یہ جگہ ہی محل

سے کتنی تھی۔ اب بھی میری کیا کہنا ہے۔ بلا خانے تو نوٹنگ کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ تو زنگارہ ہے، اسے سرائے کی طرح جانو۔ یہ تو سیر و تفریح کی جگہ ہے۔ جو گھروں میں ملتا، اس کا ہم یہاں بندوبست کرتے ہیں۔ یہ گھروں کی چیز نہیں ہے۔ گھروں میں خوش صورت لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہوتی کہ لوگ بالا خانے کی لڑکیوں کے والد و شیدا ہوتے ہیں پھر دونوں عذاب سے گزرتے ہیں۔ ساری پندہ چیزیں ملکیت میں تو نہیں لی جاتیں۔ گلستان کے پھول اپنی شاخوں پر پھلے لگتے ہیں اور اگر توڑ لیے جائیں تو گلستان کا کیا شہر ہو۔

”ہر من کی بھی کوئی بات ہوتی ہے تارا بیگم! سارا کچھ آدمی کے بس میں نہیں۔ تم بھی ادھر آؤ پر جاؤ گدگدتی ہو۔“

”ہر کوئی فریب تو نہیں۔ واپسی کے لیے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ شمعیں بجھادی جاتی ہیں۔ جو کچھ عیاں ہے عیاں ہے کچھ دکھا چھپا تو نہیں ہے۔ بالا خانے بازار میں ہوتے ہیں، شرفا کی بستوں میں نہیں۔“

وہ اپنی شریقی نینا یاد ہے؟ وہ کسی شاعر کا شعر گاتی تھی، عشق پر نہیں زور کیا تھا۔ ”پورا یاد نہیں آ رہا۔“

”عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب۔“ تارا بیگم کھل کھلا کر بولی، ”جو لگائے نہ لگے اور بجائے نہ بنے۔ غالب کا شعر ہے۔“

”ہاں ہاں وہی، کسی کا بھی ہو، گاتی اچھا تھی۔“ جہرو نے ایک کے کہا ”کیا بولتی ہو پھر؟“

”عشق اپنی جگہ ہے ہر ملکیت تو شرط نہیں، کیا عشق کے لیے لازم ہے کہ محبوب ملکیت میں آئے؟ میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ آدمی کو دور کا بھی دیکھنا چاہیے۔ آدمی کو ایسا بے گانہ نہیں ہو جانا چاہیے۔“

مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔ ”آپ کا کام بھی خوب ہے۔“ میں اپنے لیے کی برائے فکری دور نہ کر سکا میں نے تارا بیگم سے کہا ”دل جوتی بھی، دل کھنٹی بھی۔ اقرار و انکار، آمادگی و بیزاری، دروازہ کھلا رکھنا، دروازہ بند کرنا، تماشا گاہ کا وقت مقرر ہے لیکن تماشا کے اثر تو دروازے بند ہو جانے پر بھی طاری رہ سکتا ہے۔ اکثر بیشتر ہوش مندی ہی تو آتے ہیں جو آپ کے بقول عواقب پر نظر رکھتے ہیں لیکن کبھی کوئی اپنا اختیار کبھی تو سکتا ہے۔ اس کا کیا ہے؟“

تارا بیگم نے سراپا میں موج سی اٹھی۔ ”آپ، آپ سے تعارف ہی نہیں ہوا بنے خاں صاحب۔“ وہ تجسس آمیز لہجے میں بولی۔

بنے خاں کے بھائے جہرو نے جواب دیا ”یہ اپنا لاڈلا

ہے، سمجھو استاد، بھٹل کا بھائی، بیٹا، جو بھی سمجھو۔“

”یہ بھی کسی چوکی پر بیٹھے ہیں؟“

”اس کے پاس بہت سی چوکیاں ہیں۔“

”لگتا بالکل نہیں ہے۔“

”کیوں؟ لگنے والے کی آنکھیں پیچھے کی طرف ہوتی ہیں؟“ جہرو نے جلیبی کی سی آواز میں کہا۔

”نہیں، خدا نہ کرے۔“ تارا بیگم بے ربطی سے بولی پھر سنبھل کے لگنے لگی، ”مگر ان کی آنکھیں۔ ان آنکھوں میں تو بڑی آگ لگ رہی ہے۔“

”وہ تو ہے۔“ جہرو نے جھکتے ہوئے تائید کی اور بولا ”پر خود کو جلاتی ہیں۔“

تارا بیگم کی نظر اس جھجھکی ہوئی تھیں ”ماشاء اللہ تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔“

”جہرو کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے کہا ”حرف شناسی کی حد تک۔“

”میں اسے کس نفسی کون گاہ۔“

”من آنم کہ من دانم۔ میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آ رہیں۔“

”یہ وقت گزرنے کی بات ہے۔“ تارا بیگم شائستگی سے بولی ”اور ہو سکتا ہے، میری ہی فہم کی کوتاہی ہو۔“

”موجود وقت بھی تو کوئی فریب نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایک حقیقت ہے۔“

”جی جی۔“ تارا بیگم سر ہلا کے بولی ”وہ بھی بے شک وہ بھی ایک حقیقت ہے۔ آپ نے کتنی سچی اور اچھی بات کہی ہے۔“

پہلو سے شمشاد خاں کی دھمکتی آواز نے اسے متذبذب کر دیا ”کیا بات ہے تارا بیگم اور کب تم امتحان لوگی۔“

تارا بیگم مجھ سے معذرت کر کے جلد ہی ہمارے پاس سے اٹھ گئی ”واقعی خاں صاحب! تو یہ ہندی تو جانے کہاں کھو گئی۔ اس طرف آنے پر کچھ اور باتیں جھڑکیں۔“

تارا بیگم کے اشارے پر ہر محرابوں کے پاس موبہ کھڑی ہوئی بچپوں نے ہمارے سامنے سے کچھ سامان کم کر دیا۔ تارا بیگم چند لمحوں بعد واپس آنے کا کہہ کے اندر چلی گئی۔ سازندوں نے آہستہ آہستہ ساز تیز کر دیے تھے۔ طبل ان میں سب سے نمایاں تھا۔ زوراً تو باقاعدہ تھرکے لگا پانچ سات منٹ بعد محرابوں کے پار ایک دروازے سے تارا بیگم نمودار ہوئی۔ اس کے عقب میں چوڑی دار سفید پاجامے، کھد داہ لگائی کرتے اور ہرے دوپٹے میں لمبوس فوجان لڑکی چاندنی

بانو کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ لگتا ہوا قد کا منی صورت، ترشا ہوا سراپا، ترشے ہوئے نقش و نگار، بڑی بڑی شریقی آنکھیں، لمبے سیاہ بال، رخسار شعلوں کی طرح دھبہ رہے تھے کسی دلہن کی طرح تجی بنی۔ کانوں میں ہیرے جڑے جھکے، ناک میں لال دھڑی کے ذریعے کان تک بندھی ہوئی تھ۔ کلائیوں میں طلائی چوڑیاں، گلے میں کئی طرح کے ہار، پیروں میں پازیب، صرف جھومر کی کمی تھی۔ وہ چمن چمن کرتی فرش کے وسط میں آکے کھڑی ہو گئی۔ سب کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔ سازندوں نے ساز بند کر دیے اور کمرے میں سکوت چھا گیا۔ چاندنی بانو کے سرخ ہونٹوں نے شمشاد خاں اور بھٹل کی جانب، پھر ہماری طرف رخ کر کے سلام کیا اور فرش پر خاص انداز سے بیٹھ گئی اس طرح کہ کرتے کے گھیرنے نہ داند نہ پاد۔

”واہ تارا بیگم! واہ!“ شمشاد خاں نے بے ساختہ صدا بلند کی ”یہ تو مورنی کی طرح ہے۔ روز اس کی نظر اتاری ہوتا؟“

چاندنی بانو نے شرم سے سر جھکا لیا۔ تارا بیگم نے مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ کانوں پر گھما کر انگلیاں چٹخائیں اور جھٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”کوئی پل نہیں جاتا خاں صاحب!“

”جی، ہم نے کم نہ شانتا۔“

”غنائت ہے آپ کی۔“ تارا بیگم دھمکتی آواز میں بولی۔

بنے خاں اور جہرو کی آنکھیں جھپکی ہوئی تھیں۔ زوراً کو بھی سانپ سوکھ گیا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والے اڑے کے تیوں آدمی بھی دم بہ خود ہو گئے۔ جہرو کو جیسے سب سے پہلے ہوش آیا اور اس نے بنے خاں کی آنکھوں کے آگے انگلیاں نہایت ہوئے کہا ”سنبھل کے نوشہ!“

بنے خاں سٹ پنا سا گیا اور مضطرب نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دونوں نو عمر لڑکیاں گھگھکھکے آئیں۔ چاندنی نے گھیر میں چھپے ہوئے بیڑ نکال کے ان کے سامنے کر دیے۔ لڑکیوں نے پازیب اتار کے پیروں میں گھگھکھکے پاندھ دیے۔ اسی لمحے سازندوں نے ساز بجانا شروع کر دیے۔ تارا بیگم دوبارہ شمشاد خاں اور بھٹل کے قریب بیٹھ گئی اور چاندنی بانو کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے شمشاد خاں سے اجازت طلب کی۔

”غور ضرور، ہم تو کب سے اس گھڑی کو ترس رہے ہیں۔“ شمشاد خاں نے خروانہ لہجے میں کہا۔

تارا بیگم ہاتھ جوڑ کے عاجزی سے بولی ”کوئی خای ہو تو

بازی گرب 6

بچی سمجھ کے نظر انداز کر دیتے گاہ۔“

”ہم کو معلوم ہے، بالکل نہیں ہوگی۔ اوپر والے نے اس کو بنانے میں پورا وقت لیا ہے۔ یہ تو اوپر سے نیچے تک سُر میں ہے۔“

چاندنی بانو نے سازندوں کی جانب کن آنکھوں سے دیکھ کے گنگناٹا شروع کیا۔ بنے خاں اور جہرو سیدھے ہو کے بیٹھ گئے۔ اس کی گنگناٹا سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ خدی خدا داد ہے۔ قدرت نے آواز کی عطا میں بھی خوب فیاضی کی ہے۔ چاندنی نے سوا کی غزل سے آغاز کیا۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں ترپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں مجھے نصیب میاں یاد آ رہے تھے۔ کتنے تھے سب سے پہلی شرط تو کسی کا سُر میں ہونا ہے۔ ایسا لگا جیسے کمرے میں ہر سونگھنٹاں بیٹھے لگی ہوں اور درویشی بھی سترم ہو گئی ہو، ہوا بھی چاندنی کے ساتھ کار رہی ہو۔ اس کی ادائی، زبرد، پلک، سوز و گداز، سازندوں سے ہم آہنگی، مرکی بھڑاؤ، لگتا تھا چاندنی کا بدن پگھل رہا ہو اور اس کے مرتعش ہونٹوں سے ترنم کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔ آواز کے بھی کیسے کیسے روپ ہوتے ہیں۔ غنا کار کا انہماک، اس کی شمولت لازم ہے۔ چاندنی آپ اپنی امیر معلوم ہوتی تھی، مصور اپنے شاہ کار میں خود بھی تو کم ہو جاتا ہے۔

ادھر اس نے غزل سرائی ختم کی، ادھر شمشاد خاں اٹھ گیا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کے چاندنی بانو گھبرا سی گئی، اس کی غزالی آنکھوں میں وحشت اٹھ آئی۔ شمشاد خاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنے گلے سے سونے کی زنجیر اتار کے چاندنی بانو کے گلے میں ڈال دی۔ چاندنی بانو نے جھک کر اسے سلام کیا۔

”اسے چھپا کر رکھو تارا بیگم! اسے چھپا کر رکھو۔“ شمشاد خاں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

”ہاں خاں صاحب!“ تارا بیگم کے چہرے پر اداسی چھا گئی ”بے تو قی بات۔“

”بتانا ہوں تم کو۔“ شمشاد خاں خنسی لہجے میں بولا ”اکا دکا جائے گا۔“

”آئی لیے کتنی تھی، آپ کیسے رکھوالے ہو۔“

”جتنی جلدی مول تول کرلو، اچھا ہوگا ورنہ دیر نہ ہو جائے، دیر ہو جائے گی۔“

تارا بیگم کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ چاندنی بیگم نے داغ کی غزل شروع کر دی تھی۔

بھوس ختی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں۔
سب تنگ بیٹھے رہے۔ نحو محسن د آفریں بلند کرتے
ہوئے شاید سب کو چاندنی بانو کے منتشر ہو جانے کا خدشہ تھا یا
اس کی آواز کا خنجر جس نے سب کو جگر مار رکھا تھا۔ چاندنی
بانو کو راکوں کی باتا عہد تربیت دی گئی تھی۔ جب وہ نان
اٹھاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ بس اب ٹوٹا، اب ٹوٹا، جیسے بدن کا
شیشہ ٹوٹ جائے گا، چاندنی کچیوں کی طرح فرش پر بٹھ جائے
گی۔ نصیب میاں کہتے تھے، آواز کی پہلی خوبی غنا ہے تو
دوسری قابو پانگلی۔ کھینچو تو تھینچی چلی جائے، سیمٹو تو سیمٹی چلی
جائے اٹھے تو آسمان سے جا ملے، اترے تو بال چاھوئے۔
نصیب میاں کو سڑکی ہری بچان تھی۔ ٹکٹے کے اڑے پر جب
کوئی سڑے اترتا تھا تو ان کا منہ گڑا جاتا تھا، وہ کانوں پر ہاتھ
رکھ لیتے یا اٹھ کر چیکے سے باہر چلے جاتے۔ رقص و سرود کے
بارے میں مجھے جتنی شدید تھی، اس کا بیش تر نصیب میاں کا
تایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی طبیعت کی روانی کے وقت وہ بہت سی
باتیں اور یادیں سناتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آواز کا تعلق براہ
راست دل سے ہے۔ آواز کی کمان سے ٹکلا ہوا تیر ٹھیک دل
پر جا کے لگے، بات تو تب ہے سڑگروں شد وقت سے بے نیاز
گروتا ہے اور یہ مبالغہ نہیں کہ ٹھہرا ہوا پانی مثلا طم کرتا
ہے۔

تیسری غزل کے اختتام پر چاندنی بانو فرش سے اٹھ گئی
اور اس نے ستار کی سنگیت پر ناپتا شروع کر دیا۔ طبلہ نواز نال
دینے لگا۔ چاندنی بانو نے جیسے خود کو نال کے سرو کر دیا اور اس
کا اپنا کوئی ارادہ نہ رہا۔ یہاں تک کہ صرف ناچ نظر آنے لگا،
ناچنے والی او جھل سی ہو گئی۔ طبلچی درمیان درمیان میں ٹھیکا
لگا کے رقص کی شدت اور بڑھاتا۔ رقص کی یہ دیوانہ وار
حرکات و سکنات کسی جبلی تحریک، تانید و تسکین یا جبلی قوت
کے بغیر ممکن نہیں۔ چاندنی بچوں کی طرح لطیف، ریشم کی
طرح نرم و نازک تھی۔ اتنی توانائی جانے کہاں سے اس میں
آگئی تھی۔ رقص کے دوران میں اس کا رنگ اور کھربا
تھا۔ چہرہ اور خوں رنگ ہو گیا تھا۔ بستی میں کرشنا کی کے ساتھ
میں نے ایک بار جنوبی ہندوستان کی ایک راقصہ کا ایک ایسا
ہی رقص، بھارت نامہ دیکھا تھا۔ وہ اسے فن کی ماہر تھی۔
اس کا بھی انگ انگ پڑتا، تھرکتا تھا۔ لگتا تھا بس آخری
رقص ہو اور رقص کرتے کرتے بس فنا ہو جانے کی آرزو ہو۔
چاندنی کسی طور اس سے کم نہیں تھی۔ اس کے اعضا، ستار
نوازی لے اور طبلے کی تھاپ سے بندھے ہوئے تھے۔ تبھی کا
عالم دیدنی تھا۔ کہیں پلک جھپکنے میں کچھ کھو نہ جائے، تبھی

ٹنگلی باندھے برق اندام چاندنی کو دیکھ رہے تھے پھر ستار نواز
نے کوئی راگ اپنا شروع کر دیا۔
برکھا میں گھوری ابھاسن
رتائں بتائے جل جل کے
گیت کے بولوں پر چاندنی یاس و الم کی تصویر بن گئی۔
کبھی لہروں کی طرح اس کا بدن اٹھنے لگتا، کبھی شعلوں کی
طرح بھڑکنے لگتا، جرو اور زور کا بس نہیں چل رہا تھا کہ
چاندنی کے ساتھ رقص میں شامل ہو جائے میرا جسم بھی
دھڑک رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ ستار نواز نے جستم کی بے وفائی پر
اپنی آواز کا تمام کردی اور چاندنی کو قرار دیا۔
شمشاد خاں سر جھٹکنے لگا۔ وادو تحسین کے جواب میں
تارا بیگم بار بار آواب کرتی۔ رقص ختم کرتے ہی چاندنی
چٹاؤے کی طرح غائب ہو گئی۔ کمرے میں سناٹا ہو گیا۔
”کیا ہوا تارا بیگم؟“ شمشاد خاں بدحواسی سے بولا ”یہ
کیا؟ کیا اٹھ جائیں؟“
”خدا خیر کرے۔“ تارا بیگم نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر
آنکھیں چڑھائیں ”زور ادم تو لینے دیجئے سرکار۔“
شمشاد خاں نے اطمینان کی سانس لی پھر بے چینی سے
بولا ”اب ہم سے کسی اور کو نہ دیکھا جائے گا۔“
”وہی نامراد آگے آئے۔“ تارا بیگم مسکرا کے بولی ”بس
آیا ہی چاہتی ہے۔“
”کھاشا ہم بھی کوئی نواب ہوتے۔“ شمشاد خاں نے
حسرت سے کہا۔
”آپ کسی سے کیا کم ہیں خاں صاحب۔“
”ہاں۔“ تب کہتی ہو۔“ شمشاد نے زہر خند سے کہا
”پر تمہیں دینے کے لیے کوئی جاگیر نہیں ہے پاس۔“
”آپ کے دو لفظ ہی بندی کے لیے جاگیر کے مانند ہیں۔
جاگیروں والے تو جوج و شام یہاں آتے ہیں۔“
”بے خاں ابھی تک بت بنا ہوا تھا۔ جرو نے اس کے بازو
میں چٹکی بھری تو وہ اچھل پڑا ”کیا ہے نوشہ! اب پیچھو کو آجا
ساجنا۔“
”جرو بھائی۔“ بے خاں کی آواز سننا دہی تھی ”تم
نے تم نے دیکھا؟“
”نہیں ہے جانی!“ جرو نے بظاہر بے اعتنائی کا اظہار
کر کے بے خاں کی شدت کم کرنے کی کوشش کی۔
”اپنے لیے بالکل نیا ہے۔“ بے خاں ستمناقی آوازیں
بولا۔
”پرانا بھی ہو جائے گا۔“ جرو نے بے خاں کی رائے؟

چٹکی دی ”ابھی دو ایک دانت کی کسر ہے۔“
”کیسی ہے وہ؟“ بے خاں نے بچوں کی سی سادگی سے
پوچھا ”شہزادی ہے بالکل۔“
”ابھی ہے۔“ جرو نے سرسری انداز میں کہا ”اپنے کو
ہاتھ لگنے والی چیز اچھی لگتی ہے۔“
”ہاں آہ۔“ بے خاں کی آنکھیں بجھ گئیں ”ایمان
سے بولا جرو بھائی! اس کے منے کے بعد کسی اور چیز کی کیا
ضرورت ہے پھر اور کیا چاہیے۔ آوی اسی کو دیکھا کرے۔“
بے خاں بہت اضطراب میں معلوم ہوتا تھا ”کننے لگا“ ”کیوں“
غلط کہتا ہوں کیا؟“
”ٹھیک ہی بولتا ہے بھائی جان۔“ جرو نے بوجھل آواز
میں کہا ”پر دنیا میں کتنا ہی نہیں ہے۔ ایک کے اوپر ایک پڑا
ہے۔“
”خاں کہیں کھو گیا۔“
”میلین اڑے کے آوی کو راس نہیں آتیں۔“ جرو
نے چند تھوکنے کے وقف کے بعد کہا۔
”اڑے پر ویسے بھی رہنے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں
نے آہستہ سے کہا۔
”وہ دونوں مجھے گھورنے لگے اور بے خاں سر ہلا کے بولا
”ہاں لاڈلے بھائی، پھر اڑا کیا بیٹا ہے سالا۔“
”میں تو چاندنی کے بغیر بھی کم رہا ہوں۔“ میں نے
وضاحت کی۔
”اڑے سے ٹکنا بہت مشکل ہے لاڈلے بھائی۔“ بے
خاں پرموگی سے بولا۔
”کیا مشکل ہے۔“ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ ارادہ ہو
تو آواز چھوڑ دینا کیا دشوار ہے۔ اچانک سامنے سے بجلی سی
چٹکی۔ چاندنی بانو نمودار ہوئی۔ اس نے اتنی جلدی لباس
تبدیل کر لیا تھا۔ چہرہ گنار ہو رہا تھا۔ ہتھکیوں کی جگہ اب
کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں پڑی تھیں، ناک میں لوگ
آویزاں تھے۔ فرش پر ایک خاص انداز سے بیٹھ کر اس نے
مسکراتی نظروں سے سرگھما کے دیکھا اور جیسے ہی ساز بلند
ہوئے وہ غمہ سرا ہو گئی۔ ہم لوگوں سے اب وہ اتنی دور نہیں
بجھی تھی۔ اس کے ہاتھ رقص کناں تھے لہراتے ہاتھ،
تھرکتی انگلیاں اور مل تھاتی پلکیں شعروں کا مفہوم اور
سانوں کا زور دم اور اجاگر کردی تھیں۔ لگتا تھا چاندنی بانو
کو اساتذہ کا کلام خوب یاد ہے۔ اس نے یکے بعد دیگرے
والی دکن، میر غالب اور آتش کی غزلیں سنائیں۔ شمشاد خاں
مسکرتا ہوا تھا۔ بھٹل کے اشتیاق بھی دیدنی تھے۔ جرو

اور زور کے دست و بازو بار بار پھرک اٹھتے بنے خاں کا
حال البتہ مختلف تھا۔ وہ تو جیسے پتھر بن گیا تھا۔ آوازیں بھی
کیسا نشہ ہوتا ہے، آوی اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ سب خود
سے بے گانہ ہو گئے تھے۔
شمشاد خاں نے کچھ کہا ہو گا کہ تارا بیگم کے اشارے پر
چاندنی بانو بھٹل اور شمشاد خاں کے سامنے آکے بیٹھ گئی۔
بھٹل نے جب سے نوٹوں کی گڈی نکال کے چیکے سے شمشاد
خاں کی طرف کھکا دی۔ شمشاد خاں کو بھٹل کی جانب سے
اس خسروی کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس پر
حیرت طاری ہوئی لیکن پھر اس نے گڈی کھول کے سارے
نوٹ چاندنی پر بچھا کر رکھے۔ جرو بھی خالی نہیں تھا، چاندنی کو
پاس بلانے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ بھی کچھ رقم سامنے
رکھے۔ یہی ہوا، تارا بیگم نے کن آنکھیں سے چاندنی کو
ہدایت کی اور شمشاد خاں کی طرف سے اٹھ کے چاندنی بانو
ہمارے پاس آگئی۔ اتنے قریب سے اس کی گلی کا منظر ہی کچھ
اور تھا، رخساروں سے کمریں پھوٹ رہی تھیں۔ چاندنی
جل رہا ہو۔ جرو نے اور اضافہ کیا۔ نوٹوں کی گڈی چاندنی کے
سر پر گھما کے پرے بیٹھے ہوئے سازندوں کی جانب بھینک
دی۔ فرش پر پرزے ہی پرزے بکھر گئے۔ چاندنی نے اس
جو دو سٹاکے جواب میں اسے آواب کیا اور غل مل مل ہوتے
ہی ہمارے پاس سے اٹھ کے جانے لگی، جرو نے اسے روک
لیا اور وارفتہ لہجے میں بولا ”آپ تو کمال کرتی ہو۔ اتنا بہت سا
آپ نے کدھر سے سیکھ لیا؟“
”چاندنی بانو کا سراپا دہرا ہو گیا، کنیز کو کیا آتا ہے؟“ اس
نے ٹھٹکتی آوازیں جھٹکنے ہوئے کہا۔
”آپ کو کیا معلوم، کیا نہیں آتا آپ کو، تیر چلانا، بجلی
گرانہ۔“ جرو چٹل کے بولا ”تھوڑا سننے اور دیکھنے والے کا بھی
دھیان کیا کرو۔ آپ تو بہت امتحان لیتی ہو۔“
چاندنی بانو کا چہرہ اور سرخ ہو گیا۔
”ابھی ایک بات پوچھتے؟“ زور نے ادھر ادھر دیکھ کے
رازارانہ انداز میں کہا۔
چاندنی بانو کی آنکھوں میں بے چینی ہوید اہوئی۔
”ابھی آپ کو، آپ کو یہ سارا کیا لگتا ہے؟“ زور نے
سرگوشی میں پوچھا ”ابن کا مطلب ہے یہ سارا۔“
زور کی مراد محفل آرائی سے تھی۔ چاندنی بانو بھی سمجھ
گئی مگر اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ مضطرب ہو کے رہ
گئی۔
”روز یہ نوے نوے لوگ کے آگے گانا گانے کا۔“ جرو

کے شوکار مارنے سے پہلے زور کو خیال لگایا کہ وہ بلاغت سے تجاوز کر رہا ہے اس نے لاجب سے کہا ”ابھی آپ کو کسی راج محل میں ہونے کا تھا۔ پتا ہے ابھی ایدر کا سمرات بنے داوا کیا بولا ہے۔“ زور نے سانس لینے کے لیے تامل کیا اور چاندنی کے چہرے پر نظریں جمائے کہنے لگا ”ماں قسم داوا بولا ہے کہ آپ کے گل جانے پہ اور کیا چاہیے“ آپ مل جاؤ تو اٹھا۔“

چاندنی کا بدن لر گیا۔ بنے خاں مبسوت بیٹھا تھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور دونوں ہی شاید ایک دوسرے کی تاب نہ لاسکے۔

چاندنی بانو گھبراہٹ ہوئی۔
”ہم پوچھتے ہیں، مراد بھی تو کوئی مول ہوتا ہے؟“
چاندنی بانو کی آنکھیں جلتے بجھتے لگیں۔ اس کے لیے جواب آسان نہیں تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے جلو کو دیکھا پھر زیر لبی سے اٹکتی زبان میں بولی ”لیکن لکھے ہوئے کو کون مٹا سکتا ہے۔“

تارا بیگم نے اسے زیادہ دیر ہمارے پاس نہیں بیٹھنے دیا۔ اس کی صدا پر چاندنی ہڑبڑا گئی اور ہم سے معذرت کر کے فوراً اٹھ گئی۔ تارا بیگم نے اسے اندر جا کے آرام کا مشورہ دیا۔ چاندنی نے حکم کی طرح مشورے کی تعمیل کی۔ سازندوں نے ساز ایک طرف کر دیے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ شمشاد خاں نے بھی وقت نہیں لگایا اور رکی دوائی ٹکٹا کر کہہ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ تارا بیگم نے کچھ دیر کے لیے ہمیں اور روکنا چاہا، دوبارہ جلد آنے کی درخواست کی اور معذرت کا اظہار بھی کیا کہ وہ حسب خواہش شمشاد خاں اور اس کے معزز مہمانوں کی مدارات نہ کر سکی۔ وہ ہمیں دروازے تک رخصت کرنے آئی۔ سازندے بھی گلی کے ٹکڑے تک ہمارے ساتھ رہے۔

گلیوں میں اب اتنی چل پل نہیں تھی۔ پہلی کی طرح راستے میں اور کئی لوگوں نے شمشاد خاں کو اپنے اپنے بالا خانوں کی محفل میں شرکت کی دعوت دی۔ دکان دار بھی ہار پھول چائے، شٹائی اور پان وغیرہ سے تواضع کے لیے اصرار کرتے رہے۔ شمشاد خاں کہیں نہیں ٹھہرا۔ ہم آہستہ قدموں سے دور نکل آئے۔ بنے خاں بالکل محرم تھا۔ جمو نے ازراہ لطف پکارنے کے انداز میں اس سے کہا ”ادھر لکھنؤ میں ہی ٹھکانا ہے دولہا! کل ہی کی تو بات ہے، کون روکے گا بادشاہ سلامت کو۔ گدی سنبھالنے کے بعد تمہیں سینکڑے کو پیسے لگاتے رہنا۔ بولتے ہیں، حسینوں کا دیدار بھی

سرے کا کام دکھاتا ہے۔“

بنے خاں سر جھکائے چلا رہا۔ میں اس کے قریب تھا۔ اس نے کوئی توجہ نہیں کی تو جمو نے مجھے مخاطب کیا۔ ”کل“ ہے، ترچھا پڑ گیا ہے۔ پہلے ہی لمبے میں جھکا کر دینا ٹھیک رہا ہے۔“

”ہاں بنے بھائی!“ میں نے مڑ کے بنے خاں کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ مل رہا تھا اور آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں میں نے اس کا ہاتھ سینے پر لگاتے ہوئے کہا ”پیارے صاحب! کیا حال ہے؟“

میری اس سے ایسی بے تکلفی نہیں تھی، جانے اسے کیا ہوا، بے اختیار مجھ سے چپکنے کے لیے اٹھ رہا۔ میں نے بھی اپنے بازو پیچھا دیے۔ آنکھوں کی طرح سینے کی بھی کوئی زبان ہوتی ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے اسے کسی پناہ کی ضرورت ہے جیسے اس کا وجود مجھ میں پست ہو جائے، مجھ میں چسپ جانے کے لیے بے قرار ہو۔ میں نے اسے زور سے جکڑ لیا۔ چند لمبے مجھ پر کشائش کے گزروے، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے لیے کیا کوساں، مٹی چاہتا تھا کہ اس کی نشاط خاطر کے لیے احکام صادر کروں۔ اسے کوئی یقین دلاؤں مگر جلد ہی مجھے اپنی توفیق واستطاعت کا احساس ہو گیا۔ اس کے لیے اپنی ہر جانی دھم دلی کے باوجود میرے بس میں کیا تھا۔ میں نے اپنے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کی اور کسی موہوم عزم کی تلقین کے لیے اس کی کرپر چھلی دی۔ شمشاد خاں اور بھیل ہم سے آگے چلے گئے تھے۔ ہم نے بھی رفتار تیز کر دی۔

چند قدم بعد ہی میرے پیروں اٹکنے لگے۔ میں نے بدحواسی سے زور اور جمو کو ٹھہر جانے کے لیے کہا۔ بنے خاں بھی رگ گیا۔

”ٹھیک تو ہے؟“ جمو پریشان ہو گیا۔

”ہاں سب ٹھیک ہے۔“ میں نے زور سے کہا کہ آگے جا کے بھیل اور شمشاد خاں سے کہہ آئے کہ ہم بہ دیر میں اڑے واپس آئیں گے۔

ایک لمحے کے پس و پیش کے بعد زور اُلکھتا ہوا آگے آ گیا۔ ”کیا چارے ہمارا راج!“ جمو معنی خیزی سے بولا۔

”واپس چلتے ہیں جمو بھائی!“

”واپس! اب کدھر کو بھیا جی؟“

”وہیں تارا بیگم کے پاس۔“

جمو سیدھا ہو گیا اور اس نے میری کلائی پر ہاتھ ڈال کر

نہیں ٹٹولنا چاہا۔ ”ادھر اب کیا رکھا ہے میرے باب۔“

جمو کی بھنویں جھج گئیں۔ اتنی دیر میں زور اُلکھتا

”دیکھتے ہیں جمو بھائی!“ میں نے اس کی منت کی ”آؤ جلدی سے۔ ابھی سو نہیں گئی ہوگی وہ تارا بیگم۔“

”پر لاؤ۔“ جمو تیز ہو کر بولا ”ادھر“ ادھر کیا۔“

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کے اسے دھکیلا تو وہ

چپ ہو گیا اور کندھے اچکا کے ہونٹ سیکڑتا ہوا چل پڑا۔

چند ہی منٹوں میں ہم بالا خانے کی گلی میں داخل ہو گئے۔ روشنیاں مچل رہی تھیں۔ زینے کا پتلا دروازہ بھی بند تھا۔ زور کے کندھی کھٹ کھٹانے پر اوپر کا دروازہ کھلا اور تیز قدموں سے کسی کے پیڑھیاں اترنے کی آواز آئی، کوئی مرد تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے پوچھا ”کون ہے؟“

”ہم ہیں استاد شمشاد خاں کے مہمان، ابھی ابھی جو میاں سے ملنے تھے۔ تارا بیگم سے کسو، ان سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

دروازے کا ایک پٹ کھول کر اور سر نکال کے اس نے پہلے ہمارے بارے میں تسلی کی۔ وہ شخص سازندوں میں شامل تھا ”کیا بات ہے حضور؟“ گھبرائے ہوئے لمبے میں اس نے پوچھا۔

”جا کے تارا بیگم سے کسو، زیادہ وقت نہیں لیں گے۔“

میں نے نیشا بند آوازیں کہا۔

تارا بیگم بھی زینے کے اوپر دروازے پر آگئی تھی۔ اس نے متردد لمبے میں پوچھا ”کیا استاد شمشاد خاں ہیں؟ خیریت تو ہے؟“

”نہیں آپا، استاد نہیں ہیں۔ بنے خاں صاحب اور ان کے مہمان تشریف لائے ہیں۔“ سازندے نے ٹھٹکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

تارا بیگم نے کسی قدر تذبذب کے بعد سازندے کو حکم دیا کہ وہ ہمیں بے عزت اوپر لے آئے۔

کمرے کی روشنیاں جلا دی گئیں۔ ہم فرش پر بیٹھ ہوئے۔ قالین کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ تارا بیگم وہاں نہیں تھی مگر اسے باہر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس دوران میں اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ غراے اور کرتے پر سفید شال سلپتے سے اوڑھے ہوئے تھی ہونٹوں پر گلابی سرخی جی تھی۔

”آپ کو زحمت ہوئی۔“ میں نے بچپانے ہوئے کہا ”یقین تھا، ابھی آپ سو نہیں گئی ہوں گی۔“

”بندی کو خیند تھی آتی ہے۔“ اس نے بایست سے کہا ”پھر تجس سے بولی“ آپ فرمائیے زحمت تو آپ کو ہوئی، کہنے کیا حکم ہے؟“ اور میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے پوچھا۔

”کیا بیٹھنے کا چائے، قہو، شربت؟“

بازی گرا

بازی گرا

بازی گرا

بازی گرا

بازی گرا

”کچھ نہیں، آپ اطمینان سے بیٹھ جائیے۔“
”یہ کیا ہوا، قہو بننے میں کیا وقت لگے گا۔“
”خواہش نہیں ہے۔ بس آپ سے ایک بات کر کے چل رہا ہے۔“

وہ ہمارے قریب بیٹھ گئی۔ جمو، زور اور بنے خاں کی متوحش نظریں مجھ پر منڈلا رہی تھیں۔ ”بیگم صاحبہ!“ میں نے کچھ ہی آوازیں کہا ”جو بات ہم نہیں سمجھ سوجھ کے جواب دیجئے گا۔“

”اللہ خیر کرے! ایسی کیا بات ہے سرکار؟“
”ہم سودا کرنے آئے ہیں۔“ میں نے کسی لمبی تمہید سے اجتناب کیا اور اپنی آواز و جھبی رکھنے کی کوشش کی ”چاندنی بانو کا سودا! ہمیں اس کی قیمت بتائیے۔“

تارا بیگم کا عجب حال ہوا۔ سناٹا جیسے طاری ہو جائے، آنکھیں پھیل گئیں، چہرے پر ٹھنکین پڑ گئیں، ”کیا کیا فرما رہے ہیں آپ؟“ اس کی آواز بدل گئی تھی اور ہونٹ پھڑک رہے تھے۔

”دیکھئے، ہمیں زیادہ بات نہیں آتی، لاگ لپٹ تو پا لکل نہیں جو بھی قیمت آپ نے چاندنی بانو کی مقرر کی ہو، ہمیں بتائیے۔“

”آپ، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ تارا بیگم گھٹی ہوئی آواز میں بولی ”معاف کیجئے، آپ ہوش و حواس میں تو ہیں؟“

”ہم بالا خانے پر آئے ہیں بیگم صاحبہ! کچھ تاوقت ضرور ہے مگر مناسب نہیں۔ کوئی نئی بات نہیں ہے جو آپ اس قدر حیران پریشان ہو رہی ہیں۔“

”مگر تمہارے اس سے کچھ اور نہ کہا گیا۔“
”ہم سودا کرنے آئے ہیں، سودے بازی کرنے نہیں۔ اطمینان رکھیے۔“ میں نے کھل سے کہا ”ہم کی بیشی کے لیے ایک حرف نہیں کہیں گے۔“

”مگر مگر“ تارا بیگم بے بسی کے انداز میں بولی ”بندی نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا۔“

”لیکن کبھی نہ کبھی تو چاندنی بانو کو آپ سے جدا ہو جانا ہے۔ کسی نہ کسی وقت یہ مرحلہ آسکتا ہے تو آج ہی کیوں نہیں“ اور ابھی کیوں نہیں، کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ نقل از وقت گاہک خود چل کے منہ مانگی قیمت ادا کرنے آگئے ہیں۔“

”آپ کو کیا معلوم، بانو تو میرا سرمایہ، میری جائداد، میری زندگی ہے۔ اسے کسی لائق بنانے کے لیے نہ دن کو دن سمجھا

بازی گرا

بازی گرا

بازی گرا

بازی گرا

بازی گرا

”لیکن لڑکیاں تو ہر گھر سے ایک دن رخصت ہو جاتی ہیں۔ کیا آپ یہ نہیں چاہیں گی کہ چاندنی بانو اپنے گھر میں عزت اور سکون سے زندگی بسر کرے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں“ یہ زندگی نہ آپ کو پسند ہو گی نہ بانو کو۔ اسے اگر کوئی موقع مل رہا ہے تو آپ کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ اس میں آپ کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ بانو سے آئندہ جتنے فائدے کی آپ کو امید ہے اسے آپ ابھی سے وصول کر لیتے، ضرب تقسیم کر کے آپ کا کوئی گھانا نہیں ہونے دے رہے ہم۔“

”میں کیا کہوں۔“ تارا بیگم حواس باختہ سی ہو گئی اور کہنے لگی ”اچھا ہوگا، بندی کو سوچنے کی کچھ مہلت دیجئے۔“ ”کیا سوچنے کی مہلت؟“ میں نے تڑپ سی کہ ”ہمارے پاس اور کوئی وقت نہیں ہے ہو سکتا ہے، اس طرح آپ ایک اچھا طلبہ گار کیو دیں۔“ ”جی جی ہاں، ہو سکتا ہے لیکن صرف قیمت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی جناب!“ تارا بیگم بے اعتنائی سے بولی ”ادھر ادھر بھی تو کچھ سونپا دیکھنا پڑتا ہے پھر پانے سے بھی مشورہ کرنا ضروری ہے۔“

”تو ابوں کے حال سے تو آپ ہم سے زیادہ واقف ہوں
گئی۔ بانو کو محل ضرور مل جائے گا، غالیے، فانوس، باندیاں،
شان و شوکت، پردہ، آرائش کی کوئی چیز بن جائے گی۔ عینک تو
شاید وہ نہ بن سکے، ہم آپ کو صاف بتادیں، ہم اسے کسی
محل، محلہ، دروغہ میں، جس کے لے حاسن گئے، بس ایک عام سے

”کوئی بھی! اسے افشا کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے،
 بہر حال ٹھیک ہے۔ آپ کی تسلی کے لیے کوئی مضائقہ بھی
 نہیں۔ ہم بے خاں کے لیے چاندنی کو مانگ رہے ہیں۔“
 بے خاں نے آنکھیں میچھنی لیں اور زور سے سیرا بازو پکڑ
 کر سر جھٹکنے لگا۔ میں نے اس کی پٹنڈی دبا کے خاموش رہنے کی
 تلقین کی۔

”اور کوئی پیچیدگی ہو تو بتائیے؟“ اپنے لیے مجھے میں بکری
مجھے خود گراں گزری، سو میں نے توقف کیا اور نری سے کہا
”بانو کی آئندہ زندگی کے لیے ’بلور مر‘ بنے خاں ایک ایسی
جائداد بھی لکھ سکتے ہیں جس کی معقول آمدنی مستحقہ بانو کی
تحویل میں اور تصرف میں رہے اور کوئی بات؟“ میں نے بانو
بیکرم سے پوچھا۔

”ہمیں بھی اندازہ ہے لیکن یہ سمجھئے، اب دھوکوں کے خاتمے کا دن آگیا ہے، سارے امتحان ختم ہوا چاہتے ہیں۔ جانتے ہیں، آپ کا تردد بہت فطری ہے۔ ہمارا مطالبہ درخواست، کچھ بھی کہئے بہت اچانک ہے، اور ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ ہم کسی راج سنگھاسن سے نہیں، اذ-کی چوکی سے اٹھ کے آئے ہیں۔ نوابوں کو آپ نے بہت آزمایا اب کچھ نئی کوجوں والوں کا بھی تجربہ کر لیجئے۔ ہم رعایت کے لیے آپ سے نہیں کہہ رہے، یکدم صاحب! آہ! قیمت بتائے۔“

48

ساری مہنتیں دھری رہ جاتی ہیں۔" "تو تیری گنجائش تو تقدیر کے ہزار ہی ہزار ہے،" عورتیں غریب تو تقدیر کے معاملے میں دیوے ہی ہوتی ہے اور کیا آقا کا غلام۔ کیا راجا، کیا پرامن، تو بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اپنا تو یہ دیکھا ہوا ہے۔ دریا میں طغیانی آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔ بنے خاں کا سمندر بھی کل اتر چکا ہے۔"

نارا ایک مکس کش میں بڑگئی۔ دیر ہوگئی، وہ کچھ نہ بولی تو
جروے لگزی ہوئی آواز میں کہا "تسا سوئے کو کیا ہے تارا
بیکم! ایسے کا کب کدھر آتے ہیں۔ سمجھو قسمت کی بات
ہے اب کیا اجازت ہے۔ سارا کچھ ہم نے تم پر رکھا ہے۔ فنا
فٹ فیصلہ کرنا، محل کے بولوں۔"
"کیا بولوں۔" نارا بیکر بیکانی لہجے میں بولی "آب ہے"

”کیوں؟“ ہر نے تو کھلی چھوٹ دی ہے تم کو۔“ جھرو نے تاراضی سے کہا۔ ”بے فکری سے زبان کھولو۔“

”مارا بیٹے کے ہونٹ لرز رہے تھے۔“

”پھر بھی کچھ بولیں، پچاس ہزار ایک لاکھ!“

”دوا لاکھ۔“ میں نے غلت غلت اضافہ کیا۔

تارا بیگم نے دو توں ہاتھوں سے اپنا چروچھا لیا۔
 ”یہ کیا کیا ہو رہا ہے، تمہیں نہیں“ بے خاں ہدائی
 انداز میں بولا اور اٹھ جانے کے لیے مجھے جھنجھوڑنے لگا۔ میں
 نے اٹھ کے اشارے سے کسی رمز کو کیا یہ کا تاثر دیا اور بے
 خاں سے چپ چاپ بیٹھنے رہنے کو کہا۔ سب کچھ صاف تھا۔
 بے خاں جیسا شخص اس طرح کیسے مان جاتا۔ وہ بگڑنے لگا اور

بازیگر 6

”اب کیا ہے؟“ جبرو نے ترخ کے کہا۔
 ”کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔“ نارا ابیکم ہڑبا کر بولی۔
 کل دو خون ہو گئے ہیں آگے دو چار اور بھی لوٹ سکتے
 ہیں۔“ جبرو نے منہ لگا کر کہا ”کیا سمجھتی ہو، کل سے شرمیں
 ہل چکا ہوا ہے سارے میں آگ لگی ہے۔“

”پھر ماں کی طرح سوچو، اپنا نوشہ بھی ہزاروں میں ایک ہے۔“

”جھوٹے بنے خاں کی ران پر ہاتھ مار کے کہا ”پورا اصل ہے۔“

”جانتی ہوں خدا انظرید سے بچائے۔“ تارا بیگم کے لہجے میں مصنوعی شیدائیت تھی ”ہزاروں میں کیا“ لاکھوں میں کہنے۔“

”لیکن یہ تو زندگی بھر کا معاملہ ہے۔“
 ”سوچ لو، لکشمی بار بار گھر نہیں آتی۔“
 ”کچھ وقت تو رہیجئے۔“
 ”چھ وقت نکل نہ جائے۔“
 ماما نے جھڑک کر کہا، ”آج ابھی سولہ بجھا، کتنا وقت۔“

میں نے کہا: ”جبرو کو روکا، اور مارا، تیرم سے پوچھا سنا وقت
میں کی آپ۔“
”بندی اس وقت کیا کہہ سکتی ہے۔“
”میں کل میاں سے چلے جاتا ہے۔“
”اور کل کا بھانڈا پھر کل ہی دیکھیں گے۔“ جبرو نے پھر
کہا۔

”بندی ایک بات پوچھنے کی جسارت کرے۔“ تارا بیگم

کتابیات چلی کیشنز

انک ایک کے بولی "آپ کے خیال میں بندی کو بانو پر کتنا اختیار ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟" جمرو نے چونک کے کہا۔
"میرا مطلب ہے، کتنا اختیار ہونا چاہیے۔" تارا بیگم نے وضاحت کی اور تورا کے بولی "بندی کو انکار کا اختیار ہے؟"

"نہیں، کتنا اختیار ہے جو بولی ہو تارا بیگم! پھر تم سے اتنا سرمانے کی کیا ضرورت تھی۔"
"ہاں، آپ انکار کر سکتی ہیں۔" میں نے جمرو سے مضبوطی کی التجائی اور تارا بیگم سے کہا "انکار کا کوئی جواب تو ہو گا۔"

"جتنا ضروری تو نہیں ہے سرکار!"
"لیکن وجہ جانے بغیر شاید ہم یہاں سے نہ جائیں۔"

میں نے درخت سے کہا۔
"کیا اتنا کافی نہیں کہ بندی ابھی بانو کو خود سے جدا کرنا نہیں چاہتی۔"

"ہاں، مجھ سے کوئی جواب نہ بن رہا اور میں نے جبر ہو کے کہا "ٹھیک ہے، پھر ہم آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔"
"نہیں تارا بیگم! ایسے نہیں، بالکل نہیں۔" جمرو جھپٹی آواز میں بولا "ہم چاہیں گے، پھر کوئی اور بات ہے، تم ہم لوگوں سے سودا کرنا نہیں چاہیں۔ تم کو بول دیں کسی بھی طرح سے ہم آگے تھے پھر بولی نہیں لگاتے اور طریقے بھی ہم کو آتے ہیں، ہمیں!"

"جس لیے میں آپ نے بات کی ہے، بس اسی تک رکھیے استاد! تارا بیگم کی آواز میں برہمی کی لہر نہ نمایاں تھی۔

"تم بھی صاف بات نہیں کر رہی ہو، اس واسطے ایسا بولتے ہیں۔" جمرو نے پھر کے کہا "میں میں کوئی شک ہو تو انکل باہر کرنا تارا بیگم! ایک بات پر دھیان رکھنا۔ جو اتنی بڑی ذہیر چلا رہا ہے وہ اس چیز کو جیسی تم سے زیادہ سنبھال کے سینت کے رکھے گا۔"

تارا بیگم سستی رہی۔ ادھر بنے خاں مسلسل بیچ و تاب کھا رہا تھا "شہزادے بھی کچھ کہا چاہتے ہیں؟" تارا بیگم نے نظر اُمیر لے کر بولی "میں نے خاں کو کھلائے ہوئے انداز میں

"میں میں کیا؟" نے خاں کو کھلائے ہوئے انداز میں ہاتھ پھیلا کر رہ گیا اور خالی خالی نظروں سے میری اور جمرو کی شکلیں دیکھنے لگا۔
"استاد بنے کے بولنے کو اب کیا دھرا ہے تارا بیگم!"

جمرو نے زہریلی آواز میں کہا "بولی بڑھوانے کا خیال ہو تو صاف بول دیو۔ تم کو ہم سے زیادہ پتا ہے کہ اب نیلا کی کا زانہ نہیں ہے اور کھنڈ کے راجوں نو ابوں میں کتنا دم ہے۔ کوئی باپ دادا کی جاگیر کے پیچھے پڑا ہے تو نیشنل لوہ مل جائے تو ایک بار اس حاکم کی اولاد کا دیدار اپنے کو ضرور کروا دینا۔"

تارا بیگم بے حس و حرکت جھنجھی رہی۔
جمرو کے اشارے پر ہم سب اٹھ گئے۔
تارا بیگم کو ہمارے اس طرح اٹھ جانے کی توقع نہیں تھی۔ وہ بے تاب ہو گئی "آپ آپ جا رہے ہیں؟"
"جانا ہی ٹھیک ہے۔" دروازے کی طرف جاتے جاتے جمرو نے لوٹ کے کہا "پنا بھیجا جلدی گھوم جانا ہے۔"

"لیک، لیکن یہ کیا۔ نہ شربت نہ قہوہ نہ۔ کم سے کم ایک گوری تو۔"

"آئیں گے پھر، دیکھو شاید جلدی۔" جمرو نے ہم بھانے ہوئے کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
زینے سے اترتے ہی بنے خاں ہم دونوں سے چٹ گیا۔
"کی سانس اٹھڑی ہوئی تھیں۔ بری طرح وہ اپنا سر میرے سینے سے رگڑنے لگا۔ اور تارا بیگم کے بالا خانے۔
درپچوں، چٹنوں سے ہم اوچھل نہیں ہوئے تھے۔ جمرو کسی طرح بنے کو سنبھالا اور اس کا بازو پکڑ کے تقریباً کھینچا بالا خانے سے دور لے گیا۔ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے کھلی سے نکل آئے روشنیاں اور کم ہو گئی تھیں۔ کسی بالا خانے پر ابھی تک محفل جی ہوئی تھی۔ اکا دکا کانیر کھلی تھیں۔ بازار سے نکلتے ہی پان کی پکلی دکان پر زورا گیا اور جب سب کی نظریں بے اختیار بنے خاں کے چہرے پر جا اٹھیں۔ دکان کی تیز روشنی میں اس کے چہرے کی آگ

نمایاں ہو گئی۔ زورا سے گدگدائے لگا۔ بنے خاں کی آنکھیں ڈھنڈھائی ہوئی تھیں، ہونٹ سسک رہے تھے۔
نے جانے کیا کہا تھا کہ بنے خاں بے تحاشا میرے سینے لگ کے ہڑکنے لگا۔ یہ محض ممنونیت کا اظہار نہیں تھا۔ اپنے احوال سے خود بھی واقف نہیں ہوتا۔ بنے خاں وحشت یقیناً کسی گزشتہ کا غبار تھی۔ ہر آدمی فسانے چ پھرتا ہے، جیسی ایک شکار، ہوا کا ایک جھونکا آکھینے۔ گراں ہو جاتا ہے۔ پان والا بھی گنگ ہو گیا تھا۔ ج زورا، بنے خاں کو تھپکنے، تسلیاں دینے لگے۔ بہت مشا انہوں نے اسے قابو میں کیا۔ تاہم قریب ہی کھڑ گھوڑیاں ساتھ لے کے ہم نے تیزی سے نائے کارش اڑے پر ت جگے کا مظہر تھا۔ رنگ برنگی جھنڈا

بازر

ساری کھلی جی ہوئی تھی۔ اڑے کی عمارت کی دیواروں اور منڈیروں پر چراغ روشن تھے۔ عمارت کے باہر اور اندر خاصی تعداد میں لوگ انتظامات میں مصروف تھے۔ دیکھا استاد! جمرو نے بنے خاں کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "ایسا میلہ تو اپنے استاد بھٹل کے واں جی نہیں ہوتا۔"

بنے خاں نے کوئی جواب نہیں دیا تو جمرو نے پکارا "ہوئے کہا" "بس ابھی سارا بھول کے راجا بن کے گدی پر سنبھالو۔ بعد کو ادھر کو دیکھیں گے۔ سنا ہے، لیکن خاں کے بعد اڑے پر بہت اٹا سیدھا ہوا ہے۔ کئی حرام کے بنے متانے لگے ہیں۔"

بنے خاں کی خاموشی پر جمرو نے اسے کہنی ماری "ایسا کیا استاد! بولی سسری کیوں بند ہو گئی، اب ادھر سے لوٹ آؤ بیجا جی! دیکھنا، تارا بیگم کو آج نہیں توکل بلانا ہے۔ ادھر کی بات ایک دم بکی سمجھو۔"

یہ وقت تمام بنے خاں نے پڑھو گئی سے کہا "نہیں جمرو بھائی! یہ تو اچھا ہی ہوا" اس نے منع کر دیا۔ میں تو۔ میں تو۔" اس کی آواز مطلق میں پھنسنے لگی۔ کہنے لگا "بس اتنا، اتنا بہت ہے۔"

بنے خاں نے ایک نظر میری طرف دیکھا، کچھ کتنا چاہا مگر کہ نہ سکا، سر جھٹکے ہوئے آگے چوکی کی طرف چلا گیا۔ شمشاد خاں اور بھٹل اڑے کے کئی آدمیوں کے جھوم میں چوکی پر بیٹھے تھے۔ کچھ وقت ان کے ساتھ گزار کے ہم اوپر چلے آئے کمرے میں داخل ہوتے ہی زورا اور جمرو نے مجھے دبوچ لیا اور میرے ہاتھ اور پیشانی چومنے لگے۔ وہ تو جیسے اس خلوت کے خنجر تھے مجھے ان کی دیوانگی کا سبب معلوم تھا۔ ان کی شدت کم کرنے کے لیے یہی مناسب تھا کہ میں ان سے کسی ندامت اور انکار کا اظہار نہ کروں۔ یہی ہوا۔ جلدی انہیں قرار آیا۔ ان سے نجات ملی تھی کہ کچھ ہی دیر میں بنے خاں کمرے میں آگیا۔ دیوانگی کے آثار ابھی تک اس کے چہرے پر کھڑے ہوئے تھے، میرے پاؤں پکڑ کے کہنے لگا کہ تارا بیگم کی طرف سے اقرار میں جواب آئے تو میں بے درستی مسرور گردن میں نے پوچھا "آخر کیوں؟"

میں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے، ہم زبان دے کے آئے ہیں۔ بنے خاں کو یاد تھا کہ جمرو نے تارا بیگم پر اچھی طرح واضح کر دیا تھا، ہج کی بولی آج پر ہے۔ کل کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میں نے کہا۔ اگر تارا بیگم مان جاتی ہے تو آج اور کل سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بات تو اصل میں جمرو

بانڈی گھر [6]

نے تارا بیگم پر زور ڈالنے کے لیے کسی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ آدمی کی قیمت ہر رقم سے زیادہ ہوتی ہے۔ آدمی کا تو کوئی مول ہی نہیں ہوتا اور وہ تو چاندنی بانو ہے۔ اس رقم سے کوئی مصروف یا بت تراش چاندنی بانو کا بیکر نہیں تراش سکتا۔ بنے خاں سنا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے محض رقم کی فکر ہے؟ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے بتائے، کیا چاندنی اسے مطلوب نہیں؟ یہ محض اتفاق ہے کہ اس کے بجائے میں بولی لگانے پر قادر ہوں۔ میں نے طرح طرح سے بنے خاں کا کندہ دور کرنے، اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس رقم کے پتلے جانے سے میں تلاش نہیں ہو جاؤں گا اور مجھے یوں بھی روپے پیسے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ بنے خاں نے بہت پہلو بدلے، انگلیاں توڑتا، ہونٹ چباتا رہا۔ ادھر جمرو اور زورا نے دلیلیں تراشی شروع کر دی تھیں۔ بنے خاں شش و پنج کی حالت میں واپس چلا گیا۔

○●○

صبح سب کی آنکھ دیر سے کھلی۔ ناشتے ہی کا وقت ملا، پھر بنے خاں کی چوکی پر بیٹھنے کی رسم ادا کرنے کا سہ آہنچا۔ ہم تینوں نیچے آئے۔ عمارت میں مل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہر سو شور گونج رہا تھا۔ سامنے چوکی کے ایک طرف مٹھالی اور پھولوں کی ٹوکریاں رکھی تھیں۔ لوہان اور اگر تیروں کی خوشبو ساری عمارت میں بسی ہوئی تھی۔ چوکی پر شمشاد خاں اور بھٹل کے درمیان چکن کے سفید کرتے، پاجامے، مٹالی واسٹ میں ملبوس بنے خاں، سر پہ گھروے رنگ کا صاف باندھے بیٹھا تھا، گلے میں سونے کی زنجیر کان میں دیا ہاتھ میں چاندی کا کڑا، کمرے کے گرد منتش چری چینی برات کے دولہا جیسا، صرف شیروانی کی کسر تھی۔ چہرے پر ابھی تک آگ دیک رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کے کچھ مضطرب ہو گیا۔ ہمارے پچھنے کی دیر تھی کہ شمشاد خاں نے بھٹل سے جلدی کی درخواست کی۔ سورج خوب چڑھ چکا تھا، زوال کے بعد کھنڈو میں چوکی نشینی کی رسم معیوب سمجھی جاتی تھی۔

بھٹل کے سامنے رکھی ہوئی گوری ہانڈی میں دودھ بھرا تھا، ہانڈی کے اطراف دو عدد کھنڈ رکھے تھے۔ ہانڈی سے دودھ لوٹ کے بھٹل کو پہلے شمشاد خاں کی طرف کھنڈ بڑھانا تھا، پھر شاید ایک گھونٹ بھر کے بنے خاں کے سپرد کر دینا تھا۔ ایک دو گھونٹ پی کے بنے خاں کو کھنڈ کا دودھ ہانڈی میں لوٹ دینا تھا پھر ہانڈی کا دودھ مختلف جگہوں پر رکھے ہوئے شربت سے بھرے بڑے بڑے برتنوں میں شامل کیا جاتا تھا۔ یہ شربت سارے صبح میں تقسیم ہوتا تھا لیکن شربت کی تقسیم سے پہلے

کتابیات پبلی کیشنز

بنے خاں کو اپنا چاقو شمشاد خاں کے پیروں پر رکھنا تھا، جواب میں شمشاد خاں کو اپنا چاقو بنے خاں کے حوالے کرنا تھا۔ سلگتے ہوئے لوہاں کے برتن میں لوہے کی ایک سلاخ بھی نظر آ رہی تھی۔ ممکن تھا کہ اس جلتی ہوئی سلاخ سے بنے خاں کے بازو یا گردن پر داغ ڈالا جائے شمشاد خاں اور بھٹل کو اپنے خون سے بنے خاں کو تنگ لگانے کی رسم بھی انجام دینی تھی۔ اس کے جواب میں بنے خاں کو کوئی ٹس کھول کر اپنا خون لوہاں کے برتن میں پٹکا تھا۔ مختلف جگہوں پر چوکی سنبھالنے کی اپنی اپنی رسمیں ہوتی تھیں۔ بکوس کا صدقہ، 'لنگ' امام خاصن و غیرہ کسی جگہ اڑے کے ہر آدمی کی طرف سے چوکی کے دادا کی خدمت میں نقدی کے علاوہ خون کی نذر بھی پیش کی جاتی تھی۔ لکھنؤ کی بات تو ویسے بھی جدا گانہ تھی۔ مجھے کچھ زیادہ علم نہیں تھا کہ یہاں اور کیا کیا رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔

عمارت میں خاموشی چھا گئی تھی۔ بھٹل نے ہانڈی سے دودھ لوٹ کے کھڑے شمشاد خاں کی طرف بڑھایا، شمشاد خاں نے ایک گھونٹ بھر کے بھٹل کرواہیں کر دیا۔ بھٹل نے بھی گھونٹ بھر دودھ پیا اور کھڑے بنے خاں کے سپرد کیا ہی چاہتا تھا کہ اس کا ہاتھ ٹھہر گیا۔ اسی دم دائیں طرف چوکی سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر ایک پتہ قد کے پھنے چہرے کے آدمی نے کھڑے ہو کے بلند آواز میں بھٹل اور شمشاد خاں کو مخاطب کیا اور انہیں یاد دلایا کہ وہ ایک اہم رسم کی ادائی سے کوتاہی کر رہے ہیں۔ انہیں عمارت میں موجود لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ کوئی دوسرا تو اڑے کی چوکی کا طلب گار نہیں ہے؟

لڑکاک ہر طرف شور مچتے لگا۔ شمشاد خاں ہلکے لگا۔ "کیا، کیا! ایسی بات کرتا ہے خنزیر کی اولاد! کیا تو چوکی پر آنا چاہتا ہے؟ مجھ کو۔۔۔ مجھ کو۔۔۔" شمشاد خاں کے جملے پر عمارت میں قہقہے کو گونجنے لگے۔

وہ شخص نہیں بیٹھا، کسی قدر کھیا کر بولا "میں تو ریت کی بات کرتا ہوں استاد!"

شمشاد خاں کی گالی گفتاری عمارت میں اٹھنے والے شور میں گم ہو گئی۔

بھٹل نے ہاتھ اٹھا کے سب کو خاموش کیا اور ادنیٰ آواز میں کہا "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ابھی کوئی بنے خاں کی جگہ اڑے کی چوکی واسطے اپنے آپ کو آگے کرتا ہے تو بول دے۔"

شمشاد خاں کی ناراضگی اس لمحے پر اگندگی اور حیرانی

سے دو چار ہوئی جب ٹوکنے والے آدمی کے قریب بیٹھا ہوا سانولی رخت اوسط قد، سکل دست، دباؤ کا ایک پختہ کار نوجوان کھڑا ہوا، سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں، عمارت میں سنا ہوا "تو تو اپنا رجن!" شمشاد خاں پھیل ہوئی آنکھوں سے بولا "کیا بات ہے؟ اب تجھ کو بھی مستی سو جی ہے؟"

بھٹل نے مسکراتے ہوئے شمشاد خاں کو قتل سے بچنے رہنے کو کہا اور رجن نامی نوجوان سے پوچھا "تو ادھر ہی بیٹھا چاہتا ہے رہے۔"

رجن نے کچھ کہنے کے بجائے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کا سینہ آگے کو نکلا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں گہری چمک تھی۔

"ٹھیک ہے۔" چند لمحوں کے سکوت کے بعد بھٹل نے آہستگی سے کہا اور بنے خاں کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"اچھی طرح سوچ لے رجن! بولتا ہوں" اندر جا کے ایک بار بیشہ دیکھ لے۔" شمشاد خاں کی آواز میں ہمت تھی۔ "یہ معزنی ہمت منگی بڑے کی تجھ کو ایمان ہے۔"

رجن نے شمشاد خاں کی بات سنی ان سنی کر دی۔ شمشاد خاں سے برداشت نہیں ہوا، مشتعل ہو کے بولا "کیا منہ سوک گیا تھا تیرا یا تیرے کے تھا ہے؟"

بھٹل نے آنکھوں آنکھوں میں شمشاد خاں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اب اس غیظ و غضب سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

رجن سر اٹھائے، سینہ بھلائے کھڑا رہا۔

بھٹل کے حکم پر چوکی کے سامنے کا حصہ خالی کر دیا گیا۔ جگہ پہلے ہی ہمت تنگ تھی۔ لوگوں کے پیچھے بننے سے اجترک سی ہو گئی لیکن جلد ہی سکون ہو گیا۔ بنے خاں نے صاف ادا دیا اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا چاقو اچھالتا ہوا خالی ہونے والے دائرے میں اٹھیا اور دوسری جانب سے رجن بھی آگے بنے خاں کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

عمارت میں سب ہی کی سانسیں جیسے رک گئی تھیں شمشاد خاں چوکی کے کنارے پر آ گیا۔ وہ مسلسل ذریعہ بھٹکار رہا تھا۔ بھٹل بھی اپنی جگہ سے اٹھ کے شمشاد خاں کے برابر بیٹھ گیا۔

بنے خاں کی تھلید میں رجن نے بھی اپنا چاقو بھٹل آگے کر دیا۔ بھٹل نے دونوں چاقو ایک نظر کیے اور رجن کی طرف پھر بنے خاں کی طرف اچھال دیے۔ دونوں نے چابک دستی سے چاقو اچک لیے۔

"بول ہوں مان جاؤ گے روای بات نہ ہو جائے سالے۔" شمشاد خاں نے دہاڑتے ہوئے رجن کو تنبیہ کی۔ رجن کی بے اعتنائی پر شمشاد خاں تھلا کے گیا۔

بنے خاں اور رجن نے روایتی انداز میں دائرے کا ایک پکر پور اٹھیا اور دونوں نے ٹھہر کے خوں بار نظروں سے ایک دوسرے کا جائزہ لیا۔ رجن ہاتھ ملانا چاہتا تھا لیکن بنے خاں نے توجہ نہیں دی اور چاقو لٹا ہوا دو قدم آگے بڑھ گیا۔ اس کی چستی سے میری طرح جرمو اور زورا کو بھی اطمینان ہوا۔ رجن نے بنے خاں کے مقابلے میں احتیاط کا ثبوت دیا۔ لہہ کسی حد تک جھجک گیا۔ بنے خاں آہستہ آہستہ فاصلہ کم کرنا دیا اس کے قریب پہنچ گیا اور اس نے آگے آگے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چاقو بدل کے اپنی برتری کی دھماکا بھٹانا پائی۔ رجن اس کے پھلے ہوئے بازوؤں کے نرنے سے پہلو باک کے دوسری طرف ہو گیا۔ بنے خاں نے بھی پیش قدمی اری رکھی اور دوبارہ گھبراہٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جن غالباً یہی چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ بنے خاں ارد گرد س کے پیچھے بنے کے لیے کوئی جگہ نہ چھوڑے اور دائیں میں لٹنے کی کوئی گنجائش نہ رہے، اس نے اپنی گزشتہ روش ک کی اور پھرتی سے اچھل کے بنے خاں سے مذہمیز کی ان لے۔

دونوں کے درمیان ہمت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ بنے خاں نے غلط اندازہ لگایا تھا، اس کا خیال تھا کہ رجن کو وہ اور پیچھے م کی طرف لے جائے گا۔ رجن کے اس اچانک اقدام کا یہ بنے خاں کے لیے ممکن ہو سکتا تھا۔ وہ اتنی جلدی اٹلے مول پیچھے نہیں ہو سکتا تھا حالانکہ اس کے عقب میں دائرہ لی پڑا تھا۔ بس بنے خاں کا داغ ایک سو تھا، یکا یک وہ بیٹھ با۔ اب اسے بڑی تن دی سے کام لینا تھا، اس کے ہاتھ ان کی انگلیوں کی طرف بڑھے، انگلیں گرفت میں آجائے کی رت میں رجن کا توازن بگڑ جانا لازم تھا۔ اسے مجمع کی سب پیٹھ کے بل کرنا چاہیے تھا مگر رجن کو کچھ اس اندیشے احساس تھا۔ اس نے خواہش جمع رکھے اور جست کے از میں بیٹھے ہوئے بنے خاں کا جسم پھلانگ لیا۔ اپنی تک میں وہ گرے کرتے بچا اور آگے ہی بڑھتا گیا۔ اگر بس رک کے اور پلٹ کے بنے خاں پر وار کرنے کا ارادہ کے سر میں سما جاتا تو اسے مملکت نہ ملتی کیوں کہ اس اثنا اپنے خاں کھڑا ہو چکا تھا اور اس کا سر رجن کی طرف تھا۔ بنے خاں نے بس ایک لمحے کا توقف کیا ہوگا کہ بجلی کے پھر اسی طرف بڑھا۔ رجن بھی پر قول چکا تھا۔ دائرہ اتنا بڑا

ی گریہ [6]

نہیں تھا۔ دونوں کو دوپہ دو ہونے میں چشم زدن کا عرصہ لگا لیکن قریب آگے کوئی داؤہ آزمائے کے بجائے رجن پھر جھکا کر دے کے نکل گیا۔ کیا ہراس نے یہ کیا سامنے ہو کر ایک دم کسی جانب نکل جاتا۔ اس صورت حال سے دیکھنے والوں کا یہی تاثر ہونا چاہیے تھا کہ رجن پر اپنی کم تر کی کوئی احساس غالب ہے، اس نے نادانی میں بنے خاں سے نیرو آزمائی کا دعوا کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے، بعض لوگ اسے بنے خاں اور رجن کی ادنیٰ بدلی ملی بھگت بھی سمجھ رہے ہوں۔ یہ بدگمانی بہر حال زیادہ دیر قائم رہنے والی نہیں تھی۔ ابھی تک یہی کہا جاسکتا تھا کہ رجن سامنے کے داؤ سے پہلو جی کر رہا ہے اور کسی ایک موقع کی تلاش میں ہے اور بنے خاں کو مشتعل کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے یا اسے بنے خاں کی کسی کم زوری کا علم ہے اسے اپنی اشتقامت کی کوئی خوش فہمی ہے اور وہ بنے خاں کو پہلے خوب تھکا دینا چاہتا ہے۔ اس طوالت سے رجن کو ایک اور فائدہ بھی تھا کہ چشم دید گاہ شاہد رہیں، اس نے یہ معرکہ کسی فریب سے سر نہیں کیا ہے، مقابلہ تو اس ناتواں نے خوب کیا ہے۔ اس طوالت میں بنے خاں کی توہین کا پہلو بھی مضمر تھا۔

عمارت میں گاہے بہ گاہے بے چینی کی گھن گھناہٹ ہوتی اور خاموشی چھا جاتی۔ بنے خاں کی پیشانی پر رجن کی اس آنکھ چوکی سے ٹکلیں پڑنے لگی تھیں۔ اسے بھی رجن کے کس بل سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے تھا۔ دونوں ایک ہی اڑے سے وابستہ تھے، عمر میں بھی کوئی ایسا فرق نہیں تھا۔ کمین خاں اور شمشاد خاں کی تربیت سے رجن نے بھی استفادہ کیا ہوگا۔ یہ کلیہ بنے خاں کو اچھی طرح ذہن نشین ہوگا کہ ناچنے کا مقابلہ پر ذرا سی رعایت واجب نہیں اور دو فریقوں میں ایک کو فتح ہوتی ہے، دوسرے کو شکست۔ دونوں کے پاس چاقو تھا۔ ہتھیار سمیت زور اور سادے زور میں فرق ہے۔ ہتھیار کبھی کبھی بیک بھی جاتا ہے۔ ذرا سی کو تابی ہو جائے تو بس! ضروری نہیں کہ ازالے کا وقت مل جائے۔

رجن کی پھرتی کسی طور پر بنے خاں سے کم نہیں تھی۔ وہ بنے خاں کو ادھر سے ادھر کھٹانا رہا۔ بنے خاں نے ہر پار ہوش مندی کی۔ اسے معلوم ہوگا کہ حرف کسی بھی لمحے ارادہ بدل سکتا ہے اور یہی ہوا۔ رجن نے سامنے آگے کسی طرف نکل جانے کا تماشا نہیں کیا بلکہ پھیل دے کے بنے خاں کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی پر پچھو ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ اچانک جھپٹ پڑا تھا۔ بنے خاں نے زیادہ مزاحمت نہیں کی اور اپنی کلائی رجن کے پنجے میں آسانی سے تھما دی جیسے جان

کتابیات پبلی کیشنز

بوہ کے رجن کو اندازہ تھا کہ جو اپنے خاں اس کے چاقو والے ہاتھ پر بچہ ڈالنے کے لیے مضطرب ہوگا۔ چنانچہ جسم ترچھا کر کے اس نے چاقو والا ہاتھ دوسری طرف پھیرا لیا۔ ایک ہاتھ مخالف سمت پھیرا کے دوسرے ہاتھ سے مقابل کا چاقو والا ہاتھ قبضے میں رکھنے کے لیے بڑی مشاقی اور زور کی ضرورت پڑتی ہے۔ رجن کے بچے میں جیسے ہی بنے خاں کی کلائی آئی وہ کلائی کو جھکا دینے کے لیے زمین سے اٹھ چلا گیا۔ دوسری جانب بنے خاں نے اسی وقت اپنا دوسرا ہاتھ رجن کے قریب کیا۔ یہ ایک اضطراری اقدام بھی تھا لیکن اس کا ارادہ رجن کے چاقو والے ہاتھ پر قبضہ کرنے کا نہیں تھا۔ رجن کا پھیلا ہوا ہاتھ اس کی پہنچ سے دور تھا۔ اس کے لیے اسے تیزی سے محوم جانا چاہیے تھا۔ وہ بے بھی کر سکتا تھا کہ اپنا ہاتھ رجن کے بچے سے چمڑانے کی کوشش میں کھینچا تانی جباری رکھے اور ساتھ ہی چکر کھانے شروع کر دے۔ فریق وہیں گھبرا جاتا ہے جب جواب اس کی توقع کے برعکس ہو۔ رجن اڑھ بنے خاں کی کھینچا تانی سے اس کی کلائی پر اپنے بچے کی گرفت اور مضبوط کرتا، اڑھ اپنا چاقو والا ہاتھ بنے خاں کی دسترس سے بچانے کے لیے بنے خاں کے ساتھ گھومتا رہتا اور یا تو کسی ناگامی کے اندیشے میں بنے خاں کا ہاتھ آزاد کر دیتا یا دوسرے تیسرے چکر میں اچانک ٹھہر کے اپنا چاقو والا ہاتھ آگے کر دیتا دوسرے لفظوں میں گھومتے گھومتے دھنسا بنے خاں سے بھڑ جاتا۔ بنے خاں نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ اس نے گھوم کے رجن کا چاقو والا ہاتھ قبضے میں لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے رجن کی ٹھوڑی کو نشانہ بنایا۔ رجن سے ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ اس کے اچھلتے ہی بنے خاں نے اس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ غلٹ میں ضرب چمکتی ہوئی گئی۔ رجن نے بنے خاں کا ارادہ بھانپ کے فوراً ہی اس کی کلائی چھوڑ دی اور بنے خاں کے سامنے اپنا چاقو والا ہاتھ لیرایا۔ بنے خاں کو اس افتاد کی وجہ سے قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ ضرب سے رجن کا توازن بگڑ سکتا تھا لیکن وہ فاصلہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دونوں دوبارہ دور جا کھڑے ہوئے۔

بنے خاں نے اب اتنی جلدی نہیں کی۔ ابتدا میں تیزی کا مطلب مقابل کو دباؤ میں رکھنا ہوتا ہے۔ بنے خاں کی سرخ روئی اسی میں تھی کہ وہ جلد از جلد یہ معاملہ نمادے۔ رجن کو اتنی نہیں ہوئی جتنی بنے خاں کو اپنی عزت کی فکر ہوگی۔ ابتدا میں تیزی کا سبب غم و غصہ بھی ہوگا۔ عین وقت پر یہ رخ انداز ہی بڑی نازبا بھی۔ شمشاد خاں اور اڑے کے بہت

سے لوگوں کے سامان و گمان میں نہ ہوگا کہ ان کے اڑے کا ایک آدمی اس طرح چوکی کی دعوے داری کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا۔ اڑوں پر عموماً ایسا ہوتا نہیں۔ دونوں سے انتظامات ہو رہے تھے۔ لوگ ہمارے آنے سے پہلے بھی جی بکھیٹتے تھے اور دلچسپ رہے تھے کہ شمشاد خاں، لیکن خاں مرحوم کی جانشینی کے لیے بنے خاں کو تیار کر رہا ہے۔ تیاری صرف بل کی نہیں ہوتی۔ بل بے شک بہت بنیادی چیز ہے لیکن اصل بل تو داغ کا ہوتا ہے۔ داغ متناسب نہ ہو تو دست و بازو کی طاقت میں بھی آدمی کو کھرا ہونا چاہیے۔ لوگوں کو قابو میں رکھنے، مشکل وقت پر مناسب فیصلہ کرنے اور اڑے پر بل اور ہتھکاری تربیت کا کام آسان نہیں ہوتا۔ اثر و رسوخ، سب کا خیال ہوتا ہے۔ لیکن خاں کے بعد شمشاد خاں اسی لیے اڑے پر آئے تھے۔ بیٹھا تھا۔ اب اگر اڑے کے برگزیدہ استاد کی خواہش یہی تھی اور بات طے ہو چکی تھی تو اڑے کے تمام لوگوں کو اس کا احرام کرنا چاہیے تھا۔ کم سے کم کچھ عرصے کے لیے بنے خاں کے جوہر اڑانے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ نا اہل استاد دیے بھی کتنی دیر تک برقرار رہ سکتا ہے۔

اڑے کے کئی آدمی بل میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کے ہو سکتے ہیں مگر چوکی پر بھی تو نہیں بیٹھ سکتے۔ باقی سال زور والے ایک مرتبہ کسی کو چوکی پر بیٹھا کے اسی کو واجب عزت سمجھتے ہیں۔ آج کا پختہ کار آدمی محنت اور بوجھ اور زور آزمائی کی مسلسل مشق سے کل کسی لائق ہو سکتا ہے تو اسے سینہ پھلا کے چوکی کا دعوے دار ہو جانا چاہیے۔ مگر ہے، اڑے کے چند لوگ بنے خاں کو تاپندہ کرتے ہوں اور اس کی جگہ رجن کو چوکی پر دیکھنے کے طلب گار ہوں لیکن ظاہر ہے، انہیں اس خواہش کے اظہار کے لیے کسی نے ر تو نہیں ہوگا۔ ان کی خاموشی رضامندی کے مترادف تھی۔ رجن اور اس کے چند ہم نواؤں کو یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے تھی کہ اڑے کے بیشتر آدمی ذہنی طور پر بنے خاں کو اختیار سمجھ چکے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو چوکی پر بیٹھنے کی جگہ یہ سیلا ٹھیلہ اور دھوم دھڑکا نظر نہ آتا۔ رجن کو عواذ پر نظر رکھنی چاہیے تھی۔ بنے خاں کو زیر کرنے کی صورت میں وہ اڑے کا وادہ تو بن جائے گا لیکن اتنے آدمیوں تاپندہ بیگی کے ماحول میں وہ چوکی پر کس طرح اطمینان سے

شمشاد خاں کی آنکھوں میں شیطاں بھرے تھے۔ آخر میں رجن نے اپنی چابک دستی اور چستی کا مظاہرہ خوب کیا۔ اس کا طور طریق بڑی حد تک دفاعی مگر سوجھ بوجھ

علامت تھا۔ شمشاد خاں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رجن کے لیے آخری درجے کا کوئی فیصلہ کیوں کر سنا سکے۔ ٹھیلے جتنے کی نے ہونٹوں میں دبائے ساکت بیٹھا تھا۔ دائرے میں بنے خاں اور رجن ایک دوسرے کو نچ کرنے کے لیے مختلف واؤ آزمایا رہے تھے اور کسی کو اب تک کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ دونوں بہت محتاط تھے۔ احتیاط تو ایک لازمہ ہے مگر حد سے زیادہ کوئی چیز بھی شاید اچھی نہیں ہوتی، عمارت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ جمو اور زور کے چہرے بھی سوچ گئے تھے۔ بنے خاں نے پھر جرات کی۔ وہ دائرے کے وسط میں ہٹ کے ماندہ کھڑا ہو گیا۔

عمارت میں ایک غلغلہ بلند ہوا۔ دوسری جانب رجن کے پھر کھڑے، تھرکتے ہوئے پاؤں بھی رک گئے۔ اس نے چند لمحے خاموشی سے بنے خاں کے تیور کا جائزہ لیا۔ یہ ایک نہایت مشکل مرحلہ تھا۔ اسے جلد از جلد کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ بنے خاں کے دونوں ہاتھ بھی دستبرداری کے انداز میں لگے ہوئے تھے۔ رجن موقع سے فائدہ اٹھا کے ایک دو دست میں بنے خاں کے سر پہ کچھ سکتا تھا۔ اس نے توقف کیا اور تحمل سے ایک قدم بڑھایا پھر آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس نے اپنے اور بنے خاں کے درمیان کا مختصر فاصلہ لے لیا۔ بنے خاں نے اسے پاس آنے دیا۔ قریب آ کے گز بھر کی دوری پر رجن ٹھہر گیا۔ دونوں لمحوں تک ایک دوسرے سے آنکھیں چار کیے بے حرکت کھڑے رہے۔ کسی ایک کو پہل کرنی تھی۔ معاً بنے خاں نے جنبش کی اور اپنا چاقو والا ہاتھ رجن کی طرف پھیلا دیا۔ بنے خاں کے ہاتھ اٹھانے میں لپک نہیں تھی۔ رجن فوراً نہیں سمجھ پایا کہ بنے خاں کی جانب سے اپنا ہاتھ گرفت میں دینے کی پیشکش رضا کارانہ ہے اس نے بجا طور پر اسے بنے خاں کا کوئی جلد سمجھ کے خود کو بچاتے ہوئے اپنا چاقو والا ہاتھ بنے خاں پر بھجھایا۔ بنے خاں ہر طرح تیار تھا۔ اپنا جسم دور رکھے رکھے وہ آہستہ آہستہ کسی قدر ترچھا ہو گیا اور اس نے بھی کو حیران کر دیا جب اچانک فرش پر گر کر اس نے پوری طاقت سے رجن کے پیر اپنے پیروں سے نشانہ بنائے۔ رجن نے بھی ابتدا میں اسی قسم کا سلوک کیا تھا۔ رجن کے پیر فرش سے اٹھ گئے اور وہ متزلزل ہو گیا۔ ایسی حالت میں اڑے کے کسی بھی آدمی کا رد عمل یہی ہوتا کہ پہلے تو وہ زمین پر قدم بٹانے کی تک دو کرے اور جسم کا زاویہ بدل کے ممکن ہو تو جواب میں فرش پر گرے ہوئے مقابل پر چاقو تان لے۔ بنے خاں نے کچھ سوچ کے ہی یہ خطرہ مول لیا تھا۔ کرنے کے بعد اس نے فوراً اٹھ جانے کے لیے خود کو

بازو گر

آبادہ کر رکھا تھا۔ رجن نے قدم ڈنگا جانے کی بدحواسی میں جیسے ہی چاقو والا ہاتھ بنے خاں کے جسم پر جھکا، بنے خاں نے جھٹ کر ٹھٹھ بدل کی اور نشانے سے ہٹ کے اتنی تیزی سے اٹھا کہ رجن کی کلائی اس کے بچے میں تھی۔

عمارت میں بھر شور بلند ہوا۔ بھی نتیجے کے منتظر تھے اور کتنے کے چند لوگوں کو چھوڑ کے بھی بنے خاں کی کامیابی کے متنی تھے۔ لگتا تھا، بنے خاں کی نگاہیں رجن کے چاقو کی نوک سے بندھ ہی ہوئی ہیں۔ اس نے پہلے کر ٹھٹھ بدل کے اپنا رخ بدلا اور سامنے کے بجائے بائیں جانب سے بچہ ڈالا۔ بنے خاں نے صرف ایک کر ٹھٹھ پر اکتفا کیا، دوسری اس کے لیے مسلک بھی ہو سکتی تھی۔ یہ وقت رجن کے لیے سخت آزمائش کا تھا۔ اسے تمام تر ترقی سے اپنا جسم پیچھے ہٹانا چاہیے تھا۔ یوں تو بنے خاں اڑھا اٹھ چکا تھا، باقی اڑھا وہ رجن کے چمڑے جانے والے ہاتھ کے زور پر اٹھا۔ ایسے پیچیدہ واؤ پیچ کے لیے بہت تجربہ چاہیے۔ تجربہ تو خیر ہر قدم، ہر مرحلے پر شرط ہے۔ پہلے رجن بے توازن ہوا تھا، دوسرے اپنا ہاتھ گرفت میں چلے جانے سے وہ ہلکا گیا۔ یہ موقع بنے خاں کے لیے بالادستی کا تھا۔ کسی واؤ کے نتیجے میں متعدد صورتیں ذہن میں رہنی پڑتی ہیں، بے درجے پیچھے، آدمی کو بجلی بننا پڑتا ہے اٹھتے ہی بنے خاں کو چاقو والے ہاتھ سے رجن کو مزید منتشر کرنا چاہیے تھا۔ اس کا یہی ارادہ ہوگا مگر رجن کے لیے جیسے زندگی کا یہ آخری منظر تھا۔ ایک لمحے کا حجاب مقابل کے عزم نازہ کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسے ہی بنے خاں اپنے پیروں پر استوار ہوا، رجن ایک جھٹکے سے زمین پر بیٹھ گیا اور پیچھے ہی اس نے پیر پھیلا دیے اور مصرع طے پھر کتنی ہوئی کرہ لگانے کے مانند بنے خاں کا واؤ اسی پر لٹانے کی کوشش کی یعنی بنے خاں کی ناگہوں پر پیر مارنے کی۔ رجن کے لیے یہی ایک بہتر صورت تھی تاہم بنے خاں نے مہر و ضبط کا ثبوت دیا اور رجن کی کلائی پر اپنے بچے کی گرفت بھرنے کی ضد نہیں کی۔ ضد کے لیے سو معروکوں کا شمار لازم ہے، بنے خاں نے اسی دم رجن کی کلائی چھوڑ دی اور ایک جھٹکے میں اس سے دور ہو گیا۔ پیچھے ہٹ کے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر بنے خاں کو آندھمی کی طرح بڑھتا اور رجن کو اٹھنے کا وقت نہیں دیتا تھا۔ رجن کو کبھی اپنی نسبتاً کمزور صورت حال کا احساس تھا، سو وہ فرش سے اٹھا ہی نہیں گیند کی مانند لڑھکا ہوا اپنی جگہ سے دور ہوتا گیا۔ جتنی دیر میں بنے خاں اس تک پہنچے، ایک محفوظ فاصلے پر جا کے وہ ایک ٹٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کی پیشانیوں سے پسینہ نچ رہا تھا۔ دور کھڑے کھڑے انہوں

کتابیات حلیہ کتب

نے سانوں کی ہمواری کا وقت کیا اور بنے خاں نے چش قدی کے بجائے رجن کو بڑھنے کا اشارہ کیا۔ رجن نے بھی دیر نہیں کی اور چاقو گھماتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ سے بڑھا اور کچھ آگے آگے اس نے ہاتھ میں دبا ہوا چاقو جھٹک دیا۔ چاقو گرنے کی آواز کے ساتھ عمارت میں حیرت آمیز سکسکیاں سی گونیں رجن کے دونوں ہاتھ اب خالی تھے۔ استغنا کے اس اظہار سے مقابل پر اپنا غلبہ و اثر جمانا مقصود ہوتا ہے۔ یہ ایک آزمودہ حربہ ہے مگر ہر دفعہ کارگر نہیں ہوتا۔ رجن کی یہ بے چگری اس کے اعتدال کا مظہر تھی تو جتنی پر اگندگی کی غماز بھی تھی۔ اس کا ایک ہی معقول جواب تھا۔ بنے خاں نے دی کیا جو اسے سے متعلق کسی بھی کج کلامہ استاد کا شیوہ ہو سکتا ہے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر نمودار ہوئی اور اس نے بھی کسی فتنے کے بغیر اپنا چاقو ترک کر دیا۔

پھر تو دونوں ایسی شدت سے ایک دوسرے کی جانب اڑے جیسے کرا کے پاش پاش ہو جائیں گے۔ آئے سانے آگے انہوں نے طرح دی اور ایک دوسرے کے شانوں پر شانوں سے ضربیں لگائیں۔ دونوں ہی لڑکھائے اور گرتے گرتے تیز رفتاری سے آئے سانے ایک دم طرح دنا اور ضرب لگانا آسان بھی نہیں تھا۔ مقصد میں ناکامی پر پلٹ کے وہ بازوؤں کا زور لگانے لگے، اور بنے خاں نے اچھل کے رجن کے پیٹ میں گھسنا مارنا چاہا۔ لگتا تھا، دونوں پاگل ہو گئے ہیں۔ کون سے، گھنٹوں سے ضربیں، پسیوں سے تڑپتے ہنر، گردن توڑ دینے، پیر پکل دینے اور اٹھا کر خنق دینے کی کوششیں۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے فرش پر آئے کچھ دیر کے لیے تو وہ پیلوؤں یا سرک پر لڑنے والے دشمنوں کی طرح ایک دوسرے پر ٹوٹے رہے۔ یہ اکھاڑا نہیں تھا نہ ہی کسی گلی کے چوک میں وہ دست و گریباں تھے۔ اڑے کے آوی اپنے زور، ہنرمندی، خصوصاً چاقو پر گرفت سے برتری کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا۔ دونوں کہ کہناں چھل گئی تھیں اور کپڑے پھٹ گئے تھے، اس سے پہلے کہ انہیں ٹوکنے کے لیے پھٹل اور ششاد خاں کی آواز بلند ہو، انہیں خود ہی ہوش آگیا کہ وہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ یہ اڑے کی روایت سے اجتناب ہے اور اس طرح انہیں کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔ مشکل یہ تھی کہ کسی ایک کی جانب سے گرفت کمزور کرنے پر اسی کو ضرر پہنچنے کا احتمال تھا مگر بنے خاں نے حوصلہ کیا۔ اس نے رجن کی گردن سے بازو بٹائے تو موقع خیمت جان کے رجن بھی اڑنے سے باز رہا۔

رہا۔ بنے خاں کے حرکت کرنے پر اس نے بھی اپنی جگہ سے جلیں کی۔ بنے خاں نے اچانک رفتار پکڑ کے فاصلہ کم کیا۔ ظاہر ہے یہ دیکھ کر رجن کو دائیں بائیں ہو جانا تھا پھر دونوں نے دائرے میں نہایت تیز رفتاری سے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ ان کے چاقو والے ہاتھ متوازی تھے۔ دو تین چکروں کے بعد یکایک درمیان میں رخ بدل بدل کے وہ ایک دوسرے پر جھپٹنے لگے۔ کسی سے بھی پہلو بچانے میں ذرا سی چوک ہو جاتی تو چاقو اس کے گلے اور پسلیاں کاٹ دیتا۔ اس داؤ میں بے پناہ جستی اور چابک دستی کی ضرورت ہوتی ہے، اور اصرار جاری رہے تو یہ کسی فیصلے ہی پر ختم ہوتا ہے۔ دونوں ٹکٹے ہوئے تھے لیکن ان پر خون طاری تھا۔ بنے خاں نے اہٹاکی۔ رجن کو بھی اپنا چاقو اٹھا ہاتھ سیدھا متوازی رکھنا تھا۔ ایک دوسرے کے قریب آگے بھی انہوں نے ایک محفوظ دوری قائم رکھی۔

اس کھار میں بنے خاں سے وہ کوتاہی ہو گئی جس کا رجن دیر سے منتظر تھا۔ اس لغزش کی پاداش واجب تھی۔ فرش پر بنے خاں کا پیر رہنا اپنی جھونک میں اس کے پیر سے نہ رہ سکے۔ اس دوران وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جلدی جلدی چاقو بھی منتقل کرتے رہے۔ یہ فٹل مقابل سے ایک فاصلہ ہونے ہی پر مناسب ہوتا ہے۔ رجن کا سامنے کیا ہوا چاقو بدوار ہاتھ بنے خاں کی پسلیوں کے نزدیک آیا تو بنے خاں نے لمبے بھر پیلے چاقو دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا تھا۔ وہ تنے آگے ہو چکا تھا کہ طرح دینا، پہلو بٹانا اور بیٹھ جانا اس کے لیے ممکن نہ رہا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ ادھر ادھر دھکے دے کر بنے خاں سے دور رجن کا بڑھا ہوا ہاتھ پسلیوں اور بازو کے چاباب لے۔ یہ بھڑا اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ مقابل کسی لمحہ اپنا ہاتھ کھینچ نہ پائے۔ پسلیوں کی جھڑن بازو کی پکڑ کے مقابلے میں اومی ہوتی ہے چنانچہ بہت اعتدال بہت قدرت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مقابل کی طرف سے ہاتھ کھینچ لینے میں ایسا ہی کا مطلب صاف ہے، چاقو بازو یا پسلیاں کاٹنا ہوا اگر نہ آتا۔ بنے خاں کو اس حقیقت کا اچھی طرح علم ہو گا کہ اس نے خود کو ایک خطرناک حالت سے دو چار کر لیا ہے۔ رجن کا لیے اس نے جکڑ لیا تھا۔ یہ نازک گرفت مضبوط کرنے کے لیے اسے اپنا ہاتھ موڑ کے گرہ لگانا تھا اور بیک وقت، بیک کی کلام کرنے تھے، اپنے جسم کو جکڑ دینے اور اپنے گلے سے چاقو بدوار ہاتھ سے رجن کو نشانہ بنانا تھا۔ کیونکہ اب جس کا جسم بھی اس کی رسائی سے دور نہیں تھا مگر بنے خاں دوسرے دور ہو چکا تھا۔ پہلے تو اپنے آپ کو قبضے میں رکھنا ہوتا

ہے۔ اپنے آپ پر مستقل نگاہ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ کچھ دیر، کم از کم اتنی دیر کے لیے جب تک مقابل سے خبر آزمائی ہو، خود کو ایک ہی منظر سے، سامنے کے منظر سے باندھ کر رکھنا پڑتا ہے۔ رجن تو بس بنے خاں کی ایک گم رہی، گم گشتگی کی ناگ میں تھا اور اسے آنے والے لمحے کی بے اعتباری کا خوب احساس تھا۔ سو اس نے موجود لمحہ ہی ستاروں کی ہمرانی جانا اور کوئی بھول کوئی نادانی نہیں کی۔ بنے خاں نے ادھر پسلیوں اور بازو کے درمیان اس کا چاقو اٹھا ہاتھ جکڑا، ادھر رجن نے بندر کی طرح اچھل کود شروع کر دی۔ پسلیاں اور بازو بچانے کی فکر بنے خاں کو سرگرداں کیا۔ اس کا ارادہ ڈگمگا گیا۔ اس کے بازو اور پسلیوں کی گرفت سے باہر رجن کا ہاتھ انگلیوں میں دبے ہوئے چاقو کی حرکت میں آزاد تھا۔ رجن اپنا چاقو اٹھا رکھتا تھا۔ اس کے چاقو کی نوک بنے خاں کی کمر یا پسلیوں میں جھپی تھی یا بنے خاں پر اس ضرر کا اندیشہ غالب آگیا تھا کہ وہ حواس کا تائب پر قرار نہ رکھ سکے۔ غالباً بنے خاں نے ساری توجہ رجن کا ہاتھ جکڑنے پر مرکوز رکھی۔ اپنے گلے ہوئے چاقو بدوار ہاتھ کی طرف سے غفلت یا بے پروائی اسے متنگی پڑتی چاہیے تھی۔ رجن نے بنے خاں کے چاقو والے ہاتھ پر پنجہ ڈال کے اسے اور دو گروں کیا۔ بنے خاں کا کھلا ہوا ہاتھ رجن کے تصرف میں جانا آخری کل گھٹنے کے مصداق ہوا۔ اتنی ہنرمندی اور کرشمہ سازی نہیں تھی، یہ محض رجن کی مستحی کا شمر تھا کہ بیجان و مضطرب سے دو چار بنے خاں کے ہاتھ میں چاقو قائم نہ رہ سکا۔

ششاد خاں نے اپنا منہ چھپایا۔ رجن کا ہاتھ ابھی تک بنے خاں نے جکڑ رکھا تھا۔ ایک پل کی تاخیر ہو گئی۔ ایک پل کی تاخیر بھی پہاڑ کے مساوی ہوتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے ایک تیز جھپٹے سے رجن کے ہاتھ سے بھی چاقو گر گیا تھا مگر بھی گواہ تھے کہ کون اپنے چاقو سے پہلے دستبردار ہوا ہے۔ عمارت میں موت جیسا سا چھایا ہوا تھا پھر کچھ جیسے کسی نے ساری دیواریں ہٹا دیں، سارے روزن کھول دیے۔ ایسا شور مچا ہوا کہ کان بڑی آواز سنا نہیں دیتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے دائرہ تنگ ہو گیا۔ چاروں طرف سے بھوم اٹھ پڑا تھا۔ بھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے ششاد خاں اور اڑے کے معرہ باز اثر آدمیوں کی تینہندہ و تلقین سے لوگ کسی حد تک پر سکون ہوئے۔ دائرے کے وسط میں، بھوم کے درمیان گھرے ہوئے، بت کے مانند فرش پر ایستادہ بنے خاں کی بس ایک جھٹک دکھائی دی تھی، پھر وہ ہمیں نظر نہیں آیا۔ رجن کے ساتھیوں نے رجن کو کندھوں پر اٹھایا تھا اور

تخمین و آفریں کے نعروں سے عمارت گونج رہی تھی۔ رجن سب کو سر جھکا جھکا کے سلام کر رہا تھا۔ لوگ کندھوں پر اٹھائے اٹھائے اسے چوکی کے پاس لے آئے۔ شمشاد خاں کی آنکھوں میں دکھنی آگ اس کے زرد چہرے پر اور نمایاں ہو گئی تھی۔ بھٹل نے اس کا بازو تھام کے ایک طرح اس کی لگام پھینچے رکھی۔ چوکی پر بیٹھے ہوئے اور لوگوں کا حال بھی شمشاد خاں کی کیفیت سے مختلف نہیں تھا۔ ہم تینوں چوکی سے اتنی دور نہیں تھے، جمرو کے کھسک جانے پر کچھ اور قریب ہو گئے۔ اب وہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ رہ رہ کے بنے خاں کا خیال آتا۔ وہ یقیناً عمارت کے اندرونی حصے یا بالائی منزل کی طرف چلا گیا ہوگا۔ اسے اس وقت گداڑی کی بڑی ضرورت تھی۔ میری طرح زور بھی اس کے پاس جانے کے لیے بے کل تھا۔ جمرو نے ہم دونوں کو اٹھنے نہیں دیا۔ ویسے بھی اسنے لوگوں کو پھلانگ کے بنے خاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔

رجن کو چوکی کے نزدیک اتار کے اس کے ساتھیوں نے پھر نعرے لگانے شروع کر دیے۔ رجن کو بے خاں کی جگہ بٹھایا گیا۔ کسی شخص نے چوکی پر چڑھ کے پھولوں کا بار اس کے گلے میں ڈال دیا۔ کسی نے ہلا میں لیں اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ اس کے سامھی وافر دست سے دیوانے ہو رہے تھے۔ انہیں کوئی احساس نہیں تھا کہ چوکی پر اور اطراف میں بیٹھے ہوئے بے شمار لوگوں کو ان کی نجات آمیز سستی گراں گزرو رہی ہوگی۔ چوکی پر موجود ایک سن رسیدہ شخص نے رجن کے سر پر صافہ باندھ دیا۔ رجن کا چہرہ دمک رہا تھا، لرزے ہوئے پھرنے ہوئے تھمتھے بار بار دہرے سر گھما کے ادھر ادھر دیکھا تھا۔ بھٹل نے دیر نہیں لگائی۔ دودھ سے کھنڈ بھر کے اس نے رجن سے گھونٹ لینے کو کہا۔ شمشاد خاں نے بظاہر بردباری کا ثبوت دیا مگر اس کے تیر دہتا رہے تھے کہ اتنے اب چوکی سے اٹھ جانے کی جلدی ہے۔ رسوں کی آوائی کا آغاز ہوا تو بہت سے لوگ اٹھ کے عمارت سے باہر چلے گئے۔ پیچھے دروازے کی طرف سے کسی کے سکنے کی آواز آئی تھی۔ سب نے پیچھے مڑ کے اس شخص کو دیکھا چاہا مگر اسے فوراً باہر لے گئے۔ بھٹل کی ترغیب پر رجن نے چاقو شمشاد خاں کے قدموں میں رکھ دیا۔ شمشاد خاں کی آنکھیں جھنجھکیاں مام جو اب اس نے بھی خاموشی سے اپنا چاقو رجن کے آگے بڑھا دیا۔

ابھی کئی رسیں باقی تھیں۔ میرے جسم میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ داغ بہت الجھا ہوا، دل بہت کھرا رہا تھا۔ یہی

اجھا تھا کہ ہم وہاں سے اٹھ جاتے، یہ سب کچھ تو نہ پڑتا۔ یکایک جیسے کسی نے مجھے ٹوکا، میں سیدھا نہ بیٹھا۔ میری سوالیہ نظریں بھٹل کی جانب گئیں۔ وہ اپنے کام مصروف تھا۔ میں نے جمرو سے کچھ کہنا چاہا مگر اس سے کہنے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ جمرو اور زور نے میری پندلیاں جکڑ لیں۔ ”کیا بات لاؤ لے؟“ جمرو نے بے تابی سے پوچھا۔

”بھئی کی نگاہوں کا ہدف میں بن گیا تھا۔ شمشاد خاں بھٹل کو میری طرف متوجہ کیا۔ ایک نکلے کے لیے بیٹھ پیشانی پر لکیریں کھینچ گئیں، پھر اس نے سر کو ہلکی سی دے کے دھکتی آواز میں پوچھا ”کیا کیا ہے رے؟“

”استاد!“ میں نے جھجھکتے ہوئے کہا ”تم نے بے وقت پوچھا تھا کہ کوئی اور تو اڑے کی چوکی کا ظلم نہیں ہے؟“

شمشاد خاں کی حالت اضطرابی ہو گئی ”ہاں ہار تھا۔“ بھٹل کے بجائے وہ بیٹ پائی پکوں سے بولا۔ ”ابھی کوئی اور رستم کا جنا ہے ادھر ہی؟“ بھٹل آواز سے پوچھا۔

”ہاں استاد!“ میں نے سانس بھر کے کہا ”ہو کوئی۔“ ہر جانب کھلبلی مچ گئی۔ لوگ اٹھ اٹھ کے نچے گئے۔ رجن کی آنکھیں بھی جھپک گئیں۔ ”کون کون ہے وہ؟“ شمشاد خاں مضطرب ہو کے جواب میں میرے تال پر بھٹل نے کسی قدر سے پوچھا ”تو تو ادھر ہی بیٹھا چاہتا ہے؟“

بھٹل نے پہلے شمشاد خاں کی طرف پھر رجن دیکھا۔ رجن کے چہرے پر جسم کا سارا خون سٹ آیا۔ کی شعلہ بار نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں ”کیا بولتے بھٹل نے مجرد لیے میں شمشاد خاں سے پوچھا۔

”ہم، ہم کیا بولیں۔“ شمشاد خاں تذبذب سے کہنے کو کیا ہے ٹھیک ہے، سولہ آنے ٹھیک۔

بھائی؟“

عمار ت میں دائیں سمت بیٹھا ہوا بھاری تن ایک شخص اٹھا اور چیخ کر بولا ”ایسا کیسے استاد! بھائی کا نہیں ہے۔“

”کیا کہا کیا تو؟“ شمشاد خاں بھڑک کے، پیچھے کا سوچ کر زبان ہلایا کر کسی۔ یہ کدھر لکھا ہے باڑے کا جانور ہی چوکی پر آئے گا۔ کہیں بیٹا پور

بازو

ن پور کا ہوں۔“ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں پیدا ہوا تھا پر یہ رجن ن استاد! شمشاد خاں کی آواز میں کئی بھری ہوئی تھی۔ س کی نال بھی تو لکھنؤ میں گڑی ہوئی نہیں ہے باتیں کرتا، سسر! تھوڑی دیر میں بولے گا، خاندان بھی جان عالم یا کا ناچا ہے۔“

جمرو سرگوشیاں جھنسنے لگیں۔ ”اور ادھر گلے میں استادوں کا استاد اپنا بھٹل بھائی ن سا لکھتا ہے۔ اڑے کی چوکی بازو پہ چلتی ہے راجا!“ شاد خاں نے بازو دکھا کے کو نکہ دو بھئی نامی شخص سے کہا ی اور میں راج گدی پر بیٹھنے کو ایسے ہی کڑا کبلا تا ہے تو می کڑا ہوا جائے۔“

”مگر رجن استاد کو ابھی سامنا نہیں کرنا چاہیے۔“ مل نری سے بولا۔ ”کیوں کیوں میں اس کو بھی دیکھ لیتا ہوں۔“ رجن نے خ کے کہا ”یہ تمہارا چھاپے نا استاد بھٹل؟“

”ہر سامنے میں نہیں آ رہا تیرے۔“ ”تم بھی آ جاؤ، حست نکال لو۔“ ”ابھی تیری حالت ٹھکانے پر نہیں ہے رے۔“ ”ہاں!“ شمشاد خاں اپنا سینہ کوٹنے لگا ”استاد بھٹل آگے ایسا بولتا ہے مرورا! ہم نصیب! داغ لوٹ گیا ہے تیرا؟“

”لکھا ہوں، کمال میں رہ کمال میں رہ۔“ ”استاد بھٹل کیا خاص اوپر سے بھیجا گیا ہے۔“ رجن چیخ کے کہا۔

”زبان کو لگام دے رجن! حرام کی اولاد۔“ شمشاد خاں ر کے بولا ”آگے ایک بات بھی منہ سے نکلی تو زبان گدی الگ کدوں گا۔ استاد بھٹل اپنے مہمان میں سور کے سہان!“

”ہاں ہاں، بڑے نمک حلال مہمان۔“ شمشاد خاں نے اٹھ کے رجن کے گردن پر ہاتھ ڈالنا۔ بھٹل آڑے آیا۔ ایک ٹانے ٹھہر کے اس نے رجن لہا ”نوادہ کیوں بولتا ہے بادشاہ سلامت! اپنے کو بتا، کب نے آتا چاہتا ہے؟“

”جب تم بولو ماما راج!“ رجن بگڑی ہوئی آواز میں بولا تو کہتے ہیں، ابھی کیوں نہیں جو ہوتا ہے سالا! ابھی دودھ ہ، پانی کا پانی ہو جائے۔“

”نہیں رے، اتنی جلدی نہیں۔“ بھٹل نے آہستگی ما ”دو تین دن ذرا بچوں کی مالش کروالے۔ بہت جھل ہے تو نے۔“

ی گزرا

”ہاں، بعد میں مت بولنا کہ استاد بھٹل اور شمشاد خاں نے الٹی چھری چلائی تھی۔“ شمشاد خاں پھرتی آواز میں بولا۔ ”تم کو ہمارا چوکی پر بیٹھنا پسند نہیں ہے استاد تو صاف بول دو۔“

”ابھی کچھ بولنے کا تو نے کدھر کر رکھا ہے خاں بہادر!“ طر، غصہ، ناپسند، شمشاد خاں کا لہجہ ساری آکا نکشوں سے لب رز تھا۔ کہنے لگا ”اور چوکی کی کیا بات کرنا ہے بھٹیا کے چوکی کسی کی میراث نہیں ہوئی۔ جیسا تو بے وقت کرکے بھل کی طرح بیچ میں آ گیا تھا، ویسا کوئی اور بھی آ سکتا ہے۔“

”مگلے جیسے کے دن میں بہت دیری ہے استاد!“ بھٹل نے کدھری، اپنی آواز میں رجن سے کہا ”اس نام تک اپنے کو کھنڈ نہیں ہے۔ ایک دو دن کی بات الگ ہے۔ اس بیچ کوئی فیصلہ کر لو اور اپنی چھٹی کرو۔ تخت پر چاہے تم جیسے کے دن برا جہان ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، بھٹل بھائی! بیچ میں اپنا جی بہت بھاری ہے، خواہ مخواہ تمہارا رستہ کھوٹا گیا۔“ راج زیادہ نہیں، بس دو ایک دن اور۔“ شمشاد خاں التجائی انداز میں بولا اور اس نے خشکی نظروں سے رجن کو کھورتے ہوئے پوچھا ”بول رے، پھر کیا دو چار ہے تیرا؟“

”اپنا کیا دو چار۔“ رجن نے منہ شیر بھا کر کے جواب دیا ”جیسا تم بولو، ہم تو ابھی تیار ہیں۔ ہاتھ پیر سارے سلامت ہیں اپنے۔“

بھٹل نے ہاتھ اٹھا کے کہا ”کل سویرے کا بول دیں پھر؟ ہاتھ پیر کھولنے اور پانی دیکھنے کو پورا دن پڑا ہے۔ پانی تو ٹھیک ہی بولتا ہے اوپر سے نیچے تک سارا بندھا ہوا ہے۔“ ”جیسے کا دن کوئی اوپر کا کھٹا ہوا نہیں ہے۔ رانے وقت سے چلتا آ رہا ہے، اس واسطے سب مانتے ہیں۔“ شمشاد خاں ٹھیکے لیے میں بولا۔ پر اس کو کل ہی آج پہنا دیں گے۔“ شمشاد خاں شمشاد خاں کی ہدایت پر پھلوان طرز کا ایک بزرگ شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے مختصر بلند آواز میں اعلان کیا کل صبح رجن استاد اور باہر استاد کے درمیان چوکی نشینی کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اعلان کرنے والا آدمی خاموش ہوا تو رجن جلی ہوئی آواز میں بولا ”اور کوئی ادھر ادھر چھا ہو، تھارہ پڑا دو۔ دینا بہت بڑی ہے، مل جائیں گے بہت سے تیس مار خاں۔ ایک ساتھ سب کو سامنے کر دیتا۔“

شمشاد خاں کے تن بدن میں آگ بھڑکی، بھٹل نے بڑی

کتابیات پبلی کیشنز

پاک خبری

لاشعور میں دبے ہوئے خوف
احساسات اور محرکات کو بے نقاب
کرنے والی عجیب و غریب کتاب

قیمت
25 روپے
ذات خرچ
23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ
پیشگی منی آرڈر سال کریں

مکتبہ کتابیات
74200
5802551-5895313
kitabiat@hotmail.com
kitabiat@yahoo.com

اڑے سے اپنے جانے کے بعد کے واقعات کی بھٹک بھی ہے
خاں کے کانوں تک پہنچ جاتی تو وہ ارادہ بدل دیتا اور شہر در
کا یہ استثنائی قدم نہ اٹھایا پاتا۔ لکھنؤ کے لوگ اپنے شہر کے
ذہبے بھی بڑے شیدائی ہیں، کسی اور جگہ ان کا جی کم ہی لگتا
ہے۔

ہم اوپر اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھایا چاہتے
تھے کہ اڑے کے ایک آدمی نے آکے سرگوشیانہ انداز میں
مجھے بتایا کہ مبارک میاں نامی کوئی شخص مجھ سے ملنے کے لیے
جائز کا خواہاں ہے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ اس نام کا تڑپا
لکھنؤ میں کسی نام کا میرا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ جہو اور
زورائے مشورہ دیا کہ اندر بلائے کے بجائے باہر چل کے ہی
سے دیکھا جائے۔ اندر شمشاد خاں، ٹھٹھل اور اڑے کے
دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ دروازہ عبور کرنے سے پہلے
ہونے لگا تاہم کے فرستائے کا شبہ ظاہر کرویا تھا اور وہ وہی
نا، تارا بیگم کا سازندہ۔ اس نے مودبانہ سلام کیا اور اپنے
تلے لیے بھی بولا "تارا بیگم کل کسی وقت غریب خانے پر
مرا کر کی ٹھہر رہیں گی۔ کوئی مصروفیت درپیش ہو تو پر سوں
ہی۔ بڑی فوازش ہوگی، اگر پہلے اطلاع مل جائے۔"

میں نے جمو کی طرف دیکھا اور اسی نے جواب دیا کہ
ایک ہے، اتنے سے پہلے ہر کارہ بھیج دیں گے۔
جمو نے بند مٹھی سے مبارک میاں کے ہاتھ میں کچھ
ری مٹھل کر دی۔ مبارک میاں نے بھی شمار نہیں کی، جیب
سارکھ کے سرخ کیا اور واپس چلا گیا۔
قاصد کے چلے جانے پر ہم تینوں وہیں کھڑے ایک
سرے کو دیکھا کیے پھر جمو ہٹا کر ابھر کے بولا "کیا خیال ہے
اڑے؟"

"کیا کیا جاسکتا ہے۔" میں نے کوئی ہوئی آواز میں کہا
ب تارا بیگم کے راضی ہونے نہ ہونے سے کیا حاصل۔"
جمو کے پاس جت کے لیے کچھ نہ تھا۔ اس نیرنگی منج و
م کے سامنے بھی بے اختیار ہیں۔ وہ شانے سکوڑ کے رہ
یا۔

ہم تینوں واپس چوکی پر نہیں گئے، بالائی منزل پر اپنے
سرے میں چلے آئے سارا جسم نوٹ رہا تھا۔ جمو اور زورائے
ماٹھ سے ٹھہرے دکھائی دیتے تھے۔ بیداری بھی کبھی کیا
ار کر کے آئی اپنے آپ کو برا لگتا ہے۔ زورائے بستر
دش بدلتے بدلتے اوب گیا تو اٹھ کے کمرے میں ٹھٹھل لگا
بڑبڑاتے ہوئے بولا "اوا! ابھی ایک بات بولے۔"

میں نے اپنا پوچھل سر ہلا کے پوچھا "کیا ہے؟"

زی گر 6

عزیز خاں کے ہاں خاطر مدارات میں ہم اتنے پر
تھے کہ رات کو کھانا کھایا ہی نہیں گیا۔ حالانکہ شمشاد
نے ہمارے انتظار میں سب کو روکا ہوا تھا۔ اڑے پر
لوگ موجود تھے لیکن ایک ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔
ویرانی تو دل سے ہوتی ہے رات کے کھانے کے بعد
سرود کی محفل کا اہتمام کیا تھا۔ قمار گرا دوایں چلے گے
دیواروں کے سروں اور منڈیروں پر ابھی تک چراغ
سے رکھے تھے لیکن روشنی کے بغیر۔ روشنی نہ ہو تو ج
ٹھیکرے ہیں، تانیا آنکھوں کے مانند۔ بنے خاں کی
سے شمشاد خاں بہت متحوش تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ۔
کا زیادہ وقت اڑے پر ہی گزرتا تھا اور اپنی بڑی بہن
بھی اس کا آنا جانا مستقل رہتا تھا۔ آقا پیا نہیں وہاں
گیا تھا۔ بنے خاں نے تانیا کی ہوئی، بہن کے گھروا
سراغ لگایا۔ وقفے وقفے بعد اڑے کے آدمیوں کی
بہن کو فکر لاحق ہوئی ہوگی چنانچہ اسے زبان کھول
اڑے سے نکل کے بنے خاں سیدھا بہن کے گھر ہی
کچھ اسباب سمیٹ کے اور یہ بتا کے کہ وہ کچھ عرصے
لکھنؤ سے باہر جا رہا ہے، وہ فوراً بہن کے گھر سے
ہو گیا تھا۔ اگر ہم اس کے تعاقب میں اسی وقت
ہو جاتے، جب اسے جہوم کی افرا تفری میں خاموشی
جانے کا موقع مل گیا تھا تو کہیں نہ کہیں اس کا
ہو جاتا۔ رجن سے تو ہم بعد میں بھی نمٹ سکتے تھے۔
کو اپنی بزمیت کی توقع نہیں تھی۔ شکست تو بڑ
سوراؤں کو ہو جاتی ہے۔ اڑے کے آدمی کو اتنا شیش
ہونا چاہیے۔ رات گئے ایک آدمی نے بتایا کہ غور
کے وقت بنے خاں کو چار باغ اسٹیشن کے نزدیک
نے دیکھا تھا۔ لوگ اپنی اپنی بولیاں بولتے رہے کہ ا
جگہ فلاں مقام پر دیکھا گیا ہے۔ کسی نے خواہے
تھا۔ بہن کے گھر سے معلومات اور چار باغ اسٹیشن
خاں کی موجودگی کی اطلاع سے یہی قیاس کیا جاسکا
اب لکھنؤ میں نہیں ہے۔ بقا وقت گزرتا جا رہا
خاں کے چہرے پر چھایا ہوا دھواں گہرا ہوتا جا رہا تھا
محض ٹھٹھل کی وجہ سے چوکی پر بیٹھا وضع نبھار رہا۔
بھی اڑا چھوڑ کے نکل گیا ہوتا۔ بنے خاں کے دو
سازدوست بھی لاڑا لاڑا اسی کے ساتھ تھے۔ وہ بھی اڑ
نہیں آئے تھے۔ کاش بنے خاں چھوڑ دیر اور ٹھہر
کہاں معلوم ہوا ہوگا کہ رجن نے ابھی چوکی
ہے۔ ابھی اسے کل صبح میری دیوار رات سے بٹا

مشکل سے اسے سنبھالا۔
دوسرے ہو گئی تھی۔ کھانا کب کا تیار تھا۔ اڑے کے
آدمیوں نے دسترخوان بچھا دیے لیکن عمارت میں نفری بہت
کم رہ گئی تھی۔ بہت سے لوگ پہلے ہی چلے گئے تھے کچھ اور
لوگ بھی کھانا کھانے بغیر باہر نکل گئے۔ موت کے کھانے پر
اسی طرح کی خاموشی ہوتی ہے بنے خاں عمارت میں موجود
نہیں تھا۔ اس کی تلاش میں ہم تینوں بھی باہر آگئے۔ کچلی میں
ایک اڑوہام تھا اور طرح طرح کی چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔
کئی آدمیوں نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا۔ وہ عزم اور حوصلے
کی تلقین کے علاوہ میری سرخوئی کی دعائیں کرنے لگے۔
انہی سے معلوم ہوا کہ بنے خاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ
اسی وقت کہیں چلا گیا تھا جب اس کے ہاتھ سے چاکو گر جانے
پر عمارت میں داویلا ہوا تھا اور لوگ بے قابو ہو گئے تھے۔
کسی کو بھی بنے خاں کی خبر نہیں تھی۔

آقا پیا کی رہنمائی میں شام تک ہم بنے خاں کی نوہ میں
مارے مارے پھرتے رہے۔ جانے وہ کون سی کھوہ میں جا چھپا
تھا۔ شام کو ہم اڑے واپس آئے تو شمشاد خاں بہت فکر مند
دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بھی کئی آدمیوں کو مختلف سمتوں میں
بھرا تھا۔

جمو اور زورائے، سہلی کی وجہ سے بے چین ہو رہے تھے۔
کل پہلے پھر کے بعد سے اب تک ہمارا اس کے پاس جانا
نہیں ہوا تھا۔ اڑے پر کچھ دیر ٹھہر کے ہم شمشاد خاں کے
بھائی عزیز خاں کے گھر چلے آئے۔ یہاں سہلی بھی واقعی کچھ
کم مضطرب نہیں تھی۔ مطلوب صورتیں بھی کیسی باد بھاری
ہوتی ہیں۔ ہمیں دیکھ کے اس کا چہرہ چٹکنے لگا۔ زورائے اور جمو
اس کے لیے موتیا کے کجے لے گئے تھے، مینبانوں کے لیے
مٹھائی کی ٹوکری بھی۔ جمو نے عزیز خاں کے گھر والوں سے
معذرت کی کہ ہماری روانگی میں دو ایک دن کی تاخیر ہو گئی ہے
مگر وہ تو پیسے اس حادثے کے آرزو مند تھے۔ خوش چہرگی پر
خوش شعاری مستزاد ہے اور لوگ کہتے ہیں، خوش شعاری
اصل میں ہوش مندی ہے۔ دو دن میں سہلی نے کیسا جاود
کر دیا تھا کہ سہلی اس کے گرد و نظر آتے تھے۔ کل اور آج
انہوں نے اسے لکھنؤ کی خوب سیر کرائی تھی۔ عزیز خاں کے
گھر والوں کو اڑے سے وابستہ آدمیوں اور سہلی کے تعلق کی
نوعیت بوجھنے کی جستجو یقیناً ہوگی۔ ہم سے تو وہ کچھ پوچھ نہیں
سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے، انہوں نے سہلی سے سن سگن لینے کی
کوشش کی ہو یا کسی ناگفتگی کے خیال سے وہ محتاط ہی رہے
ہوں۔ بہر حال سہلی کو بھی بات کرنے کا لہجہ تھا۔

کتابیات پبلی کیشنز

”یہ ابن کا بنے دادا کیسا آدمی تھا“ زور نے بے ربط لہجے میں شکایت کی ”ابھی پیچھے اتنا لوگ چھوڑ کے چلا گیا۔“ میں کیا کہہ سکتا تھا۔ زور اس لئے لگا ”ابن سوچتا ہے“ آج کا دن بے دادا کو اس کے کچھ رجن کے آگے جانے کا نہیں تھا۔“

”پھر کون سا دن رکھنے کا تھا دادا؟“ جمرو نے اچھٹی آواز میں دخل دیا۔

”نہیں جمرو بھائی! مسخری نہیں۔ ماں قسم“ رات اور دی بائی جی کے کوٹھے پر بنے دادا انہیں جاتا تو سو رہے ایسا نہیں ہوتا۔“

زور کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ رات تارا بیگم کے بالا خانے پر جا کے بنے خاں کو ایک سلسلہ خیال کے محررے دو چار ہونا پڑا۔ چاندنی بانو کے سامنے میں نے اس کے چہرے پر ہمت سے رنگ دیکھے تھے۔ حسرت، امید، اشتیاق اور جنوں کے رنگ۔ وہاں سے آگے تو اس کی آنکھیں مسلسل خواب دیکھتی رہی ہوں گی۔ بس ایسے ہی کسی خواب آفریں خواب انگیز لمحے کا فاصلہ اسے زور پر کر گیا۔ رات ہی تارا بیگم آوارہ ہو جاتی تو بنے خاں کا عالم دگر ہوتا۔ شاید پھر اسے اس طرح روپوشی کی ضرورت نہ پڑتی۔ وہی اس وقت اڑے کی مسند پر بیٹھا ہوا اور اڑے کی عمارت میں جانے کیسی دھوئیں چلی ہوئیں۔

جمرو بھی اٹھ کے بیٹھ گیا اور خود کھامی کے انداز میں بولا ”تارا بیگم کو بھی تو پتہ چل گیا ہوگا کہ بنے خاں آج چوکی پر نہیں بیٹھ پایا۔“

”ایک دم دادا!“ زور کی آواز میں تیزی آگئی ”رات نہیں دیکھا! بولی کے ٹیم کیسا چکر رہتا تھا بائی جی۔ ابھی سر میں پیچھے کو آئی نہیں تھا۔ ابن بولتا ہے، رات بھر نیند نہیں آیا ہوگا۔ اڑے پر بنے دادا کے الٹ جانے کا سن کے ہی آدمی ایڈر آیا“ ابھی سونا بھرا پٹلی ہاتھ سے نکل نہ جائے۔“

”اور اس بکھن لال مبارک میاں نے تو بنے خاں کو پوچھا ہی نہیں۔“ جمرو لک کر بولا ”سیدھا اپنے لاڈلے نواب کو پوچھتا ہوا آیا۔“

”بات بھی تو راجا دادا نے چلایا تھا۔ اس کے پاس ہی آدمی بھیجے گا تھا۔“

”اگر تارا بیگم نے سارا دن اس پاس نواب لوگوں کو ٹھولا، ٹھکڑا ہوا ہوگا۔“

”کھادوں آج باجو نواب لوگ کا قتل کاٹنا کیا ہوگا؟“

”دھیری کا بات ہے جمرو بھائی!“ زور نے کڑوی آواز میں کہا

”ابھی سالا نواب لوگ پہلا مالک کید رہے۔ ایڈر راجا دادا نے بولی بھی آسان پر جا کر لگایا۔“

وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کی تائید و تردید کرتے رہے۔ میں بستر پر اداستارہ۔ میں نے ان سے بحث نہیں کر کہ یہ قیمت بھی کوئی قیمت ہے، لوگ تو تخت و تاج ترک کر دیتے ہیں اور زندگی بذر کر دیتے ہیں۔ ایک آدمی کی قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ اس کا تعین تو کوئی طلب گار ہی کر سکتا ہے کوئی کتنا ہی پری جیکر، کل انعام ہو، اور جیسا کہ لوگ کہتے ہیں ”ساخے میں ڈھلا ہو“ قیمت تو مطلوب کی ہوتی ہے اور مطلوب کے لیے ملوکی صفات لازم نہیں۔ اس کی قیمت ظاہری اوصاف میں ملکتی سے مشروط ہے نہ باطنی حسن و فضاہت سے۔ یہ تو سینے میں جاگزیں اور آنکھوں میں نظر ہو جانے کا معاملہ ہے۔ ہر شخص کا اپنا ایک پیمانہ ہے۔ جو اس پیمانے پر پورا اتر جائے، یا کسی خیر گاہ کا کرشمہ ہے، جو اس زور پر آجائے دو آدمیوں کے بائین یک نفسی و یکبائی کی را کوئی تیسرا کیا جان سکتا ہے۔ کبھی تو خود مطلوب کو خبر نہیں ہوتی، کون دروازے پر کھڑا دستک دے رہا ہے اور کتنا مدعی، کتنا برا فریادی ہے۔ یہ رقم تو کچھ بھی نہیں سمجھی۔ جس طرح جمرو اور زور کے کسی مطلوب کی قیمت وہی سمجھتے ہیں، بنے خاں نہیں سمجھ سکتا، اسی طرح چاندنی بانو کی قیمت کا تعین بھی بنے خاں ہی کر سکتا تھا۔ وہ کوئی نواب زادہ شہزادہ ہوتا تو سارا لاؤ لنگر نذر کر سکتا تھا، اور یہ تو محض اتفاق ہے، خوش نصیبی کا اتفاق ہے کہ بنے خاں کا مطلوب نیلام میں دستیاب ہو سکتا تھا، لیکن جہاں بولی کا امکان نہ وہاں طلب گار کا سونا چاندی کس کام کا اس کے جواہروں تو ننگر پتھر اس کے عمل دوٹکے تو کھنڈروں کے مانند ہیں۔ آخر رات کے آخری پیرا میں نیند نے آیا۔

کاذب کے وقت کہیں میری آنکھ بھی لگ گئی۔

صبح بنے خاں کا دست راست مرزا دلبر نہ آتا تو ہم؟ کب تک اپنے آپ سے دیگانہ رہتے۔ اس کی صدا تینوں بڑوں کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ فوج رہے تھے۔ دیواروں سے اتر آیا تھا۔ مرزا نے بتایا کہ جیسے عمارت ہمت سے لوگ جمع ہو چکے ہیں اور ان کی آمد کا سلسلہ ہے۔ رجن بھی اپنے ساتھیوں سمیت آچکا ہے۔ بھٹل شمشاد خاں ہمارے کھنجر ہیں۔ مرزا دلبر نے ناشتے کا ہاتھ ہوا تھا۔ جیسے تیسے مناد دھوکے ہم نے کپڑے تبدیل کیے جلدی جلدی ناشتہ کر کے ٹپلی منزل پر چلے آئے۔

بازاری

عمارت میں کل سے بڑا جھوم تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی، سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کے بے تحاشا شور مچنے لگا۔ چوکی کے وسط میں بھٹل اور شمشاد خاں کا مکانہ تیر سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اڑے کے اور آدمی بھی چوکی موجود تھے۔ دودھ کے کھنڈر، لوبان کا برتن، ہار پھول وغیرہ ٹوٹی چڑھی آج بھٹل کے آگے نہیں تھی۔ چوکی کے دائیں طرف چار زانو ٹوٹ میں رجن خاموش بیٹھا تھا۔ چہرے کی لابی کی تروتازگی درون خانہ اعتماد کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ ہ سفید لباس میں بلبوس تھا۔ کرتے کے گلے سے سونے کی خیر جھانک رہی تھی۔ رنجیر میں تعویذ بھی بوس ہوا گچکا تھا۔ چاندنی کا کڑا کلائی میں جھول رہا تھا۔ یہ کڑا کل اس کے تھ میں نہیں تھا، بازو سے بندھا ہوا کلائی دھجی کا امام خاصاں استین سے جھک رہا تھا۔ اگر دودھ بیٹھے ہوئے ساتھیوں نے بری طرف اشارہ کیا تو اس نے سر گھمایا۔ اس کی آنکھوں میں طرح طرح کی کیفیتیں نمودار ہوئیں، غصے، فحارت اور نظراب کی لہرس پھر اس نے میری جانب سے نگاہ پھیر لی۔ امتیوں کو جگہ دینے کے لیے لوگ پہلے ہی پیچھے ہٹ گئے تھے۔ شمشاد خاں کی ہدایت پر ہم رجن کے عین مقابل چوکی کے بائیں طرف بیٹھ گئے۔ چوکی کے سامنے دائرے کی جگہ جگہ کھلی رکھی گئی تھی اور لوگ دائرے میں بڑھنے سے لوگوں روک رہے تھے۔

ہمیں آنے ہوئے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک ان دیدہ قسم کے شخص نے کھڑے ہو کر خاموشی کی تاکید۔ اس کی ہنوا میں ان کے پیچھے کئی آدمی کھڑے ہو گئے۔ ہاکی کو ششوں سے جمع بڑی حد تک پر سکون ہو گیا۔ تب رگ آدمی نے مختصر لفظوں میں آج کے اجتماع کی غرض و بت بیان کی اور نیم تنہی، نیم التجائی آمیز لہجے میں کہا کہ اس کی خاموشی دونوں فریقوں کے لیے بہتر ہوگی۔ کوئی تازہ با بلند کرے، ناشتہ کھ ادا کرے والے کو عمارت سے لے دیا جائے گا۔ رہی سے دائرے کی حدیں قائم کر دی گئیں۔ بھٹل نے پہلے رجن سے، پھر مجھ سے ہماری آمادگی کی بات پوچھا۔

ہم دونوں ایک ساتھ اٹھے۔ حسب روایت میں نے بے سے چاقو نکال کے اڑے کے استاد شمشاد خاں کے ہون میں رکھ دیا۔ شمشاد خاں نے میرا چاقو سینے سے لگایا۔ اپنا چاقو بھٹل کی طرف بڑھا دیا۔ بھٹل نے اسے میرے لے کر دیا۔ رجن نے بھی یہی کیا۔ ہم دونوں دائرے میں کھڑے رجن نے اپنی کر کے گرد پکا بانڈھ لیا تھا۔ ایک نظر

زی گھر

بھٹل کی طرف دیکھ کے میں نے چاقو کھول لیا۔ بھٹل نے جواب میں ہاتھ کو خفیف سی جنبش دی۔ میں نے سر جھکا کے گویا اپنی نصیحت کا اظہار کیا۔ یہ رمز و کنایہ مقابل پر دباؤ ڈالنے کا ایک موثر طریقہ ہے۔ رجن نے بھی اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کے اس کا حوصلہ بلند کیا۔

میں نے طے کر لیا تھا کہ جلد از جلد ہو سکے تو لمحوں میں کسی نیچے پر پہنچتا ہے۔ حالانکہ جی جی چاہتا تھا کہ اسے دیر تک گھمایا جائے۔ وہ میرے لیے اب ایسا اجنبی نہیں رہا تھا۔ کل میں اسے اچھی طرح دیکھ چکا تھا، البتہ وہ مجھ سے بالکل ناواقف تھا۔ ممکن ہے، کل سے اب تک اس نے میرے بارے میں کچھ سنا ہو لیکن لکھنؤ میں لوگ ہی کتنے جھجے جانتے تھے۔ شاید کوئی بھی نہیں۔ بھٹل کا نام بے شک بہت سے لوگوں نے سنا تھا اور بھٹل سے میری نسبت کی وجہ سے رجن کو بھی محتاط ہونا چاہیے تھا۔ خصوصاً ابتدا میں تو کچھ زیادہ ہی۔ اسے اس حقیقت کا بھی خوب احساس ہوگا کہ اس کے اور بنے خاں کے درمیان معرکہ آرائی کے بعد میں نے خود کو پیش کیا ہے تو یہ کسی بولے اور برے ہی پر کیا ہوگا۔ اس نے پس نہیں کی۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چاقو قفل کرنے کی مشق سے اجتناب کیا۔ شروع میں اپنی چابک دستی اور شمشانی سے بے خبر کھنا میرے لیے سودمند تھا۔ مجھے اپنے زخم خوردہ ہاتھ کا بھی خیال رکھنا تھا، اس پر زیادہ زور نہیں دینا تھا۔ گو زخم بڑی حد تک ٹھیک ہو چکا تھا لیکن ابھی تک بنی بندھی ہوئی تھی۔

پہلے وہ مجھ سے دور دور رہی رہا پھر میرے فاصلہ کم کرنے پر وہ بھی کسی قدر نزدیک آ گیا اور جیسے ہی وہ چاقو لہرا تا دہوا ہوا میں نے اپنے خالی ہاتھ کے بجائے چاقو بردار ہاتھ اس کے چاقو بردار ہاتھ کی طرف را زد کیا۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا، کسی طور مقابل کے چاقو والے ہاتھ کا پچھر گرفت میں لے کے بے بس کر دیتے پر زور اور وقت صرف کیا جاتا ہے لیکن اصل میں مجھے اپنے خالی ہاتھ سے اس کے شانے پر ضرب لگانا تھی۔ میرا چاقو والا ہاتھ اپنی جانب جھپٹتا دیکھ کے وہ ہوشیار بلکہ منتشر ہوا۔ مجھے اس کی تمام تر توجہ اس کے اور اپنے چاقو والے ہاتھ پر مرکوز رکھوانی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے سارا دھیان میرے اور اپنے چاقو والے ہاتھوں کی نقل و حرکت پر دیا۔ اٹھے ہوئے میرے خالی ہاتھ پر نہیں۔ دوسرے ہی لمحے میں نے خالی ہاتھ سے اس کے شانے پر پوری قوت سے ضرب لگائی۔ شانے پر گردن کے قریب

کتا بیات پبلی کیشنز

63

62

کتا بیات پبلی کیشنز

ترتیب سے ہاتھ کی ضرب صحیح لگ جائے تو کچھ دیر کے لیے سر سے پیر تک جسم مفلج رہتا ہے۔ رجن کے حواس بھی یک جا نہیں رہے۔ اس کی کچھ بھی کسی آہک کہ وہ فرش پر بیٹھ جائے۔ کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ ضرب سے اس کے قدم بھی... لڑکھڑائے تھے۔ اسے اپنے چاقو والے ہاتھ کا بھی ہوش نہیں رہا۔

وہیں کھیل ختم ہو جاتا۔ اس اثنا میں کہیں بھی اس کا جسم اپنے چاقو سے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن ایک تو وہ فرش پر بیٹھے ہی یا ڈنگا کے کرتے ہی دور ہو گیا، دوسرے میں نے اسے دانستہ دور ہو جانے کا موقع دیا۔ میری خواہش تھی کہ بنے خاں پر کل اس نے جس داؤ سے برتری حاصل کی تھی، اسی کا آج اعادہ ہو۔ رجن اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑا ہوا اور اسان میں دکھائی دیا تو میں نے بنے خاں کی طرح چاقو والا ہاتھ عمودی یعنی سیدھا رکھ کے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

اب تو اسے اپنی جگہ سے حرکت کرنی ہی تھی اور میری پیروی میں چاقو والا ہاتھ جسم کے درمیان سیدھا میں اٹھائے رکھتا تھا۔ اس داؤ میں دائرے کے چکر کاٹنے رہنا ایک لازمہ ہے کسی جگہ میرے قریب آنے پر اس کے پاس دو ہی راستے تھے کہ وہ طرح دے کے دائیں بائیں ہو جائے یا آٹنے سامنے ہونے کا فیصلہ کر لے۔ دائرے کے چکروں کے دوران بجا طور پر ہر فرقہ کی جانب سے کسی بھی لغزش اور ناجی کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ گو مجھے رجن کی طرف سے کسی غیر متوقع حربے کا اندیشہ مطلق نہیں تھا، لیکن بہر حال اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا اور ٹھیل کے بقول، متناہل کسی درجے کا ہو، کھلے چاقوؤں میں آنکھیں پوری طرح کھلی رہنی چاہئیں۔ کسی وقت بھی اس کے داغ میں کوئی غلاتی نمواسکتی تھی اور کسی وقت بھی مجھ سے حساب کتاب جیسی کوئی بھول چوک ہو سکتی تھی۔ ہزیمت کے شیعے میں آدمی کا داغ ہلک سا لگتا ہے اور کوئی اونچھی حرکت بھی سرزد ہو سکتی ہے۔ آہستہ آہستہ میں اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ کم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ خاصا پھرتلا تھا۔ پیٹزا بڈلنے میں اسے بڑی مشاقی تھی۔ کچھ دیر یہی صورت رہی۔ میرا فاصلہ کم کرتے رہتا، اس کا طرح دنا اور ہلکائی دیتے ہوئے ادھر ادھر ہو جاتا، مگر کب تک وہ یہ آنکھ پوچی کرتا رہتا۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کے سامنے صف آرا فریقوں میں سے کسی ایک کو تماشا بنانے کا لحاظ بھی آ جاتا ہے، اس جگہ یا موت کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ رجن کی طرف سے تو آخر دم تک اس غلطی کا ارتکاب ممکن نہیں تھا کہ جہوم میں کتنے تماشاں اس

کے دلدادہ و دلدار تھے۔

میرے تخمینے سے وقت کچھ اوپر ہو رہا تھا۔ یقیناً رجن میری مشاکا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا سو اسے نامراد بننے کے آخری واڈوالی صورت حال کی حکمران سے پہلو کی کر رہنا چاہیے تھا۔ پہلے ہی بلے میں جب میں نے اسے شائے پر ضرب لگائی تھی، اسے میرے بارے میں رائے کرنے یا یوں کہا جائے کہ رائے بدلنے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ کچھ زیادہ ہی چوکنا ہو گیا تھا۔ کل وہ پیشتر اپنا دفاع ہی کرتا رہا تھا لیکن کل اس کے دفاع میں اور غضب شامل تھا، آج اضطراب آمیز ہوش مندی تھی۔ اس نے جیسے اپنی جانب سے پیش قدمی کا ارادہ کر دیا تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ اور سوچنا چاہیے اصرار سے کچھ دیر لگ سکتی تھی اور رجن اس عزت وار نہیں تھا۔

ایک مرحلے پر فاصلہ خاصا کم ہو گیا تو میں نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ رجن نے چاقو والا ہاتھ سیدھا ہوا تھا۔ میرے اس غیر متوقع اقدام پر وہ شدید رنج متذبذب بھی رہتے ہیں۔ اس نے یہی بہتر جانا کہ حسن اتفاق بھی کتنے ہیں۔ اس نے بھی بہتر جانا کہ اگرچہ اس کا توں سیدھا رکھے اور اب کوئی بردار ہاتھ جوں کا توں سیدھا رکھے اور اب کوئی بدلے میں اسے اپنی ذہنی ابتری اور خردمانی کا ثاؤر تھا۔ رجن کا چاقو عمودی تھا۔ درمیان میں فاصلہ بڑھ گیا اور میں بڑھا چلا آ رہا تھا۔ کوئی روانہ ہی اس مضحکہ خیز کا تحمل ہو سکتا تھا۔ بظاہر اس میں میرے ضرر کا اندازہ نہ تھا تو رجن کا ایک منہ بھی نہیں تھا۔ فاصلے کی باعث یہ میرے لیے ایک پیچیدہ مشکل منظر تھی مگر میزبان کر کے ہی قدم اٹھایا تھا۔

ہوٹ پہنچنے کے اور آنکھوں میں آگ بھڑکے میری طرف زندقہ بھری، ہر سلیم انصاف یہی کرتا اور اپنی تمام صلاحیتیں مجتمع کر کے اس کرشمہ قسمت سے لڑنے سے بہرہ مند ہوتا۔ کچھ اور سوچنے کے لیے میں ہی نہیں رہا تھا، اسے اپنی جانب اندازہ دیکھ کے میں قدم جماد کیے، اب اس کے لیے ٹھہر جانا، خود کو روکنا کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ اتنی قوت میں اسے کو بھی زاویہ بدلنے کی توقع نہ ہوتی، اور اس ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ سامنے اپنا کوئی زناں آ رہا تھا۔ اس کے عمودی چاقو بردار ہاتھ کی زد سے لے مجھے بروقت چنداں اچھا دایں جانب اپنا جسم ہٹانا

شانہ بالکل ٹھیک تھا۔ میرے جسم کے بائیں حصے کی پسیلوں کے نزدیک چاقو پست ہونا چاہیے تھا۔ گزرمحری دوری پر میں نے تیزی سے جسم دائیں طرف ہٹایا تو خلا ہو گیا، جیسے ہی رجن کا دروازہ ہاتھ اس تکنیکی خالی جگہ یعنی میری پسیلوں کے زینب سے گزرا اور میرے اٹھے ہوئے ہاتھ کے نیچے آیا میں نے اسے بازو یا پسیلوں کے درمیان جکڑ لیا۔ دو عمل کا مجھے حس تھا۔ وہ چاقو انگلیوں میں گھسا سکتا تھا مگر تبھی جب سے کوئی مہلت ملتی یا میں اپنے دوسرے چاقو بردار ہاتھ سے بنے خاں کی طرح غافل رہتا۔ بیک وقت میرے دوسرے ہاتھ نے اس کی گردن کے قریب چاقو کی نوک چھبائی اور میں نے خود کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے بازو اور پسیلوں کے درمیان جکڑے ہوئے اس کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی پچھے بن لینے کی کوشش کی اور مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ رجن کی ساری توجہ اپنی گردن کے قریب چاقو کی نوک پر مرکوز تھی۔ بازو کی گرفت ڈھیلی کر کے اور ہاتھ مروڑ کے میں نے جھٹ اس کی کلائی پر پچھو ڈالا تھا۔ اس احتیاط کی اگرچہ یہی ضرورت نہیں تھی، رجن کو چند لمحوں میں اپنا چاقو ترک کر ہی دیتا تھا مگر میری خواہش تھی کہ رجن اپنے ہاتھ میں چاقو برقرار رکھے۔ اسے ثابت و سالم تو واپس نہیں جانا چاہیے تھا، کم از کم کوئی نقش تو یادگار میں اس کے چہرے پر کندہ رہتا۔ اس کی گردن پر اپنے چاقو کی نوک کی پوسختی میں اسی لیے میں نے شدت اختیار نہیں کی تھی لیکن رجن نے جلد ہی شدت اخذ کر لیا اور چاقو ہاتھ سے پھوڑ بیٹھا۔ اس کے باوجود اس کی پیشانی میں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی لکیریں ڈالی جاسکتی تھیں۔ اس کی ناک بھی، بھئی کے تیزاوی ادائی طرح چہرے سے جدا کی جاسکتی تھی، اور کچھ نہیں تو میں چاقو کی نوک اس کی گردن میں ذرا گہری کر سکتا تھا مگر وہ نہ صرف اپنے چاقو سے دستبردار ہوا بلکہ اس نے ہاتھ پیر بھی موڑ دیے۔ مزاحمت کے دوران کوئی داغ کندہ کرنے کی بات در تھی۔ مجھے خود کو روکنے ہوئے بہت میزاری ہوئی۔

میرے اندازے سے چند لمحے زیادہ صرف ہوئے۔ گلوں کو اپنے دیکھے ہوئے پر یقین کرنے کے لیے۔ بہر حال کچھ وقت چاہیے تھا۔ سب کچھ دیکھ دیکھ، جیسے پلک جھپکنے کے رسمے میں ہوا۔ میرے جسم نے خود کا اندازہ میں ایک ساتھ کئی کام کیے تھے۔ رجن کے ہونے پر خود کو روکا، دائیں طرف ہٹایا، خالی ہاتھ نے اس کا چاقو بردار ہاتھ جکڑا، میرے چاقو بردار ہاتھ نے اس کی گردن حصار میں لی۔ ٹھیل کا کتنا تھا کہ چاقو کی گرفت اپنی جگہ لیکن اصل بات تو اس کے استعمال

یازہ کی گری

کے نظم و ضبط میں ہے، چاقو تو کوئی بھی گھونب سکتا ہے۔ صحیح مہارت اور مشاقی یہ ہے کہ چاقو مقابل سے کتنے فاصلے پر رکھنا ہے؟ کیا مقصود ہے؟ کھنکھس کرنا ہے، ہلکی لکیریں ڈالنی ہیں، لباس چاک کرنا ہے یا نشانے کے لیے کوئی مخصوص جگہ مطلوب ہے؟ ایک دھن۔ ٹھیل نے حیدر آباد میں ایسے ہی ایک موقع پر مجھے موت کے چاقو چلانے کا اشارہ کیا تھا سو میں نے شاہ کبیرا کا ازار بند کاٹ دیا تھا۔ اڑے کے دادا کی اس سے بڑی رسوائی کیا ہو سکتی ہے شاہ کبیرا کے جسم کے کسی حصے سے چاقو مس نہیں ہوا تھا۔ رجن سے بھی کچھ ایسا ہی سلوک کیا جاسکتا تھا لیکن اس نے اپنا جسم ہی ڈھلکا دیا۔

عمارت میں شور کے سوتے پھوٹ پڑے۔ میں نے ٹھوکر سے رجن کا گرا ہوا چاقو اس سے دور کیا اور اس کی گردن سے ہاتھ اٹھا کے اپنا چاقو بردار زور کی طرف اچھال دیا۔ دونوں نے ہاتھ بلند کیے تھے لیکن جھوٹے چاقو اچھال لیا۔ اچھا ہوا جو میرے ہاتھ میں چاقو نہیں رہا۔ رجن نے انگلیاں مت ایٹھ رہی تھیں۔ رجن کو دیکھ کے بنے خاں کا چہرہ نظروں میں گھوم جاتا تھا۔

جھٹکا دینے پر رجن مجھ سے الگ ہوا اور فرش پر لڑھک پڑا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ کے میں نے چوکی کی طرف قدم بڑھائے۔

ادھر سے جمو اور زور نے 'ادھر سے شمشاد خاں اور اڑے کے کئی آدمیوں نے چوکی سے اتر کے مجھے دبوچ لیا۔ ہر طرف سے لوگ اٹنے لگے۔ ہر کوئی چیخ رہا تھا، 'المانہ لہرے لگا رہا تھا۔ انہوں نے میری ہاتھ چوٹنے شروع کر دیے۔ جمو اور زور نے مجھے کندھوں پر اٹھالیا۔ شمشاد خاں نے میری ٹانگ جکڑ لی۔ وہ میرے پیر سینے سے لگتا، آنکھوں سے مس کرتا۔ اسی طرح وہ لوگ مجھے ٹھیل کے سامنے لے آئے۔ ٹھیل نے چپکتی آنکھوں سے ایک بار نظر پھیر کے مجھے دیکھا۔ جانے کیوں اس سے ٹکاپ ملا کے مجھے دشت ہونے لگی۔ ٹھیل بھی سر جھکا کے حد گزرتا لگا۔

کبھی جیسے پاگل ہو گئے تھے۔ ہر ایک چوکی کی طرف آنے کے لیے بے قرار تھا اور وہ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ بہت ہاتھ پیر چلا کے بہت چیخ و پکار کے بعد جمو زور اور اڑے کے آدمیوں نے مجھے ان سے ہٹایا اور ٹھیل کے پاس بٹھا دیا۔

چوکی کے آدمی کھڑے ہو ہو کے نظم و ضبط کے احکام صادر کرتے رہے، پھر انہیں کسی کمرے سے لاٹھیاں منگوائی پڑیں، لاٹھیاں لے کر چند آدمی چوکی سے اترے تب جا کے

کے کما کر چہان کو زینے کے بیرونی دروازے سے بلائی منزل پر بٹھایا جائے۔ اڑے کے ایک بزرگ سرگوشیوں میں ہدایات دے کے شمشاد خاں فوراً اٹھ گیا۔ ہنسل نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ انہوں نے نہیں پوچھا لیکن ہم وہاں کیسے بیٹھے رہ سکتے تھے۔ ہم تم اٹھ گئے۔ لوگوں نے پیچھے ہٹ ہٹ کے ہمیں راستہ پاک کی آمد اور یکے بعد دیگرے ہم سب کے بلائی منزل گرنے پر عمارت میں چڑیگیاں ہونے لگیں۔

زینے کا ایک دروازہ عمارت کے اندر بھی ملتا تھا۔
 نے آتیا کو زینے میں روک لیا اور تھانے دار چہاڑ
 کی وجہ پوچھی۔ آتیا نے سنسنائی آواز میں یہ جملہ
 بتایا، وہ ہمارے لیے ناقابل فہم بھی تھا، ناقابل یقین مح
 کے کہنے کے مطابق کوئی سات بجے تنگے میں سوا
 تارا بیکم اڑے پردہایاں دے آئی تھی۔ رات کے
 اس کے بلا خانے پر ڈھانے پاندھے ہوئے کچھ لوگ
 آئے ان کے پاس پیچخبر اور سچے تھے انہوں نے

پر موجود تمام افراد کو ایک کورسری میں بند کر دیا۔ اس سے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ وہ چاندنی بانو کو اٹھا کر لے گا۔ ب کے وقت بازار میں گھرا سنا ہوتا ہے۔ اس کو کالوں کاں خبر نہ ہوئی۔ مارا بیگم بار بار میرا نام تھی۔ شمشاد خاں نے اس کے ساتھ آنے والے سازندے کو، بالائی منزل بھیج دیا کہ وہ اپنی آنکھوں لے، میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرام کر رہا ہوں، خاں کے علاوہ صبح اڑے پر موجود چند اور آدمیوں نے بیگم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ رات گئے تک

ان سب کے درمیان ان کے پرستے رہے ہیں۔
 نے اس واقعے کی بات ہمیں کچھ بتانا مناسب
 ضروری سمجھا۔ عمارت میں لوگ جمع ہو چکے تھے اور
 در میں رجن سے میرا آگنا سامنا ہونے والا تھا۔ اڑ
 تھا کہ تارا بیکم کے فزائن کی ردوداد میرے لیے انتہا
 ہو سکتی ہے۔ مارا ٹیکم کو کوئی غلط فہمی تھی تو شہزاد
 اپنی دانست میں رفع کر دی تھی۔
 آغا بیک کی زبانی یہ ماجرا اس کے سب گنگ روم

اس سے کچھ اور جانا چاہتا مگر بیوی سرسباز ہو گیا۔ ہم نے تیز قدموں سے زینہ عبور کیا۔

چوہان دو سپاہیوں ایک خوبن ماسے اسرے
 66

لئے ہو رات کو یہ تینوں بلکہ چاروں بیٹے تھے۔ ”وہ دھمکتی
وازمیں بولا۔
”جی ہاں جناب! یہاں کہا ہے۔“ شمشاد خاں نے
ب کہ کہا ”وہ سحرارے لوگ جانتے ہیں۔ سبھی، سبھی۔“
”اور بنے، بنے خاں ہمارے کہاں ہے؟“
شمشاد خاں نے ایک لمبی سانس کھینچ کے مختصر اے کل
لے حادثے کے بارے میں بتایا اور کہا کہ کل صبح سے بنے
کا کوئی علم نہیں۔

تھانے وار، ایک نظر اپنے بخت افسر کو دیکھ کر جب
لیا اور کچھ دیر کے مرا جے کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر
”تو تمہارا ہی نام بار ہے؟“
میں نے سر جھکا کر تائید کی۔
”نہی نے پرسوں رات تارا بیگم کے بالا خانے پر
رہی بانو کے سوئے کی بات کی تھی؟“
”جی ہاں۔“ میں نے انہی ہوئی آواز سے کہا۔
”سچ چھا۔“ چوہان کے لہجے میں طنز نمایاں تھا ”خوب!
نیر، سوئے کے کہہ۔“ کے تھم۔“

”آپ کو نہیں معلوم؟“

”ہم تم سے پوچھتے ہیں۔“ وہ غصے سے بولا۔

”جو آپ کو معلوم ہوا ہے، وہی ٹھیک ہے۔“

اس نے چہرے پر ایک رنگ آیا تھا لیکن وہ سنبھل گیا

ٹیکلے کی طرح میں بولا ”مارا بیگم نے بتایا، تم نے دو لاکھ روپے

لا کٹائی تھی۔“

”آپ نے ٹھیک سنا۔“

”دو لاکھ؟“ اس نے معنی خیز انداز میں دہرایا ”خاص

”دو لاکھ ایک ساتھ اتنی بڑی رقم بھی دیکھئے، تم

١٦٧

”اس نے سڑی چڑی پیٹو پدے اور بھڑی آواز میں بولا
”کام ہی کی غرض سے یہاں آئے ہیں صاحب زادے! جو کچھ
مہم ہو پوچھتے ہیں، تمہارے لیے اچھا ہو گا کہ ٹھیک ٹھیک جواب
دے دو۔“

”بشرطیکہ آپ ٹھیک ٹھیک سوال بھی کریں۔“

اس نے چپکے چپکے جھجکا میں ”اس کے ہونٹ بھی سڑکے گئے
”کب سے تمہارا نیکم کو جانتے ہو؟“

”چھ سوں رات سے۔“

”تو کیا برسوں پہلے بار چاندنی مانو کو دیکھا تھا؟“

”یہی نتیجہ نکلتا ہے۔“
 ”اور“ اور پہلی ملاقات میں بولی لگا دی؟“
 ”آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“
 ”نہیں نہیں۔“ وہ کھنکھاس کے بولا ”ہم کو کیا ہو سکتا ہے۔ لکھ لٹاؤ۔“
 ”نارائیکم کا بالا خانہ ایک دکان ہے۔ کوئی بھی بولی لگا سکتا ہے۔“ میں نے ترشٹے سے کہا ”دولا لکھ لیا“ اس سے دہنی جو گنری رقم بھی لگائی جاسکتی تھی۔“

”جی ہاں جی ہاں۔“ چوہان نے مسخرانہ انداز میں کہا اور پھل کے بولا ”یہ رقم تمہارے پاس موجود ہے؟“

”بہتر ہے“ آپ اس سوال پر نظر ثانی کریں ورنہ نامناسب جواب کا الزام عائد مت کیجئے گا۔“

”کچھ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔“

شرشاد خاں مدخلت کرنا چاہتا تھا، بھٹل نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”معلوم ہوتا ہے“ اڑے والوں نے اب دوسرے کام شروع کر دیے۔

”جی ہاں چوہان جی!“ شمشاد خاں نے تیزی سے کہا

یہ سب کچھ دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گیا۔

بھی سکھاؤ گے؟

”ہم اپنی زبان میں بات کریں تو پھر آپ کو بھی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔“

”تم ہوں؟“

”میرے ہی میں تو کچھ اور آیا تھا لیکن میں نے خود پر جب کیا ”ہم کوئی بھی ہوں لیکن وہ نہیں ہیں جن کے لیے آپ بے قرار ہو رہے ہیں۔“

چوہان کے ماتحت کا پارا چھ گیا۔ اس سے برداشت نہیں ہوا ”اس نے چوہان سے اجازت لیے بغیر گھر سے بچے میں مجھے تنبیہ کی کہ میں اپنی کھال میں رہوں اور اوقات سے بڑھ کے بات نہ کروں۔“

”آپ بھی ذرا زمین دیکھ کے بات کیجئے جناب“ اور آگے کچھ کہنے سے پہلے کان کھول کر سن لیجئے ”اور آخری بار اس کے بعد جو مرضی ہو، کیجئے گا۔ استاد شمشاد خاں کی بات پر آپ نے غور نہیں کیا یا یقین نہیں کیا لیکن آپ کے پاس ذرا عین کی نہیں۔ اسے طور پر آپ یہاں اڑے پر موجود لوگوں سے ٹوہ لے سکتے ہیں کہ کچھ رات ہم نے کہاں گزارا ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ چاندنی بانو کو کون لے گیا؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ہم کوئی ٹھیکے دار نہیں ہیں۔ ایک دوسرا جواب بھی ہے پہلے یہ شب کچھ دیر کے لیے سہمی ڈن سے نکال دیتے کہ وہ بھی سے ہو سکتے ہیں۔ جو میں کہتا ہوں ”اچھا ہو گا“ اسے توجہ سے سنئے اور ہو سکے تو درمیان میں دخل مت دیجئے۔ ایک ہی بات ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ تارا بیگم نے چاندنی بانو کے لیے ہماری نذر ادا قیامت سن کے بے شک انکار کر دیا تھا لیکن اس کے انکار میں زور نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے سوچنے کا موقع دیا جائے۔ اسے چاندنی بانو کا عندیہ بھی لینا ہو گا۔ اتنی بڑی بولی سن کے اس کا پریشان ہو جانا لازم تھا۔ ہم نے خود بھی اسے سوچنے کی سہلت دی تھی

اور یاد کر لیا تھا کہ اپنی نامادری کی صورت میں وہ ہمیں جلد سے جلد مطلع کر دے۔ ہو سکتا ہے ”اس نے کل سارے دن بالا خانے پر آنے والے چاندنی بانو کے طلبکار راجاؤں، نوابوں سے رابطہ کیا ہو۔ ہم جیسا گنگا بھتہ سے نکل جانے کے اندیشہ میں اس نے انہیں بت کم وقت دیا ہو گا۔ ان لوگوں کی طرف سے اسے کوئی امید افزا یا دوسرے لفظوں میں شہزا جواب نہیں ملا تو اس نے فی الفور ہمارے پاس قاصد روانہ کیا۔ ہم رات ہی، اسی قاصد کے ہمراہ چاندنی بانو کو لانے کے لیے بالا خانے جا چکے تھے لیکن جس شخص کے لیے ہم نے چاندنی بانو کی بات کی تھی وہی کہیں کم ہو گیا تھا۔

اب ہمارے وہاں جانے سے کیا حاصل بہتر ہے، پہلے لوگوں کو جا کے نپوے جن سے کل تارا بیگم نے چاندنی کے لیے بات کی تھی۔ ہمیں معلوم ہے ”وہاں آپ کی رر اتنی آسان نہیں ہوگی“ اجازت لینی پڑے گی ”سات سا کرنے پڑیں گے۔ اس طرح آپ منہ اٹھا کے وہاں نہ جا سکیں گے جس طرح یہاں ہم چور اچکوں“ اٹھائی کیوں پاس آگئے ہیں۔“

میری توقع کے مطابق اس مرتبہ چوہان ایسا برگشتہ ہوا۔ وہ منہ پھلانے، منہ جانے کچھ سوچتا اور مسلسل گھورتا رہا، پھر چونک کے آفرانہ لہجے میں بولا ”ہم کبیر جا سکتے ہیں۔ ہمارے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں لگتا۔ سب ہمیں جانتے ہیں کہ ہم کسی لاث صاحب کو نہیں کرتے۔“

اتنی دیر میں اٹھاپا بھٹل کے لیے چچان لے آیا۔ دلبر اور اڑے کے دوسرے آدمی مٹھائی کے طشت، وغیرہ لے آئے۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ آدھوں کے واپس جاتے ہی چوہان اکھڑی ہوئی آؤ بولا ”ٹھیک ہے، دوسری طرف بھی ہم دیکھیں گے لیکن رہے استاد! ہم کسی وقت بھی واپس آ سکتے ہیں۔“

میں نے سکون کی سانس لی اور کہا ”آپ کو زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ کسی کو بھی بھیج دیجئے گا، ہم خود آگے لیکن ایک درخواست ہے جناب! زیادہ دقت نہ مہرانی ہوگی۔ ہمیں یہاں سے جلد از جلد روانہ ہو، آپ نہ آتے تو ہم آج شام یا کل صبح کسی دقت چلے جا۔“ تم لوگ ابھی کہیں نہیں جاؤ گے۔“

”ہم ولایت نہیں جائیں گے جناب! یہیں ہی میں رہیں گے اور اپنے اتے بچے سارے دیتے جائیں یہاں استاد شمشاد خاں بھی ہماری ضمانت کے لیے ہیں۔“

”باکل، باکل۔“ شمشاد خاں نے سینے پر ہاتھ مارا ”ایک میں ہی نہیں سارا اڈا“ اڑے کا ایک ایک آدمی ”ہمیں صرف تمہارے مہمانوں سے واسطہ چوہان حتیٰ لہجے میں بولا ”یہ کہیں نہیں جائیں گے۔“ میں آپ سے منت کرتا ہوں چوہان جی! ان نہ رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ شمشاد خا سے بولا ”ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ایک تو میں راستے کا پتہ نہیں کیا۔ یہ بے جا رہے تو آگے جا رہے معلوم ہوا تو میں خد کر کے ایشیں سے یہاں لے

وقت میں الو کا پٹھا، بٹنل بھائی کی بات مان لیتا تو یہ سارا کھٹ راک کا ہے کہ تو تا لیکن ہونی کو کچھ بولتے ہیں کون ٹال سکتا ہے۔ آپ کو خود اندازہ کرنا چاہیے کہ یہ گرمی بھی کسی وجہ سے ہے۔ میں آپ کو اصل بات بتا ہوں۔ شہزادے باہر میاں نے اپنے لیے نہیں، بے خاں فراری کے لیے چاندنی بانو کی بات کی تھی۔ بے خاں اس پر مرمتا تھا لیکن وہ سورا کچھ ایسا غائب ہوا کہ پھر دکھائی ہی نہیں دیا۔ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ پر ہوا یہی ہے بے خاں میں بھی کوئی لڑکی اٹھا کے لے جانے کا دم نہیں ہے مگر کیا پتہ، غیرت مندی اولاد تھا، باکل ہی نہ ہو گیا ہو۔ وہ خریدی ہوئی چاندنی کے لیے تیار نہیں تھا۔ بے خاں کو بھی ڈھونڈیے۔ یہ لوگ میرے مہمان ہیں اور مجھ کو جی جان سے پیارے ہیں۔ میرے منہ میں خاک، ان پر جرم ثابت ہو جائے اور یہ آپ کو ادھر دکھائی نہ دیں تو آپ مجھ کو لے چلے گا۔ میں جرم قبول کروں گا۔ یہ واپس باٹنے کی باتیں گے لکھتو میں ان سے ایسا برا تاؤ ہوں۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے مگر جب تک ہماری اجازت نہ ہو۔“ چوہان حکم دے کر بھاگ گیا ”نہیں یہاں ٹھہرے رہنا ہے۔“

”اس سے بہتر ہے کہ آپ فوراً ہمیں عدالت میں پیش کر دیں۔“ میں نے اچھٹی آواز میں کہا۔

”وقت آنے پر تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دی جائے گی۔“

”مگر ہم بہت دیر تک یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔“

”کیوں؟ تم کو تو یہاں کا اڈا سنبھالنا ہے۔“

”اڑے پر اب استاد شمشاد خاں ہی نہیں گئے۔“

”پھر رجن استاد سے پٹیا کرنے کی ضرورت تھی؟“

”رجن نے حرای پن کیا تھا۔“ شمشاد خاں نے غصے اور زہت سے لب ریز آواز میں کہا ”رجن ادھر چوکی پر بیٹھ جاتا تو اڈا برباد ہو جاتا۔“ شمشاد خاں نے از سر نو وہ حالات بیان کیے ان کے سبب مجھے رجن کے خلاف چاقو اٹھانا پڑا تھا۔

چوہان تپتے پھلانے، ہونٹ پیچھے کپ چپ بیٹھا رہا، پھر س نے اپنے ماتحت افسرے انگریزی میں پوچھا کہ ہم لوگ تو بکری مختلف کمائی سنا رہے ہیں وہ کیا سمجھتا ہے۔

”جناب! میری رائے میں تو حفظ مانتھم کے طور پر دئے جواب دیا۔“ ماتحت افسر نے ہچکچاتے چوہان کا منہ دیکھ کر افسرے کی بھی ہنسی ہو سکتی ہے۔

”تو پھر یہاں ان کے ٹھہرے رہنے کی کیا ضمانت ہے؟“

بھاگ بھی سکتے ہیں۔“

چوہان نے کچھ ٹال کے بعد اپنے ماتحت سے کہا ”بھاگ کر کہاں جائیں گے، شمشاد خاں تو موجود ہے ہی، ہم اسے کھینچ دیں گے۔“

”شمشاد خاں لڑکی کو پازاب کرانے میں کسی حد تک ہماری مدد کر سکتا ہے۔“ ماتحت افسر مودبانہ لہجے میں بولا ”بھی تو بات انہی حد تک ہے لیکن لڑکی جلد ہی بازیافت نہ ہوئی تو اوپر بھی چھینچ سکتی ہے اور عین صورت اختیار کر سکتی ہے۔ اہم بات لڑکی کا سراغ ملنا ہے۔“

”لیکن شاید ہمیں یہاں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ تم نے نوجوان استاد کی گفتگو پر غور نہیں کیا۔ یہ اڑے کا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ لکھتو کے اڑے سے اسے دوپٹھی ہوتی تو یہ خود یہاں ٹھہرنے پر اصرار کرتا۔“

”ٹھیک ہے جناب لیکن بیچ میں لڑکی بھی تو آگئی ہے۔ ایسے حالات میں ان کا شہر میں قیام کرنا کیونکر مناسب ہو سکتا ہے۔“ ماتحت افسر نے زیر لبی سے کہا ”یہ عاجزی بھی ہو سکتی ہے۔“

چوہان کچھ منتشر سا نظر آنے لگا، پھر بولا ”لیکن یہ کیا جرت ناک واقعہ ہے کہ ایک نوافق کی خوشنودی کے لیے کوئی اتنی بڑی رقم راز پر لگا دے۔“

”یہ کمائی کا قلم بھی تو ہے جناب!“

”مگر بولی گئی تھی۔ تارا بیگم کا بیان ہے۔“

”بولی لگانا اور بولی ادا کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ بولی کی ادائی کا مرحلہ کب آیا تھا اور اتنا بھی کب تھا جناب! کیا اتنی بڑی رقم یہ ساتھ لیے پھرتے ہیں؟“

میرے جی میں اتنی ”اتنا“ کہ رجم موجود ہے تو اس کا بندوبست ثانوی چیز ہے لیکن میں خاموش ہی رہا۔

چوہان نے گویا میری طرف سے جواب دیا ”بات کی ہونے پر رقم کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ جب تک لڑکی تارا بیگم کی تحویل میں رہتی۔“

”لیکن جناب! جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے، بولی تو ارتکاب کیے جانے والے جرم کی دھال کے طور پر بھی لگائی جا سکتی ہے۔“

”پھر انہیں بولی لگائی ہی نہیں چاہیے تھی۔ بولی لگانے کے باعث تو ہم آسانی سے ان تک پہنچ سکتے۔ لڑکی انہیں مطلب تھی تو انہوں نے اتنی غلت کیوں کی۔ کچھ روز کا وقت دے کے لکھتو سے کچھ دن باہر رہے کہ یہ چپ چپاتے واپس آتے اور یہ قدم اٹھا لیتے۔“

کشتیاں پبلی کیشنز



”میرا خیال ہے، ہمیں ٹھنڈا چاہیے کہ ان کے پاس رقم کی ادائیگی کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ اس نئے سے بات آگے بڑھ سکتی ہے۔“
”یہ کوئی ایسا نکتہ نہیں۔“ چوہان نے رکھائی سے کہا۔ ”یہ رقم کا انتظام کر سکتے ہیں۔“

”بہت بڑی رقم ہے جناب!“
خاموش رہتا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ٹھٹھلنے میں اس اثنا میں انھیں میچ کے مجھے کوئی اشارہ کیا، میں کچھ اخذ نہیں کر سکا کہ یہ ان کی گفتگو میں مداخلت سے باز رہنے کی ہدایت ہے یا مداخلت کرنے کی۔ میری دانست میں ابھی مجھے مضبوطی کرنا چاہیے تھا۔ میں ہراسنا بیٹھا رہا۔

چوہان کو گفتگو سے دو چار دیکھ کے ماتحت افسر نے کہا ”مجھے تو یہ لوگ بہت برا سرا رکھتے ہیں۔ اگر واقعی یہ سچ ہے کہ انہوں نے چاندنی بانو کے لیے اس رقم کی پیشکش کی تھی تو آگے کا تخمینہ بھی لگایا جاسکتا ہے، اور آپ ہی کے بقول ایک نوافل کے لیے یہ اس خلیفہ رقم کی سخاوت کر سکتے ہیں تو یہی کچھ، ہمیں تک تو ان کے پاس نہیں ہوگا۔ یہ تو ایک معما ہے جناب! مجھے تو یہ سب کچھ مبافہ معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔“

”ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔“ چوہان متردد لہجے میں بولا ”بہر حال آگے دیکھتے ہیں۔“

”فرض کرو، چاندنی بانو بازیاب ہو جاتی ہے اور بے خاں بھی مل جاتا ہے۔“ چوہان نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا ”تو تمہاری بولی قائم رہے گی؟“

”یہ بے خاں پر منحصر ہے، اگر بے خاں چاندنی بانو کے برآمد ہونے کے بعد بھی اس کا طلب گار ہے تو ہم اپنی زبان پر قائم ہیں۔“

”دیکھا آپ نے!“ ماتحت نے بہ جگت انگریزی میں کہا ”اب پیشکش مشروط ہو گئی ہے شاید اس لیے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

میں نے چاہا کہ کسوں، ظاہر ہے، اب صورت حال بدل گئی ہے لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔
چوہان نے غالباً اپنے ماتحت کی دل جوئی کے لیے اسی کا سوال دہرایا ”رقم کا انتظام کتنی دیر میں ہو جائے گا؟ تم اپنی بڑی رقم ساتھ لے کر نہیں پھرے ہو گے؟“

”میں نے سوچا، کسوں، اس کا جواب وہی ہے جو ابھی خود اس نے اپنے ماتحت کو دیا تھا لیکن ابھی انگریزی کا اظہار سروسٹ مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔“ مجھبی کے ایک بینک

میں رقم محفوظ ہے۔ وہاں سے منتقل ہونے میں چند روز جائیں گے۔“

”تریشگی کے بے، پچیس تیس ہزار روپے تو ڈالے جاسکتے ہیں۔“ ٹھٹھلنے نے پہلی بار زبان کھولی۔
”اوہ!“ چوہان دیدے بھانجے کے رو گیا۔

میرا خیال تھا کہ چوہان پولیس کا آدمی ہے، شک اور دتیرہ اور خامرہ ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ رقم رکھائی جا۔ اس نے خواہش نہیں کی۔

”شمشاد خاں نے مصطفیٰ اور شربت کی طرف چم توجہ دلائی لیکن اس نے کوئی رغبت ظاہر نہیں کی۔“
”بہر حال ابھی تین چار روز جنہیں میںیں ٹھہرے رہتا ہے یہ حکم کس بنیاد پر ہے؟“ میں نے الجھ کے کہا۔

”واقعے کی نوعیت کی بنیاد پر۔“ وہ چڑچڑے ہیں۔
”مشتبہ لوگوں کو پابند کرنے کا ہمیں اختیار ہے اور تمہارا لیے بھی یہی ہوتا ہے۔“

”لیکن ہم بھی آپ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔“
”صرف تمہارے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔“
”ہمارا اعتبار کیجئے۔ کوئی سرگرمی ہو تو میں پھر دہ

کرنا ہوں۔“ میں نے پھر مڑی سے کہا ”یقیناً کیجئے، گوا اور مبافہ نہیں ہے۔ ایک سیدھا سادا معاملہ پیچیدہ بنائے، بے خاں، ایک نوجوان جس کے سامنے زندگی تھی، اس لڑکی چاندنی بانو کے بغیر بہت ادھر اور رہتا۔ ہم

ایک آدمی دوسرے آدمی کے بغیر بہت دیر اور ہو جا صاحب! بے خاں کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اس حاصل کر سکے۔ یہ اتفاق تھا کہ چاندنی اس قسم کی لڑکی تھی جنہیں اس طرح کا کچھ بدل دے کے، کچھ نذر حاصل کیا جاسکتا تھا۔ ادھر میرے پاس اپنی ضرورت

زائد روپے تھے یہ رقم چلے جانے سے مجھے کوئی فرق ٹھہرے خاں کو چاندنی مل جاتی۔ کسی کو اس کا مظلوم جائے تو اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے مگر آپ شاید سمجھیں گے، میں سمجھا نہیں پاؤں گا۔ بس اتنی سی بات

جناب! بے خاں، رجن سے بھی کمزور نہ ہوتا۔ اس ہی حاضر نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے، وہی چاندنی بانو کو لے لیکن اس واقعے سے ہم لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

”ہم سمجھ رہے ہیں لیکن گواہ و شہادت، دلیل و قانونی واجبات ہیں۔“ چوہان کی آنکھوں میں غیر معمولی ہویہ اہولی۔ پہلی بار مجھے اس کے لہجے سے جذب اور احساس ہوا۔ کہنے لگا۔ ”آگے بیانات کے لیے تم

ضرورت پرستی ہے۔“
”مگر بھیجب، جب ہم کسی طور ملوث۔“ میں نے ٹھٹھل کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔
”چوہان بھی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ شمشاد خاں نے بہت اصرار کیا لیکن چوہان نے مصطفیٰ کا ایک دانہ، شربت کا ایک جرم لینا گوارا نہیں کیا۔ بھی اس کے ساتھ اٹھ گئے اور پیچھے چلے گئے۔“

”میرا خیال ہے، ہمیں ٹھنڈا چاہیے کہ ان کے پاس رقم کی ادائیگی کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ اس نئے سے بات آگے بڑھ سکتی ہے۔“
”یہ کوئی ایسا نکتہ نہیں۔“ چوہان نے رکھائی سے کہا۔ ”یہ رقم کا انتظام کر سکتے ہیں۔“

”بہت بڑی رقم ہے جناب!“
خاموش رہتا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ٹھٹھلنے میں اس اثنا میں انھیں میچ کے مجھے کوئی اشارہ کیا، میں کچھ اخذ نہیں کر سکا کہ یہ ان کی گفتگو میں مداخلت سے باز رہنے کی ہدایت ہے یا مداخلت کرنے کی۔ میری دانست میں ابھی مجھے مضبوطی کرنا چاہیے تھا۔ میں ہراسنا بیٹھا رہا۔

چوہان کو گفتگو سے دو چار دیکھ کے ماتحت افسر نے کہا ”مجھے تو یہ لوگ بہت برا سرا رکھتے ہیں۔ اگر واقعی یہ سچ ہے کہ انہوں نے چاندنی بانو کے لیے اس رقم کی پیشکش کی تھی تو آگے کا تخمینہ بھی لگایا جاسکتا ہے، اور آپ ہی کے بقول ایک نوافل کے لیے یہ اس خلیفہ رقم کی سخاوت کر سکتے ہیں تو یہی کچھ، ہمیں تک تو ان کے پاس نہیں ہوگا۔ یہ تو ایک معما ہے جناب! مجھے تو یہ سب کچھ مبافہ معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔“

”ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔“ چوہان متردد لہجے میں بولا ”بہر حال آگے دیکھتے ہیں۔“
”فرض کرو، چاندنی بانو بازیاب ہو جاتی ہے اور بے خاں بھی مل جاتا ہے۔“ چوہان نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا ”تو تمہاری بولی قائم رہے گی؟“

”یہ بے خاں پر منحصر ہے، اگر بے خاں چاندنی بانو کے برآمد ہونے کے بعد بھی اس کا طلب گار ہے تو ہم اپنی زبان پر قائم ہیں۔“
”دیکھا آپ نے!“ ماتحت نے بہ جگت انگریزی میں کہا ”اب پیشکش مشروط ہو گئی ہے شاید اس لیے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

میں نے چاہا کہ کسوں، ظاہر ہے، اب صورت حال بدل گئی ہے لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔
چوہان نے غالباً اپنے ماتحت کی دل جوئی کے لیے اسی کا سوال دہرایا ”رقم کا انتظام کتنی دیر میں ہو جائے گا؟ تم اپنی بڑی رقم ساتھ لے کر نہیں پھرے ہو گے؟“

”میں نے سوچا، کسوں، اس کا جواب وہی ہے جو ابھی خود اس نے اپنے ماتحت کو دیا تھا لیکن ابھی انگریزی کا اظہار سروسٹ مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔“ مجھبی کے ایک بینک

میں رقم محفوظ ہے۔ وہاں سے منتقل ہونے میں چند روز جائیں گے۔“
”تریشگی کے بے، پچیس تیس ہزار روپے تو ڈالے جاسکتے ہیں۔“ ٹھٹھلنے نے پہلی بار زبان کھولی۔
”اوہ!“ چوہان دیدے بھانجے کے رو گیا۔

میرا خیال تھا کہ چوہان پولیس کا آدمی ہے، شک اور دتیرہ اور خامرہ ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ رقم رکھائی جا۔ اس نے خواہش نہیں کی۔
”شمشاد خاں نے مصطفیٰ اور شربت کی طرف چم توجہ دلائی لیکن اس نے کوئی رغبت ظاہر نہیں کی۔“
”بہر حال ابھی تین چار روز جنہیں میںیں ٹھہرے رہتا ہے یہ حکم کس بنیاد پر ہے؟“ میں نے الجھ کے کہا۔

”واقعے کی نوعیت کی بنیاد پر۔“ وہ چڑچڑے ہیں۔
”مشتبہ لوگوں کو پابند کرنے کا ہمیں اختیار ہے اور تمہارا لیے بھی یہی ہوتا ہے۔“
”لیکن ہم بھی آپ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔“
”صرف تمہارے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔“
”ہمارا اعتبار کیجئے۔ کوئی سرگرمی ہو تو میں پھر دہ

کرنا ہوں۔“ میں نے پھر مڑی سے کہا ”یقیناً کیجئے، گوا اور مبافہ نہیں ہے۔ ایک سیدھا سادا معاملہ پیچیدہ بنائے، بے خاں، ایک نوجوان جس کے سامنے زندگی تھی، اس لڑکی چاندنی بانو کے بغیر بہت ادھر اور رہتا۔ ہم

ایک آدمی دوسرے آدمی کے بغیر بہت دیر اور ہو جا صاحب! بے خاں کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اس حاصل کر سکے۔ یہ اتفاق تھا کہ چاندنی اس قسم کی لڑکی تھی جنہیں اس طرح کا کچھ بدل دے کے، کچھ نذر حاصل کیا جاسکتا تھا۔ ادھر میرے پاس اپنی ضرورت

زائد روپے تھے یہ رقم چلے جانے سے مجھے کوئی فرق ٹھہرے خاں کو چاندنی مل جاتی۔ کسی کو اس کا مظلوم جائے تو اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے مگر آپ شاید سمجھیں گے، میں سمجھا نہیں پاؤں گا۔ بس اتنی سی بات

جناب! بے خاں، رجن سے بھی کمزور نہ ہوتا۔ اس ہی حاضر نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے، وہی چاندنی بانو کو لے لیکن اس واقعے سے ہم لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔
”ہم سمجھ رہے ہیں لیکن گواہ و شہادت، دلیل و قانونی واجبات ہیں۔“ چوہان کی آنکھوں میں غیر معمولی ہویہ اہولی۔ پہلی بار مجھے اس کے لہجے سے جذب اور احساس ہوا۔ کہنے لگا۔ ”آگے بیانات کے لیے تم

ضرورت پرستی ہے۔“
”مگر بھیجب، جب ہم کسی طور ملوث۔“ میں نے ٹھٹھل کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔
”چوہان بھی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ شمشاد خاں نے بہت اصرار کیا لیکن چوہان نے مصطفیٰ کا ایک دانہ، شربت کا ایک جرم لینا گوارا نہیں کیا۔ بھی اس کے ساتھ اٹھ گئے اور پیچھے چلے گئے۔“

”میرا خیال ہے، ہمیں ٹھنڈا چاہیے کہ ان کے پاس رقم کی ادائیگی کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ اس نئے سے بات آگے بڑھ سکتی ہے۔“
”یہ کوئی ایسا نکتہ نہیں۔“ چوہان نے رکھائی سے کہا۔ ”یہ رقم کا انتظام کر سکتے ہیں۔“

”بہت بڑی رقم ہے جناب!“
خاموش رہتا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ٹھٹھلنے میں اس اثنا میں انھیں میچ کے مجھے کوئی اشارہ کیا، میں کچھ اخذ نہیں کر سکا کہ یہ ان کی گفتگو میں مداخلت سے باز رہنے کی ہدایت ہے یا مداخلت کرنے کی۔ میری دانست میں ابھی مجھے مضبوطی کرنا چاہیے تھا۔ میں ہراسنا بیٹھا رہا۔

چوہان کو گفتگو سے دو چار دیکھ کے ماتحت افسر نے کہا ”مجھے تو یہ لوگ بہت برا سرا رکھتے ہیں۔ اگر واقعی یہ سچ ہے کہ انہوں نے چاندنی بانو کے لیے اس رقم کی پیشکش کی تھی تو آگے کا تخمینہ بھی لگایا جاسکتا ہے، اور آپ ہی کے بقول ایک نوافل کے لیے یہ اس خلیفہ رقم کی سخاوت کر سکتے ہیں تو یہی کچھ، ہمیں تک تو ان کے پاس نہیں ہوگا۔ یہ تو ایک معما ہے جناب! مجھے تو یہ سب کچھ مبافہ معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔“

”ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔“ چوہان متردد لہجے میں بولا ”بہر حال آگے دیکھتے ہیں۔“
”فرض کرو، چاندنی بانو بازیاب ہو جاتی ہے اور بے خاں بھی مل جاتا ہے۔“ چوہان نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا ”تو تمہاری بولی قائم رہے گی؟“

”یہ بے خاں پر منحصر ہے، اگر بے خاں چاندنی بانو کے برآمد ہونے کے بعد بھی اس کا طلب گار ہے تو ہم اپنی زبان پر قائم ہیں۔“
”دیکھا آپ نے!“ ماتحت نے بہ جگت انگریزی میں کہا ”اب پیشکش مشروط ہو گئی ہے شاید اس لیے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

میں نے چاہا کہ کسوں، ظاہر ہے، اب صورت حال بدل گئی ہے لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔
چوہان نے غالباً اپنے ماتحت کی دل جوئی کے لیے اسی کا سوال دہرایا ”رقم کا انتظام کتنی دیر میں ہو جائے گا؟ تم اپنی بڑی رقم ساتھ لے کر نہیں پھرے ہو گے؟“

”میں نے سوچا، کسوں، اس کا جواب وہی ہے جو ابھی خود اس نے اپنے ماتحت کو دیا تھا لیکن ابھی انگریزی کا اظہار سروسٹ مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔“ مجھبی کے ایک بینک

میں رقم محفوظ ہے۔ وہاں سے منتقل ہونے میں چند روز جائیں گے۔“
”تریشگی کے بے، پچیس تیس ہزار روپے تو ڈالے جاسکتے ہیں۔“ ٹھٹھلنے نے پہلی بار زبان کھولی۔
”اوہ!“ چوہان دیدے بھانجے کے رو گیا۔

میرا خیال تھا کہ چوہان پولیس کا آدمی ہے، شک اور دتیرہ اور خامرہ ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ رقم رکھائی جا۔ اس نے خواہش نہیں کی۔
”شمشاد خاں نے مصطفیٰ اور شربت کی طرف چم توجہ دلائی لیکن اس نے کوئی رغبت ظاہر نہیں کی۔“
”بہر حال ابھی تین چار روز جنہیں میںیں ٹھہرے رہتا ہے یہ حکم کس بنیاد پر ہے؟“ میں نے الجھ کے کہا۔

”واقعے کی نوعیت کی بنیاد پر۔“ وہ چڑچڑے ہیں۔
”مشتبہ لوگوں کو پابند کرنے کا ہمیں اختیار ہے اور تمہارا لیے بھی یہی ہوتا ہے۔“
”لیکن ہم بھی آپ سے کچھ کہہ رہے ہیں۔“
”صرف تمہارے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔“
”ہمارا اعتبار کیجئے۔ کوئی سرگرمی ہو تو میں پھر دہ

کرنا ہوں۔“ میں نے پھر مڑی سے کہا ”یقیناً کیجئے، گوا اور مبافہ نہیں ہے۔ ایک سیدھا سادا معاملہ پیچیدہ بنائے، بے خاں، ایک نوجوان جس کے سامنے زندگی تھی، اس لڑکی چاندنی بانو کے بغیر بہت ادھر اور رہتا۔ ہم

ایک آدمی دوسرے آدمی کے بغیر بہت دیر اور ہو جا صاحب! بے خاں کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اس حاصل کر سکے۔ یہ اتفاق تھا کہ چاندنی اس قسم کی لڑکی تھی جنہیں اس طرح کا کچھ بدل دے کے، کچھ نذر حاصل کیا جاسکتا تھا۔ ادھر میرے پاس اپنی ضرورت

زائد روپے تھے یہ رقم چلے جانے سے مجھے کوئی فرق ٹھہرے خاں کو چاندنی مل جاتی۔ کسی کو اس کا مظلوم جائے تو اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے مگر آپ شاید سمجھیں گے، میں سمجھا نہیں پاؤں گا۔ بس اتنی سی بات

کچھ لوگوں کو جگہ نہ ملنے کی وجہ سے باہر جانا پڑا۔ شمشاد خاں نے اعلان کر دیا تھا کہ آج اڑے پر آنے والے ہر شخص کو مہمان کے طور پر برتا جائے گا۔ کھانا، مضافی، مشروبات، جس کی جو خواہش ہو، اسے سیر کر دیا جائے، چار بجے شام تک کھانے کا سلسلہ چلا رہا۔ دسترخوان بار بار اٹھائے اور بجھائے جاتے رہے۔ لوگوں کا اتنا بندھا رہا۔ عصر کے بعد شیرینی، شربت اور قہوے کا دور چلا۔ واللہ اعلم، مگر آغا پانے جیسے بتایا کہ رجن بھی بنے خاں کی طرح خاموشی سے چلا گیا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔ باہر چند لوگوں نے اس سے تاسف کا اظہار کیا تو جواب میں اس نے کسی تکدر اور تردد کے بغیر کہا کہ اس نے کچھ کھوایا نہیں، پایا ہے۔ کسی ایسے دپے سے نہیں، وہ استاد بھٹل کے شاگرد سے زیر ہوا ہے۔ اور اسے اطمینان ہے کہ کھیتو کے اڑے پر پہلی مرتبہ کوئی استاد آیا ہے۔ اڑے کی چوکی کی یہ مضبوطی اس کی دخل اندازی کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے اور اگر وہ چوکی پر نہیں ہے تو کیا ہوا؟ بنے خاں بھی تو نہیں ہے۔ آغا پانے کے مطابق رجن کتا تھا کہ اس سکیدہ دو برگشتہ ماحول میں اسے استاد بھٹل کے پاس جانے کی جرات نہیں لیکن یہاں نہ سہی، اس کی خدمت میں سلام پیش کرنے اور اس کے پیروں پر سر رکھنے وہ چکاتے ضرور جائے گا۔ اسے تو کسی ایسے ہی استاد کی تلاش تھی۔ یہ سن کے مجھے کچھ یہ گمان ہوا کہ آغا پانے بھی رجن کے لیے زہی کا ایک گوشہ رکھتا ہے اور اس کی عرض احوال میں رجن کے لیے کوئی سفارش نہیں ہے۔

چوکی سے اٹھنا مشکل ہو گیا تھا، بطور خاص میرا۔ شام کے وقت تو قطار لگ گئی، ایک ہفتا نہیں تھا کہ دوسرا آجاتا تھا۔ سلام کرتا، کیلے کے پتوں میں لپٹے ہوئے تازہ پھولوں کے ہار کھول کے بھٹل اور شمشاد خاں کے علاوہ میرے گلے میں ڈالتا، مضافی کا داونا آگے رکھتا اور لٹ جاتا، کوئی سکوں سے بھری ہوئی ریشمی کپڑے کی تھیلی میری طرف پکے سے بڑھا دیتا، کوئی ہاتھ جو پٹے لگتا۔ اڑے کا ایک بزرگ آدمی سامنے آنے والے شخص کا سرسری طور پر تعارف کراتا۔ میرا اور بھٹل کا سلام، اندر گزار کی نذر قبول کرنے اور اس کا نام ذہن نشین کر لینے سے عبارت تھا۔ مجھے تو اس فضول معمول سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ذرا اور جبرو بھی میری وجہ سے بندھے بیٹھے تھے۔ میں نے اشاروں میں جبرو سے التجا کی کہ وہ کسی طرح مجھے ان رسوں سے چھٹکارا دلائے۔ اسی نے میری مشکل حل کی اور شمشاد خاں کے کان میں کوئی عذر کر کے پکاک اٹھ کھڑا ہوا، پھر میں نے بھی پلٹ کے شمشاد

خاں اور بھٹل کی طرف نہیں دیکھا اور چوکی سے اتر آیا۔ عمارت کے اندر وہی جیسے سے گزرتے ہوئے ہم با منزل کے کمرے میں آکے بستروں پر دراز ہو گئے۔ ذرا جبرو کو بے چینی ہونے لگی کہ کچھ دیر کے لیے کیوں نہ سلا دیکھ آئیں، بعد میں وقت ملے نہ ملے۔ پورا ایک دن ہو گیا، لیکن ہسپتے آکے کچھ اور کسل مندی ہو گئی۔ میں نے ان کے کما کو وہی سلی کے پاس چلے جائیں، میری طرف سے وجہ لیں۔ دونوں چلے گئے۔ پیچے جا کے انہوں نے دل بٹکنی کے لیے آغا پانے کو بھیج دیا۔ آغا پانے ایک خوش طبع شخص تھا اور ایران و تورا باتیں کرتا تھا۔ جانے کہاں کہاں کے مزے دار قصبے کہ اسے انہر تھیں۔ میں نے اسے بھی واپس کر دیا۔ آدمی اپنے آپ سے باتیں کرنے کو بھی تو دل چاہتا ہے۔ چلنے سے اٹھنے والے شور سے کرا بھی محفوظ نہیں تھا۔ طرہ کی آوازیں دور جا کے ایک آواز تک طرز ہو جاتی ہیں اور گراں نہیں گزر رہیں۔ نیند تو بالکل نہیں آئی لیکن بہت محسوس ہوا۔ ہر بار ایک زندان دار زندان سے رہائی سکون۔ آدمی کو نوٹے پر یقین نہیں ہے، بار بار کی آواز کے باوجود ہر آزمائش نئی لگتی ہے۔ یہ چند دن بھی بے گزرتے تھے خواہ خواہ ضائع ہو گئے۔ وہی بات ٹھیک گوشہ گیری میں بڑی امان ہے۔ مجھے کسی مناسب و اختصار تھا۔ میں نے بھٹل سے حقیقی بات کرنے کا فیہ تھا۔

میں نے ملے کہا تھا کہ اس سے کوں گا، وہ یا تو فیہ میں زریں کے پاس ٹھہر جائے یا بیہی میں اپا جان کے جائے۔ اب ہمیں کہیں اور نہیں جانا۔ گھر سے قد ہمیں راس نہیں۔ ہر جگہ ایک ہی افادہ جیسے ہماری ہے، اور اب اتنے شہر اتنے گلی کو بچے دیکھ لے ہیں سے کوئی امید نہیں۔ آگے جہاں بھی، جن نئی جگہوں جہاں گئے کوئی ضمانت نہیں کہ مولوی صاحب وہاں اور طرف کا قصد نہ کر رکھے ہوں۔ میں بھٹل کو قانکر کے لیے نت نئے عذر تراشتا، دلیلیں کھوجتا رہا مگر مجھے نیا عذر نہ ہی دیکھ جھٹی نہیں دی۔ بھٹل سے تو پہلے بہت کچھ کہہ چکا تھا، ناراضی اور تنہی کی حد تک اصرار کیا تھا، ایک مرتبہ نہیں، کئی مرتبہ۔ یہی ایک کہ فیض آباد اور بیہی جانے کے بعد کسی دن تنہا ہوں اور اپنا آزار خود بخود بھٹوں۔ کبھی واپس نہ آیا تو کھیا لوگ مبر کر لیں گے۔ مبر کتا ہی جبرو، آدمی حاد

ہے۔ دپے بھی میں کسی کے لیے کتا زندہ ہوں یا ایک دوسری صورت بھی تھی کہ اپنے آپ کو ترک کر کے ان کے حوالے کر دوں۔ ان کا ارادہ میرا ارادہ ہو۔ آدمی غلامی بھی تو کرنا ہے، معذوری بھی تو ہو جاتا ہے اور مال و زر کی طرح اپنے طلب گاروں میں خود کو تقسیم بھی تو کرتا ہے۔ موت کے بعد ترکے کے سزا دار بھی تو ہیں۔ کوئی ایک فیصلہ تو کبھی نہ کبھی مجھے کرنا ہی ہے۔ اب شاید میرا ارادہ، میرا عزم میرے اختیار میں نہیں رہا لیکن بتانا میں کسی پیچھے نہ ہونے کی کوشش کرتا، وعدہ اتنی ہی تیز ہو جاتی۔ ظاہر ہے، میں کہیں نہ کہیں منہ چھپاؤں گا تو کتنے لوگ ویران ہو جائیں گے۔ ایک کے بعد ایک چوب۔ کیسے کیسے میرے دل سازو دلاؤ ہیں۔ میں خود کو ان کے سپرد کر دوں تو یہ سپرد کی کتنی حقیقی اور گہری ہوگی۔ میں ان میں شامل ہو کے کس قدر شامل رہا ہوں۔ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ پہلے بھی میں نے بہت جنس کیے ہیں۔ کیا حاصل ہوا؟ میں اپنے عزم اور ارادے کی بات کرتا ہوں مگر یہ میرے اختیار میں ہے کہاں۔ کوئی اور فیصلہ کرنے کی سکت مجھ میں کتنی ہے پھر شاید جو ہو رہا ہے، یہی مناسب ہے، آدمی توفیق و مقدر کے سوا کیا کر سکتا ہے۔

اندر میرا جھگایا تھا۔ وقت کی کچھ خبری نہیں ہوئی۔ بیداری کی غفلت نیند سے زیادہ نام کرتی ہے۔ جبرو اور ذرا کے آجانے پر میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ دوسروں کا اتنا خیال بھی خود کو ترک کر دینے کے مترادف ہے۔ یہ سب کچھ تو میں کرتا ہی رہا ہوں۔ اس صحت سے ان کی سیری ہو جاتی ہے تو

س کی میرے امکان میں ہے۔ آغا پانے بالائی منزل پر میرے کمرے کے ارد گرد منڈلاتا رہا تھا، چوکی دار کی طرح۔ میرے آرام کی خاطر وہ کمرے میں داخل نہیں ہوا اور روشنی بھی نہیں کی۔ اسے کیا معلوم تھا ایک بل کے لیے بھی میری آنکھ نہیں لگی ہے۔ عمارت میں ہر دروازے پر ہوتا تھا۔ کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں چراغ نہ مل رہا ہو۔ اندر چلی منزل پر تو جتن کا ماحول تھا۔ باہر گلی میں ریت بڑی تھی۔ لنگر جاری تھا۔ آغا پانے بتایا کہ کھانے کے بعد، پہلے زنانے انکھیلیاں کریں گے، پھر مجھے کی محفل ازراستہ کی جائے گی۔ عرصے بعد کہیں اڑے کی رونق بحال دیتی ہے، لیکن خاں کے رخصت ہونے کے بعد اڑا ہی اجڑ گیا تھا۔ بھٹل اور شمشاد خاں گاؤں کے سے کمرنگے چوکی پر بیٹھے تھے۔ ہم بھی وہیں چلے گئے۔ انہیں ہمارا ہی انتظار تھا۔ دیکھ کر دسترخوان بچا دیے گئے۔ بیانی، پہلے شوربے کا رومہ، ماش کی پھر کیری وال، فیرنی، بانی اور چانپوں کا اہتمام

زیر گری

تھا۔ بھوک ایسی کھلی نہیں تھی لیکن کھانوں کی خوشبو بھی اشتہا مہیز کرتی ہے۔ خوشبو بے جواز نہیں تھی۔ تمام چیزیں ڈالنے دار تھیں۔ کھانے کے لیے بھی ایک ماحول چاہیے۔ لگتا تھا، عمارت میں موجود جہوم آنے والے کل سے بے نیاز ہے آنے والے کل کے معمول سے بہت بیزار، آج ہی سارا کچھ سمیٹ لیتا چاہیے تھا۔

سب نے جلجت کی اور پوچھ تک دسترخوان اٹھا دیے گئے۔ عمارت کے وسط میں چاند نیاں بچھادی گئیں اور زنانوں نے کھیل تماشا شروع کر دیا۔ ہنسائے ہنسائے انہوں نے سب کو لوٹ پوٹ کر دیا۔ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ لوگ زنانوں کو دیکھ کے بے قابو کیوں ہو جاتے ہیں اور ان سے ناروا قسم کی چیمز غنائیاں کیوں کرنے لگتے ہیں۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ یہ کوئی دوسری مخلوق ہے، یہ لوگ انسانوں کے گھر پیدائش ہوئے۔ مجھے تو بیشہ ان پر ترس ہی آیا۔ یہ تو سراسر آدمیت کی توہین ہے۔ آدمی کی کسی پیدائشی خانی میں اس کی کیا خطا! پیدائش انہی انہوں، گوگوں اور بہروں کا تو کوئی مذاق نہیں اڑاتا، پھر ان لوگوں سے ایسا سلوک کیوں کیا جاتا ہے۔ شاید اس میں کچھ ان لوگوں کا بھی قصور ہے۔ یہ اپنے آپ کو تماشا بناتے ہی کیوں ہیں۔ اندھے، کولے، شکرے لوگ سولہ سنگھار کر کے اپنے آپ کو رسوا تو نہیں کرتے۔ وہ بھی تو کسی طور زندگی بسر کرتے ہی ہیں لیکن کیا بھیک مانگنا سواک بھر کے پیٹ پالنے سے بہتر ہے۔

گیارہ بجے کے قریب ان کی نوٹنگی بند ہوئی اور قہوے کے دوران مجھے کی محفل کا آغاز ہوا۔ دو نوجوان خوش اندام لڑکیاں، ایک کم سن دوسری نسبتاً چھتہ کار رات کے دو بجے تک ناچتی گاتی رہیں۔ اچھا خاصا کالیچ تھیں۔ ناچ بھی خوب آتا تھا۔ دیکھنے میں شگفتہ و تازہ تھیں۔ کچھ آرائش و زیبائش کی بات بھی تھی لیکن دو دن پہلے تارا بیگم کے بالا خانے پر ہم نے چاندنی بانو کا رقص دیکھا تھا اور اس کی آواز سنی تھی۔ گانے والے کا کمال یہ ہے کہ آواز بجائے خود ساز ہو، ساز مستزاد ہوں۔ کہتے ہیں، آواز دی ہے جو دل چھو لے اور رقص کے لیے لوگوں کا کتا ہے کہ بدن میں لمبوں جیسی بے ساختگی ہو، بچکی کی چمک اور شاخوں کا لوج ہو۔ یہ لڑکیاں چاندنی کا شتر شیر بھی نہیں تھیں تاہم تماشا بین بے حال ہوتے رہے۔ سکوں اور روپوں کی بارش ہوتی رہی۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ یہ رات تمام ہو لیکن شمشاد خاں نے بھٹل کے اشارے پر روشنیاں گل کرنے کا حکم صادر کر دیا پھر بھی لوگ ڈھالی تین بجے تک بیٹھے رہے۔

مجھے جرت تھی کہ لوگ بنے خاں کو کتنی جلد، کتنی آسانی سے فراموش کیے بیٹھے ہیں یہ سارا اہتمام تو اسی دن کے لئے استاد بنے خاں کے لئے کیا گیا تھا۔ اس کی اب تک کوئی خبر نہیں تھی اور کسی کو اس کی اب کوئی فکر بھی معلوم نہیں ہوئی تھی، شمشاد خاں تک کو کچھ عجیب سی بات تھی۔ اس لیے اعتنائی کی وجہ نظر ہر بنے خاں کی اچانک روپوشی ہی ہو سکتی تھی جسے لوگ بنے خاں کی زودوسی و زودرنجی، رنگ دلی اور کم ہمتی پر محمول کر رہے ہوں گے۔ ایک اور وجہ بھی تھی۔ غیر متوقع، رجن نے سامنے آ کے سب کو مضطرب کر دیا تھا۔ گو دوسرے دن وہ پسا ہو گیا لیکن یہ ایک دن بڑے تلامذہ اور انتشار کا دن تھا۔ اس صدمے سے جس شخص نے انہیں نکالا، وہ بنے خاں سے زیادہ فضیلت کا مستحق تھا اور یہ تبدیلی شمشاد خاں کی مرضی و معیار کے مطابق تھی تو اس سے بڑی سرخوشی کیا ہو سکتی تھی۔ وہ تو شمشاد خاں کی طرف دیکھتے تھے۔ شمشاد خاں ایک زمانے سے ان کا مرکز نگاہ تھا۔ اڑے کے معاملات میں اس کی فضا ان کے لیے اعتبار کا درجہ رکھتی تھی۔ ایک اور سبب بھی ہو سکتا تھا۔ شاید لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ بعد از خرابی بسیار آخر اڑے کو یمن خاں مرحوم کا جانشین مل گیا، اب اڑے پر سنے استاد کا قیام مستقل رہے گا۔

تین بجے کے قریب ہمیں بھی اپنے کمرے میں جانے کا موقع مل گیا اور جلد ہی نیند نے آلیا۔ آغا کیا کو ہم نے تاکید کر دی تھی کہ صبح آٹھ بجے ہمیں جگا دے، ٹھیک آٹھ بجے آغا پیا اور مرزا دلبر نے دروازے پر دستک دی۔ ناشتے کا انتظام بھی انہوں نے وہیں کر دیا۔ نیند آنکھوں سے پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی اب بیداری میں کچھ سرگردانی تھی کہ آغا پیا نے یہ بتا کے ہم تینوں کو سیدھا کروا کر رات سادہ لباس والے پولیس کے کئی آدمی محفل میں موجود تھے۔ گزشتہ رات کئی بار مجھے خیال آیا تھا کہ کسی وقت بھی انسپکٹر چوہان کا ماتحت رضوی ہمارے بیانات لینے آ سکتا ہے۔ رضوی کے نہ آنے کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ چوہان نے یہ رسم بھی غیر ضروری سمجھی ہے یا اسے کسی اور طرف کوئی نشان نظر آ گیا ہے۔ یہاں سے مایوس ہو کے پولیس کو زیادہ فعال و مستعد ہو جانا چاہیے تھا۔ پہلے تو انہوں نے سیدھے تارا بیگم کے بالا خانے کا رخ کیا ہو گا اور ان دنوں بیچنک نواب زادگان کی سن گمن لینے کی کوشش کی ہوگی جو چاندنی بانو کے والد و شیدا تھے اور رجن سے تارا بیگم نے میری بولی کے بعد رابطہ کیا ہو گا۔ بہر حال آغا پیا کی اطلاع صرف میرے لیے نہیں

جہو اور زورا کے لیے بھی طمانیت و تقویت کا باعث تھی اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی کہ پولیس ہماری نگرانی کر رہی ہے۔ لاڈا انہوں نے اڑے کے بعض کمزور آدمی، ہم مخبری کے لیے مامور کیے ہوں گے۔ زورا کا خیال تھا کہ بنے خاں کے عہدہ اسرا سبھی ابھی تک اڑے پر واپس نہیں آئے کوئی بعید نہیں کہ بنے خاں ہی نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے چاندنی بانو کو اغوا کر لیا ہو۔ یہ ایک ناقابل یقین جرات تھی، سنا ہے، شکست خوردگی کبھی ایسے ہی جنوں سے دوچار کر دیتا ہے۔

رات محفل کے اختتام پر شمشاد خاں نے اڑے کے منتخب آدمیوں کو صبح اڑے پر جمع ہونے کی ہدایت کی تھی۔ بچے آئے تو خامے لوگ موجود تھے۔ چوکی پر ہمارے بیٹھے بھصل نے حقے کی ترک کی اور سپاٹ آواز میں انہیں مخاطب کیا "ہماری بات ذرا دھیان سے سنو۔ اپنے کو آ کر جانا ہے۔ صبح میں اڑے پر انٹ پلٹ نہیں ہو جاتی تو ہم ادھر سے نکل جاتے۔ ہمارے پیچھے سلی کی طرح اڑے شمشاد خاں چوکی کو دیکھ گئے۔ کسی آدمی کے تیار ہو جانے استاد شمشاد خاں کی مرضی ہے۔ اس کو چوکی پر ٹیک دے نہیں۔ رجن کی طرح کوئی حرام کا جانا بھی سامنے آیا تو۔ شمشاد خاں ہم کو خبر کر دے گا اور سینے کے اندر اندر ہمارا نہیں ہوا تو جیسا کہ اڑے کی ریت ہے، ویسا ہی ہو گا۔ آٹام میں دیا دو سے زیادہ سر اٹھانے والے بچے کر کے چو فیصلہ کر سکتے ہیں۔ سن لیا سب نے؟"

شمشاد خاں سر جھکا کر سنتا رہا۔ بھصل کے دہو جانے پر چند لمحوں بعد اس نے دل گیر آواز میں کہا "اڑے، جو استاد بھصل بھائی کہتے ہیں، ٹھیک ہے۔ ہم نے اڑے کو تھا پر کیا پتہ تھا، سب الٹ پلٹ ہو جائے گا۔ اب معلوم ہے، بھصل بھائی کو آگے جانا ہے۔ کچھ ہولناکیاں۔ اپنا منہ بھی نہیں پڑنا لیکن ایک بات سارے سن لیں، بھائی کے کہنے پر ہم یہاں ضرور بیٹھیں گے پر اڑا باہر استا نام پر چلے گا۔ شمشاد خاں کی آواز بھرا گئی "سب جانتے ہیں، اڑے اور سب بچنے کا طے کر لیا تھا۔ رجن کہتے تھے، کھیل لٹا کر دیا۔ اب اڑے کے آدمیوں سے ہمارا کہنا۔ نیا آدمی جلدی سے تیار کر دو اور بس ہماری چھٹی کر دو۔ زیادہ دن نہیں بچے اپنے پاس۔ چوکی پر کوئی رجن جیسا کی اولاد، سو کا کچھ پھر سامنے آ جائے گا۔ پھر تم کتا ایک بات!" شمشاد خاں کی عثمانی آواز میں تندی آئی ایک بات کان کھول کے سن لو سب باہر استاد کی

بازی

شکل ہے، ٹھیک ہے، لیکن رجن کی طرح کوئی دوسرا لو کا کھانا اڑے آیا تو باہر میاں اور بھصل بھائی کہتے ہی دور ہوں "اپنے مائی شمشاد خاں کے پکارنے پر ضرور لکھو، آئیں گے اور لھال نوچ لیں گے اس مسئلے کی۔ شمشاد خاں اور رجن اس کی چوکی پر وہ کسی پانی کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری آنکھیں نہ ہونے کے بعد بھی یہ بات کبھی سمجھو۔"

بھصل چوکی پر نہیں ٹھہرا۔ اس کے ساتھ سبھی نیچے آئے اور گلی میں دو تک ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ آگے، امان اور جہو دم دیکھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم اسٹیشن کی ریف جا رہے ہیں۔ میں نے جہو سے چند قدم الگ لے کے جہو سے تصدیق چاہی "کیا ہم یہاں سے جا رہے ہیں؟" "کیوں؟ کیا ہے لاڈلے؟" جہو عسبیا زبان میں شوخی سے بولا "ابھی اور ایڈر ٹھہرنے کو مانگنا کیا؟"

"یہ بات نہیں۔" میں نے الجھ کے کہا۔ "پھر کیا ہے۔ بڑی مشکل سے سالی گردن چھٹی ہے۔ باہر رکھا بھی کیا ہے۔"

"کچھ دیر بعد ہم اسٹیشن نہیں پہنچ سکتے۔" جہو چوکی کے بولا "بات کیا ہے؟" "کچھ نہیں۔" میری نظرس بھصل پر پھٹنے لگیں۔ "دھر کوئی کان لگائے نہیں ہے، صاف بتا۔"

"جہو بھائی! ایک بات کا خیال آتا ہے۔" میں نے اکتی از میں کہا "اگر زورا کا کہنا..... صبح ہے تو تارا بیگم تو برباد تھی۔ بنے خاں نے چاندنی بانو کو اغوا کیا ہے تو چاندنی تو اسے لگی۔ اب ہمیں جا کے تارا بیگم کو کچھ دینا چاہیے۔ مطلب کہ سب ہماری۔ ہماری وجہ سے۔"

"اُہا! جہو سر جھٹک کے بولا "کیا بولتا ہے۔ زورا داوا لا کوئی چیز تو پھر فقیر ہے۔ وہ تو جو منہ میں آئے، اگل دیتا ہے۔ مانو اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہم تارا بیگم کے آگے ڈھریں یا آئیں؟ اور وہ! وہ بنے خاں، میں مار خاں۔ اتنا پاگل بن تھا۔"

"اور فرض کرو، زورا کی بات صحیح نکلی؟" "تو ہم ٹھیک اور ہیں کیا؟ ہم لوگوں پر بھی تارا بیگم کا حق بن بنتا۔" جہو نے ناگواری سے کہا "پولیس ادھر پیچھے گئی ہے۔ ایسے میں کوٹھے پر جا کے اٹھنا، ڈالیں ہم سیدھے ماؤنڈ لکھنا ہی ٹھیک ہے۔" جہو مجھے سمجھانے لگا کہ سفر کے سہ انتظامات ہو چکے ہیں۔ گاڑی کی ردا لگی کے وقت ہی اڑے سے نکلے ہیں۔ زورا، مرزا دلبر کے ساتھ سلی کو لینے چکا ہے۔ یہ ہم جوئی بہت مسکائی ہوئی ہے۔ بات چھپی ہو

ری گر 6

نہیں رہے گی۔ بھصل کو خبر ہوئی تو الگ ناراض ہو گا۔ کہنے لگا کہ چاندنی بانو کون سی تارا بیگم کی پہلو زاو ہے کیس سے کسی سے خرید کے ہی تارا بیگم نے اسے پروان چڑھایا ہے۔ یہ عورتیں اپنی تربیت یافتہ لڑکیوں کو بیٹی ہی کہتی ہیں۔ اس رات بالا خانے پر چھٹی لڑکیاں ہم نے دیکھی تھیں، سب تارا بیگم کی بیٹیاں تو نہیں تھیں۔ چاندنی بانو سے جتنا حاصل کرنا تھا، تارا بیگم نے کر لیا ہے۔ میں خاطر جمع رکھوں کہ چاندنی بانو کے چھن جانے سے تارا بیگم عارت نہیں ہو جائے گی۔

جہو کی بات سمجھ میں آ رہی تھی لیکن جی نہیں مانتا تھا۔ ادھر بھصل، شمشاد خاں کے ساتھ آگے میں بیٹھ چکا تھا۔ جہو مجھے اپنے بازو میں بھر کے دوسرے آگے میں سوار ہو گیا۔ آنگوں اور سائیکلوں کا ایک قافلہ اسٹیشن تک ہمارے ساتھ چلا۔ اسٹیشن پر پہلے سے کافی لوگ پہنچ چکے تھے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ ٹکٹ، ڈبے اور نشستوں کا بندوبست اڑے کے آدمیوں نے کر لیا تھا۔ زورا پہنچ چکا تھا۔ سلی بھی ڈبے میں بیٹھی تھی۔ سلی کو برقع میں دیکھ کے مجھے کدک ہوا۔ سادہ لباس والے، ظاہر ہے۔ یہاں بھی موجود ہونے چاہئیں۔ وہ کہیں بدگمان نہ ہو جائیں۔ میں نے جہو کو بتایا تو اس نے بھی تاکید کی۔ سلی کو نقاب اٹھانے رکھنے کی ہدایت بتا دیا معلوم ہوئی تھی اور ہر چند چاندنی بانو کو اس طرح لے جایا بھی نہیں جاسکتا تھا مگر پولیس کا کچھ ٹھیک نہیں، وہ کوئی بھی رخنہ ڈال سکتی تھی۔ جہو نے جانے کس طرح سلی کو نقاب ہٹانے پر آمادہ کیا۔ ڈبے کے سامنے اڑے کے آدمیوں کا جہوم تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کا چہرہ دیکھا ہو گا۔ سلی برقع میں نہ ہوتی تو کوئی بات نہیں سلی یا پہلے سے نقاب کھلا ہوا تو بھی کچھ نہیں تھا۔ اب اچانک نقاب اٹھا لیتا اور چہرے کی نمائش کرنا سلی کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہو گا لیکن پولیس کے اطمینان کے لیے کسی ایک چارہ تھا۔

زیادہ دیر نہیں لگی کہ انجن نے سیٹی بجادی۔ شمشاد خاں بار بار ہم چاروں سے آگے گلہ مارتا رہا اس نے میری پیشانی چوٹی ہاتھ جوئے اور شکست آواز میں بولا "ہو سکے تو جلدی شکل دکھاؤ، زیادہ بار کے لیے نہیں کتا" اب وقت بہت کم ہے اپنے پاس۔"

گاڑی حرکت میں آنے تک سب ہمارے ڈبے سے چنے رہے۔

○●○

بارہ بج چکے تھے۔ تیز دھوپ بڑی تھی۔ لکھنؤ شہر سے نکلے ہی گاڑی نے رفتار پکڑ لی۔ ڈبے میں ہمارے سوا کوئی

کتابیات پبلی کیشنز

76

76

کتابیات پبلی کیشنز

مسافر نہیں تھا۔ سو ہمیں اپنے آپ میں گم ہونے کی آزادی تھی۔ یہی ہوا۔ اتنی باد ہو کے بعد کسی گوشہ سکون میں آجانے سے آدمی غالی غالی ہو جاتا ہے۔ گزرے ہوئے مناظر کی بازگشت آدمی کو متلاطم کیے رہتی ہے۔ کچھ دیر کا سکوت تھا۔ فاصلے ذہن پر چھائے ہوئے مناظر و دھندلے کرتے جاتے ہیں یا پھینکی کرتے جاتے ہیں۔ وقت بجائے خود ایک فاصلہ ہے مگر بعض نقش جو پتھر ہو جاتے ہیں، مٹائے نہیں مٹتے نہ زمانی فاصلے سے نہ مکانی دوریوں سے۔

سلی نے بھل کے کہنے پر برق اتار دیا تھا اور بدن پر شال لپیٹ لی تھی۔ اس کے چہرے پر شادابی نظر آ رہی تھی۔ شادابی، خوشی کی علامت ہے۔ خوشی اس لمحہ کی کہ قسمت نے آخر کار کسی منزل پر پہنچا دیا ہے۔ اس نے بتایا کہ میزبانوں نے اسے قیمتی کپڑوں کے دو جوڑے تحفے میں دیے ہیں اور سونے کی چار چوڑیاں بھی۔ میزبانوں نے کھانے پینے کا بہت سارا سامان بھی ساتھ کر دیا تھا۔ کھٹو سے فیض آباد کا سفر چند گھنٹوں کا ہے۔ یہ پتھر گاڑی تھی۔ بقول مخمے بیوں یوں چل رہی تھی۔ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر رکتی۔ آدھ گھنٹے میں ملور، پندرہ بیس منٹ بعد بگور اور اس کے چند منٹ بعد سفید آباد آ گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں گاڑی بارہ بجی پہنچ گئی۔ یوں بھی ڈیڑھ ہی بج رہا تھا۔ جمو زورا اور بھل بلکی نیند لے چکے تھے یا ایسے ہی میری طرح آنکھیں پتے نشستوں پر پڑے رہے تھے۔

بارہ بجی اسٹیشن پر جمو نے سلی کے میزبانوں کا دیا ہوا توشہ کھولا اور ذرا فضول میں پلیٹ فارم سے کچھ اور چیزیں لے لے آئی۔ رکابیاں موجود نہیں تھیں۔ سب نے انہی برتنوں میں کھایا جو شمشاد خاں کے عزیزوں نے ساتھ لیے تھے۔ بہت خوش مزہ کھانا تھا۔ پرائے، مرغ قلیہ، بھنا ہوا گوشت، شامی کباب اور سوچی کا طلوہ، چائے کی بے سب پھر ادھر ادھر نشتوں پر دراز ہو گئے۔ فرسٹ کلاس کے یہی ٹھاٹ باٹ ہیں۔ پیسے کا بھی کیا کرشمہ ہے۔ آدمی کتنی چیزیں حاصل کر سکتا ہے۔ آرام، ظلت، جلوت، کہتے ہیں، آدمی کی خواہشوں کے سامنے پیسہ بوشم کم پڑ جاتا ہے، اور کہتے ہیں، آدمی خواب نہیں خرید سکتا، خیال میں خرید سکتا پر اور ہزار چیزوں کے حصول کی قدرت، جو پیسہ پیدا کرتا ہے۔ کتنی عمریوں کی انک شوقی، کتنی پشیمانوں کی تلانی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے لوگ دیوانگی..... سے پیسے کا تعاقب کرتے ہیں، پیسے سے آدمی کے دس ہاتھ ہو جاتے ہیں۔

سلی ٹھہری بنی کھڑی سے باہر بھاگتے ہوئے مناظر دیکھ

رہی تھی۔ میں بھی نیچے آ کے اس کے سامنے کی نشست پر مقابل بیٹھ گیا۔ اتنے دن ہو گئے تھے، سلی سے رہی سہا کلام کے علاوہ فراغت سے بھی بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ممکن ہے، وہ مجھے کوئی بد دماغ شخص سمجھتی ہو۔ میر جی میں آئی کہ اس کی نشست پر جا کے اس سے باتیں کر دوں۔ پوچھوں کہ کوئی کک، کوئی مال، کسی قسم کا اندیشہ تو نہیں ہے اس کے دل میں، اور ہو سکے تو اسے تسلی دوں کہ اب بیٹے ہوئے کا اعادہ نہیں ہو گا۔ وہ بھی گزرا ہوا انداز بھول جانے کی کوشش کرے۔ ایک بار جو اس نے کھڑکی پر نگاہیں پٹائیں اور میری آنکھوں کو اپنی جانب گھراں پایا تو وہ پٹپٹائی، پھر اس کے ہونٹوں پر ایک شائستہ مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے پیر اور سیکڑ لے لیے پھر اسی نے جرات کی اور امدانہ لہجے میں بولی، "طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

میں نے جلدی سے کہا، "ہاں، ہاں، بالکل۔" اس نے کھٹے پر مجھے احساس ہوا کہ اور کی ہر تھ سے نیچے آ کے کسی پتلو قرار نہیں رہا تھا۔ آدمی کو اپنی بے گلی کی بھی خود نہیں ہوتی۔

اس نے دھیمی آواز میں پچھتے ہوئے کہا، "چائے؟" ابھی کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔ "ہاں، ان لوگوں نے گھوڑیاں بھی رکھی تھیں۔" کھٹکتی ہوئی آواز میں بولی، "میں تو بھول ہی گئی۔"

"ضرور۔" میں نے بظاہر اشتیاق سے کہا۔ وہ شال سنبھال کے اپنی نشست سے اٹھی اور ذرا کھوڑنے لگی۔ نئی بناری ڈبیا میں بہت سی گھوڑیاں رکھیں۔ سلی نے میرے پاس آ کے ڈبیا میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ایک ساتھ دو گھوڑیاں کھائیں۔ واقعی میں من غم بس گئی۔ اس خدمت سے سلی کا چہرہ اور چٹکنے لگا۔ رڈ گل رنگ ہو گئے۔ بعض لوگ کسی سے سلوک کرنے کے لیے تاب رہتے ہیں۔ سلی بھی زیریں کی بہن معلوم تھی۔ اس کے تکلف آمیز اطوار میں بڑی بے ساختگی تکلف تصنع سے عاری ہو تو بہت دل آویز ہوتا ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

ذخیر میں ڈبیا رکھ کے وہ اپنی نشست پر جا بیٹھی۔ دیر میں صفدر، آج اسٹیشن آ گیا پھر سید خان پور، دریا یاد، بنے خاں میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے سر سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی لیکن بنے خاں تھا کہ آنکھوں سے دور نہیں ہوتا تھا بار بار اس کا خیال میرے میں کھٹکنے لگتا۔ معلوم نہیں۔ اچھا ہوا یا برا، لیکن اگر

بازی

خاں ہی چاندنی بابو کو لے گیا ہے تو اس نے عاقب پر اچھی طرح غور کر لیا ہو گا۔ میری داستان میں اس کے اور چاندنی بابو کے درمیان پہلے سے کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ ایسی صورت میں اسے چاندنی بابو کے اظہار میں کیسی دشواری پیش آ سکتی ہے۔ کیا معلوم کہ چاندنی بابو کا بالا خانے کی ذریعہ برقی زندگی بہت مرغوب ہو اور کسی چار دیواری کی سادہ زندگی کا تصور اس کے ذہن میں نہ ہو یا اس کی مراد یہی نہ ہو۔ ضروری نہیں کہ بالا خانے پر بیٹھی ہوئی ہر عورت بالا خانے سے مطمئن ہو۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ شیخ مخمل سے چراغ خانہ کا درجہ افضل ہے، مخمل کی زیب و زینت کی نسبت گھر کی سادگی میں بہت عزت اور طمانیت ہے، اور ایسا تمنائی، ایسا شیدائی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ بنے خاں کے پاس اس نے اپنے کہاں ہوں گے کہ ابتدائی دنوں میں چاندنی بابو کو کچھ باور کرانے کے لیے سارے اور سکون میں رکھ سکے۔ اس نے کھٹو ہی میں کسی جگہ چاندنی بابو کو چھپا رکھا ہے تو آخر کب تک اسے روپوش رکھا جاسکتا ہے مگر بنے خاں بھی کہاں تک ہاتھ چیر توڑے، بیڑیاں ڈالے بیٹھا رہے گا۔ کسی وقت بھی روپوش آئیں سو پچھتی ہوئی اس کے سر پر پہنچ سکتی ہے۔ یہی ممکن ہے کہ کھٹو سے بہت دور کسی بڑے شہر میں وہ گھر بنائے کی کوشش کرے اور کوئی خزانہ اس کے ہاتھ لگ جائے ورنہ چاندنی بابو تو شیشے کی طرح نازک ہے۔ تارا بیگم نے اپنی بیگلوں پر اس کی پرورش کی ہے۔ وہ تو ذرا سی دھوپ سے کھٹلا جائے گی۔

یہی سمجھ میں آتا تھا کہ بنے خاں اتنا دیوانہ نہیں ہو گا اور یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی تھی کہ تارا بیگم نے چاندنی کے دلدادہ نواب زادگان کو بہت کم مصلحت دی تھی۔ ایک دن میں جواب مانگا ہو گا۔ کسی بھی نواب راجا کے لیے نئی ظہیر رقم ادا کرنے کے بجائے کرایے کے شورہ پشتوں کا نذر دست کرنا آسان تھا۔ بنے خاں نے بہت جلدی کی۔ اسے کچھ تو قہر کرنا چاہیے تھا۔ بنے خاں کوئی ضمانت نہیں تھی کہ خریدی ہوئی چاندنی بنے خاں کو دل و جان سے قبول کرے۔ دوسرے آدمی خریدنا جاسکتا ہے، اس کا دل و دماغ نہیں۔ یہ کسی حد تک چاندنی بابو کو مطلع رکھ سکتا تھا۔ اطاعت اور نچر ہے، بندگی اور جبر، اور دہلی خاطر اور جبر۔ اصل چیز تو خود فکری ہے۔ چاندنی پر عمل اختیار کے باوجود ایک جاتی دیکھ لایے کہ قابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ جو لوگ جاہ و چشم ترک کر کے گوشہ نشین ہو جاتے ہیں، انہیں پیسے کی بے بسی ہے۔

ازلی گھر 6

79

بھری کا ضرور کوئی عرفان ہو جاتا ہو گا، ریشم، پھول، شیشہ، جو ابر، ہاتھی، گھوڑے، خدام دیوان، من و دسلوی پیسے سے حاصل کیے جاسکتے ہیں مگر کسی کی طلب ان سے سوا، ان سے دگر ہو تو۔

آدمی اپنے آپ سے بھی تو ڈیان بکتا ہے۔ کھٹو مسلسل دور ہو رہا تھا۔ اپنی دل جی کے لیے وہی پلٹ دینا ہی بہتر تھا مگر کتاب ہی کے دوسرے آسانی سے پلٹے جاسکتے ہیں، اور یہ تو گزشتہ ورق کے نوشتے کی سرایت کاری اور اثر گیری پر منحصر ہے کہ کب تک طاری رہے، کب تک نشہ غالب اور زہر قائم رہے۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں نے بنے خاں کو دیکھ کے چاندنی بابو کے لیے بات کی تھی۔ تارا بیگم کا بالا خانہ اجڑ جائے گا اور چاندنی بابو کسی ناکارئی، ناگفتگی سے دو چار ہو جائے گی، یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ممکن ہے، اب تارا بیگم مجھے کو سنے دے رہی ہو اور چاندنی بابو آہو کا کر رہی ہو مگر میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو کیا کر سکتا تھا۔ میں نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ ممکن ہو تو چاندنی بابو کو کچھ عرصے کے لیے فیض آباد لے جائیں گے۔ زیریں کی حویلی میں وہ گھر کے لطف و لذت سے آشنا ہو کر اور بنے خاں، ایسے طلب گار کی پاسبانی اور سایہ داری کا اسے کچھ اندازہ ہو گا۔ آدمی کو سمجھنے میں دیر تو لگتی ہے۔ خدا جانتا ہے، اس کی بولی لگا کے مجھے عجب مسرت ہوئی تھی۔ واقعی وہ ایسی ہی لڑی تھی کہ جو کچھ بھی امکان میں ہو، اس پر چھادر کر دیا جائے۔ دکان پر رکھی ہوئی چیز کی قیمت کتنی ہی اونچی ہو، وہ بھی اس وجہ سے بے وقار ہو جاتی ہے کہ اس کی کوئی قیمت متعین ہے اور ادا کی جاسکتی ہے۔ چاندنی بابو بالا خانے پر نہ ہوتی تو اس پر جاگیریں قربان کی جاسکتی تھیں۔ میں نے بنے خاں کو چاندنی بابو کے سامنے بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں دیکھا تھا۔ راج کرشیا جیسا کوئی مہمان بنے خاں کے لیے دینے چھوڑ جاتا تو وہ سارا کچھ واؤ پر لگا دیتا۔ صاحب نظر اور جو پرشاس ہی نہیں، قیمت تو صحیح دینی ادا کر سکتا ہے جسے کہیں، کسی موڑ پر اپنا مطلب، اپنا مقصود نظر آجائے اور ضروری نہیں کہ ہر شخص دوسرے کے ارادے اور جتنو سے متفق ہو۔ ہر شخص صحرا نوری کا تحمل نہیں ہو سکتا اور نہ جو شیر نکالنے کے عزم سے بہرہ مند، اس کے لیے بہت شرطیں ہیں۔

سوا تین بجے گاڑی روڈلی اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ فیض آباد کا فاصلہ اب ڈیڑھ گھنٹے کے قریب رہ گیا تھا۔ میری نظر سلی پر گئی۔ پلیٹ فارم اس کی نشست کے سامنے آ رہا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے سلی نے کھڑکی کی جالی نیچے کر دی۔

کتابیات پبلی کیشنز

78

کتابیات پبلی کیشنز

میں نے سوچا، بعد میں موقع ملے نہ ملے میں اسے کچھ زریں کے بارے میں بتا دوں تاکہ نئے گھر اور نئے ماحول میں وہ کوئی اجنبیت محسوس نہ کرے گو اس تمہید و تاکید کی ایسی ضرورت نہیں، زریں کا دل تو ایک دریا کے مانند ہے جس کا پانی ہر دم رواں، شفاف اور شمد آگیاں ہو۔ وہ تو کوئی گستاخ ہے جہاں ہر موسم میں پھول کھلے رہتے ہیں۔ وہ تو ایسا شجر ہے جس کے شرور جس کا سایہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ تو سرسبز پھول، سرناپا خوشبو ہے۔ اس کے لطف و انقیات کے بیان کے لیے لفظ کم درجہ جاتے ہیں۔ میں سسلی کو یہی کچھ بتانا چاہتا تھا کہ کسی لمحے زریں کی تیز آواز اور سرو لمبے سے وہ آرزو نہ ہو۔ حالانکہ یہ تجربہ شاید سسلی کو کبھی نہ ہو، لیکن ایک رعایت آدمی کو اس کے درون خانہ تمنج، ناویدہ فشار کی ضرورت دینی چاہیے اور آگینے کی بھی۔ کبھی اپنی سماعت اور نگاہ کے غبار میں دوسرے کے مطالب اور مقصود اخذ کرنے کی چوک ہو جاتی ہے۔ سسلی خود ایک معاملہ فہم، نرم، خور، پرتاک اور خوش سلیقہ لڑکی ہے۔ زریں بھی اس سے مل کے بہت خوش ہوگی۔ اچھا تھا کہ سسلی پوری طرح مطمئن ہو کے حویلی میں قدم رکھے۔ جان لے کہ کسی ایسی دلی جگہ نہیں، وہ ہمارے گھر جاری ہے۔ وہ بھٹل کا اور میرا ہی گھر ہے، زریں تو بھٹل کی جیتی بیٹی ہے۔ گئے سے بڑا وہ ہوتا ہے جو چیتا ہو۔ ایک وہی ہے جو بھٹل پر حکم چلاتی ہے اور وہ تعمیل کے لیے آمادہ رہتا ہے۔

ردولی اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرے چند لمحے ہوئے تھے کہ بھٹل اور کی برتھ سے نیچے آگیا۔ وہ جاگتا رہا تھا کیونکہ اس نے نیچے بیٹھے ہی پان کی فرمائش کی۔ اسی اثنا میں زورا پلیٹ فارم میں مازہ چائے لے آیا تھا۔ ردولی پر مازہ دم ہونے کا وقت گزار کے گاڑی پھر چل پڑی۔ چائے کا کھنڈر ختم کر کے اور گھوڑی منہ میں دبا کے بھٹل سسلی کی نشست پر چلا گیا اور اس کے پاس بیٹھا دیر تک جانے کیا نکتے پر مذاں کرتا رہا۔ زریں ہی موضوع سخن ہوگی۔ وہی ہدایت نامہ جو میں سسلی کو تعلیم کرنا چاہتا تھا اور ارادہ باندھتا جمع کرتا رہ گیا تھا گاڑی کے شور میں بھٹل کی دھیمی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دیورا کوٹ بھی گزر گیا، سالار پور کے بعد اب فیض آباد ہی آتا رہ گیا تھا۔ گاڑی منزل پر پہنچنے میں ابھی چند ہی منٹ ہوں گے کہ زورا اور جمرو کھٹے کھٹے اور سامان لوٹنے پلٹنے لگے۔ دونوں نے اپنا سامان الگ اپنی میں رکھ لیا۔ نیچے ٹکار توں اور چاقو بھی۔ مجھے بے چینی ہوئی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ ہم سے جدا ہو کے فیض آباد سے آگے جا رہے ہیں یا

مجھے اور بھٹل کو فیض آباد میں نہیں رکنا ہے۔ میں چپ چاپ دیکھتا رہا۔ ظاہر ہے، میری حیثیت کسی مجبور اور رانم رضا شخص کی تھی۔ مجھے کچھ بتانا اور مشورہ کرنا ضرور نہیں تھا اور اصلاً تو یہ سب کچھ میری وجہ سے تھا، یہی کیا تھا۔ میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ میرے علم میں جمرو، زورا کو آگے کوئی ایسا کام درپیش نہیں تھا۔ بھٹل کو وہ بھی فیض آباد رکنا چاہیے تھا۔ فیض آباد اسٹیشن تک آ کر زریں کو دیکھے بغیر آگے چلے جانے کی کوئی تک نہیں تھی۔ زریں سے رخصت ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ ہمیں اس کے متعدد شکایتی خط آئے تھے۔ منیر علی کو ابا جان۔ ہمیں میں روکے رکھا تھا۔ خانم بھی خود گزیدہ نواب عالم تا کی مسیحا کے لیے حیدر آباد کے وہں رہ گئی تھی۔ نیساں جہاں گیر کے علاوہ زریں کے ساتھ منیر علی کا پورا کنبہ تھا بھٹل وہاں نہیں تھا اور یہی دلہا نہیں تھا۔ زریں کو وہ دونوں ہی سے نسبت تھی۔ میں نے کئی بار چاہا کہ زریں ہمیں بلالیا جائے۔ وہاں وہ سب مل لے گی یا پھر سب کو آباد چلنا چاہیے۔ زریں نے فرخ، فریال، فارہہ اور اکا نہیں دیکھا تھا۔ جولین سے بھی وہ نہیں ملی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ شہ پارہ گیتا گیتا کی ماں رانی نے زریں کے تذکرے ہی سنے تھے۔ زریں نے ان کے۔ ہمیں جا کے فرصت ہی نہیں ملی۔ کانتے گیا پھر پرو۔ ابا جان غل خرید کے نوک پلک کی د میں لگ گئے اور اچانک مارلی چلا گیا۔ اس دوران حیدر سے نواب ثروت کا خط آگیا اور ہمیں حیدر آباد جانا پڑا۔ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہوا کہ نہ زریں کو فیض آباد بلایا جاسکتا تھا نہ اس کے پاس جانا ممکن ہوا۔

ٹھیک پانچ بجے گاڑی فیض آباد شہر میں داخل ہو گئی اور زورا اپنا کام کر چکے تھے۔ بھی ڈبے سے اتر گئے اسٹیشن سے باہر نکلنے کے بجائے انہوں نے انتظار گاہ کیا۔ لکھنؤ سے آنے والی یہ گاڑی بیس ختم ہو جاتی تھی۔ لیے دوسری گاڑی سے آگے جانے والوں کو انتظار گاہ ڈیرہ ڈالنا پڑتا تھا۔ ہمیں وہاں بٹھا کے جمرو اور زورا بلا گئے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ بھٹل کا شہر جانے کا نہیں ہے۔ زورا اور جمرو کو آگے سفر کرنا ہوتا تو بھٹل رخصت ہو جاتا۔ گویا زریں کے پاس سسلی کو پہنچانے کی داری زورا اور جمرو کے سپرد کی گئی تھی۔ مجھے یہ بات عجیب لگی۔ ہر چند دخل در معقولات سے خود کو باز بہت کوشش کی لیکن مجھ سے یہ نہیں ہوا اور مجھے اپنی بازی

کتابیات پبلکیشنز

لگاتے سے سوا سو میل دور، دوسو روپے کے کنارے سے نزدیک، چھوٹا ناگ پور، کشتی کے چیلو کے منہ کی کنارے پر واقع، پلوے کے بڑے مرکز، بجلی کے تار، شیشے، المونیم چینی کے برتن، سائیکل اور پارچہ پانی کے کارخانوں سے گھرے ہوئے شہر آسن سول کی آبادی لاکھ سے اوپر ہی ہوگی۔ اطراف میں کوئلے کی کانیں پھیلی ہوئی ہیں۔ دوسرے شہروں کی نسبت یہاں موسم خوش گوار تھا۔ آسن سول میں دینی مدارس کی تعداد چند ہی تھی، ہمیں وہاں سے مایوس ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہاں، ایک مدرسے میں ایک نورانی صورت، درویش مثال بزرگ قاری فرمان احمد سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے ہمیں شہر کے ایک معزز رئیس سید محمود علی سے مل لینا چاہیے۔ ان کی خوئی کے مسمان خانے میں اطراف و اکناف سے آئے ہوئے مسمان ٹھہرتے ہیں۔ رئیس سید محمود علی بہت اثر و رسوخ کے آدمی ہیں، مزاج بھی مختلف ہے، علم و ادب کے قدردان، موسیقی کے رسا، بڑی سوجھ بوجھ کے خوش خلقی اور وضع اور ادب اور شخص ہیں۔ شہر میں ان کا گھر تہذیبی ادارہ ہے، محفلوں کا مرکز، قاری فرمان احمد کی رطب اللسانی سن کے میری طرح بٹھل کے دل میں بھی سید محمود علی سے ملاقات کی خواہش نمودار ہوئی ہوگی۔

صبح وقفے وقفے سے ہونے والی بارش ٹھہر گئی تھی لیکن آسمان بادلوں سے اٹا ہوا تھا۔ کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ بادل پھر برگشتہ ہو جائیں اس لیے ہم نے اپنے نمکانے پر جا کے دوسرے کپڑے بدلنے کا ارادہ ترک کیا۔ پانچ سے چھ اوپر وقت ہوا ہوگا۔ بادلوں کی وجہ سے اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ارمان درست کرنے کے لیے ہم نے سر راہ واقع چائے کے ایک ہوٹل میں منہ ہاتھ دھوا، کھجکھی کی، لباس کی شائین درست کیں اور چائے پی کے گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گئے۔ سڑکیں ابھی تک گیلی تھیں۔ بارش سے عمارتیں وحلی وحلی لگ رہی تھیں۔ چھوٹے شہر میں فاصلے ایسے طویل نہیں ہوتے۔ چند ہی منٹ میں گھوڑا گاڑی عام سڑک سے مڑ کے ایک کشادہ اور صاف ستھری گلی میں داخل ہو گئی۔

کتابیات پبلی کیشنز

قاری فرمان احمد کا نام سن کے اس کے چہرے پر المٹی غبار صاف ہو گئیں۔ وہ فوراً اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد والا آ کے خندہ پیشانی سے ہمیں اندر بٹھلنے کی ہدایت کی۔ دیواری کے اندر تازہ رنگ دروغن سے آراستہ درم درجے کی ایک دو منزلہ عمارت ایستادہ تھی۔ اسے بنگا نہیں کہا جاسکتا تھا، نہ قدیم طرز کی خوئی۔ چار دیواری عمارت کی راہ واریوں تک کے فرش پر سبزہ بچھا تھا۔ کنارے کنارے کیاریوں میں پھلواری بھی ہوئی تھی۔ اطراف میں ادھر ادھر تناور درخت اٹھے ہوئے تھے۔ دیواری سے عمارت کا فاصلہ کم نہیں تھا، کس زیادہ۔ پچھلے کے دائیں جانب سبزے کے وسیع حصے پر سنگ مرمر کا ڈھانچا اور بید کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ عمارت سے یکم خوش ذوقی اور نفاست جھلکتی تھی۔ دریاں ہمیں وہاں نہ واپس چلا گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسی اثنا میں دوسرا ممبرائیں ملازم لپکتا ہوا باہر آیا اور اس نے ہم لہجے میں کہا کہ مالک کو اطلاع کر دی گئی ہے، ذرا دیر انتظار کی زحمت ہوگی۔ اس نے ہم سے شہرت وغیرہ نہ پوچھا۔ ٹھیل کے انکار پر وہ سر ہٹا کائے آہستہ قدردان چلتا ہوا راہداری میں گم ہو گیا۔

نظارہ عمارت کے کمین سید محمود علی اور مواد می شناسائی کی کوئی توقع نہیں تھی، خانہ پری کی بات تھی۔ کی ہماری پاس کیا کی تھی۔ بے شمار دروازے پر دستک دے تھے۔ سائل خوش گمانی نہ کیا کریں تو ہر کس و نام آگے ہاتھ کیوں پھیلا دیں۔ کوئی ایک صدا تو کارگر ہے۔ ہمیں چوتھے پر بیٹھے دس منٹ سے زیادہ ہوئے صاحب پر آمد نہیں ہوئے۔ بٹھل گم صم بیٹھا تھا۔ ہم سارے جسم میں نوٹن ہو رہی تھی۔ ہمزئی تھا، مجھے اپنی حالت بتا دینی چاہیے تھی۔ یہاں آئے کے بجائے میں آرام کرنا ہی مناسب تھا۔ یہاں ہم پھر کسی اور درجے آگئے تھے۔ ایک پھلو بھٹنا دو بھر ہو رہا تھا۔ رئیس سے کوئی موس رہا تھا۔

یوں یہ ایک خوش گوار شام کی جاسکتی تھی۔ فضا تھی، ہوا چھلکی چھلکی اور ٹھنڈی ٹھنڈی، سبزے اور سونہری منک ہر سو رہی ہوئی تھی، پرندے آشیانوں کے لیے شور مچا رہے تھے۔ سارے موسم پابند ہو ورنہ ان کی کیفیتیں سب پر ایک جیسی مرتب ہوتی تھیں۔ مجھے مسلسل کرسی پر سہما تا دیکھ کے بٹھلنے کا پوچھا، کیا ہے رے؟

بازر

میں بڑبڑا گیا، کچھ نہیں، کچھ نہیں۔

”ٹھیل جلیں پھر؟“
”نہیں نہیں، ابھی۔“ میری آواز میرے قابو میں نہیں تھی، پھر میں نے منتشر لہجے میں کہا کہ ہاں ٹھیک ہے، واپس چلیں، یہاں پھر آجائیں گے۔

”کچھ اٹا ہے کیا؟“
”ہاں!“ میں نے کمر سیدھی کر کے کہا، ”دل میں کچھ گھبرا رہا ہے لیکن، لیکن چاہو تو کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔“

”نہیں رے، چلتے ہیں۔“ یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا مگر ایک قدم بھی نہ بڑھ سکا تھا کہ چوتھے کے عقب میں واقع راہداری میں کھن کھناتی آواز سن کر رک گیا، دوسرے لمحے جو شخص ہمارے سامنے تھا وہ مکان کے مالک کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ پچاس سے اوپر کی عمر، قد متناسب، نہ اتنا زیادہ نہ کم، گٹھا ہوا جسم، ناک نقشہ تر شا ہوا، گداز ہوٹ، سرخ سپیدی ہوئی اور کسی قدر سیاہی مائل رنگت، بلکی بلکی سوچیں سفید کرتے، پاجامے اور سلک کی وائٹ میں ملبوس، سلیم شای جو، تیرہ ٹی ماگ، سامنے سے سر کے بال رُبانے کی وجہ سے پیشانی چوڑی ہو گئی تھی۔ کسی زمانے میں ناصا وچہ ہوگا۔ چہرہ دکھا ہوا، بڑی بڑی آنکھوں میں گہری ہلکے آسودہ حالی کی چمک دکھائی اور ہوتی ہے۔ تیز قدموں سے سید محمود علی چوتھے پر آئے اور پر تپاک انداز میں ہم سے مخاطب ہوئے، ٹھکتی آواز میں بتایا کہ وہی سید محمود علی ہیں۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ مصالحتی کے بعد بٹھل نے زحمت دینے کی معذرت چاہی اور آمد کا مدعا بیان کیا۔ یعنی انوشہ و ہر ایا۔

سید صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے، ”مولوی شفیق، انام تو کچھ سنا ہوا، آشنا آشنا لگتا ہے۔“ وہ دہدہاتے ہوئے بولے، ”ذرا علیہ اور وضع قطع تو بتائیے۔“

بٹھل نے میری طرف دیکھا، مجھ سے بات نہیں دیاری تھی۔ میں نے ہمت جمع کی اور مولوی صاحب کے رے میں مزید کچھ تفصیل بتائی۔

”ہاں، ہاں کچھ یاد آتا ہے، یاد آتا ہے جناب!“ سید محمود لی نے چٹکاتے ہوئے کہا، ”ایک صاحب، بے رنگ، بے نیک، قہقہا کا نام تھی، زہن پر نقش ہے، مگر اب تو زمانہ ہو گیا ہے، دیکھو، مولوی صاحب کے بارے میں انہوں نے کبھی کبھی کے مجھ سے دوبارہ استفسار کیا، میری تصدیق پر وہ بڑی سے سر ہٹا گئے اور بولے، ”وہ مدرس اور تبلیغ ہی نہیں، وہ عام آدمی ہیں۔ جی ہاں، یہاں تشریف لائے ہیں، بازی گر!“

بازر

ایک بار نہیں، شاید دو تین بار۔ اچھی یاد اللہ تھی ان سے۔ اب تو بہت وقت ہو گیا۔“

اتنی ہی بات سے ظاہر ہو گیا کہ ہمیں یہاں سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے، لیکن اس طرح تو اب اٹھا نہیں جاسکتا، بٹھل نے ہماری آواز میں پوچھا، ”کے برس لگ بھگ؟“

”چھادھت ہو گیا، صبح تو کچھ نہیں بتا سکتا۔“ سید محمود علی نے بھٹکتے ہوئے کہا، ”میرا خیال ہے، دس سال سے زیادہ ہی گزرے ہوں گے۔ ان کا پتہ محفوظ تھا۔ خیر خیریت کو عرصہ ہو گیا یاد آتا ہے، ایک دو مرتبہ انہیں خط بھی لکھے، کوئی جواب نہیں آیا، مگر اب کہاں، کہاں ہیں قبلہ؟“ سید صاحب نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ایسے کو بتاؤ تو آپ کے در پر کیوں آتے۔“
”بی بی ہاں۔“ سید صاحب چل کے بولے، ”آپ ان کے آبائی شہر مراوا آباد بھی گئے؟ وہیں سے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“

”وہ ادھر ہی آئے تھے، ابھی تھوڑے دن ہوئے، اپنا آتا جا کسی کو بول کے نہیں گئے۔“ بٹھل نے گہری سانس بھر کے کہا۔

ابتدا ہی میں بٹھل اپنی آمد کی غرض و غایت بتا چکا تھا لیکن مختصر بیان سے سید محمود علی کی سیری نہیں ہوئی تھی، جس آئینہ میں بولے، ”مگر ایسی، ایسی کیا، میرا مطلب ہے، آخر آپ کو ان کی اس قدر تلاش کیوں ہے؟“

”میری بات ہے صاحب!“ بٹھل نے منہ بنا کے کہا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ انہیں بتایا کہ میں مولوی صاحب کا عزیز ہوں، کچھ خاندانی جائداد کی تقسیم وغیرہ کے سلسلے میں مجھے مولوی صاحب کی تلاش ہے۔ یوں سمجھا جائے کہ مولوی صاحب کا حصہ انہیں لوٹانا ہے وغیرہ وغیرہ یہ کہانی اسے حفظ ہو گئی تھی۔

”یعنی مولوی صاحب قبلہ کی کسی جائداد کے امین یہ خوش اطوار نوجوان باہر میاں ہیں؟“ سید صاحب جلیں پٹ پٹا کے بولے۔

”ٹھیک، بالکل ایسا ہی۔“ بٹھل نے بے اعتنائی سے کہا۔

”یقیناً بڑی جائداد ہی ہو سکتی ہے جو آپ قرے قرے انہیں ڈھونڈ رہے ہیں؟“ سید صاحب نے ہونٹ کھینچ کر پوچھا۔

”بڑی ہے صاحب، اچھی بڑی۔“

کتابیات پبلی کیشنز

سید صاحب نے ہنکارا بھرا اور متانت سے بولے۔
”مولوی صاحب یہاں کا راستہ تو شاید بھول ہی گئے۔
خدا انہیں سلامت رکھے۔ بڑے درویش صفت آدمی ہیں۔
حدیث دفعہ کے عالم مشہور خن کے دل واہ، وہ ایک روشن
خیال علامہ ہیں، اپنی بات منوانے اور دوسروں کی بات سننے کا
حوصلہ رکھتے والے۔“

”بچپل بارودہ اکیلے آئے تھے یا کوئی؟“ سید صاحب
نے سانس لینے کے لیے توقف کیا تھا کہ بھل نے پوچھا۔
”نہیں، بالکل ختم، بالکل ختم۔“ سید صاحب نے بہ
عجلت کہا ”آپ کی مراد ان کی یکم سے تو نہیں ہے؟ اس
وقت تو جیساکہ انہوں نے فرمایا تھا، ان کی شادی نہیں ہوئی
تھی، کیا بعد کو حضرت نے؟“ کاٹھی ہو گیا۔ ”سید
صاحب کے لیے بے تابی ہویدا تھی۔“

”نہیں صاحب ابھی وہ پورے کے پورے ہیں۔“
سید صاحب کی سمجھ میں دیر سے آیا اور انہوں نے بے
ساختہ قہقہہ لگایا ”جی ہاں، واقعی شادی کے بعد تو آدمی آدھا
ہی ہو جاتا ہے مگر آپ کی مراد“ وہ بخند ہو کے بولے ”پھر
آپ کی مراد کس سے ہے؟ بھلا کون ان کے ساتھ ہوتا؟“
”ان کی بیٹی۔“

”ان کی بیٹی۔“ سید صاحب نے چونک کے پوچھا ”مگر
انہوں نے تو شادی! آپ فرما رہے ہیں کہ۔۔۔“
بھٹل نے ہاتھ اٹھا کر صراحت کی ”انہوں نے ایک کو
منہ بولی بنایا ہے۔“

”ہوں! اول۔“ سید صاحب چرماتی آواز میں بولے
”کب، کب یہ دل خوش کن واقعہ پیش آیا؟“
”بیس بیت گئے۔“ بھٹل نے آنکھیں سے کہا۔
”یہ اچھی بات ہوئی، وہ اکیلے بھی بہت تھے۔“ سید
صاحب نے تبصرہ کیا ”ویسے جناب کو ان کے بارے میں
معلومات خاصی ہیں۔“

”اے کوئی اور کام نہیں ہے۔“
”کتنے برس ہو گئے قبلہ کی تلاش میں؟“
”اب کتنی یاد نہیں رہی۔“

سید صاحب کے چہرے پر بھر پور اور فکر کا اثر ابھرا
اور انہوں نے لہجہ دہی میں آواز میں کہا ”معاف کیجئے، آپ
صحابان کے تعارف میں غلطی محسوس ہوتی ہے۔“ وہ
اشتیاق اور کسی قدر لجاجت سے بولے ”مناسب ہو تو کچھ اور
بتائیے۔“
”کیا پولیس صاحب۔“ بھٹل نے پڑھاتے ہوئے کہا کہ

بھین میں کچھ جامد اور غیرہ ہے، اس کی کی آمدنی پر گزرا
ہے۔“
”مشاء اللہ لیکن جناب بھین کے مستقل رہنے وا
تو نہیں معلوم ہوتے۔“
”اب تو ادھر ہی ہیں، پہلے فیض آباد میں ہوتے تھے
جانے کدھر۔ اپنا دانہ پانی بہت مستحق کرتا ہے۔“
”غریب۔“ سید صاحب نے شگفتگی سے پوچھا ”
سول پبلک بار آتا ہوا؟“
”بھٹل نے سہلانے پر انکشاف۔

”میاں کہاں قیام ہے؟“
”ادھر ہی نزدیک ایک جگہ پر بکسا دھرا ہے۔“ بھٹل۔
”پاٹ لےجے میں کہا اور رخصت کی اجازت چاہی۔“

سید صاحب بے قرار ہو گئے ”ایسا کیسے جناب! آ
نے غریب خانے کو عزت بخشی ہے، کاش میں آپ کے
کام آسکتا لیکن اس طرح اس طرح آپ یہاں سے کم از
میرے گھر سے تو نہیں جاسکتے۔ واہ صاحب! اتنی دور۔
تشریف لائے ہیں، کچھ میزبانی کا موقع تو اس عاجز کو دیتے
انہوں نے اونچی آواز میں نصیحتا بنائی کسی ملازم کو کپکارا۔
”آپ کا نام کم ہوتا انکا، اتنا بہت ہے صاحب! اجازت دو۔“
بھٹل نے میری نام سازی طبع کا غدار کیا اور
کہ یہ صورت دیگر ہم کچھ اور بیٹھتے۔“

سید صاحب کی پیشانی لکیوں سے بھر گئی ”کیا بات۔
ارے رے؟ آپ نے پہلے کیوں نہیں فرمایا۔ حد ہے بنا
کیا محسوس کر رہے ہیں آپ؟ انہوں نے مضطرب لہجے
مجھ سے پوچھا۔“

میں نے غلت آواز میں انہیں مطمئن کرنے کی کو
کی کہ ”سفر کی تھکن غالب ہے۔ ایسے ہی بس جسم نو۔
ہے۔ کچھ آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

سید صاحب نے بے تابانہ کرسی سے اٹھ کر میری
تھام لی۔ ان کے ٹھنڈے ہاتھ سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ
تو جل رہا ہے ”حیرت ہے صاحب، آپ اس طرح خود کو
ہوئے بیٹھے ہیں۔ آپ کو تو تیز بخار ہے۔ محض آرام
آپ کو تو دوا کی شدید ضرورت ہے۔“

”ادھر ہی سے کھل کے کسی دید حکیم کو پکارتے ہیں۔
”دید حکیم میں آجائے گا۔ آپ ذرا ٹھہریے
یہاں سے قریب ہے۔ انگریزی ڈاکٹر میرے دوست
کشن تو آدمی۔ کتنے ہی مریض ہوں، پیغام ملتے ہی آ
گئے۔ ہاتھ میں شفا ہے۔ تانتا بندھا رہتا ہے مریضوں؟

”رے لوگ آتے ہیں۔“ ابن ثانی ملازم آس پاس کہیں
لگ رہا تھا کہ طلبی پر حاضر ہو گیا۔
”بھٹل نے اس زحمت سے سید صاحب کو روکنے کے
لیے بہت کچھ کہا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ ابن کو جب
ل ڈاکٹر ملانے کی ہدایت نہ کردی، انہیں چین نہ آیا۔
”کب سے یہ کیفیت ہے؟“
”رات سے۔“ میں نے گھٹی ہوئی آوازیں کہا ”لیکن
ج کچھ بڑھ گئی۔“
”اور آپ چلتے رہے!“

”یہ دلائل نہیں ہے، نہ ادھر ہی لکھنؤ کا رہا ہے نواب کا
تا، جو سامنے بہت چبا ہے اس نے۔“ بھٹل نے میری
نت جانی کا انہیں یقین دلانا چاہا لیکن سید صاحب پر کوئی اثر
میں ہوا۔

”میں جانب راہ داری سے خالص مقامی لباس پہنے
رے ایک اور میز ملازمہ شرمٹ، مٹھائی اور ٹکیوں چیزوں کا
بس قسم کی فطرتوں سے بھرا ہوا طشت لے کے حاضر ہوئی۔
شت جھاروں والے کیروی رنگت کے ریشمی کپڑے سے
عکا ہوا تھا۔ ملازمہ نے کرسیوں کے وسط میں رکھی ہوئی گول
بزر خوش نما فستراں سجادی۔ اس دوران میں سید صاحب
سن سول کے موسم کی تیرگی کے بارے میں بتاتے رہے۔
چھا ہوا، انہوں نے مجھ سے کھانے پینے کے لیے اصرار نہیں
کیا۔ بھٹل نے سوسے، مٹھائی کا دانہ اور لال رنگ سے
میز کیا ہوا دو دھ کے شرمٹ کا گلاس زہر مار کیا۔ مجھے معلوم
ہا اسے اس وقت کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ زندگی
ابراھمہ تو آدمی کا وضع بھانے میں صرف ہو جاتا ہے۔

سید صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے ”انہیں ابن کو حکم دیے
ہوئے دس باہر منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر کا بیگ
ہاے،“ بند کرتے اور ٹوٹی میں بلبوس، چھریے جسم کا
رجوان ابن سامنے سے حاضر ہو گیا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر کشن
راڑی ہی ہو سکتا تھا۔ وہ سائولی رنگت کا پتہ قد معمولی مثول
دور درمیانی عمر کا شخص تھا۔ دور ہی سے جانے کیا کیا بلکا ہوا
ایا ”سب خیر تو ہے بھیا صاحب۔“

سید صاحب اور ڈاکٹر کے مراسم بے تکلفانہ معلوم
ہوتے تھے۔ کسی رسی تپاک کے بغیر سید صاحب نے میری
طرف اشارہ کیا اور حرد لہجے میں کہا کہ میرے عزیز مہمان کی
طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھتے سے پہلے میری نبض ٹٹولی اور ابن
کو حکم دیا کہ مجھے فوراً مہمان خانے کے کمرے میں منتقل کر دیا
لاؤ گی گھر

جائے مہمان خانہ گھر کے خاص دروازے کے بائیں
جانب تھا۔ اتنی دیر بیٹھے رہنے پر اچانک اٹھ جانے سے میرا
سارا جسم ڈگڑگا گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔
مہمان خانہ زیادہ دور نہیں تھا مگر اتنی ہی مسافت میں سانس
پھولنے لگی۔ وہ مجھے ایک صاف شفاف سجے ہوئے کمرے میں
لے آئے اور نہایت صاف تھرے بستر پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر نے
کسی تاخیر کے بغیر مختلف آلات میرے جسم پر آزمانے شروع
کر دیے۔ درمیان میں وہ مجھ سے طرح طرح کے سوال بھی
کرتا رہا۔

”کیا صورت ہے؟“ ڈاکٹر کے سننے پر سید صاحب نے
بے تابی سے پوچھا۔

”تیز بخار ہے، ٹائی فائڈ کا انڈیکس۔“ ڈاکٹر کشن نے من
مناتے ہوئے کہا ”آرام پر بیزار اور دوا کی ضرورت ہے۔“

”اور تو سب ٹھیک ہے۔“ سید صاحب الجھ کے بولے
”میرا مطلب ہے، ایسی تشویش کی کوئی بات تو نہیں؟“
”بیاری کا پچھانا نہ کرو تو گلے میں ایک جاتی ہے بیا
صاحب! یہ ٹائی فائڈ ہے، ٹائی فائڈ، زلہ زکام کھائی نہیں۔“

”ابھی آپ اتنا کرو ڈاکٹر صاحب! اپنے کو ٹھکانے بیٹھتے
تک کی کوئی دوائی دے دو، ادھر ہی جی ہمارا گھر ہے۔“ بھٹل
نے نرمی سے کہا ”ٹھکانے ادھر ہی سے زیادہ دور نہیں ہے۔“
”ہم کو بھی معلوم ہے، پر آپ کو اس سے کوئی دشمنی لگتی
ہے کیا؟“ ڈاکٹر کٹی سے بولا۔

بھٹل چپ ہو گیا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد اس
نے آہستہ سے پوچھا ”کتنے دن لوگے آپ؟“

”کیا بول سکتے ہیں، یہ تو اس جوان پر ہے، دوا کے ساتھ
بیار کا زور بھی چلتا ہے۔ زیادہ تو نہیں لگتا چاہیے۔ آٹھ دن یا
زیادہ بھی۔ ابھی اس وقت ٹھیک سے کچھ نہیں بول سکتے۔ ٹائی
فائڈ تھوڑی خیرے والی بیماری ہے۔“ ڈاکٹر اپنے کام میں
مصروف رہا۔ اس نے بیگ سے ایک ٹکٹن نکال کے میرے
بازو میں ٹکھن دیا اور مختلف رنگوں کی گولیاں کھانے کو
دیں۔ میری کرسی میں اٹھ رہی تھیں۔ دوا پینے کے بعد
میں نے اٹھنا چاہا مگر ڈاکٹر نے مجھے جھڑک دیا اور خاموشی سے
لینے رہنے کی تاکید کی۔

”سید صاحب! ایک بات تھوڑی تسلی سے سن لو۔“
بھٹل نے دلی دلی آواز میں کہا ”اے کو ادھر ہی اپنے نزدیک
کوئی ٹھکانا لا دو، آٹھ دس دن کے لیے چاہے کتنے کاہن۔“
”واہ صاحب! یہ گھر یہ مہمان خانہ ہم نے کس لیے،
کس کے لیے بنایا ہے۔“ سید صاحب ناگواری سے بولے

کتا بات پہلی کیشن

”ٹھکانے آپ کو مل سکتے ہیں“ اس سے بہت اچھے لیکن ہم آپ کو صاف بتائیں، یہاں جیسا آرام کہیں نہیں ملے گا۔ میں پوچھتا ہوں اس میں حرج ہی کیا ہے۔ درست ہے ہماری آپ کی پہلی بڑھتی ہے لیکن پہلی نہ ہو تو دوسری بھی ممکن نہیں ہوتی۔ انجینی سہی مگر آدمی کا آدمی سے ایک رشتہ تو سدا رہتا ہے۔ بہتر ہوگا، آپ سب کچھ ہم پر چھوڑ دیجئے، ملازم کو بتائیے سمان کہاں رکھا ہے، وہ لے آئے گا۔ آپ بار میاں کو دیکھئے، انشاء اللہ جلد افادہ ہوگا، ڈاکٹر کشن نام ہی کے نہیں گھنوں کے بھی کشن کنیا ہیں۔“

”ہاں آں گویوں والے۔ بس ہم کو ملی بجانا نہیں آتا۔“ ڈاکٹر نے انگلیاں بچا کے کہا اور بھٹل سے بولا، ”بابا! آپ کیوں چننا کرتے ہو، ادھر مزے سے ریتھان کردو شراب کرو، اپنے بھیا صاحب کو سمان پالنے کا بہت شوق ہے۔“ ”بے شک، بے شک۔“ سید صاحب بیٹے پر ہاتھ رکھ کے بولے، ”میریانی میری عادت ہے۔ یہاں سمان خانے میں کوئی سمان نہیں ہوتا تو بچ پوچھئے، عجب اداسی رہتی ہے۔ یہاں دس بارہ افراد کے قیام کی گنجائش ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ ان دونوں کی ہی لوگوں کا اس طرف آنا ہوا اور نہ برکت ہی برکت رہتی ہے۔ سمان خانہ بنا رہتا ہے۔ بھاول پور ریاست کے ایک بزرگ البتہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ بھی محل صبح رخصت ہو جائیں گے۔ اب تو خبریات ہی دوسری ہوئی، ویسے بھی جناب! ہم آپ کو ایسے تو نہیں جانے دیتے۔ کم از کم ایک رات کے لیے تو آپ ہماری درخواست رو نہیں کر سکتے تھے۔“

”آپ بھیا صاحب کو نہیں جانتے بابا! ان کا دل کسی دن ضرور چپک کر جائے، اتنا بڑا ہونے پر ڈاکٹری میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔“ ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔

”اب دل رہا ہی کہاں ہے۔“ سید صاحب نے بظاہر سرد آدھ بھر کے کہا۔

”رہے بھی کیسے، پاس رکھو جہی تو بھیا صاحب!“

ڈاکٹر کشن اور کہا جاتا تھا کہ سید صاحب نے بے جلت کہا، ”تم نے پریز کے لیے کچھ نہیں بتایا مری منوہر۔“

”کم اور ایک دم ہلکا چھلکا، بہت نرم، دوانی کے ساتھ ابن مستان کے ہاتھ پورا چارٹ بنا کے بھیج دوں گا۔“ ڈاکٹر نے بیک بند کیا، مجھے چھلکی دے کے اور خنجر مریٹوں کی کشت کاغذ کر کے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ بھٹل نے چند قدم لپک کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سید صاحب بھی سمجھ گئے، ”تم جاؤ کہنا!“ انہوں نے ڈاکٹر سے کہا اور اشاروں سے بھٹل کو کچھ تلقین کرنی چاہی۔

”اب تو کوری بھر موتی چور، چھوٹے میاں جی ایش ہو جائیں، پھر کھائیں گے۔“ ڈاکٹر بھٹلے ہوئے لمبے میں بولا اور بھٹل کو محل کا درس دینے لگا۔ اس نے از خود وعدہ کیا کہ، ”دشام میری خبر گیری کے لیے آتا رہے گا۔ بھٹل کو اس۔“

شکریہ کا موقع نہیں دیا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ دونوں میرے پلنگ کے نزدیک کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سید صاحب ڈاکٹر کشن کی طبی مہار کے مختلف واقعات سناتے رہے۔ کہنے لگے کہ برسوں سے اس کی دوستی ہے۔ خاصانہ بھٹ اور کسی قدر مضحکہ خیز ہے۔ یہاں تو اس نے احتیاط کی، بے تکان گالیاں بکتا ہے۔ دل بہت اچھا ہے۔ الہ آباد سے تعلق ہے، برسوں پہلے آسن کے آکے مطلب شروع کیا تھا، اب فرصت ہی نہیں ملتی۔ پھر اپنے بارے میں بتانے لگے کہ آسن سول کے گرد و نواح ان کی تھوڑی بہت زمیں وادی ہے، کچھ زمین بردوان میں ہے۔ شری میو بیٹلی میں بھی ان کا عمل دخل ہے۔ بچہ رفاہی فلاحی کاموں میں مصروف رہتے ہیں، بیٹے فشرے، ایک دو دن کے لیے زمینوں کی نگرانی کے سلسلے میں دور کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں ان کے مراسم اعلیٰ حکام، تاجرز دار اور معززین سے بڑے گہرے ہیں۔ شاید ہی کسی اقرب میں انہیں مدعو نہ کیا جاتا ہو۔ وہ رنگ و دل و ملک میں رعایت کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس تعلق ہر طرح کے لوگوں سے ہے اور اطراف اور کناف ان کی عزت کی وجہ بھی یہی ہے۔

”اور ادھر کی گھر میں۔“ بھٹل نے پلو بدل پوچھا، ”گھر میں بیوی بچے؟“

”سید صاحب نے گہری سانس بھری، چہرے پر کئی آئے، کہنے لگے کہ گھر کے معاملے میں وہ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ دو مرتبہ شادی کی، دونوں بیویاں گزر گئیں۔ بیوی سے ایک بیٹی تین بیٹے ہوئے تھے۔ ایک بیٹے کا میں انتقال ہو گیا۔ باقی دو ولایت تعلیم حاصل کرنے گئے لیکن وہاں کی زندگی ایسی مرغوب ہو گئی کہ یہاں آنا چاہتے۔ سال دو سال بعد جگر لگاتے ہیں اور جلد ہی جاتے ہیں۔ دو دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بیٹی گھر کی ہو چکی ہے اور بھوپال میں آسودہ زندگی گزار رہی کبھی بھی میکے آجاتی ہے۔

”پھر تو گھر میں بچو بڑھ گئے ہوں گے۔“

”جی، جی ہاں مگر نہیں ایسی ختمی تو نہیں، گھر تو اللہ رکھے ہوا ہے، نوکر چاکر ہیں، دوست احباب کا جھگڑا رہتا ایک بوڑھی رشتے دار خاتون بھی ساتھ ہیں، جی لگا رہتا۔“

”پھر کتنا کھینچ لیا کیا؟“

”جی، کیا فرمایا آپ نے؟“

”تیسری کوئی نہیں کھوئی پھر؟ شکر ہے۔“ بھٹل کا لہجہ طنز باری تھا، ”چھ کیا۔“

”ایک خانے کے تردد کے بعد سید صاحب چپک کے لے، تیسری بھی ممکن تھی، بس یوں مجھے ستارے نہیں آتے، ہو نہیں پاتی، ہو بھی سکتی ہے۔ آپ فرمائیے، آپ تو اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں؟“

”کچھ بولنے کا ہوتو نہ کھولیں۔“

”کتنے بچے وغیرہ؟“

”بہت سارے۔“

”ہائے اللہ؟“ کتنے؟“ سید صاحب نے اشتیاق سے پوچھا، ”بیس، تین یا د نہیں۔“

”یہ بھی خوب رہی۔ سید صاحب نے قہقہہ لگایا اور گئی سے بولے، ”زیادہ بچے رحمت بھی ہیں، رحمت بھی اور کچھ بیوی کا ہے۔ آج تک سمجھ میں نہیں آیا، ہونے یا نہ نے میں کون سی صورت زیادہ اچھی ہے۔ کیا خیال ہے؟“

”اپنے کوچ پوچھو تو کچھ بتائیں۔“

”آپ کا تجربہ کیا ہے؟“

”کبھی فرصت ہی نہیں ملی صاحب۔“

”آپ کے چہرے پر بہت تجربے لکھے ہیں۔“

”اپنے کو بتائیں، آپ بڑھے لکھے آدمی ہو۔“

”بھٹل بے زندگی بہت چھیلی ہے آپ نے۔“

”بھٹل بے حرکت بیٹھا رہا۔“

”یہ بارہ میاں! آپ نے بتایا ہی نہیں کہ ان سے آپ کی ریزواری ہے؟“

”کبھی کبھی۔“

”وہ تو نظر آ رہا ہے پھر بھی۔“

”نہیں چھاپنا ضروری ہے کیا؟“

”نہیں بے شک نہیں۔“

”پھر تو آپ سمجھو وہی ٹھیک ہے۔“

”مناسب ہے۔“ سید صاحب خفیف سے ہو گئے اور کہنے لگے، ”ہماری گفتگو سے بار میاں بے آرام ہو رہے ہوں گے، آئیے باہر چلتے ہیں۔“

میں نے یہ وقت کہنے کی کوشش کی کہ وہ میری فکر نہ کریں، بہتر ہے، یہیں بیٹھیں۔

لیکن سید صاحب اٹھ گئے، ”ملازم نصیر بابا کمرے کے باہر رہیں گے، دوسرے ملازموں کو بھی ہدایت کر دی گئی ہے۔ کسی فوری ضرورت کے لیے سمان خانے میں ایک مختصر سا باورچی خانہ بھی ہے۔ نصیر بابا کو اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔“

انہوں نے میری چلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور تسلی دیتے رہے۔

”سمان ادھر ہی آکے تو پیچھے کا سارا بھول جاتا ہوگا؟“

بھٹل نے چپکی بھرنے والے انداز میں کہا۔

”نہیں صاحب! اپنی اپنی مصروفیت میں گھرے ہوئے لوگ آتے ہیں۔ میری تو بس یہی شمار ہتی ہے کہ یہاں سے کوئی ناخوش نہ جائے مگر یہ کوئی بہت بڑا شہر تو ہے نہیں، آسن پاس اچھے شاداب مقامات ہیں لیکن بسبھی ٹھکاتے، دلی کی رنگینیاں تو یہاں نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، لوگ میری عزت افزائی کے لیے اس طرف کا رخ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کام کی غرض سے، کچھ خاص تعلق خاطر کی وجہ سے، بعض حضرات سکون کی تلاش میں غریب خانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ابھی چند ماہ پہلے ندوے کے ایک عالم کتاب لکھ رہے تھے، انہیں خلوت کی ضرورت تھی۔ یہاں شریف لے آئے مینے ڈیڑھ مینے قیام رہا۔ انہی دنوں دوسرے کمرے میں سنگیت سرٹ استاد شاد خان ٹھہرے ہوئے تھے۔ صبح و شام کمرے میں بند ہو کر ریاضت کرتے تھے، افسر، مصور، شاعر، نظم قسم کے لوگ، تفصیل کیا عرض کروں۔“

”ادھر ہی ہر ایک کو کھلی چھٹی ہے کیا؟“

”ہر ایک کو نہیں، معاف کیجئے یہ سرائے یا ہوٹل نہیں ہے۔ یہ تو محبت کی ایک رسم ہے، محبت کا ایک سلسلہ ہے جو جاری ہے، جاری رہے گا۔“

”ادھر کوئی کاٹنا تو رکھا ہوگا آپ نے؟“

”اتھک سب سے بڑی ترازو ہوتی ہے، نظر آتا جاتا ہے جناب! اتنی پرکھ ہو گئی ہے۔“ سید صاحب نے اعتماد سے کہا۔

”اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

سید صاحب سے فوراً کوئی جواب بن نہ پڑا۔ بے ترتیبی سے بولے، ”آوی بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔“

”ہم تو دکھائی نہیں دیتے چائیں صاحب! کسی ترازو پر

پورے نہیں اترتے۔“
سید صاحب کے جسم پر توجہ سامعہ اور ہوا۔ ”آپ نظر آ رہے ہیں جناب! یہ کس قسم کی خوش ہے، جانے دیجئے۔ سمجھئے، آپ ہمیں اچھے لگے، دوسروں سے الگ۔“ انہوں نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”دھوپ میں تو سفید نہیں ہو رہے۔“

”ابھی پورے چنے بھی نہیں ہوئے۔“
”آپ تو کب سے ہو چکی ہے، پانی کتنے دن کے ہیں۔“
”کبھی کوئی نوٹس والا بھی نہ لایا ہوگا؟“
سید صاحب کی جلیبیں مرتعش ہو گئیں، اضطرابی لہجے میں بولے ”جی ہاں، مگر مگر ایک دو بار ہی جی پر بار ہوا۔ اصل میں کوئی آدمی اتنا مکمل نہیں ہوا مگر آپ، آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”ایسے ہی صاحب! اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔“
”کچھ مت سوچئے اور آئیے، باہر کھلی ہوا میں بیٹھتے ہیں۔ موسم بڑا سنا ہے، بارش کی بھی اپنی مستی ہوتی ہے۔“
بنجار اور سردی کی شدت کی یاد دہانی ان کی باتوں سے لطف آ رہا تھا۔ باہر سے ابن کے آجانے پر سید صاحب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابن دو ایک شیشی بلکہ شیشیاں اور گولیاں لایا تھا۔ اس کے پاس پرہیز کا مکمل گوشوارہ بھی تھا۔ چارٹر پر ایک نگاہ ڈال کے سید صاحب سہلے رہے اور بیٹھنے کی کمر ہو گیا۔ میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں کہ کسی کی چاپ سے کھل گئیں۔ وہ ملازم نصیر بابا تھے۔ دہے قدموں چلتے ہوئے وہ میرے سرہانے آکے بیٹھ گئے اور سر دبانے لگے۔ میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اتنے عمر رسیدہ شخص کو یہ زحمت دینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے بت منع کیا، وہ نہیں مانے۔ ان کے ہاتھ سخت کھردرے تھے لیکن دباؤ میں بڑی نرمی تھی۔ انگلیاں بھی بولتی ہیں۔ گوئی گئے تو اتنے دکھ اپنی خوشی کے اظہار پر قادر ہوتے ہیں۔ مجھے قرار سا آ گیا۔ ایسی غفلت طاری ہوئی کہ رات گئے آنکھ کھلی۔ ڈاکٹر نے دواؤں میں یقیناً کوئی نیند آور دوا بھی شامل کی ہوگی۔

سید صاحب نے کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا بلکہ واقعے سے کچھ کم ہی بیان کیا تھا۔ کسی بڑے ہوش میں یہ اہتمام اور احتیاط میں یہ نگہداشت ممکن نہ ہوتی۔ مطلب جانے سے پہلے ڈاکٹر شخص معائنہ کرنے آیا اور مطلب ختم کر کے رات کو ایک بار پھر چکر لگایا۔ سید صاحب بھی دن میں متعدد بار کم وقت کے لیے سہی مگر پوچھ گچھ کے لیے آتے رہے۔ بوڑھی

ملازمہ اسٹل گھر سے ملکی پھلکی غذا میں اور پھلوں کا تازہ لاتی رہی۔ ابن اور دوسرے ملازم بشارت اور نذر ہو گئے، مانوس ہو گئے تھے نصیر بابا نے پھردوانی لگے کا اپنی چار راہداری میں دروازے کے ساتھ بچھائی تھی۔ وہ میری صدا، ایک آہٹ پر مستعد ہو جاتے تھے۔ بیٹھنے کے حر عادت ملازموں کے انکار کے باوجود جانے کتنی رقم ان تقسیم کی تھی اور انہیں باور کراوا تھا کہ سید صاحب عطیات کی بجائے نہیں پڑنے دی جائے گی۔ مال دوز تو ہے، روپیے کا ریشم آدمی کو زیادہ آسودہ رکھتا ہے۔ غیر بیش تر وقت میرے پاس کمرے میں گزرا یا پھر وہ سید کے ساتھ گھنٹے گھنٹے کے لیے باہر چلا جاتا۔ کوئی اور جانے کن کن مصوعات پر نصیر بابا سے اس کی کھسر پھر رہی۔ نصیر بابا نے اس کے لیے حق کا انتظام کر دیا تھا۔ دونوں کے تعلقات دلچسپ لگتا تھا کہ برسوں سے ہے۔

چوتھے دن کہیں بخار کا زور نہ تھا، پانچویں دن میں قابل ہو گیا کہ کمرے سے باہر دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ سکوں۔ پانچ چھ روز میں تقریباً سارا بیٹھنے کے مصاحب ہو چکے تھے۔ بیٹھنے کی جگہ کوئی توان کی خاطر درازات سے تنگ آ جاتا۔

سید صاحب کے ہاں آئے ہوئے چھ دن ہو چکے تھے جیسے مینے گزر چکے ہیں۔ چھ دن میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ نصیر بابا بہت خوش تھے۔ وہ صبح صبح صبح صبح عقب میں پھیلے ہوئے سبزہ زار میں چل قدمی کے گئے۔ بڑی دل کش جگہ تھی۔ چار دیواری۔ پھلوں اور پھلوں کے اونچے نیچے درخت۔ وسط میں کے مانند سبزہ کاریوں میں آراستہ بڑے بڑے رنگ گلاب، ایک گوشے میں مکمل طرز کی جالیوں کی دیوار ملازم کے مکانات تھے۔ بیلوں نے توھی دیوار ڈھا تھی۔ شام کو گھٹے کا رس اور سبزی کے کباب کو دوا کی خوراک ٹنگنے کے بعد سبزہ زار میں جانے کو لگا۔ چھ دن کی قید کے بعد آج رہائی ملی تھی۔ میں تو سے دور بازار اور گلیوں میں جانا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر راہداری کے سوا کہیں اور چلنے پھرنے کی سختی تھی۔ اس کے احکام کی تعمیل ہی کا اثر تھا کہ اب محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے تنبیہ کی تھی کہ ذرا سی بنجار لوٹ سکتا ہے مگر راہداری سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں نے نصیر بابا سے وہاں چلنے کی فرمائش

ہوں نے صاف انکار کر دیا پھر جلد ہی کچھ اپنی ٹھکوی کے ہاں کچھ میری خوشنودی کی خاطر آتا رہے۔ شام کے پاس نہ سبزہ زار کا سماں اور فرحت انگیز تھا۔ نصیر بابا کے پاس ان کی کمی نہیں تھی، اتنے فتنے کمائیاں یاد تھیں اور زندگی کے معمولات کے ایسے تجربے ازر تھے کہ آدمی بس سنتا ہے۔ باتوں باتوں میں ہی نہیں چلا، ہم دور آگئے۔ صبح اس رف نہ آئے تھے چلتے چلتے ایک نصیر بابا کو خیال آیا اور وہ تشر ہو گئے۔ ”واپس چلتے ہیں میاں! اوھر سے زنان خانے کا شروع ہو جاتا ہے۔“

میں مہمان خانے کی ست پلاہی چاہتا تھا کہ سامنے میں ہاتھ کی جانب عمارت کے ٹھکانے میں پہلی منزل پر فتح عربی دروازے کے پٹ کھلے اور پردہ کھٹکنے کی آواز پر رہے قدم ٹھک گئے۔ آنکھیں بھی سماعت رکھتی ہیں۔ غیر آدمی طور پر میری نگاہ نے دروازے کا نقاب کیا۔ کوئی شاعر آتا ہر شاید یہی کہتا، جیسے ماہ تاب درستی میں اتر آیا ہو۔ ایک جھکا سا تھا۔ پتیا ہوا سرخ و سپید کٹلی چوہ، ٹھیکے ش و نگار سامنے میں ڈھلے ہوئے بڑی بڑی آنکھیں، بے تپ سیاہ بال، گرتا سفید تھا، دوپٹا سبز رنگ کا کانوں میں موٹے آؤڑے بھول رہے تھے۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی۔ او دونوں کی نظریں ایک ٹھٹھے کے لیے چار ہوئی تھیں کہ چشم دان میں وہ لڑکی سے بہت گئی۔ میں دیکھ رہا گیا۔

نصیر بابا نے بھی اسے دیکھ لیا تھا، آہستگی سے میرا ہاتھ ام کے وہ مہمان خانے کی جانب مڑ گئے۔ معمول کی طرح اس نے بھی ان کی پے روی کی۔ چند لمحوں کے لیے میں اپنے سے پیگنا ہو گیا تھا۔ واپسی کا پانی رست خاموشی سے گزرا۔ نہ نصیر بابا نے کوئی کلام کیا نہ مجھ میں اس سے پوچھنے کی زرات ہو سکی۔ منظر کی تبدیلی سے مراد منظر کی روپوشی نہیں ہے۔ بعض منظر آنکھوں میں جذب ہو جاتے ہیں، میرے سے پہلے سید صاحب کی تصویر کی طرح۔ میرے سبزہ زار جانے سے پہلے سید صاحب بیٹھ کر کہیں لے گئے تھے، وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ مجھے واقعی کھٹک محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں آکے میں بہتر دراز ہو گیا۔ ملازمہ اسٹل اور نصیر بابا نے صبح معمول کی تہی کی ضرورت کے لیے مجھ سے استفسار کیا کہ میری طرف سے معمول کا جواب سن کے چلے گئے۔ میں جسم میں تھکاوٹ تک آنکھیں موندنے لگا اور جب بہتر محسوس ہو گیا تو باہر راہداری میں آکے آرام کر سہی پر بیٹھ گیا۔ شام اندھیرے میں ڈوب رہی تھی۔ منع کرنے کے باوجود ملازمہ ابن نے میرے پیروانے شروع کر دیے۔ خدمت

گاری بھی شاید جزو جاں بن جاتی ہے۔ ابن میری صحت کی بجائی پر خدا کا شکر ادا کرتا اور مسرت کا اظہار کرتا اور سادگی سے کہتا تھا کہ اسے میرے اچھے ہو جانے کی جتنی خوشی ہے، اتنا ہی یہ سوچ کے دشت ہوتی ہے کہ چند دن بعد میری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی تو میں اور بیٹھل یہاں سے چلے جائیں گے۔ بیٹھل کو سارے ملازم بابا کہتے تھے۔ ابن بطور خاص اسے بابا صاحب، بابا سرکار کے لقب سے مخاطب کرتا تھا۔ ابن کی آواز میں کوئی کھوٹ نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ مہمان تو آئے دن یہاں آتے ہی رہتے ہیں، بڑے بڑے اونچے لوگ لیکن ہم دونوں جیسے آج تک نہیں آئے۔ میرا تو خیر کیا ذکر تھا، میں تو ان کے لیے مسلسل بوہہ بنا ہوا تھا اور میں تو اتنے دن بہتر نہ کر میں دل، اینڈنا ہی رہا تھا۔ بیٹھل ہی سے ان کی راہ دور ہو گئی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ ابن سے زنان خانے کے کیمپوں کے بارے میں کچھ نہ لوں۔ سید صاحب نے گھر میں رشتے کی ایک عمر رسیدہ خاتون ہی کا ذکر کیا تھا، پانی ملازموں کا البتہ انہوں نے ہم انداز میں یہ بھی کہا تھا کہ ابھی لوگ ہیں۔ ممکن ہے زنان خانے میں مہمان خواتین بھی ٹھہری ہوں، سید صاحب کی عزیز رشتہ دار خواتین۔ میں نے ابن سے کچھ نہیں پوچھا اور خود کو روک لیا کہ مجھے آخر کیا جتو ہے۔ وہ لڑکی کو بھی ہو، مجھے اس سے کیا سروکار؟ میں نے کسی حد تک خود کو مطمئن کر لیا تھا لیکن جانے کیوں وہ درپچ میری آنکھوں سے دور نہیں ہوتا تھا۔ اس تردد کا کچھ جواز بھی تھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر اضطراب آمیز سیاحت چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بے تاثر نہیں تھیں۔ سوچتی ہوئی، ٹھوکی ہوئی آنکھیں۔ میں اس کیفیت کو کوئی نام دینے میں ہجرتا رہا۔

بیٹھل کوئی آنکھ بجے واپس آیا۔ اس رات اس نے کمرے میں کھانا کھایا۔ معلوم ہوا کہ سید صاحب کسی خاص دوست کے ہاں مدعو ہیں۔ بیٹھل کا توشہ تو خاص الخاص تھا، میرے پرہیزی کھانے میں بھی کچھ کم اہتمام نہیں تھا۔ مرغ کا شوربہ، مونگ کی وال کی پتی پھجڑی، چٹائی، سلا دہی اور پھلوں کا رس، میٹھا دیا بھی۔ مجھے رات کی خوراک پلانے اور بیٹھل کے لیے آتہ حق لانے کے بعد روشنی کم کر دی گئی۔ نصیر بابا سے آخر میں رخصت ہوئے۔ وہ دروازہ پوری طرح بند نہیں کرتے تھے تاکہ کسی ضرورت کے لیے ہماری آواز نہ آجائے۔ راہداری میں دروازے کے ساتھ چھٹی ہوئی ان کی چارپائی تک پہنچ جائے تمام کمر کیوں اور دیوانوں پر جالیاں لگی تھیں۔ ہمارے کمرے میں آمد و رفت کے راستے پر دو

دروازے آگے پیچھے نصب تھے، دوسرا جالی دار تھا۔ چاروں طرف سبزے کی کثرت کی وجہ سے کپڑے کوڑوں کی بہتات ہو سکتی تھی مگر نصیر بابا کے کتنے کے مطابق ہفتے میں ایک بار دلائی کپڑے مار دو کے چمڑکاؤ اور کھڑکیوں پر دروازوں پر کھینچی ہوئی جالیوں سے عمارت کا اندرونی حصہ محفوظ رہتا تھا۔ اس وقت دیواری گھڑی نے گیارہ کا گھبر بایا تھا۔ بھصل حدہ کشی میں مصروف تھا۔ کہتے ہیں: خند کے لیے چشم بستگی شرط نہیں، خند کا اپنا تیر ہے، کھلی آنکھوں میں بھی اتر آتی ہے۔ میرا ذہن جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا اور خند جیسے چھڑ خالی کر رہی تھی۔ اچانک جالی والا دروازہ چڑچرایا۔ دوسری نصیر بابا نے ابن کو بدایا کی تھی کہ وہ دروازے کے قبضوں میں تیل ڈال دے، کسی طور تو یہ تکلیف دہ آواز بند ہو۔ ہلکی روشنی کے باوجود پچانے میں دشواری نہیں ہوئی۔ وہ نصیر بابا تھے، چوروں کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔

”بابا! انہوں نے سرگوشی میں بھصل کو پکارا“ سو تو نہیں گئے؟“

”نہیں بھایا، نند ریا تو بھنی سان ہے۔ اپنے سے بہت کھیلن کرتی ہے، پر ایک دن تو۔“ بھصل نے گونجی آواز میں کہا ”تم بولو، آگے پیچھے بٹھیک ہے تو کھینچ لاؤ اس کو۔“

”میں پوچھنے کے لیے آیا ہوں۔“ نصیر بابا کے لیے میں سراپستگی عیاں تھی ”میں نے اس کو بول دیا ہے، اچھی جی دار ہے، پر ڈر رہی ہے بہت۔ میں نے بڑی کمر چھٹی دلا سے دیے کہ بڑے صاحب جلدی نہیں آئیں گے، محفل میں گئے ہیں۔ اسے بھی معلوم ہے، کبھی کبھی تو سیرے ہی ملتے ہیں۔“

”اس کو بولا نہیں، بڑے صاحب بیچ میں آجائیں تو کیا ہے، دیکھ لیں گے پھر۔“ بھصل نے بے پروائی سے کہا۔

”میں نے بولا تھا، وہ تو کانپ گئی۔ آنے سے انکار کرنے لگی، میں نے سمجھا پھر یہ وقت نکل جائے گا، اچھی طرح سوچ لو، تیار ہو گئی۔“

”پھر دیواری کا ہے کرت ہو؟“ بھصل نے پوربی لیے میں کہا۔

”ہیں، ہیں۔ میرا مطلب ہے، میں نے آؤں۔“ نصیر بابا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

”اور گھر ہی پھر؟“ بھصل نے تندی سے کہا۔

”کوئی دوسرا کرا کھول دیتا ہوں، یہاں تو اپنے مہاں۔“

”نہیں، ادھر ہی لے آؤ۔ بڑے صاحب کھڑکیوں سے تو اس تاہم ادھر ہی رخ نہیں کریں گے۔“

”اور کیا پتا کس حال میں ہوں۔“

”یہ تو تم اچھا جانتے ہو۔“ نصیر بابا یہ کہہ کے کہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آئی لے کرے سے چلے گئے۔ مجھ سے بستر پر لیٹا ہوں نے طے کیا تھا کہ بھصل سے سوال ہی کیوں؟ اس کی مرضی پر ہوتا ہے، خواہ مخواہ پھر بھی بڑی اہم ہے لیکن میں خود کو نہ روک سکا ”کون آ رہا ہے؟ یہ؟“ میں نے جھپٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”دیکھتے ہیں رے ابھی۔“ وہ حقے کا کش لیتے ہوئے ”کون ہے وہ؟ مجھے کیوں نہیں بتاتے؟“

”ابھی سارا تیرے سامنے آ جائے گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے ترشی سے کہا۔

میں ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

میری بہتر تھا کہ آنے والے لمحوں کا انتظار شاید وہ مجھے اب تک بچہ سمجھتا ہے اسے میری دا شہ ہے، اس کی دانست میں، میں ایک بے توازن اسی لے رہے مجھ سے صحیح طرح بات نہیں کرتا۔ ہاتھ پاؤں مارے لیکن کوئی سرا مجھے بھائی نہیں، کون اسے باور کرنا کہ جتنا وہ مجھ میں شامل ہے، سے کچھ سرکار رکھتا ہوں۔ اسے بالکل احساس اس کے رویے سے دوسرے کو کتنی اذیت ہو دوسرا کوئی اور نہیں، وہ میں ہوں۔“

نصیر بابا کو گئے دیر ہو گئی۔ گھڑی نے ساڑھے بجایا۔ یقیناً زنان خانے سے کوئی آ رہا ہے۔ دہار خانے کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہے۔ میری نظریں جبی ہوئی تھیں۔ ایسی خاموشی تھی کہ قدموں کی کمرے میں در آئے۔ بھصل دوبارہ بستر پر دراز، مثال اس کی ہونٹوں سے چسکی ہوئی تھی۔ وقفہ کی گزر گزرا ہٹ کمرے میں گونجی رہی۔ میں بچہ کمر نکالے بت بنا بیٹھا رہا۔ گھڑی کی ٹک بیزاری ہونے لگی تھی۔

چند منٹ اور گزر گئے۔ میں نے پانچ ہوئی میز سے بگ اٹھا کر آدھا گلاس پانی پیا۔ وقت گزارنے اور حواس یک جاکھنے کی کو بارہ سے اوپر ہو گئے۔ اب رات بہت ہو گئی۔ آدھا امکان کم ہوتا جا رہا تھا مگر بارہ نہیں بجے داری میں سرسراتی چاؤں کا گمان ہوا۔ عام تھا۔ لمبے بھر بعد جالی والے دروازے کی دی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نصیر بابا نے

جھانک کر پہلے اطمینان کیا، پھر دبے قدموں آ کے پہنچی ہوئی آواز میں کہا ”بابا! میں آیا ہوں۔“

”ہاں ہاں دیکھ لیا ہے۔“ بھصل بھی بستر بیٹھ گیا۔

”آج آ جاؤ۔“ نصیر بابا نے اپنے پیچھے سر می چاروں میں لٹی ہوئی عورت کے شانے پر ہاتھ رکھ کے تقریباً اسے دھکیلا۔ اس کی حالت اضطرابی، سیمائی سی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر آئی۔ انہوں نے پلٹ کے جھٹ عام دروازے کی چٹنی چڑھا دی ”بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ تسلی سے۔“ نصیر بابا کی آواز دھڑک رہی تھی۔ ”یہ ہیں اپنے بابا صاحب اور یہ؟ یہ چھوٹے صاحب باہر میاں۔ میں نے تم کو ان کے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ اب گھبراؤ بالکل نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں گھبرانے کی۔“

وہ پہلے تو سسکی سنی دروازے کے پاس کھڑی رہی پھر نصیر بابا کی مسلسل تلقین و تاکید پر اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور بیٹھتے، اگلے قدموں سے کونے میں رکھے ہوئے صوفے پر ایک جانب بدن چراتے ہوئے بیٹھ گئی۔ اس نے چادر کے آچل سے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا، چادر سے پیشانی بھی چھپی ہوئی تھی۔ بھصل کی طرف سے روشنی تیز کرنے کی بدایت پر نصیر بابا کو کسی قدر تامل ہوا تھا لیکن انہوں نے قہر کوئی۔ روشنی بھی حیرت، خوف اور رنج و اہم کچھ کم کرنے کا سبب ہوئی ہے۔

”اب ادھر ہی آگئی ہو تو آرام سے بیٹھو۔“ بھصل نے بہتر سے اٹھ کے نرمی سے کہا اور صوفے کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا ”ادھر ہی تمہارے آجانے سے لگتا ہے نصیر بابا نے تم ہی بولا ہے۔“

وہ صوفے پر دیکھ بے حس حرکت نہیں رہی۔ بولو بیٹا۔“ نصیر بابا نے پکارتے لیے میں کہا ”پنے کو جتنا پتا تھا، بابا صاحب کوتاہی ہے لیکن اصل بات تو تمہاری ہے۔ تم ہی اپنی زبان سے بولو تو اچھا ہے۔“

وہ کوئی لڑکی سی تھی۔ اس کا سر اور جھک گیا اور ہونٹ لڑنے لگے پھر جانے اسے کیا ہوا، وہ سسکیاں بھرے لگی۔ ادھر سے نصیر بابا لنگ کے اس کے پاس پہنچے، ادھر سے بھصل نے اٹھ کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ اور گھڑ گئی۔ نصیر بابا جلدی سے پانی کا گلاس لے آئے اور مشتقانہ انداز میں بوسے کہ وہ حوصلہ رکھے اور یقین کرے کہ ہمدردوں میں آئی ہے خیال رہے کہ اسے زنان خانے میں، جتنی جلدی ہوئے واپس پہنچا ہے۔ اگر اس نے یوں ہی چپ ساڑھے رنج، دروٹی رہی تو کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا، یہ وقت نکل باؤنی کر۔

جائے گا۔“ نصیر بابا کے اصرار پر اس نے یہ مشکل گھونٹ بھربانی پیا۔ اس کی چادر اس دوران میں چہرے سے ہٹ گئی تھی۔ اس نے دوبارہ چہرہ ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی جس کی ایک جھٹک میں نے سرشام زنان خانے کے درجے میں بیٹھ گئی۔ چودہ پندرہ سے زیادہ اس کی عمر نہیں ہوگی۔ لکھا ہوا، بدلتی، محفل رنگ رخسار، ستواں ناک اور ترستے ہوئے ہونٹ۔ اسے دیکھ کے بے اختیار مجھے نیساں یاد آئی۔ نیساں کے چہرے پر بھی ایسی ہی دل آویز معصومیت تھی۔ وہ بھی ایسی ہی نازک تھی، پھول کی پتیوں کی طرح۔ خال و خد میں دونوں کے فرق تھا جو فرق پھولوں میں ہوتا ہے۔

”یہ تو ایک دم مورنی کی طرح ہے۔“ بھصل نے بے ساختہ کہا۔

”بچ بابا صاحب! کیا بولوں، دونوں بہنوں کو اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ شہزادیاں ہیں شہزادیاں، ایک کو اٹھاؤ، دوسری کو بٹھاؤ۔ پر نصیب بھی تو اچھا لکھا ہوتا۔“ نصیر بابا آہ بھر کے بولے۔

دوسری بہن کے ذکر پر میرا ہاتھ ٹکا۔ وہ درجے والی لڑکی کیوں اس کی بہن تو نہیں؟ دونوں میں ایک شبابت ضرور ہے۔ میں بستر سے اٹھ کے بھصل کے پاس جا بیٹھا۔

”کیا نام ہے ری تیرا؟“

”لڑکی کے ہونٹ پھڑک کے رہ گئے۔“

”بولو بیٹا بولو، بابا صاحب کیا پوچھتے ہیں، اطمینان رکھو، تم بچوں میں ہو، یہاں کوئی غیر نہیں ورنہ میں تم کو یہاں کیوں لانا۔“ نصیر بابا شکایت آمیز صرناہ لیے میں بولے۔

بھصل نے دوبارہ لڑکی کا نام پوچھا تو اس نے زیر لبی سے یا سمن بتایا۔

”یا سمن!“ بھصل نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا ”کیا بولے ہیں اس کو، کوئی پھول نا۔“

”ہاں، پینیلی۔“ میں نے کہا۔

”بھصل نے اپنا بھاری سر ہلایا ”اور بڑی کا؟“ اس نے یا سمن سے پوچھا۔

”فروزاں۔“ وہ چرم کی اور ناتوانی سے بولی۔

بھصل نے اس بار مجھ سے فروزاں کے معنی نہیں پوچھے۔ نصیر بابا کھٹکنا چاہتے تھے کہ بھصل نے ہاتھ اٹھا کے انہیں روک دیا اور تھی ہوئی، تھپتھپ ہوئی آواز میں یا سمن سے کہا کہ جس استقامت سے اس نے یہاں آنے کا عزم کیا ہے، یہی عزم و جرات اسے اور فروزاں کو کرنا ہے۔ ہوسکتا

ہے، یہاں آنے کے بعد ہم سے مل کے، ہمیں دیکھنے کے بعد اسے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ اس کے خیال میں ہم وہ لوگ نہ ہوں جن کی اسے تلاش ہے۔ اسے ہماری توجہ و استطاعت پر کوئی شبہ ہے یا ہم اسے مستہو محترم لوگ نظر نہیں آ رہے ہیں تو ہماری جانب سے کوئی اصرار بھی نہیں۔ یہ بات اسے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خود اس نے ہمارے دروازے پر دستک دی ہے، ہم اس کے پاس نہیں گئے ہیں۔ تاہم یہاں آگے اسے کوئی پہچتا ہوا ہو رہا ہے تو نصیر بابا موجود ہیں وہ اسی وقت واپس جا سکتے ہیں اور وہ خاطر جمع رکھے، ہم اس کی آمد اور اس معاملے کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ ہمیں تو جلد از جلد یہاں سے چلے جانا ہے اور شاید دوبارہ اس شہر میں واپسی ممکن نہ ہو۔

یہ کیسی باتیں ہو رہی ہیں؟ میں ان تینوں کو بے چارگی سے دیکھا کیا۔ سب سے بڑی بے چارگی تو دیکھنے اور سننے کی صلاحیت سے متصف ہونے کے باوجود کچھ نہ سنانا اور دکھائی دینا ہے۔ میرا سر دھنک رہا تھا۔ یا سمن نامی یہ لڑکی کون ہے؟ اتنی رات کو اس کے یہاں آنے میں کیا راز ہے؟ پھیل کو اس قسم کی صراحتوں کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے؟ نصیر بابا نے لڑکی کے بارے میں کیا واقعہ پھیل پر متکشف کیا ہے۔ آخر اس بایکڑ صورت، نازک و اندام، ناتواں لڑکی پر افتاد کیا پڑی ہے؟ صرف اس قدر واضح ہو سکا کہ سید صاحب، ملازموں اور زنان خانے کے کمینوں کا لاعلمی میں وہ یہاں آئی ہے۔ ظاہر ہے، کسی بڑی وجہ کے بغیر وہ یہ قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ کچھ پھیل کا سر دو گرم مخاطب بھی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اسے بہر حال غلت ہونی چاہیے تھی کہ اس طرف کسی کے بہنکے سے پہلے مناسب ہو گا وہ زنان خانے واپس چل جائے۔ پھیل کے سامنے زمانے کے پست و بلند سے ناواقف، زندگی کی نیرنگیوں سے نا آشنا، ایک پانچتہ کار لڑکی بیٹھی تھی۔ اجنبی مردوں کے درمیان اس طرح رو بہ رو ہونے کا تجربہ یا سمن کو پہلے بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا یہ اقتناع نہایت فطری تھا۔ اپنے خواص کی یک سوئی اور ارادے کی استواری کے لیے اسے کچھ وقت تو لگنا چاہیے تھا، دونوں صورتوں میں جیسا کہ پھیل نے اس سے کہا تھا کہ بصورت دیگر وہ کسی بھی لمحے زنان خانے واپس جانے کا فیصلہ کر سکتی ہے مگر اب آجانے کے بعد یہ فیصلہ اتنا آسان بھی نہیں تھا، وہ بیٹھی رہی۔ اس کی ذہنی تکلیف کا اندازہ اس کی سرخ آنکھوں اور جلتے پیچھے چہرے سے کیا جاسکتا تھا۔

”اسنے دونوں میں کھتے بڑے بڑے لوگ مہمان خانے

میں آئے میں نے تم کسی کچھ بولا۔ اب آدمی دیکھ کے تو کی ہے بنیاریانی؟“ نصیر بابا بجا بجا سے بولے۔

”میں کیا کیا، کسوں۔“ یا سمن کی چٹختی آواز سینے میں رتی تھی۔

”بابا صاحب کو بولو کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا۔ ہوتا رہا ہے۔“ نصیر بابا دل دی کے لیے اس کے پاس گئے۔

”آپ نے نہیں بتایا؟“ وہ کرب سے بولی۔

”لیکن تم بھی تو اپنی زبان سے۔۔۔“

پھیل نے نصیر کو پھر روک دیا۔ ”نہیں اس کو بولنے کی ضرورت نہیں، ہم سارا جان گئے ہیں۔“ وہ بچپن کے بولا ”ہم کو اتنا بول رہی“ آگے کیا مرضی ہے؟ آگے کی بات کر۔“

یا سمن کے گھائی چہرے پر دھواں سا چھا گیا۔ بتاؤں مجھے کچھ نہیں معلوم، پس کسی طرح ہمیں یہ یہاں سے۔۔۔ اس سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ پھیل کی آواز بچپن کے ”ادھر ہی اس پاس رہتے تھے کا کوئی ہو تو بولو؟“ یا سمن نے سر اٹھا کے ڈیڈائی آنکھوں سے طرف دیکھا اور چادر سے چہرہ چھپا کے بری طرح لگنے ”نا۔ نا۔“ نصیر بابا نے بے لمانہ اس کے سر پر شانوں پر پھکیاں دیں اور بچوں کی طرح ہلانے لگے۔ ”اپنے آپ کو سنبھالو میری بیٹی، امیری کرنا! تم تو والی ہو۔ یہ رونے کا وقت نہیں، کوئی دور نزدیک صاحب کو بولو۔“

یا سمن بہت منتشر ہو گئی جیسے کسی آزمائش ہو یا کسی عذاب سے گزر رہی ہو۔ یہ مشکل اس ہموار کیا اور انہی، لڑکھاتی زبان سے بتایا کہ اگر جمال الدین سیفی کے کئی قریبی دوست، پٹنہ، لکھنؤ، حیدر آباد اور دہلی وغیرہ میں ہیں لیکن کوئی رشتہ دار میں نہیں ہے۔ اس کے عالم و فاضل، محقق و مجتہد الدین نوری کا تعلق ایران سے تھا۔ نوجوان بد خواہوں نے ان کے ایک مقام پر انہیں عتاب اتنا بہت زدہ کیا کہ وہ فرار ہو کے ہندوستان آئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انہیں فارسی زبان اور درس و تدریس کی عارضی ملازمت مل گئی پھر وہ جہاں چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ہندوستان میں اولادیں ہوئیں، صرف ایک بیٹا اور ایک بیٹی بنی۔

لو انہوں نے اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا۔ گو ہوا، انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ توقع کے برعکس ان علاقے پر رہا رہنے کشادہ قلبی وسیع النظری کا ثبوت دیا نہیں، فیصلت سند سے نوازا ہے۔ وادامت پہلے اپنے وطن واپس جا سکتے تھے لیکن ریاست حیدر آباد میں رہنے کی بڑی عزت و حرمت حاصل کر لی تھی۔ وہ یہاں خوش تھے۔ ہندوستان انہیں ایسا پسند آیا تھا کہ ترک کا فیصلہ کر لیا تھا۔ البتہ چند ماہ کے لیے ایران جاکے اپنے ہم پیشہ ورینہ رفیق کار کے تعلیم یافتہ صاحب سے بیٹی کی شادی کر دی تھی۔ بیٹی وہیں رہ گئی اور اپنے کے ساتھ عراق پھر روس میں جا گئی۔ روس میں آباد نہ سے پہلے یا سمن کی پھولی اور پھر پچھلے سے خواب رابطہ شادی کے بعد ایک مرتبہ پھولی عراق سے اپنے نیکے تان بھی آئی تھی۔ وادانے بیٹی کی شادی کے سلسلے میں ان کے دورے میں اعلیٰ درجہ کی سرکاری عہدے پر فائز رشتے دار کی صاحب زادی سے اپنے اگھوتے بیٹے کے بات کی کر لی تھی چنانچہ کچھ عرصے بعد اپنی پسند کی ہو کے لیے انہیں دوبارہ ایران جانا پڑا۔ بیٹے کی شادی کو بھر سے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ زندگی کا باب ختم ہو گیا۔ ریاست حیدر آباد میں وادانے ایک چھوٹی سی حویلی تھی۔ والی ان کو حضور نظام نے ان کے علمی و تحقیقی کام ستائش میں شہر کے قریب زرعی زمین کا ایک قطعہ بھی عطا کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی انہیں ریاست کی طرف سے انعام ملے رہے تھے۔ یا سمن اور فروزاں حیدر آباد پر رہا ہوئی تھیں، ان کا ایک بھائی شیر خوار کی زمانے میں ال کر گیا تھا۔ دونوں بیٹیں بھی ایران میں گئی۔ ان والد جمال الدین سیفی بھی ہندوستانی بود پاش کے دل وادہ اور اپنے والدین اور باپ کے سچے پیروکار تھے۔ وضع واد میں بیکانہایت خوش گفتار، خوش شعار، ان کا پیشہ تر نہ سلسلے میں گزرتا تھا۔ سیاحت کا شوق تھا اور داستان کی قدیم تہذیب پر تحقیق کر رہے تھے۔ بڑی بہن زان نے مشرقی علوم کی چمکی سند حاصل کر لی تھی۔ باپ ہانپوں کے اناج بھی تھے۔ اردو اور انگریزی کے لیے دل نے گھر پر استاد رکھے تھے۔ دونوں بہنوں کو خود بھی بہت مہارت تھی۔ حیدر آباد میں ان کا گھرانا آسودہ ال الدین سیفی حیدر آباد کا نواب ہویاں کی پیش کش پر اکرام کی گئی پھر کھٹو چلے آئے اور لکھنؤ سے پٹنہ۔ پٹنہ میں

ان کی ملاقات سید صاحب سے ہوئی اور دونوں میں جلد ہی گھرے مراسم ہو گئے۔

نصیر بابا پھیل کے لیے حقہ اٹھانے تھے لیکن پھیل نے ایک گٹھ نہیں لیا۔ ہم تینوں خاموش بیٹھے یا سمن کی نوٹی پھولی آواز میں اس کی روداد سن رہے تھے۔ کہتے ہیں، عورت کے آنسوؤں میں بڑی پیش ہوتی ہے۔ ایسی کم سن، سادہ و معصوم لڑکی کے آنسو برداشت ہی نہیں ہو رہے تھے۔ بار بار یا سمن کی آنکھیں اٹھ آتی تھیں۔ بار بار اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب جاتی تھی۔ اس کے اسلوب میں یکسانی تھی نہ ترتیب لیکن اس ہڈیانی و بیجان بیان میں بہت سوزش تھی۔ نصیر بابا کی آنکھیں بھی پھل گئی تھیں۔ یا سمن نے ابھی تک اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کسی حد تک بتایا تھا اور کسی غیر معمولی حادثے یا سانحے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے ماں باپ میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا تھا کراس قسم کے تماشے تو آئے دن زندگی نہ جانے کتنے لوگوں سے کیا کرتی ہے۔ صرف اسی قدر ہو تو یا سمن کے لیے میں ایسی دل گیری دل سوزی نہ ہوتی۔ آگے یقیناً بہت کچھ مختلف تھا۔ اسے جاننے کی جستجو کے باوجود مجھے اس کی گرانی و ستم ناک کا اچھی طرح احساس تھا۔ سننے والے کی مستعدی اور شمولیت سے بھی کتنے سننے والے کا حوصلہ کچھ سوا ہوتا ہے۔ اس دوران میں یا سمن کی دھند کچھ کم ہوئی چاہیے تھی۔ ہم کتنے ہی اجنبی ہوں لیکن تماشائی تو نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کتنے گلی کر پٹنے میں سید صاحب کے مشورے پر اس کے والد نے حیدر آباد جاکے واداکا حویلی اور زرعی زمین کا سودا کر لیا۔

”بس رہی ہیں کرب۔“ پھیل نے ہماری آواز میں کہا۔

پھیل کی اس اچانک مداخلت پر وہ حیران رہ پڑا۔

”ہوئی۔ چادر میں لپٹے اس کے سر میں جموج سامعہوار ہوا۔

”اور وہ؟ وہ کون تھا بھائی؟“ پھیل نے نصیر بابا سے پوچھا

”اس کے باپ کے ساتھ والا جوان، ایک نام بولا تھا اس کا؟“

”کون گون بابا صاحب؟“ نصیر بابا کڑوا گئے۔

”وہی، جس کا تم بولتے تھے؟ اس کے باپ کا خاص چیلہ، نام بھی بولا تھا تم نے۔“

”وہ؟ وہ ظفر میاں، ماں بابا صاحب۔“ نصیر بابا پھلانے لگے۔ ”اس بے چارے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی پر۔“

”اس کا کوئی آتا ہے تمہارے پاس؟“

”مل جائے گا، ضرور مل جائے گا۔“ نصیر بابا نے پر ہاتھ رکھ کے بولے۔

پھیل نے ہنکار بھر کے سر ہلایا اور نصیر بابا کو ہدایت کی

”جی، جی بابا صاحب!“ نصیر بابا بدحواسی سے بولے اور
بٹنیاتی پلکوں سے بٹھیل کو دیکھنے لگے۔

ہو۔“

کمرے میں جی نہیں لگاتیں راہ داری میں آگیا۔ ہر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میزنگوں کی نرزاہٹ سناٹا اور بڑھادی تھی۔ جب بے ارادہ دروازے کے آس پاس پہنچتے تھے میرے قدم خود بہ خود عقبی سبزہ زار کی طرف بڑھنے لگے۔ راہ داری کے سرے پر کچے فرش سے نیچے سبزے پر پاؤں رکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ یہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اس وقت اگر کسی کی نظر

ادھر وہاں علم بہت خوار کرتا ہے پورے علم کی آ
ہی کچھ اور ہوتی ہے یا پھر آدمی سرے سے کچھ جانتا ہی
اندھوں اور بہوں کی طرح، اور شاید نہ جانتا ہی جا-
بستر رہتا ہے۔ مکمل آنکھی کے بعد قرار و سکون کی کیا
ہے، یہ تو آنکھی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ پٹھل جاگ،
کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ ایک کوشش کر کے دیکھوا
کسی ترش و تنگی کے اندیشے نے مجھے باز رکھا۔ اس را
نہید نہیں آئی۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہو رہی تھی
انہوں کے وقت غودگی طاری ہوئی تھی کہ کمرے میں
والی کھڑکھڑاہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ صبح سویرے
پٹھل کا معمول تھا۔ نصیر بابھی نماز کے لیے جاگے۔
علی الصباح نصیر بابا نے پٹھل کو بتادیا تھا کہ را

آخری پریسید صاحب کی واپسی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے
کا مقصد یہ معلوم کرنا بھی تھا کہ بھٹل کے ناشتے کا اہم
کیا جائے۔ میرا پرہیزی ناشتا اسی کمرے میں آجاتا تھا
روزانہ سید صاحب کے ساتھ کھانے کے خاص کمرے
ناشتا کیا کرتا تھا۔ سید صاحب کی عدم موجودگی میں کہ
کمرے میں بھٹل کے تنہا ناشتا کرنے کی تک نہ
روشنی بڑھتے بڑھتے دوسرے ملازموں کی آمد بھی ش
تھی۔ کسی نے بستردورست کیا، چادریں بدلیں، کسی
کی، پھر این اور امتل ناشتے کے ٹوٹ لے آ
کھانے کو طبیعت نہیں چاہ رہی تھی لیکن ڈاکٹر کی
مطابق دو ایک خوراک سے پہلے کسی قدر شکم بڑی
طرح طرح کی چیزیں ٹوٹتے ہیں سچی ہوئی تھیں۔
تھوڑا سا دیا لیا، دو ایک انگریزی بسکٹ اور پیالہ
کے بعد کسی اور چیز کی طرف رغبت ہی نہیں ہوئی۔
خاصا الجھا ہوا لگتا تھا۔ اس نے بھی بس ناشتے کی
پرائیوٹ اور آلو کی ترکیبی کے چند تھلے اور دہی
چٹوں کے بعد ہاتھ میچ لیا۔ اس دوران ڈاکٹر

شور مچا کرے میں داخل ہوا اور میری طرف آنے کے بجائے وہ ٹھٹھل کے سامنے رکھے ہوئے ناشتے کے ٹولٹ پر بیٹھ پڑا "سچ تھا" تو آج یہاں ملا لگا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے، جھٹ مارا جا سید میاں تو رات کی تھکن اُتار رہے ہوں میں صاحب بہادر ڈی سی کی دعوت تھی مذاق نہیں۔ بڑی رنگ دار محفل ہوگی بڑے بڑے تئیں مارو رباری آئے ہوں گے جلدی چھٹی کہاں ملتی" وہ لپکتی آواز میں خود کلاہ کر رہا تھا، پچاسیت سے بولا "جانا تو تم کو بھی تھا" پر کیا بولیں "رات کو ادھر آئی جاتے تو سویرے ادھر کلینک میں بابا کار پچی دتی۔ یہ اکثری بھی سسری گلے کا پھندا ہے، گھر کا نہ گھاٹ اُٹا۔ اپنے سید بادشاہ کو دیکھو، من موج، جدھر من اٹھا چلے۔ بت چاؤ تھا منی جی کو، چھوٹا بیٹا ڈاکٹری پڑھ لے۔" نے بولا، "بھیا" اس کو آدمی ہی رہنے دو، آدمی ہونا تم کو برا لتا ہے کیا؟ بات تمہے میں آگئی۔ میری حالت زمانے سے یہی رہے ہیں۔" ٹھٹھل چپ چاپ سنتا رہا۔ ڈاکٹر کو مناس ہوا تو چوٹک کے بولا "کیا بات ہے بابا صاحب! آج ب کامن بھی تمہو را ٹھیک نہیں لگتا۔"

”اپنے کو کیا ہوتا!“ مجھل نے سیدھے ہو کے کہا ”آدی
ما کھال کدھری ہے اپنے پاس۔“

”ایسا ہی ہونا چاہیے“ ڈاکٹر اچھل کے بولا ”یہ کیا کہ
لہو اور انگریزی چلی اور آج چھیں، آج چھیں۔ کیا بولوں،
بیا کیا کالج کا بنا، نواب کا کھانا اپنے پاس آتا ہے۔ لکھنؤ تو
یہی بدنام ہے۔“

مجلس نے آزار و موت اس کی ہنسی میں ساتھ دیا۔ میرا
ہل تھا، موقع دیکھ کے مجلس، سید صاحب کے بارے میں
کڑے شاید کوئی سلسلہ جنبانی کرے۔ اس نے جب
رہے رکھی۔ پتلون اور بسکٹوں سے اچھی طرح چھل
رہے کے بعد ڈاکٹر میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے دوا میں
لی تبدیلی اور غذا میں رعایت کردی تھی۔ گزشتہ کل کا
بہرہ اسے حفظِ حاکمی باری پر بڑی حد تک قابو پایا گیا ہے۔
ن کوئی ہوئی توانائی کی بحالی کے لیے آرام، مقوی غذا میں
ردوائیں اہم لازم ہے۔ میں نے اسے یقین دلانا چاہا کہ
مجھے ذرا سی بھی کمزوری محسوس نہیں ہو رہی ہے، میں
کل صلا چکا ہوں۔ اس نے منہ بنا کہ مجھے جھڑک دیا، کہنے
اک بڑی اچھی بات ہے لیکن جیسا وہ کہتا ہے، مجھے تعیل
رہے رہتا ہے۔ وہ مجھے مختلف مریضوں کے تجربات سنانے
مجھے آج نہ دے، اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی باتیں متاثر کر رہی
تھیں۔ کسی چاہتا تھا اسے نکال باہر کروں۔ معمول کے خلاف

یازیگر [6]

اس نے آج زیادہ وقت صرف کیا، بڑی مشکل سے وہ ملا۔
اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ساڑھے دس بجے کے قریب
بھل نصیر بابا کو ساتھ لے کے جانے کہاں نکل گیا، دونوں
نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ مجھے بتانا ضروری بھی کیا تھا۔ بعد میں
ابن سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی جلد واپسی ممکن نہیں
ہے۔ جاتے وقت بھل نے ابن سے کہا تھا کہ دیر ہو جائے تو
سید صاحب دوسرے کے کھانے پر اس کا انتظار نہ کریں۔ میرے
پاس اپنے آپ کو چٹکایاں بھرنے، نوپنے کھسونے کے سوا کوئی
کام نہ تھا۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے ساتواں دن تھا۔ پھل کئی بار گھر سے باہر جا چکا تھا لیکن جلدی واپس آ گیا تھا۔ ایک دو مرتبہ سید صاحب اسے اپنی زمینیں دکھانے لے گئے تھے اور صبح سے شام ہو گئی تھی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ پھل کے سر میں کیا مالتی ہوئی ہے۔ اس وقت وہ نصیر بابا کے ساتھ بے سبب تو کہیں نہیں گیا ہوگا، مجھے دھڑکا کا ہوا تھا، آنے والا وقت بہت کاٹنے بکھر سکتا ہے۔ دیکھیں، کیا رنگ دکھائے ہمارے ساتھ جگہ جگہ کی کچھ ہو تا رہتا ہے۔ آزمودہ کاروں کا یہ قول ہی شاید معتبر ہے کہ آدمی کو پہلے اپنے راستوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ آدمی کی اپنی بجزریاں، محرومیاں کم نہیں ہوتیں۔ کاش فیض آباد اسٹیشن پر پھل میری بات مان لیتا۔ درمیان میں خاصا وقت گزر گیا تھا۔ زریں ہمارے لیے بہت بے تاب ہو رہی ہوگی۔ وہ بھی تو ہماری ذمہ داری ہے۔ اتنے طویل سفر کے بعد فیض آباد میں چند دن قیام سے درس کا اطمینان بھی ہو جاتا، ہمیں بھی آرام کا کچھ وقت مل جاتا۔ کچھ دنوں بعد بھی ہم سفر پہ روانہ ہو سکتے تھے۔ کون سی گاڑی نکلی جا رہی تھی اور مولوی صاحب کو ہماری کون سی خبر تھی کہ ویر ہو جانے وہ کسی اور شہر کا قصد کر لیں گے۔ پھل سے زیادہ مولوی صاحب کے سراغ کی جستجو مجھے ہونی چاہیے۔ فیض آباد سے دوبارہ سفر پہ نکلنے وقت جبرو اور زورا بھی ہمارے ساتھ ہوتے اور بیماری کی صورت میں ہمیں سید صاحب کا زیر بار احسان ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اتنے عرصے ساتھ سفر کرتے ہوئے جبرو اور زورا کی رفاقت کی عادت ہو گئی تھی۔ پھل بے شک میرے ساتھ تھا لیکن لگتا تھا، وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے، میں تو اس کے ساتھ ہوں، وہ میرے ساتھ نہیں ہے۔

کمرے میں دن بھر ابن، نذو، امتل اور دوسرے ملازموں کا تانتا بندھا رہا۔ دوپہر کا کھانا بھی ایسے ہی واپس چلا گیا۔ مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔ سپر کو سید صاحب

کتابیات پبلی کیشنز

میری پریشانی کے لیے آئے تھے، میری صحت کی بحالی پر انہوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا، بھٹل کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو انہوں نے کوئی تردد نہیں کیا۔ میں نے اخلاقاً ان سے کچھ دیر ٹھہرنے کی درخواست بھی کی لیکن میرے آرام کا غور کر کے وہ جلدی میں رخصت ہو گئے۔ کمرے میں اپنی سے تنہائی کا موقع ملا تھا، میں ادھر ادھر کی باتیں کر کے کوئی ٹوہ لے سکتا تھا۔ میں نے خود کو روکے رکھا، مبادا مجھ سے کوئی چوک ہو جائے اور خلتانی مہنگی ثابت ہو۔ ضروری نہیں کہ ابن اور نصیر بابا میں کوئی فرق نہ ہو۔ ملازم تو دونوں ہیں مگر آدمی تو ایک نہیں۔ بعض ملازم نکون کی صفات رکھتے ہیں۔

”چار بجے“ پھر پانچ بج گئے۔ دن بھر میرا مشغلہ کبھی بستر پر آ کے جسم زحیر کر دینا کبھی کمرے سے باہر آ کے راہ داری میں ٹھلنے رہنا تھا۔

دھوپ آسمانوں میں لوٹ چکی تھی کہ بھٹل اور نصیر بابا کی صورتیں دکھائی دیں۔ دونوں کے چہروں سے نکلن عیاں تھیں۔ میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ آتے ہی بھٹل غسل کے لیے چلا گیا اور سنے کپڑے پن کے راہ داری میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا حقہ کھینچنے لگا۔ ملازمہ امتل نے بھٹلوں کا طشت کمرے سے اٹھا کے اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ کل کی طرح سبزہ زار میں چل قدمی کا وقت گزر چکا تھا۔ آنے کے بعد نصیر بابا بھی کہیں کھو گئے تھے شاید زنان خانے کی طرف نکل گئے تھے یا ہو سکتا ہے، اپنے ہی کسی کام میں الجھ گئے ہوں۔ ملازموں کے اپنے بھی تو کچھ کام ہوتے ہیں۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں کسی ملازم کے ذریعے باقاعدہ انہیں طلب کروں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ ملازموں میں سب سے پہلے امتل مجھے نظر آئی، اسی سے میں نے کہا تھا۔ چند منٹ بعد ہی نصیر بابا حاضر ہو گئے۔ وہ بہت اجڑے اجڑے لگ رہے تھے۔ امتل سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ملاقاتیوں کی خصوصی نشست گاہ میں سید صاحب اور ان کے چند خاص دوستوں کی محفل جی ہوئی ہے۔ نصیر بابا کا آنا مشکل ہو گا مگر وہ آ گئے۔

بھٹل کمرے کے باہر موجود تھا۔ نصیر بابا اس کے سامنے آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ نصیر بابا کو کوئی حکم صادر کرے، میں نے انہیں عقبی سبزہ زار کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ متذبذب ہوئے تھے لیکن انکار کی جرات نہ ہو سکی ”سید صاحب کی طرف تو آپ کی ضرورت نہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”ادھر کا انتظام کر کے آیا ہوں“ نصیر بابا کی آواز پر ضعف طاری تھا ”بولو میاں! کیا خدمت ہے؟“

”میرے ساتھ آئے“ میں نے نیم حکم کیے ”عشا کے بعد کھانے کا وقت ہو جائے گا“ ہوئے بولے۔

”عشا میں ابھی وقت ہے اور کھانے میں تو کبھی بھی ہو جاتی ہے پھر ابھی تو سید صاحب کے مہمانوں کا دور چل رہا ہو گا“ راہ داری کا مختصر فاصلہ عبور کر زار میں آ گئے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ ”آپ ٹھیکے“ میں نے قریب ہی ایک سنسان گوشے میں ر کی بیچ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا اور کسی ترمیم نہ کیا ہوا ”جہاں آپ گئے تھے، کوئی کامیابی ہوئی؟“ وہ میری صورت دیکھتے لگے۔ پھر انہوں نے نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ملازموں کو تیر شنا مہارت ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ انہوں نے سر میں کہا ”ہاں میاں! ملاقات ہوئی۔“

”کیا کیا ہوا پھر؟“ میں انہیں اپنی بے خبری نہیں چاہتا تھا اور اپنی دانت میں اسی طور ان سکتا تھا۔

ان کی ہراساں نظریں اطراف میں منڈلا جگہ ٹھیک نہیں ہے، شاہوگامیاں آپ نے دیا کان ہوتے ہیں۔“

”اس وقت یہاں کون پھلک سکتا ہے، فکر میں نے انہیں دلا سا دیا“ ہاں تو آپ کیا کہہ رہے ”بات ہو گئی لیکن وہ تو امید کھو بیٹھا تھا“ وہ ہو کے راہ داری میں انداز میں بولے ”ہاتھ پیر پڑے بابا صاحب نے اسے بہت کچھ بولا تب جا کے ہائی ”کسی باہی!“

”کیسی کہ وہ ہر طرح سے تیار ہے تیار تو؟“ تھا۔

”مجھے پوری بات بتائیے۔“

”لبا قصہ ہے میاں!“

”کیا کیا! کہہ رہا تھا وہ؟“

”اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ بابا صاحب مجھے دیکھ کے یا یوں کہو کہ بابا صاحب کی مشہ حوصلہ پکاؤرنہ وہ تو سہ وہ تو۔“

نصیر بابا کے جوابات میرا جتنس اور اضع کر رہے تھے۔ یہی بہتر تھا کہ پہلیاں بجھا کر کچھ کوشش کے بجائے میں اپنی تاریکی کا اعتراف اس میں ان کے محتاط ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ نہ

کہ بھٹل کی طرح وہ مجھے بھی راہ داری کا سزاوار اعتبار سمجھیں۔ یہ امر ان کے سر میں گہرے بھی ڈال سکتا تھا کہ بھٹل نے اب تک مجھے اس معاملے میں شریک نہیں کیا ہے۔ میں انہیں جس طرح یاد کرانا کہ بھٹل کی پردہ پوشی مصلحت کوئی نہیں ہے، یہ دانستہ غفائی نہیں ہے ”یا سمن بی بی سے بات ہوئی؟“ مجھے کچھ اور بھائی نہیں دیا تو میں نے انہیں ٹھوکا دیا۔

”وقت کدھر ملا، ہاں“ آنے کے بعد اتنی تسلی ضرور ہے تھا ہوں کہ ظفر میاں سے ملاقات ہو چکی ہے۔ زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں تھا“ وہ چپکے سے بولے۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں اس طرح مجھے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میں نے گویا پر زوال دی اور منت کی ”نصیر بابا! مجھے شروع سے سب کچھ بتائیے۔“

میری توقع کے مطابق ان کی آنکھیں حیرت سے بھر گئیں ”بابا صاحب نے کچھ نہیں بتایا؟“

”شاید میری بیماری کی وجہ سے“ میں نے کسمکے کہا ”لیکن اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھ پر کوئی دباؤ نہیں ہو گا یوں سمجھئے کہ کچھ نہ جاننا، فکر و تشویش کا باعث بن رہا ہے۔“

”میاں! یہ تو لمبی داستان ہے!“ وہ ہونٹ سیڑ کر بولے۔

”کچھ تو یا سمن بی بی کی زبانی مجھے سن گئی ہے“ میں نے بھٹل سے تفصیل سے بتائیے، ممکن ہے، میں بھی کوئی مشورہ دے سکوں ”یا سمن کا ذکر میں نے عموماً کیا تھا کہ وہ جان سکیں“ بھٹل کو مجھ سے کچھ چھپانا مقصود ہوتا تو وہ یا سمن کو میری بوجھ میں نہ ملاتا۔ گزشتہ رات جیسا کہ خود نصیر بابا نے بھٹل سے معلوم کیا تھا، وہ کسی دوسرے کمرے میں بھی اس کو بلا سکتا تھا۔

”کیا بولوں میاں! وہاں ہوتے ہوئے کچھ نہ کو آتا ہے۔“

”نہ جاتا ہے سوچتا ہوں تو سیریکر آنے لگتا ہے“ نصیر بابا کی آواز بھر گئی۔

”میں سمجھ رہا ہوں۔“

”میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے لیکن کیا کروں؟ یہ اندھیرا دیکھا نہیں جاتا۔“

”بات کیا ہے بابا!“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”آپ نے سن ہی لیا تھا اس بچی کی زبانی تھوڑا بہت اجڑا۔ اسے دیکھ بھی لیا ہے۔ دونوں ایسی ہیں کہ ذرا اچھو لو تو ملے ہو جائیں“ وہ ذوقی آواز میں بولے۔

”یا سمن بی بی نے اپنے والد کے پٹنا آنے تک کا احوال بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ سید صاحب کی ایما پر ان کے والد نے

بازی گرا

حیدر آباد جا۔ کساری زمین، مکان وغیرہ کا سودا کر لیا تھا۔“

”وہ بڑے نیک آدمی تھے بہت بڑے لکھے، اللہ والے۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ان کی صورت اب تک آنکھوں میں گھومتی ہے۔ بہت نور تھا چہرے پر ان کے ہاتھ چمکتا تھا، منہ سے پھول جھرتے تھے۔ ہر وقت مٹلے کھلے، ہم جیسے چھوٹے لوگوں کی بہت پوچھ گچھ کرتے تھے۔ مجھ سے تو خاص لگاؤ تھا، بس میاں!“ نصیر بابا کا گلا رندھنے لگا۔

نصیر بابا سے بات کرنی مشکل ہو رہی تھی۔ وقت کم تھا اور یہ جگہ بھی مناسب نہیں تھی تاہم پھر کب وقت ملے۔ یا سمن کی طرح ان کے بیان میں بھی بڑی سوزش تھی، بار بار مغلوب ہو جاتے تھے۔

گھنٹے لگے، سید صاحب نے علامہ پروفیسر جمال الدین سیفی کو حیدر آباد کی جائداد سے ملنے والی رقم سے پیشہ کے نواح پھلاری شریف میں ایک زرعی زمین لاد دی اور کچھ ہی دنوں میں خطیر منافع کے عوض اسے فروخت کر دیا۔ دو ایک اسی نوع کے سو دوں میں سید صاحب کے مشوروں اور اعانت سے پروفیسر کو اچھا منافع ہوا۔ پروفیسر نے روپے پیسے کی بھی ایسی جستجو نہیں کی تھی، علم ہی ان کے لیے سب سے بڑا سرمایہ رہا تھا۔ گھر میں ویسے بھی کسی چیز کی گنجی نہ تھی، عزت آہو سے گزر رہا ہوا تھا۔ پہلی بار حصول زرعی تدبیر اور اس کی کرشمہ سازی کا عرفان ہوا تھا۔ دولت میں غالب علم سے زیادہ کشش ہوتی ہے۔ طاقت کی فضیلت تو مسلمہ ہے۔ پروفیسر اپنے مربی سید صاحب کی فہم و فراست سے بہت متاثر تھے۔ سید صاحب کی طرز نیک، حسن خلق، زندہ دلی اور دریا دلی مستزاد صفات تھیں۔ چشموں میں سید صاحب نے پروفیسر کو خاندان سمیت آسن سول بدو کیا۔ مینے ڈیڑھ مینے گی اس مہمانی اور میزبانی سے دونوں گھروں کو قریب آنے کا موقع ملا اور راہ و رسم کچھ ایسی بڑھی کہ ذرا وقت گزر جاتا تو کبھی سید صاحب، پٹنے کا رخ کرتے، کبھی پروفیسر آسن سول آ کے دم لیتے۔ یہاں زنان خانے میں ملازموں اور ایک پٹنہ کارخانوں کے سوا کوئی نہ تھا، پروفیسر صاحب نے اپنی یکم سے سید صاحب کا پڑھ بھی ختم کر دیا تھا۔ پھر سید صاحب نے اپنے دوست پر ایک احسان یہ کیا کہ آسن سول سے دس میل کے فاصلے پر ایک بڑے زرعی قطعہ اراضی کی بات پکی کر لی۔ سننے ہیں ”اس خریداری میں کم پٹنے والی کچھ رقم سید صاحب نے بے طور قرضہ حد عطا کی تھی اور طے یہ پایا تھا کہ پہلی فصل کی آمدنی سے یہ قرض ادا کر دیا جائے گا۔

پروفیسر نے یہ قطعہ اپنی یکم کے نام سے خرید لیا تھا۔ وہ

کتابیات پبلی کیشنز

998

98

کتابیات پبلی کیشنز

مسائل اور حل

نہ گوئی سال کے گزری ہو
ہے اولی سال میں سال
نہ گوئی سال کے گزری ہو
ہے اولی سال میں سال
نہ گوئی سال کے گزری ہو
ہے اولی سال میں سال
نہ گوئی سال کے گزری ہو
ہے اولی سال میں سال

ایک ایسی کتاب جو آج کے ہر فرد کی
ضرورت ہے۔

قیمت 30 روپے
ذاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت سے ذاک خرچ ہٹا دیں
شنگی می آرڈر سال کریں

کتابت کی کتابت
کتابت کی کتابت
کتابت کی کتابت
کتابت کی کتابت
کتابت کی کتابت
کتابت کی کتابت
کتابت کی کتابت
کتابت کی کتابت

آپ سول سے دور لے جاتے، کبھی پہاڑی مقامات پر، کبھی
شہروں کی طرح گاہوں میں، کبھی دونوں شکار پر نکل جاتے
جنگلوں کی سریر کرتے۔ آپ سول شہری میں نہیں، گردنوا
میں دور و نزدیک سید صاحب کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ بڑے
شاموں میں یا تو وہ خود کھینچ مدعو ہوتے یا ان کے اپنے
ضایفوں کا اہتمام ہوتا۔ کئی قریبی دوستوں کی محفلوں میں
پروفیسر کو بھی لے جانے لگے۔
پروفیسر کے لیے یہ دنیا بنی تھی۔ یہ دنیا انسانی
تھی، اس میں خواب کم، تعبیر بہت تھیں۔ ممکن۔
شروع شروع میں انہیں اجنبیت محسوس ہوتی ہو لیکن
رفتہ رفتہ بدلی ہوئی زندگی میں شامل نظر آنے لگے تھے۔ ان
نے روایتی لباس درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا۔ وہ
وسیع رنگت، اچھے ہونے قد، متوازن دست و پاؤں کے
وجہ اور جامہ زیب شخص تھے۔ پینتالیس سے زیادہ
ہوں گے، دیکھنے میں بہت کم کے لگتے تھے۔ نئی وضع قطع
اور پردہ کار ہو گئے تھے۔ جہاں جاتے، نگاہوں کا مرکز
جاتے۔
دو دوستوں کی اس باہمی شیدائیت کو دیکھ دو
عمر گزر گیا۔ لگتا تھا، دونوں میں کوئی ازلی رشتہ ہے، بھائی
میں بھی ایسی نگاہت، مہو الفت کیا ہوگی۔
پھر ایک دن ایسا ہوا، آدھی رات کا وقت تھا۔
صاحب کو پروفیسر کی طبیعت اچانک خراب ہو جانے کی
خبر ملی۔ سید صاحب کسی تاخیر کے بغیر وہاں پہنچ گئے اور
نے عزیز از جان دوست کے علاج معالجے کے لیے دن
ایک کر دیے۔ پروفیسر کو اتفاق ہو گیا تھا لیکن کچھ دنوں
طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ کئی حکیم ڈاکٹر بدلتے گئے۔ کوئی
تفصیل کرتا تھا، کوئی کچھ۔ پروفیسر نے خود بھی خاصی
آزمائی کی۔ کبھی ان کی حالت درست ہو جاتی، کبھی
جاتی۔ طرح طرح کے ٹوٹکے بھی آزمائے گئے۔
دور و دور خانقہ کا سلسلہ جاری رہا اور حاصل یہ نکلا کہ
دوا کی ارزانی سے مرض بڑھتا گیا۔ سید صاحب، پروفیسر
لگاتار کے بڑے اسپتال لے جانا چاہتے تھے مگر اس کا
آپ ایک رات پروفیسر نے ساری اقتضو سے نجات
کر لی۔
ایک دو مہینے کے لوٹ پھیر میں ایک تروتازہ
شخص یوں چپکے سے چلا گیا۔ کسی کو یقین نہیں آتا
تھیں تو ایک جبر ہے، سب کو کرنا پڑا ہے۔ سب کو مطلع
کسی کو یہاں نہیں رہنا۔ جتنے نظر آتے ہیں، سب
بازی

بٹنے میں بڑھتا تھا۔ سید صاحب کی کوشش سے آپ سول
کے ایک کتبہ میں بھی فارسی زبان کی تدریس کے لیے انہیں
چند مہینوں کی تقرری مل گئی۔ یوں آپ سول میں ہر ہفتے
پروفیسر کی آمد یعنی ہونے کی گمراہی قریبوں کے بعد شکستیاں اور
سوا ہو گئیں۔ سید صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ آپ سول
میں کرائے پر اٹھا ہوا ایک پختہ اور وسیع مکان خالی کر کے
پروفیسر کو پیش کر دیا۔ سید صاحب کی خواہش تو یہ تھی کہ ان
کی اپنی اقامت گاہ بن سکے مگر کھانا کھانے نہیں ہے، پروفیسر کا کنبہ
چار افراد پر مشتمل ہے، کیوں نہ پروفیسر ان کے بڑے مکان
کے ایک حصے میں منتقل ہو جائیں۔ پروفیسر اس پیش کش پر
آہستہ ہوئے، ہاں آپ سول میں مستقل سکونت کے لیے
تیار ہو گئے اور سید صاحب کا خالی مکان اس شرط پر قبول کر لیا
کہ زرعی زمین سے سال بہ سال ہونے والی آمدنی سے مکان
کی رقم ادا کی جاتی رہے گی۔ سید صاحب نے دو قدم آگے
جا کر یہ سلوک کیا کہ ایک جزوی، علائقی قسم کی رقم کے
بدلے مکان کی رجسٹری پروفیسر کے نام کرادی۔ کاغذات میں
بعد کی قطع و ادا کی جانے والی کثیر رقم کی شق بھی درج نہیں
کی گئی تھی۔ سید صاحب کا یہ بے پناہ اعتماد بظاہر ہے جو زرعی
نہیں تھا کہ پروفیسر باطن ایک اصول پرست، راست باز اور
دیانت دار آدمی تھے۔ زرعی زمین سے ہر سال معقول آمدنی کا
امکان تھا۔ چند سال میں اس رقم کی اونگھ پروفیسر کے لیے
کوئی وقت طلب یا صبر آزما مرحلہ نہ ہوتا۔
پروفیسر کا خاندان پٹنہ سے ہجرت کر کے آپ سول میں
آباد ہو گیا۔ پروفیسر اب پٹنہ میں تین دن کے لیے پٹنہ چلے
جاتے، چار دن آپ سول میں قیام کرتے تھے۔ عدم موجودگی
میں بیوی اور بیٹیوں کی خبر خیر کے لیے سید صاحب آپ سول
میں موجود ہی تھے۔ دن میں ایک مرتبہ پروفیسر کے گھر پھیرا لگاتا
سید صاحب نے شعرا بنایا تھا۔ انہوں نے وہاں اطاعت پیشہ
ملازم بھی رکھوا دیے تھے۔ امور خانہ داری میں ماہر ایک تجربہ
کار ملازم بھی تعینات کی تھی۔ سید صاحب کی تجویز تھی کہ
کچھ عرصے بعد پروفیسر زرعی زمین پر ایک چھوٹا سا گھر بنائے
مستحق وہیں اقامت اختیار کریں، اس گھر کا مرعہ زار میں
انہیں یک سوئی سے تعینف و تانیف کے مواقع میسر آئیں
گے۔ ساتھ ساتھ زمینوں کی نگہداشت بھی ہوتی رہے گی۔
پروفیسر پھر درس و تدریس کا مشغلہ ترک کریں۔ ایک زمانے
سے تحقیقی و تحقیقی کام کے لیے پروفیسر کو اس فراغت کی تنہا
تھی۔ آپ سول میں ان کی شاہین سید صاحب کی معیت میں
گزر تھیں۔ سیاحت کا پہلے سے شوق تھا، سید صاحب انہیں

مستعدی، علم کی جستجو اور جستجو میں شدت کے اوصاف کے اسیر ہو گئے تھے۔ وہ ہر وقت اسے خود سے قریب رکھتے تھے۔ ابتدا میں ظفر کالج کے ہوشل میں رہتا تھا، بعد میں پروفیسر نے اسے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ ذہن، ایماء، پیشہ، معاملہ، قسم اور خوش مزاج ظفر نے اولادِ نرینہ سے پروفیسر کی محرومی کا ازالہ بڑی حد تک کر دیا تھا، سو پروفیسر کے ہاں اپنی دخل و تصرف پذیر فروزاں اور شاگرد عزیز ظفر کو یک جا کر دینے کی خواہش کی بالیدگی غیر فطری تھی۔ غیر منطقی۔ ان کی بیگم بھی شوہر کے اس خواب میں شریک تھیں اور ظفر کے لیے تو اس رفاقت کا تصور ہی ایک اعزاز تھا۔ وہ کیا، کوئی بھی اس کی جگہ ہوتا تو اپنی خوش بختی پر ناز کرتا۔ فروزاں حسن و جمال کی ایک مثال تھی، وہ تو ایک شاہ کار تھی۔ صورت درنگ، خال و خد میں یکسانی کے علاوہ ذہانت و وفات سے آراستہ۔ بہت سی خوبیاں تو اسے درشتیں ملی تھیں۔

آسن سول منتقل ہو جانے کے بعد پروفیسر کے خاندان کے ساتھ ظفر بھی یہاں آگیا۔ حالانکہ اپنا دھور انصاف پورا کرنے کے لیے اسے بار بار پٹے جانا پڑا تھا۔ جیسے ہی تعلیمی امور سے فراغت ملتی، وہ آسن سول کا رخ کرتا۔ تعلیمی سال مکمل کر کے وہ مستقل آسن سول آگیا۔ وہ پروفیسر کے گھر کا ایک جزو تھا۔ سید صاحب سے روز افزوں رسم و رواج کی وجہ سے پروفیسر کا گھر میں قیام کچھ کم ہونے لگا تھا مگر ایک جوان مرد، گھر کا ایک فرد ظفر گھر میں موجود تھا، اس کی موجودگی پروفیسر کو گھر کی فکر سے آزاد کر دیتی تھی۔

اسے مرشد کے منظور نظر ہونے کی نسبت سے سید صاحب ظفر کی نظروں میں نہایت واجب احترام تھے۔ ہر چند دونوں میں علیک سلیک کے سوا ربط و ارتباط کی کوئی خوش گوار صورت پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ اس بے گامگی میں ظفر کی جانب سے کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ تھی، سید صاحب ہی سمجھنے سمجھنے لیے دیے سے رہتے تھے۔ گو ان کی زبان سے ظفر کے لیے پروفیسر ان کی بیوی، بیٹیوں کے سامنے کبھی کوئی ناروا تازیبا نہ نکلتا اور انہیں ہوا تھا نہ انہوں نے بالمشافہ ظفر سے خلوت و جلوت میں کسی موقع پر پاپندہ کی کا اظہار کیا تھا تاہم وہ اس سے کچھ اس طرح پیش آتے تھے جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو، جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ سلام کے جواب میں ان کے ہاں لپک اور چمک کا فقدان ہوتا تھا۔ کسی خدمت کی پیشکش پر وہ بالعموم معذرت کر لیتے تھے۔ ان کی یہ بے نیازی، بے اعتنائی ظفر کو بہت کھٹکتی تھی۔ پروفیسر کے رخصت ہو جانے پر سید صاحب ان کی بیگم اور بیٹیوں کو صبر کی مسلسل

تلقین کرتے رہے۔ ظفر کو بھی اس دل جوئی اور تلقین کی ضرورت تھی۔ سید صاحب کو خوب معلوم تھا کہ ظفر کے یہ صدمہ اتنا ہی کاوی ہے جتنا پروفیسر کے اہل خانہ کے بزرگ ہونے کی حیثیت سے سید صاحب نے ایک مرتبہ اس سے کچھ نہیں کہا، ایک بار بھی اسے گلے نہیں دیا۔ جب تک پروفیسر کی بیوہ اور بیٹیاں گھر میں رہیں، سید صاحب کی مغائرت میں کسی معاندت کا احساس ظفر کو نہیں ہو

بعد میں دھندلے لفظ روشن ہوتے گئے۔ ظفر نے پروفیسر کی سوگ دار بیوہ اور بیٹیوں سے یہ تھی کہ وہ اپنے گھر ہی رہیں، ظفر بکھرا ہوا گھر سنبھال استطاعت رکھتا ہے مگر سید صاحب کے سامنے اسے حیثیت ہر اعتبار سے فروتر تھی۔ پروفیسر کے گھروار صاحب کے بے شمار احسانات، خسروانہ سلوک اور مراد موت سے زربار تھے۔ وہ بیٹیوں ان دونوں ذہنی اختلا بھی دو چار تھیں۔ انہیں ظفر پر پورا اعتماد تھا۔ قیام صاحب کو انکار کر دینے کی جرات بھی نہ تھی۔ پروفیسر کے گھر میں اب وصیت بھی ابھی تازہ تھی۔ پروفیسر کے گھر میں اب بھی شمار ہونے لگا تھا۔ سید صاحب کے علم میں تھا کہ نے اپنی بیٹی فروزاں اور ظفر کے لیے کیا طے کیا ہوا۔ انہیں اپنے گھر پروفیسر کی بیوی اور بیٹیوں کو لے جا۔ تکلفاً اور رشتہ ظفر کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہنا چاہیے۔ انہوں نے یہ رواداری نہیں کی۔ ظفر کا تو یہی ہے! سید صاحب کے گھر جانا مناسب نہیں تھا۔ پروفیسر کی البتہ ظفر کے لیے سید صاحب کو اشارہ کیا تھا۔ سید نے انہیں مطمئن کر دیا کہ ظفر ان سے کہاں دور ہو گیا پروفیسر کا گھر بند کر دیا جائے؟ گھر کے کسی ایک فرد رہنا چاہیے۔ یہ عذر مقبول تھا۔ پروفیسر کی بیگم ہر اپنے مرحوم شوہر کا گھر قائم رکھنا چاہتی تھی۔ سید صاحب کے ہاں پروفیسر کے گھر والوں۔ ہو جانے کے بعد صبح و شام ان کی پریش احوال ظفر فرض کا درجہ رکھتی تھی۔ شروع کے چند دن تو بے گامگی کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ وہ بلاتعذر و دہر سید صاحب کے گھر جاتا رہا۔ آنے والے دن اس بڑی آزمائش کے تھے۔ ایک روز دربان نے اسے سے روک دیا۔ ظفر نے ناراضی کا اظہار کیا تو وہ ملازمین و دربان کی تائید میں کمر بستہ ہو گئے۔ سید صاحب نے اپنے التجار پر جواب دیا کہ وہ جب چاہیں گے تو

وہ رنج و غم، غصہ و غضب کی حالت میں گھر واپس آیا۔ سید صاحب کا ایک فرستادہ بے دخلی کا حکم نامہ لے کر پہلے یہ موجود تھا۔ ظفر اس ذات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اسی وقت سید صاحب کے گھر کا رخ کیا۔ اسے اپنی کی اجازت نہیں ملی۔ اس کے تو اوسان ہی جاتے۔ پھر اس نے پروفیسر اور سید صاحب کے ایک مشترکہ باغیچہ میں جا کر کھانا کھا کر چلے گئے۔

اس اقدام سے اتنا ضرور ہوا کہ سید صاحب ملاقات لے آئے۔ لیکن وہ اسے ایک بدلے ہوئے آدمی نظر آئے، جیسے ان کا ظفر سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو، وہ اسے نہ ہی نہ ہوں۔ انہوں نے ظفر کو الگ گھر کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔ ظفر نے فریاد کی کہ وہ یہ کیا کر رہے ہیں، پروفیسر کا ان کا نہیں، پروفیسر کا ہے جو اس کے معنی باپ اور مرشد تھے۔ پروفیسر نے اسے اپنے گھر مستقل قیام کی بات کی تھی بلکہ اسے مجبور کیا تھا، وہ اسے دل و جان سے جو رکھتے تھے۔ سید صاحب نے سنی ان کی کوئی اور کہنے کی گھر تک پروفیسر کا ہے لیکن ظفر کا نہیں ہے۔ ظفر ظفر پروفیسر سے تھا اور پروفیسر اب موجود نہیں ہیں۔ ہم کی وصیت کی رو سے وہ ان کے سارے معاملات کے مالک ہیں۔ وہ جو بہتر سمجھتے ہیں وہی کریں گے۔ ظفر نے زان سے اپنے رشتے کی بات یاد دلوائی۔ سید صاحب نے مہر کی کہنا کہ وہ کسی برے پر اس رشتے کا دعوے دار نہیں۔ اسے میزان کرنا نہیں آتا کیا؟ اسے اپنی حیثیت کا ن ہونا چاہیے۔ ظفر نے عاجزی کی کہ اسے مقامی کالج بہت اچھی ملازمت مل رہی تھی۔ وہ تو پروفیسر نے اسے رکھا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ابھی وہ مزید تعلیم لے کر آئے۔ سید صاحب نے اسے دھکا دیا کہ پہلے وہ کسی نا تو ہو جائے تب آئے ان سے بات کرے۔ اس دوران فروزاں کے لیے انہیں بہتر مشق مل گیا تو وہ ظفر کا انتظار نہیں کریں گے۔ ظفر نے بہت دہائیاں دیں مگر سید صاحب کو پتہ نہ چلے گئے تھے۔ پروفیسر کی بیگم سے ملاقات کی ذمہ داری انہوں نے سختی سے ٹھکرادی۔

ظفر ایک ذکی، محسوس، سلیم الطبع، سربلغ الفہم نوجوان تھا۔ اسے تعلیم لگانے میں دیر نہیں لگی اور نہ یہ سمجھنے میں تھک دیکھ دیکھ کا کچھ حاصل نہیں ہے۔ سید محمود علی نے اسے ترقی کا پورا خیال رکھا ہے۔ سب کچھ ایک سلسلے میں کر رہا ہے کہ اسے وہاں جائے؟ کسی دلیلیز پر جا کے سید صاحب نے اسے خوب آئینہ دکھایا۔

ہے شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں، وہ تو خود کو جانتا ہی نہیں، وہ کیا بے دلیل ہے۔ وہ تو رت کے گھروندے میں رہتا تھا۔ اس کے وجود کی استواری تو پروفیسر کے ستون سے مشروط تھی۔ اس نے اسی دن پروفیسر کا گھر چھوڑ دیا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا کہ سید صاحب کے نمک خوار وہاں موجود تھے۔ اس کا ذہن معطل ہو چکا تھا۔ ہر جانب اندھیرا نظر آتا تھا۔ یہ گمانی تو پروفیسر کی موت سے بڑا سانحہ تھی۔ اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کے سید صاحب کے دوستوں کے گھر جا کے عرض گزار کی پھر اس نے کسی قانون دان سے مشورہ کر کے پولیس کی مدد حاصل کی۔ پولیس کا بڑا عہدے دار سید صاحب کے گھر سے شرم سار واپس آیا۔ سید صاحب نے پروفیسر کی وصیت کی نمائش کے علاوہ ان کی بیگم اور بیٹیوں کے بیانات بھی پولیس آفسر کے گوش گزار کر دیے تھے۔ سید صاحب کے گھر سے واپس آئے اس نے اپنی ظفر کو سرزنش کی اور یہ فہمائش بھی کہ بہتر ہے، وہ سید محمود علی جیسے عزت دار، حیثیت مند شخص سے بیوہ آزمائی کا خیال دل سے نکال دے ورنہ اسے گھانا ہو جائے گا۔ نوجوان ظفر نے خود کو کبھی ایسا بے دست دیا، بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی۔ بدحواسی میں ایک روز اس نے سید صاحب کے مکان پر دھڑکاؤ دیا۔ نتیجے میں اسے ایک ازیت سے گزرا پڑا، کرائے کے غنڈوں نے اس پر لٹائیاں برسائیں اور ناقولائی کی حالت میں شہر کے کنارے پھینک آئے۔

کوئی بھی کہیں بھی اس کی بات نہ سنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ لگتا تھا، سارا شہر سید صاحب کے ظلم میں ہے۔ ظفر نے صرف کتابیں پڑھی تھیں، آدمی نہیں دیکھے تھے۔ کتابوں کے دل وادہ اس نوجوان کو پہلی بار تجربہ ہوا کہ آدمی وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے۔ جو اس کا چہرہ، ہاتھ، تیز، بٹ و قامت دکھائی دیتے ہیں۔ آدمی تو وہ ہوتا ہے جو بھی دو آدمیوں کے برابر ہوتا ہے، کبھی تین، چار یا اس سے زیادہ، بہت زیادہ۔ اور آدمی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ آدمی آج بھی ہوتا ہے اور نہ ہونے کے برابر بھی ہوتا ہے۔ قیافے، نظروں اور تجربے سے آدمی کی پیمائش محض خوش گمانی ہے۔ آدمی کے سامنے تو سمندر بھی چلے ہے۔

ظفر نے سید صاحب کے ملازموں کا تعاقب شروع کیا۔ ایک ایک سے ہاتھ جوڑ کے جتنی کہ وہ اس کا ایک خط ہی پروفیسر کی بیگم تک پہنچا دیں۔ پہلے تو وہ تیار نہیں ہوئے مگر نذرانے بھی ان سے مسترد نہ ہو سکے۔ ظفر کے بعد دیگرے

خط ان کے حوالے کرتا رہا، کسی کا جواب نہیں آیا۔ ملازم یہ خط اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے اور آقا اپنے غلاموں کو ظفر کے بزاروں سے کہیں زیادہ انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ ملازم باہر جا کے ظفر کو باور کراتے رہے کہ وہ اس کا ہر خط بہ حفاظت بیگم صاحبہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ جواب دینا دنیا کی مرضی رہے کسی ملازم نے ظفر کے کانوں میں یہ زہر بھی گھولا کہ بیگم صاحبہ اس کے خطوط دیکھیں بغیر تلف کو دیتی ہیں اور اس بات پر رکتے ہوئی ہیں کہ اگر وہ یہ خط وصول ہی کیوں کرتے ہیں، وہ ظفر سے کوئی تعلق ہی کیوں رکھتے ہیں۔ سید صاحبہ کے مکان کی دیوار اس بہت اونچی تھیں۔ ظفر بھی قد و قامت میں کوتاہ نہیں تھا لیکن یہ دیواریں پار کرنے کے لیے بہت مختصر اور ناکافی قامت تھا اس کا۔

نصیر بابا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اندھا اور بڑھ گیا تھا۔ رات کے کھانے کا وقت ایسا متعین نہیں تھا لیکن کسی بھی لمحے کوئی ہرکارہ ہمیں تلاش کرتا ہوا اس طرف آسکتا تھا۔ بہر حال بھٹل کرے میں موجود تھا۔ اسے دونوں تک سید صاحبہ کے ساتھ تئیں وقت نہاٹے اور کھانے میں وہی شریک ہوتا ہوا تھا، میری ڈھنڈھیا نہیں پڑے گی۔ مجھ پیار کا کھانا تو کمرے میں آجاتا تھا۔ ٹھیل کے سامنے ہی میں نصیر بابا کو لے کے عقبی سبزہ زار کی طرف چلا تھا، اسے اندازہ ہوگا کہ ناوقت مجھے نصیر بابا کی ضرورت کیوں پڑی ہے۔ وہ ملازموں سے کمرے میں میری عدم موجودگی کا کوئی بھی عذر کر سکتا تھا۔ مجھے ایسی کوئی بے چینی نہیں تھی لیکن نصیر بابا کو بار بار کسی کے آجانے کا خوف گھیر لیتا تھا، میں نے بہ وقت انہیں روکے رکھا تھا۔

نصیر بابا کی ذہنی آواز میں نفرت اور بیزاری شامل ہو گئی تھی۔ سید صاحبہ کے ذکر پر وہ اپنا منہ توپنے اور گالوں پر طمانچہ مارنے لگے۔ کتنے لگے کہ یہاں سارے ملازم آدی کی نہیں، جانوروں کی نسل سے ہیں۔ سب کو بس دم بلانا آتا ہے۔ وہ بھی کبھی انہی میں سے تھے۔ وہ بھی بہت بڑے کتے تھے۔ سید صاحبہ کی نظروں میں تو ان کی یہی حیثیت ہے۔ نصیر بابا نے بتایا کہ وہ ایک زمانے سے سید صاحبہ کی خدمت کر رہے ہیں۔ میرٹھ میں گوروں کے خلاف شورش نے فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بلوایوں نے ان کے گھر کو آگ لگا دی۔ بوڑھے ماں باپ، دو جوان بیٹیں، ایک چھوٹا بھائی، ان کی بیوی اور تین بیٹے آگ کی نذر ہو گئے۔ اوسر مشتعل گوروں نے اندھا دھند گرفتاریاں شروع کر دیں۔ کبھی کسی موقع پر جوش میں آکے نصیر بابا نے گوروں کو ہندوستان

سے نکالنے کی تحریک میں اپنا نام بھی مسرفوشوں میں لگا تھا۔ کسی غدار نے وہ فہرست گوروں کو فراہم کر دی کہ وہ بھی زہر آگئے۔ وہ عدالت میں داد و فراہم کر کے گورے حاکم نے انہیں تین سال کے لیے جیل بھیج دیا تین مہینے ہوئے تھے کہ ایک روز سیاسی قیدیوں نے ہا کارنوں کی مدد سے جیل میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس افز میں نصیر بابا کو جیل سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ میر اب کیا رہ گیا تھا۔ وہ اپنے آبائی شہر خوجہ میں رشتہ کے پاس بھی نہیں جاسکتے تھے، مختلف شہروں میں جا بدل کے منہ چھپاتے، پھرتے رہے، طرح طرح کے اور بھگتے بھگتے آسن سول آگئے اور آخر انہی محمود علی کے ہاں پناہ مل گئی۔ سید صاحبہ بھی اس زنا اوسط درجے کے آدی تھے چھوٹے سے مکان میں رہ لیکن صبح و شام تک دو دو میں لگے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے کے پاس زر کی افراط ہوئے گی۔ انہوں نے یہ ق مکان بنوایا۔ نصیر بابا سید صاحبہ کے سب سے برا ہیں۔ اپنے حالات سے وہ اس قدر دل برداشت ہوئے سفید و سیاہ کی تمیز ہی جاتی رہی تھی۔ کہتے ہیں، کانٹا پوے ابتدا میں اکھاڑ چھینک دیے جائیں تو تاد گویں نہیں۔ کانٹوں کا یہ درخت نصیر بابا کے سائے چڑھا ہے، وہ اس کے سائے کے ساتھ کانٹوں کے ہو گئے تھے۔ سب کچھ ان کے سامنے گزرا ہے اور روز بڑھتا، پھیلتا رہا ہے۔

نصیر بابا جگر کی ہوئی آواز میں کہنے لگے کہ دہرائیں۔ زنان خانے کی ساری ملازمتیں جن جن گئی ہیں۔ وہ ساری عورت ذات پر سمیت ہیں۔ ان بوڑھی خاتون ریس بیگم سید صاحبہ کی کوئی رشتہ اول درجے کی قظامہ ہے، کسی کتنی کی مانند۔ یہ جانے کہاں سے اسے لائے تھے۔ یقیناً کسی بالا تعلق ہونا چاہیے۔ اس وقت سید صاحبہ کی پہلی تھی، ریس بیگم کی آمد کے سال بھر کے اندر اندر پیاری کے بعد حیرت انگیز طور پر اس کا انتقال، صاحبہ کے دونوں بیٹے ننھی تال کے انگریزی پڑھتے رہے ہیں، وہاں کی تعلیم کے بعد انہیں ولا گیا۔ ننھی اپنے گھر کی ہو گئی تھی۔ پہلی بیوی کی موت دو سال بعد سید صاحبہ آگرے کی ایک طوائف درازد، سانولی رنگت، تھکے نقوش کی ایک نازک کے ایسے شیدا ہوئے کہ منہ مانگی رہ کر کمرے آ۔

با:

خوش شعرا، پاکیزہ اطوار لڑکی تھی، عزت مندانہ زندگی کی طلب رکھتی تھی۔ نماز روزے کی پابند ہو گئی تھی مگر ایک روز وہ بھی اچانک بیمار ہو گئی۔ سید صاحبہ علاج کرائے کے لیے اسے الہ آباد لے گئے۔ ریس بیگم بھی ہم راہ تھی۔ پندرہ ہیں روز بعد دونوں واپس آئے تو وہ عقیقہ ساتھ نہیں تھی۔ بتایا گیا کہ اس کا وقت آ گیا تھا۔ بڑے بڑے انگریزی ڈاکٹروں نے کوشش کی لیکن جس کا لاواڑا آجائے اسے کون روک سکتا ہے اصل بات کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ اس واقعے کے بعد سید صاحبہ نے کسی عورت کو بہ حیثیت بیوی گھر پر نہیں رکھا۔ ہاں عورتیں آتی جاتی رہیں، آتی جاتی رہتی ہیں کبھی چند روز پہنچے دوپٹے، مہینے دو مہینے کے لیے۔

شہر اور اطراف میں دو دو نزدیک سید صاحبہ کے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ بہت سے ہم مزاج وقفے وقفے پر ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں، پر شکوہ عورتیں، راگ رنگ کی محفلیں، جام دینا کے دور، ان کی دنیا ہی الگ ہے۔ ہندوستان بھر سے رفص و سرود کی ماہر حسین و جمیل عورتیں اہتمام سے ان محفلوں میں ملانی جاتی ہیں، کبھی اس اقبال مند کے گھر، کبھی اس منصب دار کے ہاں۔ سید صاحبہ کے ہاں کبھی کوئی مہمان خاندان سمیت آکے ٹھہرا ہے اور اس میں کوئی دو تیرہ یا رنگ آئینہ عورت سید صاحبہ کی نگاہ کو بھا

باتی ہے تو ریس بیگم کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ وہ شیشے میں تارے کا پانچا ہنر آزماتی ہے۔ ریس بیگم ناکام کبھی نہیں ہوتی۔ وہ اور اس کی کینیز، زنان خانے کی مخصوص ملازمتیں سب مل کے تجویزوں، رنجیوں، تحائف اور ان سب سے بڑھ کر خوابوں اور خیالوں کا ایسا جال بچھاتی ہیں کہ یہ صاحبہ کی مطلب کے لیے گریز کا راستہ نہیں رہ جاتا۔

مہمان خالی پر کثیر مصارف ہوتے ہیں، وقت بھی کم صرف نہیں ہوتا لیکن میزبانی و مدارات کے اس سلسلے کا اصل بے اندازہ ہے۔ یہاں بڑے مختلف لوگ آکے مہرستے ہیں۔ علوم و فنون کے ماہر جید و مستند عالم دین، بڑے کرکاری عمدے دار، نگارہ بردار میں دار اور زر بار تاجر اور ہ لوگ جو سید صاحبہ کو زیادہ مرغوب ہیں۔ کسی بہت موصی مہمان کے لیے زنان خانے سے متصل عمارت کے سطح صے میں انتظام کیا جاتا ہے۔ ہر مسلک اور فرقے کے لوگ سید صاحبہ کا تعلق ہے۔ مجسود میں چندہ ان کے ہاں سے جاتا ہے دوسرے کی تقریبات میں بھی وہ بخل میں گرتے خود بھی شریک ہوتے ہیں، بڑے دن کے جشن نماز و خوش و خوش سے حصہ لیتے ہیں۔ وہ اور ان کے بعض

بازیگر

خاص دوست اپنی پسندیدہ عورتوں کا تبادلہ بھی میوہ نہیں سمجھتے۔

نصیر بابا کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری رگوں میں جلن ہونے لگی تھی۔ نصیر بابا کہہ رہے تھے، انہیں یقین ہے، یہ پروفیسر کی موت کا وقت نہیں تھا۔ وہ تو بڑے صحت مند، بہت زندہ دل آدمی تھے۔ ان کے گھر سید صاحبہ نے آزمودہ ملازم تعینات کیے تھے۔ پروفیسر کے پاس زرعی زمین کی صورت میں ایک بڑا اثاثہ تھا۔ سید صاحبہ سے سودا کیے ہوئے مکان کی دو ایک قطعیں بھی پروفیسر زرعی زمین کی آمدنی سے ادا کر چکے تھے مگر مال و زر کی بات تو جانی ہے۔ پروفیسر کی بیوی خانم فرخ ایک پری پیکر، ماہ جمال خاتون تھی۔ کسی ملکہ کے مانند، اس کے چہرے پر وقار تھا۔ اس کی آنکھوں میں بجلی سی گوندتی رہتی تھی۔ اس کا سراپا کسی کچھنی شاخ کے مثل تھا۔ اس کی شبانی رنگت، شفتی سے مشابہ تھی۔ فارسی لب و لہجے میں وہ ہندوستانی ہوتی تھی اور یوں اس کی طرز گفتار اور دل کش اور دل نہیں ہو جاتی تھی۔ ہر لباس اس پر خوب چلتا تھا۔ وہ اپنی دو بیٹیوں کی ماں کے بجائے بڑی بہن نظر آتی تھی۔ بڑی بیٹی فروزاں ہو یہ وہ اس کی مثال ہے۔

سید صاحبہ کے گھر میں آنے کے بعد وہ تئیں ابتدائی چند دنوں تک بڑی آرزو دل گرفتہ رہیں مگر یہاں ان کی دل پری ولدہ کا سارا اہتمام کیا گیا تھا۔ ریس بیگم ان کے لیے پلیٹیں بچھاتی تھی۔ ریس بیگم کے اشارے پر دیگر ملازمتیں باندھ یوں کی طرح خدمت بجالانے کو مستعد رہتی تھیں۔ خود سید صاحبہ ہمہ وقت ان کی دل داری و دل جوئی کے لیے مضطرب رہتے تھے۔ یکایک جب ظفر کی آمد بند ہو گئی تو ماں اور بیٹیوں کی تشویش لازم تھی۔ ظفر تو ان کے لیے پروفیسر کی امانت، یادگار اور نشانی کی طرح تھا۔ ظفر تو ان کی امید تھا۔ سید صاحبہ نے ظفر کی اس روپوشی پر حیرت و ہنگامہ کا اظہار کیا۔ خانم کو بتایا گیا کہ ظفر تو گھر میں بھی نہیں، پھر بتایا گیا کہ وہ تو اپنا سامان اور کتا ہیں اپنے ساتھ لے گیا ہے اور گھر میں موجود چوکی دار سے بھی کچھ کہ سن کے نہیں گیا۔ خانم کو یقین نہیں آتا تھا۔ اس نے مختلف ملازموں سے کھلی کوچے ظفر کا سراغ لگانے کی منت کی۔ ہر ایک ناکام واپس آکے خانم اور اس کی بیٹیوں کو دھشت زدہ کرتا رہا۔ سید صاحبہ مسلسل انہیں تسلی دیتے رہے کہ جلد یا بد ظفر کے بارے میں اچھی خبر آئے گی۔ وہ خاطر جمع رہیں، ظفر کی تلاش میں کوئی کسر نہ رکھی جائے گی۔ انہوں نے ہر جگہ رکھا ہے،

یہاں تک کہ پولیس کی بھی مدد ملی ہے۔ وہ پٹنے میں رہ چکی تھیں اور انہیں پروفیسر اور ظفر کے بعض ملاقاتیوں کے نام یاد تھے۔ ان کے اصرار پر ملازم پٹنے روانہ کیے گئے، ایک بار نہیں، کئی بار دوسرے سیرے روز بظاہر وہ پٹنے سے واپس آئے مایوسی کا اظہار کر رہے تھے۔

شاہ جہاں پور میں مقیم ظفر کی ماں اور بہن کی بابت بھی خانم تھوڑا زبانت جانتی تھی۔ ظفر اکثر ان کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ گھر کی الماریوں کو نئے بجالوں میں شاہ جہاں پور سے آنے والے ظفر کے خطوط تلاش کرانے لگی یعنی خانم کو ایسا تاثر دیا گیا۔ سید صاحب نے خانم اور اس کی بیٹیوں کے اطمینان کے لیے ایک آدمی بھی شاہ جہاں پور روانہ کیا۔ جو کبھی وہاں نہیں تھا۔ دس پندرہ روز کے غیاب کے بعد آئے اس نے بھی خانم کو کوئی فرحت اثر خیر نہیں سنا۔ ظفر کے لیے سب سے دل فگار فردزاں تھی۔ وہ کسی سے کچھ کتنی نہیں تھی لیکن اس کے چہرے پر بادل سے چھائے رہتے تھے۔ بہت دنوں بلکہ مہینوں تک انہیں ظفر کا انتظار رہا۔ وہ سید کے گھر سے مانوس ہونے لگی تھی۔ کسی مرد کے بغیر وہ عین جوان عورتیں اپنے گھر میں تنہا رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ اور سید صاحب نے ان کی خوشنودی کے لیے ہر جتن کیا تھا۔ رئیس بیگم کی ترغیب پر خانم گھر کے معاملات میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی کیونکہ اس کی رائے کو فوریّت دی جاتی تھی۔ سید صاحب بھی کبھی کبھار خانم سے ایرانی کھانوں کی فرمائش کرتے اور داد و تحسین کا حق ادا کر دیتے۔

کچھ عرصے بعد سید صاحب نے گھر کی کسائی سے آگے کے پہاڑی مقامات پر جانے کا اعلان کیا۔ رئیس بیگم، نصیر بابا اور چند ایک ملازماؤں کے ساتھ یہ لشکر پیلے وار ہلنگ کیا، وہاں کے سبز زاروں کوہ ساروں کا نظارہ دیکھا، شریں بنگال میں سندر بن کی سیر کی۔ ٹکٹے شریں گھوسے پھرے۔ ایک ڈیڑھ مہینے مسلسل روپے روٹی کے اس سفر میں رہی سہی انجینٹ بھی ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ ٹکٹے میں زیورات اور لمبوسات کی خریداری میں سید صاحب نے ہزاروں صرف کر دیے۔ اس سفر سے خانم اور بیٹیوں پر لازماً خوش گوار احساس مرتب ہونے چاہیے تھے۔ گھر واپس آئے یقیناً اچانک نہیں، مناسب وقت دیکھ کر رئیس بیگم نے خانم کے کان میں شوشہ طرازی ہوگی کہ کیوں نہ وہ اور سید صاحب یہ دیکھ دو ریاں مٹا دیں۔ نصیر بابا کا کہنا تھا کہ خانم اس کے لیے جلد آمادہ نہیں ہوئی ہوگی مگر رئیس بیگم ایک دست کار، بیش باز، پتھر پکھانے کے فن سے واقف۔ اس کی دلیلیں بھی توانائی سے

عاری نہیں تھیں۔ ظفر چاکا تھا، آٹے سائے گرد و پیش سید صاحب کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ دو بیٹیاں اس ذمے داری تھیں۔ خود اس کے آگے زندگی بڑی تھی۔ ان دنوں تک وہ سید صاحب کی شینگی دو ارتقائی کا مشاہدہ کر تھی۔ رئیس بیگم اس بار بھی اپنی سحر کاری میں ناکام نہ ہوئی۔ ایک رات وہ خانم کو عمارت کے وسطی حصے میں گئی۔ سید صاحب کے علاوہ وہاں ایک مولوی، نصیر بابا ایک اور شخص پہلے سے موجود تھے۔ وہ سختوں کے لیے تیار تھا۔ منٹوں میں رسم ادا ہو گئی۔

رئیس بیگم کے مشورے پر سردست یہ واقعہ بنیور چھپایا گیا، دوسرے ملازموں سے بھی مخفی رکھا گیا۔ خانم اس اختصار پر تعجب کا اظہار کیا تھا مگر غدر و جیش کیے فردزاں اور یا سمن ابھی تپانچے اور حساس ہیں۔ ہوسکا خانم اور سید صاحب کے اس محترم و مقدس رشتے کی توبہ کے لیے ابھی وہ ذہنی طور پر تیار نہ ہوں۔ کچھ عرصے اور جانے پر مرحوم باپ کے نقش ضرور دھندلے پڑ جائیں۔ وقت سب سے برا مہیا ہے ابھی اس افشاں سے ان منفی اثر برا تو ان ذمال کی ساری کوششیں اکارت جائیں باہر کے لوگ یا ملازم سید صاحب اور خانم کی اس یکہ سے آشنا ہوئے تو فردزاں اور یا سمن سے بھی کچھ ہوا نہیں رہے گا۔ بے شک یہ مبارک و مسعود کام مٹا جاسکتا تھا لیکن خانم کو ذاتی طور پر گداز اور یقین کی کم ہے اور جب کسی کام میں بہتری کا پہلو مضمر ہے تو کم سہی اسے انجام دینے میں دیر کیوں کی جائے آخر کار تو بھی کو معلوم ہو جاتا ہے۔ ان توجیہوں نے خانم قائل نہیں کیا مگر سید صاحب کی زبردستی، دور اندیشی پر داری تو مسلم تھی۔ وہ خاموش رہی، نصیر بابا کہہ رہے خود انہیں بھی بڑی حیرت ہوئی تھی، بہت دنوں بعد ان پر وہ داری کے راز منکشف ہوئے۔ نصیر بابا کے مطالبات اس وقت ایک بے نام خوف کے ساتھ انہیں بھی ہوئی تھی کہ خانم کے غم کا اس طرح کچھ مداوا نصیر بابا خود کو ملامت کر رہے تھے، کہنے لگے، وہ یہ بھول خانم کی غم ناک کا ذمے دار کون ہے۔ تاہم نصیر بابا باندھی کہ اب شاید سید صاحب کی زندگی کا رخ بدل خانم فرخ واقعی مبارک ثابت ہو۔ ایسی حور شاہک بیوی کے بعد اب انہیں کسی اور طرف نہیں دیکھنا چاہیے سید صاحب نے بڑی احتیاط کی، کسی کو ہونا نہ خانم اور بیٹیوں کے الگ الگ کمرے پہلے سے مختص

میں کی بیگم بیٹیوں کو منجھال لیتی تھی اور خانم اپنے نئے اہلی خدا کے پاس خلوت میں چلی جاتی تھی۔ ان دنوں سید صاحب کا عجیب عالم تھا۔ پیر جیسے زمین پر نلتے ہی نہ تھے گالوں سے سرخی چھوٹی تھی، آنکھیں تائب دار ہو گئی تھیں۔ رفتار نہ تھی، ہنسی بھی لباس پر یوں بھی توبہ دیتے تھے، ان دنوں رنگ و رنگ ہی بدل گیا تھا۔ لگتا تھا، جیسے انہوں نے دنیا فراموش کر لی ہو۔ کئی مہینے اس سرشاری میں گزر گئے اور خانم وہ نکال ہونے لگی کہ اس طرح چوری چھپے سید صاحب کے ہاتھ اچھا نہیں لگتا۔ وہ بیٹیوں کے سائے خود کو بھرم میں کرتی ہے۔ اسے ملازموں کے سائے بھی شرمندگی سی تی ہے یہ کیسا سہم ہے، وہ سید صاحب کی بیگم، اس گھر کی لہجے اور اپنے استحقاق کی دعوے دار نہیں ہے۔ اب یہ کون سا ناچا ہے۔ خانم کو اولاد نرنہ کی بڑی تمنا تھی۔ فیر کے زمانے میں گزر جانے والے بیٹے کی موت کی تلخی طرح ہو سکتی تھی۔ نصیر بابا کہتے تھے، اولاد سے تو تجوید نہ ہوتی ہے اس سے بندھن مضبوط ہوتے ہیں۔ درپردگی، ان تعلقات میں اولاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ خانم کے لیے بڑی ہولناک روح تھی۔

سید صاحب کی پرہیزگاری کی رمز و اس وقت کھلی جب اکھوڑا بیٹا اسد علی لندن سے وارد ہوا۔ بیٹے آئیں یا بیٹی داماد، رئیس بیگم سید صاحب کی اولاد کی آمد پر روانہ دار ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی خاطر موضع سے ان کی ماں کی کمی دور لیتی تھی۔ سید صاحب نے بڑی ہمت و ہمتی دی تھیں مگر ایک زمانہ خانے کے جھروکے میں اسد علی نے فردزاں کا جلوہ یا۔ وہ دم بخورہ گیا۔ والد صاحب سے سلسلہ جنسانی کی بات نہیں تھی۔ اس نے رئیس بیگم سے فردزاں کی بات کی اور خوب منت ساجت کی۔ رئیس بیگم نے جواب میں ہاتھ توقف نہیں کیا، معذرت کردی کہ اسد علی اس قسم لونی آس نہ لگائے تو بہتر ہے۔ فردزاں اپنے والد مرحوم ہر کے ایک شاگرد ظفر سے منگ چکی ہے اور فردزاں خود اس رشتے کی مدد ہے تعلیم سے فراغت کے بعد ظفر آئے کی دیر ہے فردزاں اپنے گھر کی ہوا جائے گی۔ یا سمن ہاشمی کی عمر کو نہیں پہنچے لیکن یا سمن کے لیے بھی براہی زندگی میں رشتہ تلاش کر سکتے تھے۔ یہ سن کے اسد پر اچھی طاری ہوئی۔ وہ ضد کرنے لگا کہ بابا چاہیں تو سب ہو سکتا ہے اس نے نصیر بابا سے بھی ایک روز جھجکتے سید صاحب سے بات کرنے کی درخواست کی۔ نصیر بابا موقع نیت جان کے ایک شام سید صاحب کو اسد علی کی زہی گری

خواہش سے آگاہ کر دیا۔ سید صاحب کی برہمی پر انہیں تعجب ہوا۔ انہوں نے نصیر بابا کو تاکید کی کہ وہ اسد علی کے دل سے یہ خیال نکالنے کی کوشش کریں اور نہ مانے تو واضح طور پر بنادیں کہ اس کے بابا اس بارے میں قطعاً مجبور ہیں، انہیں اپنے دوست پروفیسر جمال الدین سیٹھی سے کہے ہوئے وعدے کا پاس ہے اسد علی سے رئیس بیگم کے جو کچھ کہا ہے وہی صحیح ہے اس کے لیے ایک سے ایک ماہ جیں لڑی دھونڈی جاسکتی ہے نصیر بابا نے آقا کے حکم کی قبول کی، حالانکہ ان کے خیال میں ولایت میں پڑھنے والا اسد علی فردزاں کے لیے کوئی نامناسب لڑکا نہیں تھا۔ اور سید صاحب ظفر کا باب تو بیشک کے لیے بند کر رہے تھے ہیں۔ اب ان کے ذہن میں کیا ہے؟ اسد علی کے لیے فردزاں جیسی رنگ و رنگ ماہ تاب لڑکی انہیں ملنی مشکل ہے۔ آج نہیں تو کل، انہیں اپنے ہاتھوں سے فردزاں کی شادی کرنی ہی ہے شاید خانم بھی منع نہ کرے۔ اسد علی نے بہت ہاتھ پیر مارے، بڑی سرکشی کی، اور ایسا دل گرفتہ ہوا کہ سفر اور حورا چھوڑ کے ولایت واپس چلا گیا۔

اور خانم نے شدت سے اصرار کرنا شروع کر دیا تھا کہ فردزاں اور یا سمن نے نیا گھر اور نیا ماحول اچھی طرح قبول کر لیا ہے اب کوئی ہرج تھیں۔ سید صاحب اور ان کی ماں کی شادی کی فوریّت انہیں ایسا صدمہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے وہ کچھ سکون ہی محسوس کریں۔ انہیں بھی تو اپنی ماں کا بہت خیال ہے۔ اس طرح انہیں اس گھر پر اپنے حق کا اعتماد بھی ہوگا۔ گھر میں نصیر بابا اور رئیس بیگم خانم اور سید صاحب کے خفیہ رشتہ ازدواج کے گواہ تھے۔ خانم نے ان سے بھی داد و خواہی کی کہ وہی سید صاحب کو ہموار کریں۔ ایک نہایت متحرک علقی، راز کیوں رہنے دیا جائے اچھا ہوگا کہ اسے ایک مسلسل احساس مذمت سے نجات دلائی جائے۔ فردزاں اور یا سمن اب ایسی نادان بھی نہیں ہیں۔ سید صاحب نے حسب سابق کچھ اور مہلت مانگی اور اس مہلت میں ایک دن خانم کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اسے پروفیسر جتنا وقت بھی نہیں ملا۔ وہی ڈاکٹر، حکیم اور ویدوں کا سلسلہ شروع ہوا اور قصہ مختصر، ہفتے ڈیڑھ ہفتے کی کش کش یا زور آزمائی کے بعد خانم بھی پروفیسر کے پاس چلی گئی۔

فردزاں اور یا سمن کو سکتہ ہو گیا تھا۔ ان کی دیرانی کا حال بیان کرتے ہوئے نصیر بابا ہر کتنے لگے۔ ان دنوں نے سب سے کنارہ کر لیا تھا اور اپنے کمرے میں محسوس ہو گئی تھیں۔ رئیس بیگم واری صدمہ جاتی تھی۔ سید صاحب ان

کے لیے آسمان سے تارے لانے کے دعوے کرتے۔ مہر کی تلقین کرتے کرتے ان کی آواز ڈوب جاتی تھی اور ان کی آنکھیں سیلاب ہو جاتی تھیں۔ سب موت و حیات کا فلسفہ بیان کرتے تھے۔ کہتے تھے، زندگی تو خدا کی امانت ہے، موت سے کسے مفر ہے کوئی یہاں قیام کرنے والا نہیں۔ یہ سب تو پیدا کرنے والے کی مشیت ہے، جسے چاہے، جب چاہے پاس ملائے۔ اس موقع پر خدا کے حوالے خاصے کار آمد ہوتے ہیں۔ کئی دن تک گھر میں کلام پاک کا درد ہو تا رہا اور مرحومہ کی روح کو ثواب پہنچایا جاتا رہا، اس کی منزیل آسمان کی جاتی رہیں۔ گھر کے سارے افراد اشک شوق کے لیے فردزاں اور یاسمن کے ارد گرد رہتے تھے مگر صرف آنکھیں ہی تھوڑی دلتی ہیں۔

نصیر بابا کا سر بھی اب گھومنے لگا تھا۔ دست و بازو کی طرح کے حواس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ نیل سے فرار ہو کے انیسویں سب کچھ دیکھنا تھا تو نیل ہی اچھی تھی۔ کاش وہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ جل مرتے۔ ایک دفعہ کی آگ، زندگی بھر کی آگ سے چھکارا دلادیتی۔ ان کی زندگی تو ایک اتفاق ہے۔ بلوائیوں کے ہلا بولتے وقت وہ گھر پہ ہوتے تو ان کا انجام بھی ماں باپ، بیوی بچوں جیسا ہوتا۔ اب انہیں یہ متعارف زندگی واپس گردینی چاہیے۔ بے اختیار زندگی تو موت سے بدتر ہے۔ موت کی سزائیں ایسی بے سکونی نہ ہوگی۔ نمک کا حق آخر کس قدر ہوتا ہے، ظرف سے سواتو نہیں۔ کیا عجب کہ ایک یہ آخری اقدام عاقبت سنوارنے کا سبب بن جائے مگر اس سے پہلے انہیں فردزاں اور یاسمن کے لیے کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ انہیں ظفر کو تلاش کرنا چاہیے۔ کچھ عرصے پہلے تک تو وہ دربانہ، درد آشنا، شکستہ سے دوچار شرمیں نظر آتے آتے تھے۔ اب جانے کہاں کھو گیا ہے۔ بہت سوچ سمجھ ہی کے قدم اٹھانا ہوگا۔ صرف اتنی ہی نہیں کہ وہ خنجر لے کے نکل کھڑے ہوں، انہیں فردزاں اور یاسمن کے لیے بہتر عواقب کی ضمانت درکار تھی۔ وہ مسلسل تک و دو میں رہے اور کچھ نہ کر سکے۔ انہیں اپنے آپ سے وحشت ہونے لگی تھی، وہ کیسے ادھر سے، کتنے تنہا اور لاچار آدمی ہیں۔ انہوں نے تو بس ایک تماشائی، ایک معمول کی زندگی گزار دی ہے۔ انہوں نے بس سانس لینے کی آسانش پر قناعت کرلی ہے۔

ایک روز انہیں آسن سول میں ظفر نظر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حرف بد زبان پر لاتے، ظفر نے ان کے ہر پکڑ لے اور دیو داگی کرنے لگا کہ ایک بار، صرف ایک بار اسے

خانم اور فردزاں یا یاسمن سے ملنے کا موقع فراہم کر جائے۔ اسے دیکھ کے نصیر بابا کا جی چاہا کہ وہ گلے سے لگا بین کریں مگر وہ بت بنے رہے۔ زیاں کے بہت سے اندر نے انہیں گھیر لیا تھا۔ نصیر بابا نے خانم کے سامنے اسے آگاہ نہیں کیا اور نہ کچھ اور بتایا۔ ظفر کے ہوش و خواہ مخواہ موزونیت پر انہیں شبہ تھا۔ ظفر شرمیں تھا، کسی اور ملازم بھی اس کی مدد بھیج رہا ہو سکتی تھی۔ اس کے سامنے ظفر نے سی لغزش ہو جاتی تو نصیر بابا کے لیے زندگی اور مشکل ہو جاتیں۔ انہوں نے ظفر سے یہ بھی نہیں کہا کہ اس کے پیچھے ہونے خانم اور اس کی بیٹیوں کے پاس پہنچنے ہی نہیں پائے۔ انہوں نے ظفر سے ایک اور خط لکھنے کی گزارش کی۔ اس کی انہیں بڑی ضرورت تھی۔ ظفر کی تحریر سے حیران نہ فردزاں اور یاسمن کے ہاں امیدیں روشن ہو سکتی تھیں۔ شام کو اسی جگہ انہوں نے ظفر سے دوبارہ ملنے کا ملے کیا۔ گھر سے باہر نکلنے کا موقع اور غدر تلاش کرنا انہیں دیر ہو گئی۔ ظفر بے قرار سی سے ان کا منتظر تھا۔ وہ نے خط وصول کر کے کچھ حوصلہ کیا۔ انہوں نے دے لے میں ظفر کو عزم و استقامت کی نصیحت کے علاوہ خردا رہا کہ اب ان کے سوا وہ سید صاحب کے کسی ملازم سے علاقہ نہ رکھے۔ مناسب ہو گا کہ اب وہ آسن سول گیا کرے اور اس خط کے جواب کے لیے بھی اتنا متوجش، ذرا تحمل کرے اور بہتری کی توقع رکھے۔ اب گزشتہ کی نہیں ہوگا۔ دیر سے سہمی، امید ہے، اس خط کا جواب آئے گا۔ نصیر بابا نے اسے یقین دلایا کہ وہ خود اس سے کریں گے اور واضح رہے، ان دونوں کی ملاقات کی بجائے کسی کو پڑ گئی تو دونوں کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ ظفر نے سول سے آدھ گھنٹے کی مسافت پر دھن بادشہ کا چارواک عاجزی پر نصیر بابا کا دل بھرا آیا۔ ایک بار تو ان کے جی کہ وہ اسے سارا احوال بتا دیں۔ انہوں نے خود کو رد کر دیا۔ بہر حال ایک نوجوان تھا۔ جوانی جلد ہی آگ پکڑ لیتی۔ بہت باطل بھی ہو سکتا تھا۔ پھر فردزاں اور یاسمن کے نصیر بابا کی آنکھوں میں در آئے۔ درمیان میں وہ تم بھی تو ہیں، صرف ظفر اور نصیر بابا کا معاملہ تو نہیں۔

خط جیب میں رکھ کے وہ واپس گھر آگئے۔ جیسے نے کوئی چوری کی ہو، چوری پکڑی نہ جائے، ان کا دل کرتا رہا۔ زنان خانے میں ان کی آمد رفت پر کوئی نہیں بھی۔ وہ خود ہی دستیں دیتے اور کھٹکارتے ہو جاتے تھے۔ خط کی وجہ سے ان پر احتیاط کا احساس اور

بازی

یا تھا۔ رئیس بیگم اور دیگر ملازما میں ان دونوں بہ طور خاص زیاں اور یاسمن کی عکد اشت اور دلداری کے لیے ان کے موجود رہتی تھیں۔ ایسے میں فردزاں اور یاسمن کے رہے کام کرتے ہوئے نصیر بابا کے قدم اٹکتے تھے۔ انہیں ہاں تک موقع نہیں ملا اور تین دن تک انہیں غینہ بھی نہ پہلے اصل میں خط سپرد کرنا دوسرا مرحلہ تھا، اس سے پہلے زیاں اور یاسمن کو عقل و ہوش کا درس دینا ضروری تھا۔ تھیں انہوں نے بہت پائے تھے۔ ایک بے ضروری ترکیب کے منتشر دماغ میں آئی تھی۔ یاسمن اور فردزاں کے بے کے باہر کھڑے ہو کے انہوں نے ملازمہ اسٹیل سے کہا وہ فردزاں اور یاسمن میں سے کسی کو ذرا باہر بلا دے۔ بی معطل علی نے روٹا اور سکون قلب کے لیے ایک سوہ اور آسمان سا وظیفہ تجویز کیا ہے۔ اللہ نے چاہا، اس ورد سے دونوں بہنوں کی تشفی ہو گئی۔ سادہ مزاج نصیر بابا پر ختم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

حفظ انتقام کے طور پر نصیر بابا نے یہاں تک خیال رکھا کہ قریبی مہر کے مولوی معظم علی کی خدمت میں حاضر لے نہ کہ وہ وظیفہ لکھوا لائے تھے اور ان کے سامنے اسے بھی کر لیا تھا۔ یاسمن فوراً باہر آگئی۔ اس پر مہر کی سے نصیر بابا نے غلیظہ کا پرہیز کیا۔ یاسمن نے خوالے کیا اور دیشانہ انداز میں جلدی جلدی کہا کہ یاسمن ذرا توجہ سے اس سے ملنے کے لیے انہوں نے اس پر زے کا سارا لیا، کوئی اہم چیز اسے سپرد کرنی ہے، لیکن اس سے پہلے رہی بات بھی کرنی ہے اور بات تفصیلی ہے اس لیے یہاں انہیں کی جاسکتی۔ یاسمن اور فردزاں پہلے کی طرح زنان نے میں گھومنا پھرنا شروع کر دیں تو ان تک رسائی آسمان سے یاسمن سموت ہو گئی تھی۔ اس نے پیچھے ہونے لے پوچھا کہ ایسی کیا بات ہے؟ نصیر بابا نے اس کے سر پر رکھ کے دلا سادہ کہ وہ پریشان نہ ہو، اور خیال رہے کہ نہ والے دنوں میں دونوں ہمیشہ غیر ضروری جلت اور اسی سے احتیاط کریں۔ جو بھی بات ہے، ان کی خیر خواہی، متعلق ہے اور جو ان کے تعاون کے بغیر ممکن بھی نہیں۔ بس انہیں اپنے آپ کو سنبھالنے رکھنا، زبان بند رکھنا، ملیں گے، حیرت زدہ یاسمن نے پوچھا، پھر کہ وہ اس سادہ روز نصیر بابا نے بتایا کہ وہ زنان خانے کا پیچھے لگاتے ہی انہیں قریب تو ہیں گے ہی۔ ان کی کو شش ہو گی کہ یاسمن کوئی موقع مل جائے اور وہ صراحت سے اسے یا

زیگر 6

فردزاں کو کچھ باور کرا سکیں۔

وہ یاسمن کو حیران و پریشان چھوڑ کے وہاں سے چل دیے۔

نصیر بابا کا قیاس درست نکلا، فردزاں اور یاسمن نے اسی دن سے اپنے کمرے میں بند رہنے کا طور ترک کر دیا۔ لیکن چاروں ایسے ہی گزر گئے۔ یاسمن اور فردزاں سے کئی بار نصیر بابا کا آتما سنا ہوا مگر ختمی باتیں کرنے کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ وہ مسلسل اسی فکر میں لگے ہوئے تھے اور انہیں ملال ہو رہا تھا کہ یاسمن اور فردزاں ان سے کہیں زیادہ مضطرب ہو رہی ہوں گی۔ یاسمن نے دن شام کا وقت تھا، سید صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ نصیر بابا عقبی بڑھ زار کے اس حصے کی طرف چلے گئے جو خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ فراغت کے اوقات میں عادت کے مطابق وہ کیا رہاں درست کرنے لگے۔ یاسمن نے جھوٹے سے انہیں دیکھ لیا۔ زنان خانے کی صورت حال بھی موافق ہو گئی جیسی لکھوں میں وہ نصیر بابا کے پاس پہنچ گئی۔ نصیر بابا نے کیا رہوں سے پھول توڑ کے چھوٹا سا گلہ دست بنایا اور ہر طرف سے مطمئن ہو کے ظفر کا مڑا مڑا رقعہ گلہ دست کے ساتھ یاسمن کو پیش کر دیا۔ "یہ ظفر میاں کا خط ہے بی بی!" انہوں نے دھڑکتی آواز میں کہا، "بڑھ کے فوراً جلاؤ۔" ظفر کے نام پر یاسمن دنگ رہ گئی۔ نصیر بابا نے مختصر وقت میں جتنا کچھ ممکن تھا، بے جلت تمام یاسمن کو آگاہ کیا اور کہا کہ اب سارا معاملہ ان دونوں پر ہے کہ وہ کس ہوش مندی اور حوصلہ مندی سے آنے والا وقت بسر کرتی ہیں۔ انہیں سید صاحب، رئیس بیگم اور ملازموں کے سامنے اپنی حالت کی بحالی اور آسان کی درستی کا تاثر دینا ہے تاکہ مگر ان ملازموں کی بھیڑ اطراف سے چھٹ جائے۔ رئیس بیگم کی شیدا نیت اور ذہانیت کے جواب میں انہیں بھی اس کے ساتھ تپاک سے پیش آنا ہے۔ انہیں گھر کے ہر فرد کو یہ بتانا ہے کہ انہی ماں کے سامنے پر انہوں نے مہر شکر کر لیا ہے۔ سب اللہ کی جانب سے ہے اور وہ اس گھر کا حصہ ہیں، ان کا مستقبل تو اسی گھر سے وابستہ ہے۔ نصیر بابا نے یاسمن سے کہا، انہیں معلوم ہے کہ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن ظفر کا خط پڑھنے کے بعد ان پر گزرنے والی کیفیت بڑی مختلف ہو گئی۔ بہت اندھیرا اور جھل انہیں یہاں محسوس ہوگا۔ ان پر ایک ایک لمحہ عذاب ہو سکتا ہے۔ انہیں اپنے ارد گرد ہمہ دم مستعد رہنا حال، اپنے خدمت گاروں سے بڑی گھن آئے گی اور ڈر بھی لے گا۔ وہ جان لیں، یہی وقت ان کی آزمائش کا ہے۔ نصیر بابا ادھر اپنی کوششوں میں لگے رہیں گے مگر دیر

کتابیات پبلی کیشنز

کتابیات پبلی کیشنز

ہو سکتی ہے، بہت دیر بھی ہو سکتی ہے پھر بھی انہیں امید ہے، کوئی راہ ضرور نکل آئے گی۔ وہ ظفر سے مسلسل رابطہ رکھیں گے۔ اس خط کا جواب بھی اسے پہنچا دیں گے۔ جواب صرف دو سطر ہی ہونا چاہیے۔ صرف خط کی رسید اور اپنی خیریت سے ظفر کو مطلع کرنا ہے اور لکھنا ہے، اس سے پہلے اس کا کوئی خط فزراں اور یاسمن کو نہیں مل پایا ہے، تفصیلی جواب وہ بعد میں لکھیں گی۔ اپنی ماں کے بارے میں بھی انہیں ایک لفظ نہیں لکھنا۔ سرگراں ظفر سے کوئی بھی انا سیدھا قدم اٹھ سکتا ہے۔ فزراں اور یاسمن کو یقین کرنا چاہیے کہ وہ اس گھر میں تنہا نہیں ہیں۔ ایک بوڑھا آدمی مگر ان کا بھی خواہ ان کا تمکسار نصیر بابا زندہ ہے۔ اسے موت بھی آنے لگی تو وہ یوں انہیں بے آسرا چھوڑ کے نہیں جائے گا۔ نصیر بابا نے عزم سے کہا، ایک فیصلہ تو ہر وقت ان کے پاس محفوظ ہے۔ وہ بھروسہ رکھیں۔

چکا بکا یاسمن سنتی رہی۔ نصیر بابا نے اسے اپنے پاس مزید نہیں ٹھہرنے دیا اور آئندہ بھی چاروں طرف سے مطمئن ہو کے اپنے قریب آنے کی تاکید کی اور کہا کہ دونوں بہنوں اور نصیر بابا کے درمیان غیر معمولی رابطہ مضبوط کا کسی کو احساس نہ ہونے پائے۔

ظفر کا خط ملنے کے بعد یاسمن کو پر لگا کے اپنی بہن فزراں کے پاس پہنچنے کی وحشت ہوئی چاہیے تھی مگر اس نے مصروفیت کا ثبوت دیا کوئی جلدی نہیں کی۔ وہ شدید تکلیف اور شش در شش سے دوچار نظر آتی تھی۔ اسی حالت میں وہ نصیر بابا کے پاس سے ہٹ گئی اور آہستہ قدموں سے دور ہوئی تھی۔ نصیر بابا بوسے ہونٹوں سے بولے کہ انہیں اتنے ہی لفظ آتے تھے۔ ان کی زبان ہی ساتھ نہیں دے پاری تھی۔ یاسمن کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کے ان کا سینہ کھٹ رکتا تھا۔ شکر ہے، یاسمن نے ان سے سوال جواب نہیں کیے، وہ خاموشی سے چلی گئی۔ کسی گوشے سے اچانک کسی کے نمودار ہو جانے کا خدشہ نصیر بابا کو اور ہولائے ہوئے تھا۔ یاسمن کے جاتے ہی انہیں ایک اور دوسرے نے آکھیا کہ ان سے کوئی چوک تو نہیں ہوگئی؟ ظفر کا خط پڑھنے کے بعد تو دونوں بہنوں پر ایک باب حیرت کھل جائے گا۔ اب تک یہ گھر ان کے لیے ایسا زنداں نہیں تھا، اب تو سب کچھ انہیں بدلا ہوا نظر آئے گا۔ نصیر بابا نے کتنی آسانی سے ہدایتیں جاری کر دیں، یہ سوچے سمجھے بغیر کہ سامنے کون سے وہ توشیح کی طرح نازک ہیں، جس حد تک ان کے حکام کی گراں باری کی منتہی ہو سکیں گی، انہیں یہ زمانہ سازی، یہ سوانگ اور بہو پ کہاں

آتا ہے۔ انہیں کبھی اتنے چروں کے لوگوں سے کب وار بڑا ہوگا۔ وہ تو بڑے صاف و شفاف اطوار کی لڑکیاں ہیں انہیں تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا ہوگا کیونکہ انہیں کبھی کی ضرورت ہی نہیں پڑی ہوگی۔ نصیر بابا کو یہ فکر کھائی جا رہی تھی کہ فزراں اور یاسمن پر خوف و وحشت کے علاوہ باور اور اداسی کا غلبہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ، ایک اعتبار سے ان کے ہاتھ میں بھی ہے، باپوسی میں آدمی زیادہ کم زور ہو جاتا ہے۔ خدا انہیں بہت و استقامت دے، اسے انہیں اپنی امان میں رکھ۔ نصیر بابا نے ظفر کا خط نہیں تھا۔ ظاہر ہے، ظفر نے اپنی بے بسی و بے چارگی کا حال ر ہوا۔ کاش ظفر کی تحریر ہی جوت جلائے رکھے۔ نصیر بابا بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یاسمن کو گھبرے رہیں ہوئی ان کے قدم بے اختیار زنان خانے کی طرف اٹھ گئے دونوں اپنے کمرے میں تھیں۔ نصیر بابا ادھر ادھر کا چکر ہونے لگے۔ اس رات وہ صبح تک دعا میں رہے۔

مہمان خانے میں ان دنوں ایک دو مہمان ٹھہرے تھے۔ نصیر بابا سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ مہمان چپے تھے۔ مہمان کے ہاتھ انہوں نے فوراً زنانہ رخ کیا۔ انہوں نے پھر ایک گلدستہ تیار کیا اور تاکیدیں بھول گئے۔ یاسمن کو انہوں نے کسی ملازمت کے لیے کمرے سے بلوایا۔ اسے دیکھ کے چپے ان کی بھال ہوئیں۔ ایک رات میں یاسمن کی رنگت زرد تھی۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے ہاتھوں سے گلدستہ اس کے حوالے کر کے سر پہ تھپکا اور اس سے پہلے کہ یاسمن کی آنکھیں کھلنے لگیں، اسے لے کر نکلے۔

تین چار دن تک ان سے خود اپنی عاید کردہ اجازت عمل نہ ہو سکا۔ عام روش کے برعکس وہ شہرت خانے جاتے رہے اور دوسرے ہی دن انہیں چند لمبے یاسمن سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے ارادہ عزم کے سابق درس کی تکرار کی۔ یاسمن نے ظفر کے خط کا جواب ان کے سپرد کر دیا۔ نصیر بابا کو حد تک اچھی اردو آتی تھی مگر انہوں نے سر راہ ایک روک کے عام سے کانڈ پر چند سطر تحریر لکھوائی۔ کوارد نہیں آتی تھی۔ نصیر بابا جو بولتے تھے وہ آگاہ لکھتا گیا۔ کسی اور اچھی سے نصیر بابا نے ظفر کا پتہ درج کرایا اور یاسمن کے خط کے ساتھ اپنا رقعہ لکھا۔

کر کے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ انہوں نے سرکل کا نام بھی لکھانے پر نہیں لکھا۔ نہ اسے خط میں۔ ان کے مختصر خط کا متن بت سادہ تھا۔ انہوں نے لکھوایا تھا کہ دو سراسر آئے تک ظفر اپنی جگہ ٹھہرا رہے جب اسے بلایا جائے، بھیجے آئے اور اگر اپنی مرضی سے آئے تو ان سے ملنے کی کوشش قطعاً نہ کرے۔ اسے امید رکھنی چاہیے شاید وہ جلد ہی اچھی خبر سے اسے مطلع کر سکیں۔

بعد کے مطابق ظفر کو انہوں نے جواب بھیج دیا تھا لیکن وہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ اچھی خبر سے جلد مطلع کرنے کا یہ دوسرا وعدہ کس طرح اور کب پورا کر سکیں گے۔ پہلی بار خط کا جواب مل جانے کے بعد ظفر کے وقت و تامل پر انہیں شک تھا، اور تحریر اگر فزراں کی ہے تو ظفر کے حال کا تو خدا حافظ۔ کئی روز گزر گئے۔ یاسمن نے اشارہ اُن سے ایک بار ظفر کا ذکر کیجیڑا۔ نصیر بابا نے کچھ نہیں چھپایا، صاف بتا دیا کہ انہوں نے ظفر کو دھن بادیں روکے رکھا ہے، اس کا اس شہر میں اتنا مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے اسے خط لکھنے سے بھی منع کر دیا ہے۔ وہ ڈاک کے ذریعے تو کوئی خط میاں بھیج ہی نہیں سکتا۔ جب تک وہ یہاں نہ آئے، خیریت ناے کا امکان نہیں۔ دھن بدواتی دوری پر نہیں ہے، کسی دن کسی بہانے وہ خود اس سے ملنے وہاں جائیں گے۔ یاسمن ان سے اصرار یا ہند کرنے کا ناز نہیں کر سکتی تھی حالانکہ اس ناز برداری کی نصیر بابا کو بڑی حسرت تھی۔ دونوں بیٹیں ان کی ہدایت کے عین مطابق غم فراموشی اور زندگی میں رغبت کے وظیفے پر یہ مزاج عمل کر رہی تھیں۔ سید صاحب، رئیس بیگم اور ملازم، فزراں اور یاسمن میں اتنی سرعت سے امید کی بھالی اور زندگی کی طرف مراجعت کے آثار بہت شادیاں تھیں۔ سید صاحب تو جب وہ سامنے آئیں، بقول ٹھنٹے، دیدہ و دل فرشتہ یاہ کوہیتہ، رئیس بیگم ان کے اشارے سے سمجھتی پھرتی گی۔ ملازمہ کے خیال میں فزراں اور یاسمن میں یہ قرار اور استغنا مولوی معظم علی کے عطا کیے ہوئے وظیفے کی کرامت تھی۔ سید صاحب اسے رئیس بیگم کی مشافی کا کرشمہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس حسن خدمت کے اعتراف میں ایک جڑواں گولڈن رئیس بیگم کے زیب گلویا۔ فزراں اور یاسمن نے سیاہ لباس کے بجائے رنگ برنگ کپڑے پہننے شروع کر دیے تھے۔ وہ گھر میں اپنی ماں خانم کے نقش خوبی مناریں تھیں۔ کوئی ان کے سامنے مرحومہ کا ذکر کر بیٹھتا تو وہ چپ چاپ رہتی تھیں۔ کسی ان کی ماں کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ انہوں نے باپ کی تصویر انیسویں سے عاری کر لی تھیں۔ عمران کی زیادہ باپ کی گھر

نہیں تھی، تجربہ بھی کچھ نہیں تھا لیکن پہلی شرط تو آدمی کا عقل و ہوش سے آراستہ ہونا ہے۔ کتابیں تو وہ مستقل پڑھتی رہی تھیں۔ کتاب پڑھنے والا آدمی زیادہ دیکھتا، زیادہ سنتا ہے۔ جو استاد نہیں کہہ پاتے، وہ کتابیں سکھا دیتی ہیں۔ سید صاحب نے بھی اپنے گھر میں ان کے لیے کتابوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔

وقت گزرنے پر نصیر بابا کے سر میں جالے پڑنے لگے۔ انہوں نے اپنی دانست میں کئی دروازے کھول دیے تھے مگر اب سمجھتے تھے ان کی نظروں سے اوچھل ہوگئی تھیں۔ ظفر سے رابطہ ہو جانے، گھر میں فزراں اور یاسمن کے گرد پاس بانوں کا حصار ٹوٹ جانے سے یہ مراد کہاں بھی کہ حصار ٹوٹ گیا، پاس بانوں کو موت آگئی۔ اب کچھ بھی نصیر بابا کی دسترس سے دور نہیں، کچھ وقت اور جاتا، کسی خوشگوار دن اور مبارک ساعت میں فزراں اور یاسمن کو ایک اشارے کی ضرورت پڑے گی اور منزلیں سر ہو جائیں گی۔ درمیان میں حاکم پتھروں اور کانٹوں کا نصیر بابا کو اتنا اندازہ نہیں تھا۔ اونچی اونچی دیواروں، پتھروں سے بھرے ستونوں پر استوار چار دیواری، سنگ و دیوار اور نمک کا احترام کرنے والے خدا سے زیادہ ناخداؤں پر اعتبار کرنے کی سرشت رکھنے والے غلاموں سے آگے، دور دور تک سید صاحب کا کچھ چلتا تھا۔ نصیر بابا سید صاحب کے ہم مشروں میں ایک ایک سے واقف تھے، کیسے کیسے بلند اقبال، زور و اثر والے ان میں شامل تھے۔ وقت گزرا جا رہا تھا، دیر ہو جانے سے اور پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ زنان خانے جا کے فزراں اور یاسمن کے سامنے نصیر بابا کا سر جھک جاتا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ان کے چہرے پر بیکھری آرزو میں نصیر بابا کو بہت آرزو، بہت سرا سید کرتی تھیں، سوچتے سوچتے ان کے اعصاب جواب دینے لگتے تھے۔ ان کی مشافی قبیل میں فزراں اور یاسمن نے خود پر کیسا جبر کیا ہے۔ بہو پ بھرنے والوں کے سامنے بہو پ بھرتا ایک اذیت ناک مشقت ہے۔ کب تک وہ اس سوگ اس تماشے پر قادر رہیں گی۔ کسی دن ان کا پتا نہ چمک سکتا ہے۔ خواب اور تعبیریں اتنی تفصیل نہیں ہوتی چاہیے۔ نصیر بابا کو رئیس بیگم کی طرف سے بڑی فکر تھی۔ وہ بزرگ خود اس خوش گامی سے سرشار تھی کہ ماں کی موت سے فزراں اور یاسمن کے نماں خانے میں جو اندازہ راج چکا تھا، اسے اس نے اپنی حکمت سے اجالے میں بدل دیا ہے۔ یہ پہلا مرحلہ تھا۔ پہلے مرحلے کی تکمیل کے بعد اب وہ دوسرے مرحلے کے تیز و تفتک، دشنہ و خنجر مصل کر رہی ہوگی۔ دوسرا

مرحلہ خانم کی طرح اس کی بیٹی فروزاں پر اپنے جوہر آزمائے کا بے سید صاحب نے ابھی سے بے مہربانی کا اظہار شروع کر دیا ہو گا۔ بے شک اب کے رئیس بیگم کا کام ہو جائے گی کہ اس کے سامنے خانم نہیں، فروزاں ہے۔ سادہ شعار خانم کو رئیس بیگم کی صورت شناسی سے زیادہ دیکھنے اور سمجھنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ خوش قسمتی سے خانم کی بیٹی فروزاں کو رئیس بیگم کی سیرت آشنائی کا موقع فراہم ہو گیا ہے۔ مگر اس گھر میں تو رئیس بیگم کی موجودگی کا ایک ہی جواز ہے۔ اس کا تمام عہد و افتخار اس کے کارفروں کے سبب سے ہے۔ وہ ایسی آسانی سے پسپائی قبول نہیں کرے گی۔ اس لیے کہ اسے اس کی عادت نہیں ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اپنے آقاؑ اپنے ولی نعمت کی نظروں میں سرخروئی کے لیے پھر وہ کون سا جیلہ تراشے، کون سا پیٹیز بدلے، وہ انگلیاں نیڑھی کرنا بھی جانتی ہوگی اور فروزاں کا آب گینہ تو اس کی ماں سے زیادہ نازک ہے۔ وہ کہاں تک اپنی سرکاوہ اٹھا سکے گی۔

وقت چپکے سے گزر کر گیا۔ نصیر بابا نے گھر سے باہر جا کے ظفر کے نام ایک اور خط کسی سے لکھوایا۔ انہیں اس کا بھی بہت خیال تھا۔ پہلے کی بات اور تھی، ظفر راجہ پیر جموڑ بیٹھا تھا۔ نصیر بابا نے اس کی آنکھوں میں دوبارہ خواب جگا دیے تھے۔ اب اس کا حال دگر ہو گا۔ نصیر بابا نے تصدیق نہیں کی تھی مگر انہیں یقین تھا کہ فروزاں نے ان کی ہدایت سے بیش و کم ظفر کو کچھ نہیں لکھا ہو گا لیکن جتنا بھی لکھا تھا، ظفر کے لیے یہ ایک مقصود و مطلوب کی تحریر تھی۔ ظفر کے روزوں کے لیے یہ تو پھر اس کے بس میں نہ رہے ہوں گے۔ نصیر بابا کا خط لے کے دوسرے ہی دن ظفر آسمن سول آیا۔ شرے دور ایک غیر آباد مقام کی سنان مسجد میں ان کی ملاقات ہوئی۔ انہیں دیکھ کے ظفر نے سوالوں کی پورش کر دی۔ نصیر بابا اس سے اتنا ہی کہہ سکے کہ وہ ایک آدمی، اُدھورے آدمی ہیں، اپنی بساط کے اعتبار سے معذور بھی۔ جسمانی نقص سے آلودہ ہی معذور نہیں ہوتا غلام بھی معذور ہوتا ہے، بے اختیار بھی معذور سے کم نہیں ہوتا۔ دنیا میں بہت سے آدمی اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے، وہ بھی ان میں سے ایک ہیں۔ نصیر بابا کو اپنی بے ایمانی، بے سروسامانی، جسم و جاں کی ناتوانی کا ایسا احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے ظفر سے کہا کہ وہ جتنی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے، صرف اس قدر کہ اسے ان کی طرح آسمان سے لو لگانی چاہیے۔ وہ آسمان نہیں بھی تو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کیا ظفر بھول گیا، اس نے بھی تو کوئی گوشہ نہیں چھوڑا تھا، قانون، پولیس سفارشیں، دہائیاں۔ اس دن ظفر نصیر بابا

کے پیچھے ہوئے چرے اور کھلائی ہوئی باتوں سے، آسودہ ہو کر نصیر بابا، ایک جی دست اسے دے بھی گئے تھے۔

نصیر بابا خاکے بناتے اور فسانے وضع کرتے۔ ایک دن 'کاش ان کے پاس جادو کی چھڑی آجائے صاحب، رئیس بیگم، ملازم، دربان اور چار دیواری۔ ممکنہ خاقاب کاروں کی بصارت اس چھڑی سے زائل یا پھر ایسا ہو، کسی دن سید صاحب زمینوں کے دورے وقت کے لیے گئے ہوئے ہوں تو خبر بدست نصیر بابا خانے میں داخل ہو جائیں، پھر کوئی بھی ان کے آڑے یا وہ سید صاحب کی شکاری بندوق پر قبضہ کر لیں۔ ہر اثنا وقت چاہیے کہ سید صاحب کے والا مرتبت افسران عالی مقام کی قلم رو سے وہ پرے ہو جائیں۔ کوئی لغزش سرزد نہ ہو، فروزاں اور یاسمن کو کوئی گز سکے، درمیان میں کہیں، کسی جگہ وہ لوٹ ہو کر چھوٹی موتی کے مانند ہیں۔ گھر کی بات اور ہے، یا دوسری ہے۔ نصیر بابا کو اپنے آپ پر شک ہونے سے کوئی ناتوانی تو نہیں ہو رہی؟ انہیں یہ گمان ہوتا صاحب ان سے کچھ محتاط ہو گئے ہیں۔ گھر کے ملا نظر نہیں انہیں کبھی بھی بدلی ہوئی لکھیں۔ انہیں کھنکا لگا رہتا کہ کسی کو ذرا بھی ان پر شک ہو گیا تو نہیں رہے گا۔

یوں ہی دن گزرتے گئے اور نصیر بابا، فروزاں کا سامنا کرتے ہوئے پہلو کترانے لگے۔ بس اب فیصلے کا عزم انہیں توانا رکھتا تھا اور وہ تنہائی میں عزم کی تجدید کرتے رہتے تھے۔ انہیں صرف ڈی یاسمن کے لیے ایک گوشہ دار اماں کا یقین چاہیے تھا۔ فکر انہیں مطلق نہ تھی۔ اس کے بعد سارے ہر سزاؤں کے لیے گریبان چاک کرنے کی بہت اوجھڑائی تھی۔ پھر انہیں موت آجائے یا ان کے تجویز کر دی جائے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایسی موت نہایت اعلیٰ ہوگی۔

اور پھر خدا نے، ان کے بقول "بابا صاحب میں ایک صاحب دل بھیج دیا۔ اس دوران جب مہمان آئے، بڑے بڑے صاحبان ذرا اور صاحب بات کے دھنی، قول و فعل کے یکے نصیر بابا مانوس بھی تھے، ان کا بڑا احترام کرتے تھے مگر زبان کھولنے کی توفیق نصیر بابا کو نہ ہو سکی۔

کو دیکھ کے انہیں ایسا لگا جیسے انہیں بس اسی کا انتظار تھا پھر انہوں نے ذرا بھی نہیں کی۔

بہنو زار کی بیٹی پر بیٹھے ہوئے ہمیں خاص وقت ہو گیا تھا۔ نصیر بابا کا گدا دیے بھی خشک ہونے لگا تھا اور اب کچھ کہنے کو بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے ان کی کمر پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو وہ کہنے لگے۔ میں نے ان کا بازو پکڑ کر انہیں اٹھا دیا۔ میرے جسم میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ بھٹل تو چورس اور غلج کی طرح سوچ بچار میں لگا رہے گا۔ جی کرتا تھا، میں ہی جا کے سید محمود علی کو دیکھوں۔ میں بھی کوئی فیصلہ کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں، میرے یہ ہاتھ پھر کس کام کے ہیں۔ بہنو زار سے اٹھ کے ہم راہ وادی میں آگئے۔ یہاں تیز روشنی تھی۔ بھٹل نہ کرے کے باہر موجود تھا نہ کمرے کے اندر۔ نصیر بابا مجھ سے الگ ہو کے عمارت کے وسطی حصے کی جانب چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں کسی گوشے سے ابن نمودار ہو گیا۔ مجھ سے کمرے میں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ بیٹے میں بڑی کھول کر دیا۔ میرے لیے میں ترشی پر وہ جو کچھ پڑا اور معذرتی انداز میں بولا کہ پہلے بھی وہ وہ مرتبہ آچکا ہے۔

بھٹل نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں دیر سے کھاؤں گا اور جب ضرورت ہوگی، اسے طلب کر لیا جائے گا۔

بھٹل کے بارے میں اختصار پر ابن نے بتایا کہ چند من پہلے وہ کھانے کے کمرے کی طرف گیا ہے۔ سید صاحب کے مہمانوں کو رخصت ہوئے چند ہی من میں ہی ہوئے ہوں گے، اس لیے آج کھانے میں دیر ہو گئی۔ اس گھر میں اب کچھ کھانے پینے کو دل ہی نہیں کرتا تھا، اتنا کچھ جانتے ہوئے جانے کس طرح بھٹل عزم پری کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے تھا مگر آج کی بات تھوڑی ہے، اسے تو پہلے ہی سب کچھ معلوم ہو چکا تھا اور کھانا ترک کر دینے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ جگہ کس کی تھی، یہ سازو سامان، یہ خدمت گار۔ ابن کے ساتھ میں بھی غیر ارادی طور پر کھانے کے کمرے تک چلا آیا لیکن دوازے میں داخل ہوتے ہی میرے قدم ٹھک گئے۔ مجھ سے ابھی شاید اس شخص کا سامنا نہ ہو سکے۔ بھٹل کی طرح مجھ سے یہاں نہیں بیٹھا جائے گا۔ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ واپس چلا جاؤں۔

ابن نے اندر جا کے بتا دیا کہ میں باہر ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس لیے اندر سے سید صاحب کی حلاوت آمیز آواز کو کبھی نہ سنے، جی، آئیے آئیے باہر میاں! باہر کیوں رک گئے۔ مبارک ہو، آج تو مٹھائی کھانے کا دن ہے۔ واہ وا! ماشاء

اللہ۔"

سید صاحب اندر سے اٹھ کے میرے سامنے آگئے۔ انہیں دیکھ کے آنکھوں میں دھند اتر آئی تھی۔ سید صاحب نے میرا بازو تھامنا تو سارا جسم متزلزل ہو گیا۔ چند لمحوں کے لیے دماغ سن ہو گیا تھا۔ اس کشادہ اور مرصع طعام گاہ میں پہلی بار میرا آنا ہوا تھا۔ یہاں مغربی و مشرقی، دونوں طرز کے اختلاعات تھے۔ کمرے کے وسط میں وسیع میز کے اطراف کرسیاں رکھی تھیں اور سامنے کی دیوار کے ساتھ تخت چٹھا تھا۔ چھت کے بیچ میں فانوس لنگ رہا تھا۔ دیواروں پر ابرے ہوئے گل بوٹے کندہ تھے اور ان میں شیشے جڑے تھے۔ فرش پر قالین چسپاں تھا۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ صوفے پوست تھے۔ "کتنے اب کیا حال ہے۔ آج تو شہ زادے بہتر دکھائی دیتے ہیں۔" سید صاحب مسکراتے ہوئے مجھے تخت تک لے آئے "بسم اللہ بیٹے۔ آج واقعی بڑا وقت ہو گیا ہے۔ کیا بتائیں، بیٹے سے ایک برائے واقف کار سرکاری افسر بھی اس طرف آتے ہیں، غریب خانے ضرور تشریف لاتے ہیں، اور جناب اجا تک آہٹکتے ہیں۔ ساتھ میں ان کے دو مین اجاب بھی تھے۔ محفل جم گئی۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے گزارش بھی کی مگر وہ کہیں اور بدعو تھے۔ "انہیں فوراً خیال آیا "ارے وہ آپ کا تو پرہیزی کھانا چل رہا ہو گا۔ آپ نے کھانا کھایا؟"

مجھے جواب دینے میں تامل ہوا۔

"کہاں کھو گئے؟" سید صاحب نے شگفتگی سے مجھے ٹھوک دیا۔

"جی! میں نے سٹپا کے کہا "جی نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"رات کو تو کچھ نہ کچھ ضرور کھانا چاہیے اور بھوک نہ لگنا عالی جناب! ابھی ناشانی نہیں ہے۔ دوا تو چل رہی ہے؟"

میں نے بمشکل اقرار میں سر ہلایا۔

"دلا جی دوا سے پہلے کچھ کھانا کھالینا بہتر ہوتا ہے، میرا خیال ہے، ہمارے ساتھ ہی بیٹھ جائیے۔ یہاں بھی چند ایسی چیزیں ہیں جو آپ اطمینان سے کھا سکتے ہیں۔"

"ہے دوا صاحب! بھٹل نے دخل دیا "بھوک سے کھانے تو ٹھیک ہے۔"

"یہ بھی مناسب ہے۔" سید صاحب نے برملا اس کی تائید کی اور اچھا ہوا کہ ان کی توجہ بھٹل کی جانب ہو گئی "تو پھر آپ نے کیا کیا دیکھا یہاں؟"

"اسنے میں کیا دیکھتے، سارا نام چکر میں رہے۔"
"میرے ساتھ چلے، یہاں ارد گرد کے علاقے، خصوصاً
چائے باسا اور پورولیا شہر میں مسلمانوں کی مدرسوں سے
تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ قبلہ مولوی شفیق اس طرف کہیں
ہوتے تو مجھے ضرور خبر ہوتی اور وہ اسنے قریب رہ کے یہاں
کیوں نہ آتے۔"

"ان کو اتنا ہی نہیں تھا۔ ادھری اسنے دن بند رہ کے
گاتھ پڑنے لگی تھی۔ کھلے میں جا کے تھوڑے ہاتھ پاؤں بھی
کھلے۔ آدمی کو جانور سے زیادہ ہیرائی کی ضرورت پڑتی ہے،
چرنا نہیں تو کیا ہوا، آدمی بھی جنگل کا جانور ہے۔"

"بے شک، سبزہ زندگی ہے۔" سید صاحب چپکتی آواز
میں بولے "اور یہاں کے کیا کئے، یہاں تو زمین سے سبزہ ابلتا
ہے۔ وہ جو کہتے ہیں، زمین سونا اٹکتی ہے، یہاں کی زمین سونا
نہیں، ہیرے موتی اٹکتی ہے۔"

"اپنے کو ادھری منہ مارنے کو چھوٹا موٹا کلکرا مل جائے
گا؟" بھٹل نے دھیرے سے پوچھا۔

سید صاحب اچھل پڑے "کیوں نہیں، چھوٹا موٹا کیا،
آپ اشارہ کیجئے، بلکہ پبل آراوہ تو کیجئے۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ
چھپکتے ہوئے بولے "اور جگہوں کے مقابلے میں یہاں زمین
کی قدر متنگی ہے۔"

"اب مزگستا کیا رکھنا، آپ جو چوٹک میں لوگے۔"
سید صاحب نے قہقہہ لگایا "ہاں ہاں، آپ نے صحیح کہا،
بالکل صحیح کہا۔" پھر وہ سنجیدہ ہو کے بولے "آپ فرمائیں تو
نہوٹ لگاؤں؟"

"میں بول رہے ہیں۔"
"ذرا سوچ لیجئے، بڑا فیصلہ ہے۔ کہاں، کہاں یہ
گاؤں آسں سول۔"

"ادھری آپ جو ہو۔"

"میں، میں کیا ذرہ تو ازی ہے آپ کی۔"
"سارا آپ پر ہے، ادھری پاس رکھنا چاہتے ہو کہ
نہیں۔"

"اس سے بڑی خوشی کی بات میری لیے کیا ہو سکتی ہے۔
میں کل ہی نگاہ دوڑاتا ہوں، کچھ عرصہ گزرا، کسی نے مجھ سے
کہا میں تھا بلکہ یاد آیا، لیجئے، کل رات ہی دعوت میں کلکٹر
صاحب اپنے کسی عزیز کی زمین کا ذکر کر رہے تھے۔"

میں سخت کے پاس صوفے پر بیٹھا ان دونوں کی گفتگو سن
رہا تھا اور میری آنکھیں جل رہی تھیں کہ بھٹل یہ کس قسم
کی باتیں کر رہا ہے۔ وہ تو اس طرح سید صاحب سے شیر و شکر

ہے جیسے کوئی اور بات ہی اس کے دماغ میں نہ ہو۔ جیسے فہم
بابا نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، بھٹل اس سے نا آشنا ہو۔

"آپ کا کیا خیال ہے بار میاں؟" ایک سید صاحب
نے میری جانب پلو بدل لیا "آپ کو یہ علاقہ کیسا لگتا ہے؟"
"جی، جی ہاں، اچھا ہے۔" میں نے ہلکائی آواز میں
"بہت اچھا ہے۔"

"آپ کیا کہتے ہیں؟ لگتا ہے، بابا صاحب نے تو سیر
ڈیرے ڈالنے کی ٹھان لی ہے۔"

میں بھٹل کی تائید کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

"ایک اہم بات تو رہ گئی۔" سید صاحب نے شرائط
سے پوچھا "کم از کم کتنی زمین کی بات کی جائے؟"

"جتنی آپ ٹھیک جانو۔"

"یہ تو کڑ ڈالنے والی بات ہے صاحب! اب بار
ہزاروں تک جاتی ہے، کہیں کہیں تو اس سے زیادہ بہرہ
زیادہ، مجھے ایک اندازہ تو ہونا چاہیے۔"

"اپنے کو پتہ نہیں، آپ جیسا بولو۔"

"اس طرح کیسے؟" سید صاحب کسی قدر بے چینی
بولے "میری تو یہی خواہش ہوگی کہ آپ کی یہاں سب۔۔۔
بڑی زمین ہو، کچھ مرا تو آئے۔"

"پھر آپ بڑی کی بات کرلو، جتنی چاہے بڑی، بعد کو
چھوٹی رہ جاتی گی۔" مضمی بھی شاید بڑی پر جاگئے۔

"نہیں صاحب، یہاں میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا
جو آپ فرما رہے ہیں، وہ تو ہوتا ہی ہے، سب میں دھرا
جائے گا۔ وہ جو کہتے ہیں، جب لاڈ چلے گا، بخارہ گھر یہ زندگی
کوئی خواب ہے؟ یہ کوئی جھوٹ ہے؟ یہ بھی تو ایک چاچہ
اور جب تک ہے، اس کا پورا سوا دیوں نہ لیا جائے، اگر سوا
دستیاب ہو سکتا ہو۔ زندگی میں رس بھی بہت ہے، کسی کو کلا
نہ آئے اور کوئی منہ پھیرے رکھے تو اسے کیا کہیں گے آپ
کیا اس آنے والی زندگی کے لیے سامنے کی اس زندگی
خاک ڈال دی جائے؟ نہیں صاحب، نہیں، یہ بات اپنے
آج تک نہیں پڑی۔"

"پر اپنے نرت بھاد میں تھوڑا دوسروں کا بھی دھیان
رہے۔"

"کیا مطلب؟ معاف کیجئے، میں سمجھا نہیں۔" سید
صاحب کا چہرہ ہمتانے لگا۔

"جائے دو صاحب!۔"

"نہیں نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کیا بولیں۔ دیکھا ہے، اپنی رنگ بازی کبھی دوسروں
با۔۔۔"

ہی اپنی سیدھی چل جاتی ہے۔ کبھی کسی سے سنا تھا، مکھشی
کی طرف بھاگتے بھاگتے چچ میں پڑنے والوں کا دھیان نہیں
رہتا اور جدھر رو کڑے سے پوتا تڑپتا ہے، ادھری کسی کا گلا
مزدور ہوتا ہے۔ دھن کے بنا تو لنگی بھی نہیں ہوتی۔ ایک
کے بعد ایک، ایک سے بڑھ کے ایک۔ آدمی کو پھر کٹ پار کا
پتا نہیں۔"

"آپا۔" سید صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کی
آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ نیاز مندانہ انداز میں بولے
واقعی جس نے کہا ہے، اچھا کہا ہے۔ جہاں تک ناچیز کا
حاملہ ہے، کوشش تو یہی رہتی ہے، اپنے عیش و عشرت میں
کسی دوسرے کا ضرر نہ ہو۔ آپ یہاں دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"اچھی طرح سے دیکھ رہے ہیں۔"

"بس جس کھیل کر گزارا لیتے ہیں، اور ہے بھی کیا، چند
روزہ زندگی ہے جناب! اپنا تو اصول ہے، جو ملے اسے ٹھکراؤ
نیں، جو ملے، اس کی توجہ کرلو، ہاتھ پاؤں چلاؤ، دماغ لڑاؤ،
ہر بھی نہ ملے تو راستہ بدل لو۔ معلوم ہے کوئی یوں آکے تو
بولی میں ڈالنے سے رہا۔"

"ایسے کتنی بار راستہ بدلی کیا ہے؟"

"جی، سید صاحب، لیکن چھپکانے لگے "سچ پوچھتے تو
بھی تک اس کی نوبت نہیں آتی۔"

بھٹل نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، شکر ہے، بات آگے نہیں
بڑی ورنہ سید صاحب کچھ کلک گئے تھے "ہم کیا بات
کر رہے تھے؟" انہوں نے اچھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

بھٹل کے یاد دلانے پر ان کی آواز دک اٹھی "ہاں، میں
کہ رہا تھا جناب! ایسے نہیں، میرے لیے کوئی حد مقرر
کوئی تھیں، مگر میں اس کے اندر یا اس کے آس پاس ہی
صاحب کتاب پچھاؤں۔"

"آپ کے لیے کوئی نہیں، جو حد آپ چاہو۔"

"یہ یہی بات کر رہے ہیں آپ؟ شاید آپ سنجیدہ نہیں
معلوم ہوتے۔"

"مگر بات بولتے تھے آپ! اپنے پاس اس کی کتنا
نہیں ہے۔"

"مشاء اللہ، خدا کا فضل و کرم کہنے سے یہ بات ہوتی تا۔"
سید صاحب کی آواز میں حیرت شامل تھی، ان کی نظریں
بھٹل پر مرکوز ہو گئیں "دیکھیے، میں دیکھتا ہوں۔" وہ
تذہب سے بولے "لیکن اچھا ہوگا، آپ بھی ساتھ ایک نظر
دوڑائیں۔"

"آپ سے اچھی نہیں ہے اپنی۔ دور کی پاس کی، سہی
با۔۔۔"

میں انہیں سے پائیز مٹی بولو۔"

"مگر نفسی تو کوئی آپ سے سکھے۔" سید صاحب
مکھرانے لگے "میرا کہنا تھا، آپ تو بار میاں بھی رو بہ صحت
ہیں، آج کی طرح آپ کل بھی کل سکتے ہیں۔"
"پہلے آپ پتی کرلو، اور آپ کے ہوتے اپنے کو کیا
دیکھنا۔"

"مجھ پر اتنا اعتبار مت کیجئے، میں بھی انسان ہوں۔"

"آپ جیسا ابھی تک نہیں دیکھا۔"

ایک کھلے کے تردد و توقف کے بعد سید صاحب کھل
کھلا پڑے "خدا میری لاج رکھے، آپ مجھے کانٹوں میں
گھسیٹ رہے ہیں۔"

"ابھی تو کانٹوں کی بات ہے، آگے دیکھو صاحب!۔"

شیرینی کے پالے پر یک لخت سید صاحب کا ہاتھ رک
گیا، پھر انہوں نے جلدی سے چپ منہ میں رکھ لیا "تیار ہیں
صاحب، چلے یوں ہی سہی، آپ جان مانگئے۔"

کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ زمین کی بات چھپنے
اور طول دینے میں بھٹل کی کیا مشا ہو سکتی ہے مگر یہ تو ایک
طویل مرحلہ تھا۔

"ایک بات بولیں مہاراج! اپنے کو جلدی ہے، ابھی
آگے بھی جانا ہے۔" بھٹل نے رکھائی سے کہا "یہ سامنے
رکھنا۔"

"آگے جانا ہے مگر ابھی تو آپ۔"

"وہ تو آپ ادھری ہو، جب بولو گے، لوٹ آئیں گے،
ادھری دن ہو گئے، تھوڑا کھار بھی دیکھنا ہے۔"

"مگر ابھی آپ کو جانا نہیں چاہیے۔ آپ بھول گئے۔
ڈاکٹر کشن نے کیا کہا تھا، بار میاں کو پورے ہفتے آرام کرنا
چاہیے۔"

"یہ تو شکرا ہے صاحب۔"

"یہ ایک بڑی بیماری سے اٹھے ہیں۔ ابھی دوا جاری
ہے، تاہم بھانڈا تھا انہیں۔" سید صاحب زور دے کے بولے
"تاہم بھانڈے کے بعد کم از کم ہفتے بھر مکمل آرام ضروری ہے۔"

"نہیں صاحب! میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا۔ کم از
کم چند دن تو اور ٹھہریے۔ پانی آپ کی مرضی، میرا ارادہ تو بار
میاں کی صحت کی بحالی پر چھوٹا موٹا جشن منانے کا تھا۔"

بھٹل نے بحث نہیں کی، کہنے لگا کہ وہ اپنی یہ حسرت بعد
میں بھی پوری کر سکتے ہیں۔ زمین وغیرہ کی کوئی بات ملے پائی تو
ہمیں واپس آنا ہی ہے یہ جشن اس وقت تک کے لیے موخر
کیا جاسکتا ہے۔

کتابیات پبلی کیشنز

"ارے صاحب!" سید صاحب چل کے بولے "کل پہ اتنا اعتبار کون کرے؟ کل کسی نے دیکھی ہے۔ خوشی کے لمحے ارزاں ہوں تو ٹوٹ لیتے چاہئیں۔ زیادہ بڑی نہیں چھوٹی سی محفل رکھیں گے اس بمانے میاں کے بعض خاص لوگوں سے آپ کا تعارف بھی ہو جائے گا۔"

"آپ کے بعد اب کسی سے جان پہچان کیا کرتا۔"

"یہ تو آپ کی نوازش ہے۔" انکساری میں سید صاحب کا جسم سٹ گیا "اصل میں وہ لوگ ابھی شہر میں ہیں۔" وہ رازداری سے بولے۔

"کون صاحب؟" بٹھل نے چونک کے پوچھا۔

"ارے جناب وہی، جو کل رات ہر برٹ اینڈ رو کشر صاحب بہادر کی دعوت میں خاص طور سے بلائے گئے تھے۔ یاد رکھئے جانے والے لوگ ہیں" اپنے فن میں طاق، ہر لحاظ سے یگانہ و یگانہ۔ ساری رات جاوہ جگائے رکھا، رات بھر بجلی چمکتی رہی۔ ابتدا ہی میں مجھے آپ کے صاحب ذوق ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ خود آپ نے بھی فرمایا تھا کہ "سرتال سے دل چسپی ہے، عزت کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ کل رات آپ بہت یاد آئے۔ بس کیا تائیں، کیسی محفل رہی۔ کم کم ایسا دیکھا ہے۔ کشر صاحب بھی دنگ رہ گئے۔ چیدہ چیدہ لوگوں کا اجتماع تھا۔ خوب ہنسا رہا۔ کشر صاحب کو آج دلی جانا تھا۔ میں نے گزارش کی تھی، آج رات غریب خانے کو عزت دی جائے۔ افسوس کا اظہار کرنے لگے کہ دلی میں طلبی ہے، رک نہیں سکتے۔ خاک سارے تو بہت خوش ہیں۔ ایک بار بس شکار کھلایا تھا، اہتمام البتہ خاصا کر لیا تھا، بساط سے کچھ زیادہ۔ جنگل میں منگل کا سماں ہو گیا تھا۔ یہ گورے بھی کمال کے نشاۃ باز ہوتے ہیں۔ ابھی دھماچو کڑی رہی۔ رات کو جنگل میں محفل بھی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، ایسی یاد اللہ ہوئی کہ کیا عرض کروں۔ اس طرف دورہ ہوتا ہے تو ضرور طلب کرتے ہیں۔ پوچھتے رہتے ہیں، کوئی پریشانی تو نہیں ہے، کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ خادم نے اپنا کوئی کام ان سے نہیں کرایا ہے۔ ہاں، ایک بار مجبور ہو گیا۔ ادھر قریب کے علاقے رام گڑھ میں ایک بڑے زمین دا لالہ بشن داس رہتے ہیں۔ حالات آدمی کے ایک جیسے نہیں رہتے۔ قرض لینے کی فوج آگئی۔ پرکھوں کی زمین گروی رکھنا پڑی پھر کسی طرف سے کوئی انتظام ہوا تو قرض خواہ کی نیت میں مل گیا، پھر پھر کرنے لگا، آئیں بائیں شامیں کرتا رہا۔ مقصد وقت گزارنا تھا کہ لالہ کے پاس آنے والی رہائی نہ رہ سکے۔ وقت گزر گیا تو عدالت میں فیصلہ لالہ کے خلاف ہو گیا۔ آپ تو واقف ہی ہوں گے،

ہر جگہ درپردہ الگ کھیل چلتا ہے۔ لالہ بشن داس کو کمر بٹایا کہ گورے کشر سے سید محمود علی کی بڑی صاحب سلاطین ہے۔"

ملازموں نے تخت پر بیچے ہوئے دسترخوان سے کپڑا اٹھانی شروع کر دی تھیں۔ سید صاحب منتشر ہو گئے۔ ناگواری سے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ یہ بجلت اپنا کام نہ کرنا۔ پھر انہوں نے بٹھل سے معذرت کی کہ وہ یہ کیا کر سکتے ہیں ہمیں بے لطفی ہو رہی ہوگی۔ بٹھل نے ان کی توقع کے موافق جواب دیا کہ ان کی تدبیر آمیز باتوں سے کوئی کیسے بے لطف ہو سکتا ہے، وہ سلسلہ کلام جاری رکھیں، اور ہمیں جانا تھا ہے۔ ملازموں نے قافیں اٹھا کے قوے کا طشت تخت پر دیا اور سلیقے سے ہم قیوں کے لیے چھوٹی پیالی قیوں سے بھر دیں۔

"بس جناب!" سید صاحب قوے کے گھونٹ سے تر کر کے بولے "ایک دن کیا دیکھتا ہوں، لالہ غریب خانے موجود ہیں۔ ضرورت بھی آدمی کو کہاں کہاں لے جاتی۔ راجوں مہاراجوں سے تعلق ہے لالہ کا۔ اصطبل، جانور خانہ، بست لائونڈریج میں نے کہا، مجھے بلایا ہوتا، آپ نے؟ زحمت کی، مجھے شرمندہ کیا۔ کہنے لگے، غرض اپنی بھی بجا، مدافع بیان کیا، کام چیدہ تھا، امدادی فیصلہ ہو چکا تھا۔ اور عدالت میں جانے اور وہاں سے کوئی فیصلہ ہونے میں سفید ہو سکتے ہیں۔ میری عجب مشکل تھی۔ لالہ کو انکار بھی ممکن نہ تھا۔ لالہ جیسے ذی حیثیت آدمی کا گھر آنا دست سوال دراز کرنا، آپ سوچئے، کہنے مجھے میں بڑگا، گا۔ ڈر تھا کہ اگر کہیں لالہ صاحب گورے بہادر کے میں نہ آئی؟ مجھ سے بیان کی کوتاہی ہو گئی؟ پھر لالہ کے کیا منہ لے کے جاؤں گا۔ خیر صاحب، کشر صاحب اب وقت بٹھنے میں تھے۔ بٹھنے جا کے ڈرتے ڈرتے خدمت حاضری کا خواستگار ہوا۔ بازاریابی میں دیر نہیں لگی۔ بے کاست مدعا حضور والا کے گوش گزار کر دیا۔ کشر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ منع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے کہا معاملے میں پڑنے سے آپ کی ذات پر کوئی حرف آتا۔ میں واپس چلا جاتا ہوں۔ کہنے لگے، سید، تو پرامن، کوئی نہیں۔ فائل میںیں چھوڑ جاؤ، ہم دیکھتے ہیں۔ میں نے آپ کے یہی بات لالہ سے بیان کر دی۔ ہفتہ بھی پورا نہیں ہو گا کہ ایک روز لالہ گھوڑے پر سوار ڈھول ماشے کے مٹھائی اور ہار پھولوں کے ٹوکروں سے لدے چندے گم ہوئے، گئے سے لگا لیا۔ منہ چوہا، کہنے لگے، سید، اتم نے

کر دیا۔ وہ بد ذات حیوتی رام جوتی آکے کاغذات واپس کر گیا، اور کہہ گیا کہ پیسے جب چاہیں، بھجوا دیں۔ میں نے بھی اسی وقت غنیمتی اور دھکیل کے ساتھ ہر کارے دوڑا کے رقم بھجوا دی اور رسید حاصل کر لی۔ دیکھا آپ نے گورے بہادر کا اقبال، اللہ اللہ۔ گورے بات کم، کام زیادہ کرتے ہیں۔ اور صاحب، کشر سے کرتے ہیں، کشر سے۔ سارے میں اس واقعے سے ناچ کی رسوائی ہو گئی۔ اس کے بعد نہ پوچھیے، میاں کے افراد جو پہلے ہی کم مہربان نہ تھے، ان کی شیدائیت کا حال کیا بیان کروں۔ بس جناب، بھرم رہ گیا۔" سید صاحب نے قوے کی پیالی خالی کر کے بٹھل سے کہا "اتنی سیغ خراشی سے مراد تھی کہ جان پہچان بڑے کام آتی ہے۔ رکھنی پڑتی ہے سلام دعا، غرض اور بے غرضی، دونوں صورتوں میں۔ اس سے زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ شہر میں کہیں بھی اس عاجز کا نام لیجئے، اوس۔" سید صاحب کانوں پر ہاتھ رکھ کے خود کو سرزنش کرنے لگے "بڑے بول سے توبہ، اللہ مجھے معاف کرے۔"

بٹھل سنتا رہا اور قوے کی چسکیاں لیتا رہا "کچھ جان کے ہی ہم بھی داری ہوئے ہیں۔" اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"یہ تو آپ کی محبت ہے جو اتنی عزت دے رہے ہیں۔"

"کوئی کیا دے سکتا ہے یہ تو آدمی خود لیتا ہے۔"

"ہاں جناب! کیا اچھی بات کہی آپ نے، عزت ایسی مرکب پڑی تو نہیں مل جاتی۔"

"اور ذلت کا بھی تمہوڑا لپی چکر ہے۔"

"سید صاحب کا جسم تن سا گیا، زبان میں بھی لکنت آگئی۔ یقیناً سب کچھ، سب کچھ آدمی کے اعمال پر موقوف ہے عزت، ذلت دونوں اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہیں، اور عزت کی کمائی بڑی مشقت جاتی ہے۔ ذلت کے لیے ایک نادانی بہت ہوتی ہے۔ آپ کتنی دل پر لگنے والی باتیں کرتے ہیں۔"

"پہلے ہی نہ ہو۔"

"ہاں ہاں جناب!" سید صاحب سر ملانے لگے "دل کا ہونا ہی لالہ ہے۔ دل ہونے کا مطلب صاحب دل ہونا نہیں ہے لالہ، ہماری آپ کی خوب چھنے گی۔"

"دیکھو صاحب، آپ چھٹانے ہو کہ نہیں۔" بٹھل سرگرایا۔

"تمہا میں، میری طرف سے بے فکر رہے۔ خوب گورے کہہ۔ بس کل سے کام شروع، انشاء اللہ کوئی عجیبے بابی گر۔"

قطعہ ہی ڈھونڈیں گے۔"

دوری پر ہو تو بھی چلے گا۔ دور آنے جانے کا مزہ اور ہوتا ہے۔"

"بالکل، سفر کا اپنا ایک لطف ہے، میری زمین شہر میں ہے ہی سکتی، نہ ہونے کے برابر، بیشتر تو ادھر ادھر بھری پڑی ہے۔"

"کچھ دام درم کی ضرورت بھی تو پڑے گی آپ کو، بولو تو رسی ڈوری کھینچیں۔"

"دام درم کس لیے؟" سید صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

"تمہوڑا سا چارہ ڈالنے، بات بکی کرنے کو۔"

"میاں زبان چلتی ہے، اور کہیں ضرورت پیش آئی تو اتنا تو یہ غلام بھی انتظام کر سکتا ہے، لیکن ایک بات طے سمجھئے، بات بکی کرنے سے پہلے ایک نظر آپ کا دیکھنا ضروری ہے اسی لیے گزارش کر رہا ہوں، ابھی آپ جانے کی جلدی نہ کیجئے۔"

"اپنی زبان کو ہماری زبان سمجھو۔"

"پھر بھی، دیکھیے روپے پیسے کا معاملہ ہے، اپنے اطمینان کے لیے مجھے آپ کی تھدیق کی ضرورت ہوگی۔ ستر ہے، آپ بھی اچھی طرح دیکھ بھال لیں۔"

"ہم نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" سید صاحب زوج ہو کے بولے۔

"خدا! میری عزت رکھے۔ میں کل ہی دکھتا ہوں گم۔ اس محفل کا کیا رہا؟"

"وہ آپ کی مرضی پر ہے۔"

"کل تو ذرا مشکل ہے، ٹرس پر رکھیں؟"

بٹھل نے اقرار کیا، نہ انکار۔

"معاف کیجئے، آپ کی جلدی نے میرے ارادے منتشر کر دیے۔ خیال تھا، باہر میاں چلے پھرے لگیں تو کسی روز شکار پر چلیں۔ مجھے یاد ہے، آپ نے شکار کا شوق ظاہر کیا تھا۔"

"پر صرف جانوروں کا۔"

سید صاحب پہلے تو شٹائے، پھر ہنس کے بولے "جانوروں ہی کی بات کر رہا ہوں۔"

"بھی انسان کا بھی کھلیا؟"

سید صاحب کی پیشانی لکیوں سے بھر گئی "آپ نے کھلیا؟" ان کے لہجے میں واضح طور پر تعجب آگئی۔

"ہاں صاحب، جب بھی موقع لگے، کھلتے ہیں اور ہم ہی

نے کیا کھلیا، جدہری دیکھو، کھلیا جاتا ہے، آدمی، آدمی کے پیچھے ہے سب سے آسان شکار تو انسان کا ہوتا ہے۔ جال بھندے، ہتھیار کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسان تو سارے پالتو ہوتے ہیں، پالتو کا شکار آسان ہوتا ہے۔ برا تو نہیں مانے آپ؟

”نہیں“ نہیں۔“ سید صاحب کے چہرے پر سکون کے آثار ہویدا ہوئے ”آپ سے ملاقات میرے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔“

”ابھی تو شروع ہوئی ہے۔“
”اور“ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔“ سید صاحب کے قہقہے سے طعام گاہ گونج اٹھی ”نشانیہ کیسا ہے آپ کا؟“ مضطربانہ انہوں نے پوچھا۔

”چوک بھی جانا ہے۔“
”اس کا مطلب ہے، کمال کا ہے۔“
”کام چل جاتا ہے، نشانے پر آنے والے سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔“

”ایسا لگتا ہے، آپ وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔“
”پھر کیا ہیں؟“
”کچھ اور۔“

”کچھ اور کیا صاحب؟ بولو۔“
”ارے بھائی ہی، بہت زمانہ دیکھے ہوئے، گرم و سرد آشنا۔“ وہ ہنسیا کرتے ہوئے بولے۔

”اور لگتے کیا ہیں؟“
”لگتے! بہت اچھے لگتے ہیں۔“ سید صاحب کڑائی ہوئی زبان سے بولے ”سیدھے سادے، بھولے بھالے لگتے ہیں، اور کیا کہا جائے، آپ نے جو نواب بات پکڑ لی۔“

دواری گھڑی کے ڈائل کے وسط میں چھوٹا سا دروازہ کھلے پر گٹھاک کی آواز آتی، دروازے سے انگشت بھر چڑیا جھپاک سے برآمد ہوئی اور سرخ رخم کر کے چلنے لگی۔ ٹھیک گیارہ مرتبہ وہ چمکی۔ سید صاحب چوک پڑے اور معذرت کرتے ہوئے تخت سے اٹھ گئے ”وقت خاصا ہو گیا۔“ انہوں نے متانت سے کہا ”آپ بھی آرام کیجئے۔“

ہم دونوں بھی کھڑے ہو گئے۔
دروازے سے باہر نکلتے نکلتے سید صاحب کو خیال آیا ”ارے باہر میاں! جدہ ہونگی جناب! یاد ہی نہیں رہا کہ آپ نے تو ابھی تک کچھ کھایا ہی نہیں۔ کچھ کھائے بغیر نہ سویئے گا، بلکی غذا ضرور لیجئے یا پھل وغیرہ۔“ میں نے سر جھکا لیا۔

نصیر بابا اور ابن دوسرے ملازموں کے ساتھ کمرہ باہر مستعد کھڑے تھے، ہمیں دیکھ کے وہ ایک طرف ہو سید صاحب شب بخیر کہتے ہوئے زنان خانے کی طرف گئے۔ ابن میرے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے بے حد کلام معلوم ہوتا تھا۔ بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی۔ ایسے بھوک لگی بھی کسی کی، دماغ ہی حاضر نہ ہوا جگڑا ہوا ہو تو جسم پابند ہو جاتا ہے۔ کمرے میں آکے میں بستر پر لیٹا، سب کچھ ذہن سے محو کر دینے کی کوشش کرتا رہا لیکن محمود علی کا چہرہ بار بار آنکھوں میں گھومنے لگتا تھا۔ اور کتنی برتنیں ہوتی ہیں۔ کسی دیدہ دلیری سے وہ باتیں کر اور بٹھل بھی کسی ڈھٹائی سے سنتا رہا تھا۔ کبھی کبھی آہوتا تھا، جیسے نصیر بابا کو کوئی بڑی غلطی ہوئی ہے، عمر طرح کے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور سب ایک نہیں ہوتے۔ اگر یا سمن کو میں نے خود نہ دیکھ لیا تو شاید سے یقین آتا۔ طعام گاہ میں کی بار بیٹنے میں غبار اٹھا میں بھی سید سے کچھ کھوں مگر بٹھل کی طرح مجھے اپنی اور لیے پر قابو نہ رہا تا۔ اس کے سامنے تو بیٹھنا ہی ہو رہا تھا۔ بہر حال بٹھل کی کٹ بچتی اور طول کھائی۔ نہیں تھی ”اور کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے سر تدبیریں سائی ہوئی ہیں۔ یہ کوئی ایسا آسان کام تو نہیں ہو رہا تھا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی سے ہم نا معلوم تک بے اختیار ہو سکتے ہیں۔ بٹھل کو بھی اس کا احساس ہو گا۔ مجھے کوئی کام نہیں تھا یا میرا وجود مجھ محدود تھا لیکن بٹھل کی تو بڑی ذمہ داریاں تھیں۔ اسے بہت سے طلب گار تھے۔ ایک زریں ہی نہیں ”اور ہم سے“ ایک میں بھی تو تھا۔

ابن میرے ارد گرد منڈلا رہا تھا اور کسی اشارے تھا۔ نصیر بابا سے سارا ماجرا سن کے اب کسی ملازم کی طبیعت راجب ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بات کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ ابن کو نظروں سے دور کرنے کے لیے تیار کھانوں کی بابت پوچھا اور مرغ کا سادہ شوربہ لا ہدایت کی۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ آگیا۔ ٹھٹ اور بھی چیزیں سمیٹ لایا تھا۔ میں نے اسے جلد ہی کر دیا۔ جیسا کہ مجھے توقع تھی، اس کے جاتے ہی کمرے میں آگئے اور دروازہ بند کر کے بٹھل کے پانتمی بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر بٹھل کی آواز گونجی ”سو رہے ہی ان کو تیار کیا بول دینا۔“ ”کل، کل ہی۔“ نصیر بابا سنائی آواز میں ہو۔

”کل یا پرسوں، بولنا، گھنٹے پاتے، کاغذ نشانیاں ساتھ رکھ زیادہ اتنا رہیں، دو تین جوڑی کپڑے لائیں تو ٹھیک ہیں تو ایسی ہی چل آئیں۔“

”مگر وہ حرافہ جو تانکن کی طرح پھن پھیلائے بیٹھی نصیر بابا کی زبان لڑھک رہی تھی۔“

”دیکھیں گے اس کو بھی۔“
”ایک وی نہیں“ اور بھی سو رکھانے والے پرے پر ”چہ ہے۔“ بٹھل نے تنک کے کہا ”گھوڑا گاڑی میں تو پری نہیں لگے گی؟“

”نہیں، آسانی سے مل جاتی ہے۔“ نصیر بابا بیٹھے ہوئے دنتوں سے بولے۔
”ابن یا نذر کو یا ہر بھیج کر گاڑی بلوالینا، پوچھیں تو ہمارا ل رہا۔ تم کو ادھر رہنا ہے۔“

نصیر بابا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ جلدی جلدی سر اٹے رہے ”اور“ اور بیچ میں بڑے صاحب آگئے تو؟“
”ان کو کون روک سکتا ہے؟ آئے وہ پھر۔“

”خدا آخر کرے۔“ نصیر بابا کی آواز کانپ رہی تھی۔ پولو تو ابھی نکل لیں پھر۔
”نہیں نہیں، یہ مطلب نہیں، جو آپ نے سوچا ہے، ہی ٹھیک ہے۔ پر اپنے ہاتھ پاؤں، دماغ ہی ٹھکانے پر نہیں ہے۔“
”کھوٹے پر باندھ کے رکھو، تم کو دیکھ کے تو وہ آدمی ہوجائیں گی۔“

”ہیں! اللہ ساتھ خیریت کے معاملے نمٹا دے۔ میں تو ماری زندگی شکر کے سے نقل پڑھتا رہوں گا۔“ نصیر بابا بھی لگی آواز میں بولے پھر کچھ توقف کے بعد ہڑک اٹھے ”اور“ اور دو لڑنے پر بھی دور ستم سہرا پڑے ہوئے ہیں۔ ایک کے پاس دو ٹائی ہے، دوسرا لائھی لے بھٹکتا رہتا ہے۔“

”پھر میں نے کوئی منترا بابا!“
”بٹھل دفعہ خیال آتا ہے، میں نے آپ کا رستہ بھی کھو گیا، یہ میاں کس جگہ میں پھنسا ہوا ہے۔ خدا انخواتہ کچھ اور ادرہ۔“

”آپ تو بھندرا ڈال ہی دیا ہے۔“
”مناسب سمجھیں تو کوئی اور وقت رکھ لیں، کچھ دنوں بعد نڈرا اور کچھ بھال کے۔“
بٹھل بھکاری بھر کے ہتھ پینے لگا۔ نصیر بابا بت نے بیٹھے رہے وقفہ وقفے سے بٹھل کے حق کی کڑکڑاہٹ شکرے بازو ہمارے

میں گونجتی یا پھر نصیر بابا کی تیز سانسوں کی آواز، اور کمرے میں سناٹا چھا جاتا۔ گھڑی کی ٹک ٹک تو خاموشی کا جزو بن چکی تھی۔ روشنی کم کر کے نصیر بابا دے پاؤں کمرے سے چلے گئے۔ ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ بٹھل بھی دیر تک حق سے شغل کرتا رہا۔ صبح، وہ حسب معمول جلدی اٹھ گیا تھا۔ نصیر بابا نے اٹھ بیچے کے قریب بتایا کہ سید صاحب باہر جا رہے ہیں، انہیں بٹھل ہی کے کام سے باہر نکلنا ہے۔ آج بھی ناشتہ مین وہ شریک نہیں ہوں گے، دوسرے کے کھانے پر بھی شاید ملاقات نہ ہو سکے ہاں، اگر کوئی پیغام ہو تو صبح دس بجے تک وہ گھری ہو رہیں گے۔

بٹھل نے آنکھیں میچ لیں ”ٹھیک ہے بابا!“
”اور ابھی ایک نئی بات ہوئی۔“ نصیر بابا نے بٹھل کے اور قریب ہو کر سرگوشی کی ”بڑے صاحب بولے تھے کہ میں آپ دونوں پر ذرا نگاہ رکھوں۔ کہاں آتے جاتے ہیں، انہوں نے یہ بھی کہا کہ خاطر تواضع میں کوئی کی نہ کی جائے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ نصیر بابا کا چہرہ جل بچھ رہا تھا۔

بٹھل سن کے چپ رہا، پر اس نے نصیر بابا کو تائید کی کہ جیسے ہی سید صاحب باہر جائیں اسے مطلع کر دیا جائے۔

کچھ دیر میں ڈاکٹر نشن آگیا۔ پورے ہفتے، کل پہلی بار دوا میں توازن نہیں رہا تھا۔ رات کی خوراک کا توازن دھو گیا تھا لیکن طبیعت بہتر تھی۔ نبض دیکھ کے اور سینے پر آکر رکھ کے ڈاکٹر مطمئن ہو گیا۔ آج اس کی ادبیت گراں گزر رہی تھی۔ کل کی طرح بٹھل کے لیے ناشتا کمرے میں آچکا تھا۔ ڈاکٹر کشن نے آج پھلوں کے رس پر قناعت کی اور جلد ہی چلا گیا۔

میری نظرس گھڑی پر پئی ہوئی تھیں۔ ابھی دس بجے دیر نہیں ہوئی تھی کہ نصیر بابا بولائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور باپتی آواز میں بولے ”وہ چلے گئے ہیں اور شام تک آنے کا کہہ گئے ہیں۔“

بٹھل نے انہیں تسلی سے بیٹھ جانے کو کہا اور چائے دانی سے چائے انڈیل کے اپنے لیے چائے پائی۔ نصیر بابا کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ چہرے پر ایک رنگ آتا، اک جاتا تھا ”آج تو بدلی گھری ہے سارے میں۔“ بٹھل نے دھیمی آواز میں کہا۔

”ہاں، لیکن گمرے، گمرے بادل نہیں ہیں۔“ نصیر بابا حواس باختگی سے بولے ”اور کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا، کب چٹک پڑیں۔“
”ادھر ہی دونوں کو بول دیا ہے؟“

”ہاں ہاں، کہہ آیا ہوں، بڑی گھبراہٹ رہی ہیں، بالکل جیل پڑ گئی ہیں۔“

بھٹل نے چائے نوشی اور حقہ کشی میں وقت صرف کر دیا، پھر کہیں گھڑی پر نظر ڈال کر کسی سے اٹھا۔ گیارہ بج چاہتے تھے۔ اتنی دیر میں ان بھی آگیا تھا۔ بھٹل نے اسے آگاہ کیا اور بطور خاص عمارت کے اندر آگاہ کرنے کی ہدایت کی۔

ابن نے فدویانہ انداز میں پوچھا ”باہر جانے کا ارادہ ہے یا آپ؟“

”ہاں رہے۔“ بھٹل نے ناگوار سی سے کہا۔

”دوسرے کا کھانا۔“

”کھائیں گے رہے دوسری لوٹ کے۔“

ابن چند لمحے متذبذب ہوا تھا مگر اس نے مزید کوئی صراحت نہیں چاہی اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے ہی بھٹل نے مجھے مخاطب کیا ”تو بابا کے ساتھ اوپر جا کے دیکھ، خالی مت جانا۔“

اس کا اشارہ میں سمجھ گیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سنسناتی آواز میں کہا ”بھٹل کو مجھ سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ جیسے ہی نصیر بابا کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا، میں نے جلدی سے اپنی کھولی۔ سیدھے پھل کا ٹکڑا والا یہ اصلی رام پوری چاقو کھنڈ میں مجھے شمشاد خان نے دیا تھا۔ دونوں باہر میرے مختصر تھے۔ بھٹل وہیں گھس رہا۔ میں آہستہ قدموں نصیر بابا کے پیچھے پیچھے عقبی راستے کی طرف چل پڑا۔ ہمارا رخ زنان خانے کی طرف تھا۔

☆○

دور ایک عمارت میں مانی پودوں کی تراش خراش کر رہا تھا۔ اس نے نصیر بابا کو سلام کیا، نصیر بابا نے بدحواسی سے ہاتھ اٹھا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور وحشت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھیں میچ کے انہیں مبرو سکون کی تلقین کرنی چاہی۔ ان کا قابو میں رہنا پہلی شرط تھا۔ میں نے اپنی رفتار کچھ کم کی اور نرمی سے انہیں سمجھایا کہ زنان خانے میں داخل ہو کے انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ متذبذب انداز میں سر ہلاتے رہے اور اضطراب سے بولے ”اگر، اگر، رئیس بیگم نے کوئی جت کی؟“

”تو تو پھر کیا ہوگا، مجھے ایسے ہی اندر جانا پڑے گا۔“ میں نے حتیٰ لیے میں کہا۔

”سوچ لو میاں۔“ وہ سراپائی سے بولے ”وہاں کوئی

ایک تو نہیں ہے۔“

”آپ حوصلہ رکھیے، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ ہم نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن خود میری حالت ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اب واپس بھی نہیں ہوا جاسکتا تھا۔ آنے والے لمحوں کے لیے میں خود کو استوار کر رہا۔ نصیر بابا کی نگاہ چاروں طرف بھٹک رہی تھی۔ کبھی وہ بڑبڑا کے پیچھے دیکھ بھی دانتیں بائیں، کبھی اوپر عمارت کے دروازے کی طرف میں نے ان کی کمر بہ ہاتھ رکھ کے چھٹی دی۔ وہ گہری سانس کے رہ گئے اور ہونٹ کاٹتے ہوئے کچھ فاصلہ اور کم کیا۔ زہ کے پاس آ کے ان کے قدم ٹھکنے لگے۔ میں نے زور سے کا ہاتھ تھام کے میڑھیاں طے کرنے کا اشارہ کیا ”آپ کا زیادہ نہیں ہے مگر اس مختصر عرصے میں آپ کو بہت اہم کرنی ہے، آگے سب کچھ آپ پر منحصر ہے۔“ میں سرگوشی میں ان سے کہا۔ ان کی پہلی پہلی آنکھیں مجھ پر نہ گئیں۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زہ نے جڑے ہوئے وہ بالکل گرم صم ہو گئے تھے۔ میں نے بھی دبے قدموں ان کے پیروں کی۔ اوپر دروازہ بند تھا۔ انہوں نے دھڑکتے سے کھٹ کھٹایا۔ میں ان کی آڑ میں ساکت کھڑا رہا۔ دروازہ بند نہیں تھا، تیسری بار دروازہ تیز دھاؤ سے کھل گیا۔ اوپر جا۔ انہوں نے پلٹ کے ایک نظر مجھے دیکھا اور اوپر بھٹل ہوئے دروازے کا ایک پٹ ٹھوڑا سا کھلا ہوا رہ گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ واپس آنے میں انہیں دیر لگ سکتی ہے۔

یہ ایک روشن اور صاف ستھرا زینہ تھا۔ نہ اتنا کشادہ اتنا تنگ۔ دونوں جانب سمارے کے لیے ٹکڑی کی بکیاں ہوئی تھیں۔ میری ہدایت کے مطابق ”اندروں کے نصیر بابا کسی طرح نہیں بیگم کو دروازے تک لانا تھا۔“ مجھے قطعاً نہیں سمجھی کہ جو کچھ میں نے انہیں باور کرایا ہے، وہ اسی سے رہیں بیگم سے کہہ سکیں گے۔ ان کی حالت تو ناہ جا کے اور اتر ہو سکتی ہے۔ زبان کہیں لٹو کر اتر جائے رہیں بیگم کسی بھی لمحے مجھ سے پڑ سکتی ہے نصیر بابا۔ بقول ”وہ اول درجے کی قحطامہ ہے۔ حالانکہ شے کا کوئی نام نہیں ہے شاید یہی بہتر تھا کہ نصیر بابا کے پیچھے میں بھی نا خانے میں داخل ہو جاتا۔ میں نے رہیں بیگم کی شکل دیکھی تھی، ظاہر ہے، وہ خادماؤں سے مختلف طے تھے عورت ہوگی۔ میں اسے فوراً پہچان لیتا مگر ضروری نہ زنان خانے میں پہلے رہیں بیگم ہی سے واسطہ پڑا۔ خادمہ بھی ہو سکتی تھی، خادمہ یا خادماں۔ نصیر بابا کے ایک انجینی مردود لکھ کے ان میں سے کوئی بھی ہو سکتا تھی۔

دی ہوا، جس کا مجھے اندیشہ تھا، ابھی نصیر بابا کو گئے دے چند ٹانے گزرے ہوں گے کہ ترائق سے دروازہ کھلا۔ ان کا زرد چہرہ دکھائی دیا ”میاں، میرا دل بہت گھبرا رہا ہے، آگاہی ہوئی سانسوں سے بولے اور جھٹ دو۔“

”میں اب آ رہا ہوں، پھر تو کچھ بھی نہیں ہوگا، آپ کا کام ہی کیا بات ہوئی، میرے پاس لانا ہے۔ باقی تو مجھے سنبھالنا ہے۔ اے میرے پاس لانا ہے۔ باقی تو مجھے سنبھالنا ہے۔ اے میرے پاس لانا ہے۔ باقی تو مجھے سنبھالنا ہے۔ اے میرے پاس لانا ہے۔ باقی تو مجھے سنبھالنا ہے۔“

”شاید مجھ سے۔۔۔ مجھ سے۔۔۔“ ان کی آواز لرز رہی

”کمال ہے، آپ عجیب آدمی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا جا، وہ دروازے پر نہیں آئے گی، نہ آئے۔ میں نے آپ سے کیا کہا ہے، میں اندر چلا جاؤں گا۔ اب سب کچھ طے ہوا ہے تو آپ۔۔۔ دوسرے بابا انتظار کر رہے ہیں، آگاہی بھی نا ہوگا۔ میاں تک آگے آپ بالکل الٹی بات کر رہے ہیں، ہاں تو اپنی جان، اپنے آپ کو داؤ پر لگا دینے کو۔“ میں نے ٹھٹکی سے کہا ”آپ اور جاتے ہیں یا میں ہی جاؤں۔ ٹھیک ہے، آپ میرے پیچھے پیچھے آجئے۔ اتنا تو کر سکتے ہیں آپ کہ ان دونوں کو لے کے باہر چلے جائیں۔ اندر سب عورتیں ہیں رو کوئی کوئی غلط کام کر رہے ہیں آپ۔“

میری فحشی و تندہی کا اثر ہوا۔ ان کے ڈھکے ہوئے نالے سیدھے ہوئے، آنکھوں میں خاص قسم کی چمک ہوید ا۔ میں نے انہیں مزید تردد و تکبر کا موقع بھی نہیں دیا جلدی کیجئے، اوپر سے کوئی بھی آسکتا ہے۔ نیچے کا دروازہ بھی کھلا ہے جائے، جائے۔“ میں نے انہیں تقریباً دھکیلتے دے کہا۔ وہ پھر کچھ نہیں بولے۔ وہ بیڑھوں کے فاصلے پر بڑھا تھا۔ وہ دوبارہ اوپر چلے گئے اور اس بار انہوں نے پلٹ کے میری جانب نہیں دیکھا۔ انہوں نے دروازہ بھی بند کیا لکڑی میں لگائی ورنہ آواز آتی۔

کی منت گزر گئے، دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ انتظار کا یہ وقت کاٹنا وہ بھر پور تھا تاہم دیر ہو جانے کا مطلب تھا کہ اب کے نصیر بابا ایسے ہی واپس نہیں آئیں گے میں پوری طرح مستعد کھڑا تھا۔ نیچے چلے ہوئے دروازے پر بھی نگاہ نہ رکھی تھی۔ دوسرے کوئی ملازم اوپر آگیا تھا لیکن اس سے نمٹنا ایسا مشکل نہیں تھا۔ یہی اچھا تھا کہ کسی کے اس طرف پھٹنے سے پہلے میں اوپر چلا جاؤں۔ جائے تھوڑا وقت گزرا، دس منٹ یا اس سے زیادہ یا اس سے

”خواب“ کے موضوع پر

اردو زبان میں اپنی نوعیت

کی

منفرد کتاب

خوابوں کے اسرار

قیمت 25 روپے ♦ ڈاک خرچ 23 روپے

خوابوں کی تعبیر، ان کی حقیقت اور ان

کی افادیت کے بارے میں ایک نادر

کتاب!

کتاب کی قیمت 25 روپے ♦ ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت 25 روپے ♦ ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت 25 روپے ♦ ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت 25 روپے ♦ ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت 25 روپے ♦ ڈاک خرچ 23 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

121

120

کتابیات پبلی کیشنز

کب تک ایک اوپر قدموں کی چاپ سے میرا جسم غیر شعوری طور پر اڑ گیا۔ میرے سارے حواس دروازے پر مرکوز تھے وہ نصیر بابا ہی تھے دروازے کا پت کھول کے انہوں نے تنی ہوئی، جکڑی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا "میاں! بیگم شکر یہ ادا کرتی ہیں، کتنی ہیں" اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مہمانوں کی خدمت سے نہیں دلی خوشی ہوتی ہے۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو بہتر ہوگا "سید صاحب واپس آجائیں" شام تک انتظار کر لیں۔

میں نے نصیر بابا کو تاکید کی تھی کہ اندر جاتے ہی وہ رئیس بیگم کو میری آمد کی اطلاع دیں اور کہیں کہ صبح وشام اسنے دونوں تک اس کی اور زنان خانے کی خداماؤں کی مہمان نوازی پر مہنیت کے اظہار کے لیے میں حاضر ہوا ہوں اور اپنی دل بھیجی کے لیے کچھ نذرانے پیش کرنا چاہتا ہوں" انہیں قبول کیا جائے گا تو عزت افزائی ہوگی۔ میرا بار کچھ کم ہوگا۔ میری بنیادی کے دوران مسلسل نگہداشت اور پرہیزی کھاناؤں کے اہتمام میں خداماؤں نے بڑی زحمت اٹھائی ہے۔ کوئی کسی اپنے ہی کے لیے اتنا کر سکتا ہے۔

رئیس بیگم کوئی عام عورت نہیں تھی، کوئی خانہ دار، روایتی عورت۔ اس کے پاس عام عورتوں ایسا اکراہ و انتہاء نہیں ہونا چاہیے تھا، مجلسی قسم کے ادب و آداب اسے بہت آتے ہوں گے۔ امید یہی تھی، یہ پیغام سن کے وہ ضرور تجسس ہوگی۔ ممکن ہے، جواب کے لیے خود دروازے پر آجائے یا اندر مہمانوں کے کسی کمرے میں مجھے بٹھانے کی ہدایت کرے اور خود ہم کلام ہو۔ کوئی بھی صورت ہو، مراد اسی قدر تھی کہ نصیر بابا اسے کسی طور مجھ سے نزدیک لے آئیں یا اس کے پاس مجھے لے جائیں۔ انہوں نے یہ پہلا مرحلہ سر کر لیا تھا۔ دروازے کے پت سے ان کا آہا جسم باہر نکلا ہوا تھا۔ مجھے ان کی استقامت پر حیرت ہوئی۔ رئیس بیگم کو دیکھ کے ان کے سینے کا غبار متلاطم ہوا ہوگا۔ ان کے پُر تکلف لب و لہجے اور دروازے پر تھمتھ کھڑے ہونے کے یہی معنی نکلتے تھے کہ رئیس بیگم ان کے قریب ہی کہیں ہے۔ میں نے ایک بل کی دیر نہیں کی۔ دھر نصیر بابا نے ہاتھ اٹھا کے مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا، وہ فوراً دروازے سے ہٹ گئے۔ جب سے چاقو نکال کے میں نے درمیان کا فاصلہ جست کے انداز میں طے کیا۔ وہ دوسرے لمے میں اندر تھا۔ وہ ساز و سامان سے مرصع ایک چوڑی اور لمبی راہ داری تھی۔ درمیان میں بھی ایسے راستے نکلتے تھے۔ دونوں اطراف منقش محرابوں کے پیچھے کچھ دوری پر کمرے بنے ہوئے تھے۔ جو

عورت نصیر بابا سے گزر بھر کے فاصلے پر کھڑی تھی، وہیں بیگم ہو سکتی تھی، متوازن بدن کی ایک عورت۔ نہ اتنی ایسی نازک اندام، قامت بھی متناسب، عمر چالیس کے بجھک ہو سکتی ہے، اس سے زیادہ ہو۔ رنگت بادامی، گہری چمکیلی آنکھوں میں کاجل کے ڈورے، کشیدہ ہونے اور ترشے ہوئے ہونٹ، کانوں میں جھمکے آویزاں میں موتیوں کا ہار سجا ہوا، طلائی چوڑیوں سے بھری کلائیوں، بالوں میں جوڑا، گول چہرے کے گرد اڑیں، نگار دم ہو گئے تھے سلیقے کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ہنسنے کا سلیقہ ہر کسی کو نہیں آتا۔ گھریں اور خصوصاً اس لباس اور آرائش کا تصور طبعی نفاست اور آسودہ تنی تھا۔ کسی وقت نہایت دلکش ہوگی، لگتا تھا، وہ تو شاید اسی گمان میں ہے۔ اس خوش گمانی کی آئینہ بھی تردید کرتا، آئینے میں ایک خوں سے مرمت بدرجہ اتم ہوتی ہے۔ اچانک مجھے سامنے دیکھ کے وہ بری طرح اٹھل جیسے بھجھو ڈبکا جا جائے آنکھیں پھیل گئیں، کھلے ہو۔ سے گھٹی ہوئی چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے جھپٹ کے اس درمیان فاصلہ عبور کیا اور اس سے پہلے کہ وہ کسی طرے حاصل کرے، اس کے منہ پر پنجہ کس دیا۔ میرے دو ہاتھ میں کھلا چاقو دیکھ کے اس کا بدن پڑ پھرا کر میرے پنجے کی گرفت سخت تھی "جب چاپ کھڑی رہی میں نے بے شکل تمام کہا۔ اپنی آواز مجھ کو گونجی لگی، بڑی میرے ہاتھ پاؤں ہی اٹھ رہے تھے کسی عورت کو قاتل کرنے کا یہ دوسرا اتفاق تھا۔ اس نے شعوری ہی حرا کی۔ چاقو کی نوک اس کی گردن کے پاس تھی۔ اس ڈھلک گیا۔ نصیر بابا کے دیدے بھی میٹھے ہوئے تھے۔ کے رنگ بدل رہے تھے۔ میں نے گھڑی آواز میں انہ "تزوید کا کوئی کمر کھول دو اور ان سب کو وہیں بچاؤ ایک کو۔"

نصیر بابا ہڑبڑا کے ایک طرف دوڑ پڑے، پہلے اوپر منزل لائے پھر انہوں نے دائیں جانب کی محرابوں کے قریب کا ایک کمر کھول دیا۔ نیم جاں رہیں بیگم کا سینہ دھک دھک کر رہا تھا نے اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کی اور دبے لمبے میں کہا "وہاں سے سنو! تم سے مجھے کوئی غرض نہیں، جو ہو" اس پر عمل کرتی رہو تو اپنے حق میں بہتر کرو تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچے گی۔ زنان خانے میں موجود خداماؤں کو تمہیں چپ چاپ کمرے میں بیٹھے رہنے

کہہ کر کہو، مجھے میاں ڈاکا نہیں ڈالنا، نہ کسی کو ختم کرنے ارادہ ہے۔ میرا کام کچھ اور ہے، اور مجھے زیادہ دیر نہیں

میں نے اس کے نرم ہونٹوں اور گالوں سے ہاتھ لایا۔ اس کی آنکھیں لوٹی جا رہی تھیں۔ بدن پر رعبہ سا اسی تھا، ایسی ناکامی سے اسے کہاں واسطہ پڑا ہوگا۔ جانے میں دوبارہ اس کا بدن چھونے سے مجھے بھجک ہو رہی تھی کمر ن وچیں کا محل نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ کو ترک کیے رہنا نہ اپنی بند و پائند، مرضی و فضا سے بیگانہ۔ ناچار اس کی نہ پڑنے کے میں اسے نصیر بابا کے کھولے ہوئے کمرے کی اب لے آیا۔ اس نے ذرا بھی تامل نہیں کیا، کسی معمول

ن طرح قیل کی۔ میں نے اس کا بازو آڑا کر دیا۔ اوپر طول و عرض کے اس آراستہ و پیراستہ کمرے میں فون طرح کی نشست تھی۔ فرشی بھی، کرسیوں کی بھی۔ اپنے دیوار سے پیوست تخت پر قالین اور گاڑتیکے، دونوں طرف کی دیواروں کے ساتھ رکھی ہوئی قیمتی کرسیوں کے بیچ میں چینی کے بڑے گلدان، کھڑکیوں پر پھول دار ریشمی رے تخت سے اوپر اور کھڑکیوں کے درمیان خوش نما مناظر کی روئی تصویریں۔ پھت سے جھولتے ہوئے فانوس سے لٹے جلتے شمع دان، جگہ جگہ دیواروں سے جڑے ہوئے ریشم کے وسط میں بھی قالین بچھا ہوا تھا۔ راہداری سے کھلنے آئے دروازے سے ملحق دیواروں پر لکڑی کے بڑے جالی اور چھکوں میں نصب آئینے آویزاں تھے چھت کے کنارے کنارے کندہ کیے ہوئے گل بوٹوں کی پٹی کمرے کی جلد و چند کرتی تھی۔ اچھا خاصہ روشن کمرہ تھا۔ چھوٹی دلی مغللوں کے لیے موزوں تر۔ نصیر بابا نے سوچ سمجھ کے اس کا انتخاب کیا ہوگا۔ تخت کے برابر بھی ایک دروازہ تھا۔ میرا بابا واپس جایا چاہتے تھے یہ دروازہ اندر سے بند کروا کے ان میں نے انہیں واپسی کی اجازت دی۔ ان کے جاتے ہی پھر میں بیگم کو تخت تک لے آیا مگر یہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ دروازے سے سامنے کا تخت صاف نظر آتا تھا۔ آنے والا رئیس بیگم کو اس ناگفتہ بہ صورت حال سے دو چار دیکھ کر دروازے ہی سے لوٹ سکتا تھا۔ دوبارہ مجھے دروازے کے پاس آنا پڑا۔ رئیس بیگم کو سامنے کر کے اس کی آڑ میں کمرے کے دروازے میں قیاس تھا۔ یوں آنے والی خداماؤں کو کوئی بھی اشارہ کرنے کا موقع اسے مل سکتا تھا۔ اس کے پہلو پر کمرے کے دروازے کے پت سے اسے نظر آتا تھا۔ اس اثنا میں وہ کسی قدر مبہل بھی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ آنے والی

خداماؤں کو وہ اتنی خست و شکستہ حالت میں نظر نہ آئے۔ راہداری میں لپکتے جھپکے قدموں کی آہٹ پر میں سیدھا ہو گیا۔ دھنٹا تیزی سے دو خداماؤں اندر آئیں۔ ان کی نظر پہلے رئیس بیگم پر پڑی، پھر مجھ پر اور پھر میرے ہاتھ میں کھلے چاقو پر۔ ان پر جیسے بجلی گری۔ سسکاری بھر کے انہوں نے پلٹ جانا چاہا۔ دروازے پر نصیر بابا دیوار بنے ہوئے تھے "خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جاؤ۔" میں نے بظاہر مگر جتنی آواز میں کہا "کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو۔" میں نے چاقو بلند کیا اور رئیس بیگم کی گردن کو نشانہ بنانے کا تاثر دیا۔ کمر پر میرے ٹوکے سے رئیس بیگم کا سر اپنا زبرد ہو گیا۔ وہ بھائی انداز میں بولی "ہاں ہاں، جیسا کہتے ہیں" دیباہی کر دیا ہی کرو۔"

دونوں لڑکیاں حواس باختگی سے میرے پاس آگئیں۔ میں نے انہیں دروازے کے دوسری جانب اپنے عین مقابل بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ وہ ایک دوسرے سے چٹکی کھٹی ہوئی، اپنے آگے چہرے دوپٹوں سے چھائے کرسیوں کے پاس ایک کونے میں دبک گئیں۔ دونوں بیس آئیں کے لگ بھگ ہوں گی۔ نقش و نگار کھل، ایک کارنگ کھلتا ہوا چیمچی، دوسری کا سرمئی سرمئی تھا۔ دونوں عینکھی اور چھریزی تھیں اور چوڑی دار پاچائے کمرے اور دوپٹوں میں خاصی جاذب نظر لڑکیاں تھیں۔ ایک کا دھنٹا ہوا تھا، دوسری کا کچھ دبا ہوا۔

تھوڑی دیر میں تین اور خداماؤں نصیر بابا کمرے کے زندان کی طرف ہٹا کے لے آئے پھر تین اور "دور" اور ایک اور۔ نصیر بابا انہیں رئیس بیگم کے بارے میں کوئی ایسی وحشت اثر اطلاع پہنچاتے ہوں گے کہ وہ بولانی ہوئی تیز رفتاری سے کمرے میں داخل ہوتیں، اپنی جھوٹ میں کئی قدم اندر آنے کے بعد ایک ایک سامنے کا منظر ان کی بینائی خرو کرنا، وہ لکڑا تھیں، ان کی چیمچیں بلند ہوتیں اور ایک دم ٹھہر جاتیں۔ اس ناقابل تصور واقعے سے گریز کے لیے ان کے قدم ہلکتے۔ دروازے پر نصیر بابا کی موجودگی انہیں اور بے حواس کرتی۔ دھر میں، میرا چاقو اور رئیس بیگم ان کے پیروں کی زنجیر بن جاتی۔ وہ محلوں میں ڈھیر ہو جاتیں۔ مجھے دوسری بار ان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔ رئیس بیگم نے میری مشکل آسان کر دی۔ ان کے داخل ہوتے ہی رئیس بیگم پہلے دو خداماؤں کی طرح انہیں بے حس و حرکت اس گوشے میں بیٹھے رہنے کی تاکید کرتی رہی جو میں نے تجویز کیا تھا۔ اس تاکید میں کرب بھی شامل تھا، یہ اتنا آہستہ بھی

تھی۔

نصیر بابا نہ ہوتے تو میرا کام یقیناً دشوار ہو جاتا مگر ناممکن نہیں تھا۔ کمرے میں آکے بھاگنے کے لیے ایک جرات مطلوب تھی، جرات اور ہوش مندی دونوں۔ نصیر بابا دروازے پر نصیل بن کے ایستادہ نہ ہوتے تو ان خادماؤں کو دوسری طرح مجھے قابو میں کرنا پڑتا۔ دروازے سے میں بے حد قریب تھا۔ وہ ساری عورتیں تھیں اور ان میں بیشتر نوجوان اور ناپختہ کار لڑکیاں۔ وہ چھوٹی موٹی تو ایک دھمکی زرا سی اونچی آواز ڈرا سی دست دراز کی تاب نہ لاتیں۔ رہیں بیگم، ان کی دلی نعت میرے حصار میں تھی، چاقو سے بڑا ہتھیار۔ رہیں بیگم پر ذرا سا دباؤ بھاسا کہ انہیں پابند کیا جاسکتا تھا۔ بہر حال وہ نوکر تھیں۔ نوکر کو ویسے ہی اطاعت واجب ہے، یہ غولی نہ ہو تو کوئی نوکر ہی کیوں ہو۔ چیخو پکار کے سوا ان کی طرف سے کوئی اور خدشہ نہیں تھا۔ چیخے نصیر بابا دیوانے ہو جاتے۔ انہیں جلد از جلد زنان خانے کے مختلف حصوں سے ساری خادماؤں کو ترتیب دے کر اس کمرے میں جمع کرنا تھا اور باری باری، کلیدیوں ہی کی شکل میں اس مہر آزمائش کے انجام دی ممکن تھی۔ اول پھر تھا، ہر کوئی اپنے روزانہ کے معمولات میں مصروف ہوگی۔ کسی ایک جگہ ان کے اکٹھے ہونے کا امکان نہیں تھا۔ آخر میں ایک بوڑھی عورت کو پچانے کے بعد نصیر بابا نے سر کی جنبش سے مجھے مطمئن کیا کہ اب زنان خانے میں کوئی اور باقی نہیں رہ گیا۔ باہر نکل کے انہوں نے احتیاطاً دروازہ بھی بند کر دیا۔

ان کی تعداد گیارہ تھی۔ گھر میں ایک مرد، سید صاحب، تین خواتین، فرداؤں، یا سمن اور رہیں بیگم کی خدمت گزار کی کے لیے یہ تعداد حیران کن تھی اور ضروری نہیں تھا کہ ان کی یہی تقری ہو۔ عمارت کے عقبی سبزوار کے ایک حصے میں ملازموں کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ وہ سکتا تھا، ابھی کچھ اور اپنے گھروں میں موجود ہوں۔ کام کے اوقات بھی تو مقرر ہوں گے۔ اطاعت گزاروں کی کثرت سے مراد اظہار امارت ہے۔ اظہار کے بغیر امارت بے لطف رہتی ہے۔ جتنے زیادہ خدمت گار، اتنا بڑا آقا، اتنا بڑا بادشاہ۔ بڑے گھر میں سب سے سستے ملازم ہوتے ہیں۔ بڑے گھر کا ساؤ سامان زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور سید صاحب کے گھر میں خدمتوں کی گنتی تھی ہی کم ہو، مہمان خانہ تو ہر وقت آباد رہتا تھا۔ ملازموں کی وہاں بھی ضرورت پڑتی تھی۔ مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کے لیے کھانا زنان خانے میں تیار ہوتا تھا۔ سید صاحب کو بزم آرائی کا بھی برا شوق تھا۔

کمرے میں موجود خادماؤں میں ایک سن رسیدہ عورتوں، گیارہ بارہ سال کی ایک بچی کے سوا باقی نوجوان لڑکیاں تھیں، آگے پیچھے کی عمروں کی۔ قاعدے قریب کا سا دوش و شوخ لباس پہنے ہوئے تھیں تخت کرتے وقت گلتا تھا، شکل و صورت کی دلربائی نگار کی رعنائی اور قالب و قامت کی زیبائی کا خاصہ گیا ہے۔ خوش خرامی و خوش کلامی پر بھی توجہ دی گئی رہیں بیگم ان کی عمر ان تھی، معلوم بھی ہوگی۔ اسے آداب آتے تھے، ہر طرح کے آداب۔ ان سب کے تر و تازگی و شادابی تھی۔ سب نئی نئی معلوم ہوتی تھیں تازہ۔ رشیم، شیشہ، پھول، زرد نگار، دیوہام اور آرزو، زیبائش کی دگر چڑوں کی طرح خوش جمال لیکن یہ زیب و زینت اور فنون کرتے ہیں۔ وہ کسی حسن تراش کے تراشیدہ مجسموں کی طرح تھیں، چلنے پھرنے ان میں سے دو تین خادماؤں میں نے مہمان خانے میں تھیں۔

کمرے پر سناٹا چھا گیا تھا۔ نصیر بابا کو گئے ہوئے کمرے ہوں گے کہ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کھسکا کے آگے کی اور رہیں بیگم سے بیٹھ جانے کہا۔ اس نے پھرتے ہوئے ہونٹوں اور ڈبڈبائی آنکھ مجھے دیکھا، چند لمحوں وقف کیا، میری پیشکش کی تقدیر شاید پھر وہ جھجکتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جیسے کوئی سے دھوپ میں ہانپتا کپڑا چل کے آیا ہو اور اسے جانے، کچھ بھی حال اس کا ہوا۔ اس نے ساری کے ڈھک لیا اور اپنے مقابل میں بھی خادماؤں کی طرح ڈھانپ لیا۔ میں بھی کرسی سنبھال سکتا تھا۔ میرے سب کی سب بے بسی و بے جا رگی کی حالت سے دوچار تھیں۔ عورت اور مرد کی مٹی میں ضرور کوئی فرق ہو عورتیں کسی اور مٹی کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ محض مرد فرومردہ اور چوں کہ ایک طرف ہے اس لیے مستند نہیں۔ طے نہیں ہوا کہ جسانی طور پر عاجز عورتیں ذہنی طور پر لاغر ہوتی ہیں۔ مجھے محتاط ہی رہنا چاہیے تھا۔ ان باران دیدہ رہیں بیگم بھی تھیں۔ میں نے پہلے ہی کہ رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ بھاری گل داں سو کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کے اشتعال کے کام کر سکتے۔ میرا چاقو کو اب نہیں بیگم سے دور تھا مگر ہل دانوں کے مساوی ہوتا ہے، اس کی اپنی ایک کرش ہے ان کی ماکن تو میرے ہتھیار کی دگر چڑ تھی۔

نصیر بابا نے بتایا تھا، گزشتہ رات انہوں نے فرداؤں اور یا سمن کو آج کے لیے تیار رہنے کی نوید دے دی تھی۔ ساری رات دونوں ہنسونے بے کلی میں گزار دی ہوگی۔ نیند بھی کیا آئی ہوگی۔ خادماؤں کی موجودگی میں، معلوم نہیں، وہ ضروری نہیں ہوئے، پور اور دگر چڑیں کس قدر سمیٹ پالی ہوں۔ اس کا منہ تو یا سمن اب ملا ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ وہ چند ہی چیزوں کا منہ کر لیں۔ نصیر بابا انہیں زیادہ مہلت بھی نہیں دیں گے۔ پھر خاک ڈالیں۔ اتنا بہت ہے کہ بے سلامت یہاں سے بات پانے کی کوئی سبیل نکل آتی ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ناگہرا رہیں بیگم کے پاس پہنچتے اور اسے میرے قریب لانے سے پہلے نصیر بابا، فرداؤں اور یا سمن کے پاس ہو کر آئے تھے یا نہیں۔ رہیں بیگم کو میری تحویل میں دینے کے بعد دو خادماؤں کو یہاں لانے کے لیے کی بار عمارت کے اندرونی حصے میں گئے تھے۔ اس دوران میں انہوں نے فرداؤں اور یا سمن کو آگاہ کر دیا ہے تو اب تک دونوں کو اپنا مختصر سامان لٹکا کر کے تیار ہو جانا چاہیے۔ نصیر بابا نے اگر اس سارے نام سے فراغت کے بعد ان سے رابطہ کیا ہے تو جوری نادانی کی ہے مجھے بھی اپنی کشائش میں خیال نہیں رہا کہ ان سے کہہ سکتا، جس وقت وہ چلی منزل پر جانے کے لیے کمر بستہ ہوں، مجھے بھی مطلع کرتے جا میں تاکہ میں کچھ دیر بعد اسیر خادماؤں کو آزاد کر سکوں۔ اسیر صرف وہی نہیں، میں ان سے کہیں زیادہ بے غداں بھگت رہا ہوں۔ کاش نصیر بابا کو زنان خانے سے رخصت ہوتے وقت میری طرف آنے اور مجھے اس اذیت سے نجات دلانے کا خیال آجائے وہ سیدھے چلے گئے تو مجھے پھر کتنی دیر یہاں ٹھہرے رہنا ہوگا۔ مزید چند رہ منٹ یا آدھا گھنٹا۔ اس سے زیادہ وقت فرداؤں اور یا سمن کو نیچے لے جانے میں نصیر بابا کو صرف نہیں کرنا چاہیے۔ چلی منزل پر چل ان کا خنجر ہوگا۔ آنا گئی آجکا ہوگا۔ ابن کستا تھا، آگاہ قریب ہی مل جاتا ہے۔ مجھے پھر زیادہ دیر یہاں نہیں رکھنا چاہیے۔ اس دوران کو بھی کوئی زنان خانے کا رخ کر سکتا ہے۔ فرداؤں اور یا سمن کو لے جانے کے بعد نصیر بابا زنان خانے کا خاص دروازہ کھلا ہی رہے ہیں گے۔ دوسری جانب، عقبی ہنوزار کے جس راستے سے میں اور نصیر بابا یہاں داخل ہوئے تھے وہ بھی کھلا ہوا ہے۔

مگر میرا کیا ہے! میں تو آنے والے یا آنے والوں سے مجھے تیسے نمٹ لوں گا، میرا وہ کیا کر لیں گے۔ سارا معاملہ تو فرداؤں اور یا سمن کا ہے۔ وہ کسی طور اس چار دیواری سے باہر ہوجائیں۔ رہیں بیگم اور ان حیران و پریشان خادماؤں کو

پابند کرنے کا مرحلہ اتنا دشوار نہیں ہے جتنا چلی منزل پر اتنے لوگوں کے درمیان سے فرداؤں اور یا سمن کو بے غایت باہر نکال لے جانے کا ہے۔ سید صاحب کی عدم موجودگی میں، بھٹل اور نصیر بابا کی معیت میں زنان خانے سے دو عورتیں آگے میں باہر جارہی ہیں، کہاں جارہی ہیں؟ آگے میں فرداؤں اور یا سمن کے ساتھ صرف نصیر بابا ہوتے تو یہ واقعہ اتنا تجسس انگیز نہ ہوتا۔ ظاہر ہے، زنان خانے کی خواتین بھی نہ بھی باہر بھی جاتی ہوں گی اور ان کے ساتھ کوئی مرد ملازم بھی ضرور ہوتا ہوگا۔ فرداؤں اور یا سمن کے ساتھ گھر کے سب سے پرانے نمک خوار، وفا شعار، سید صاحب کے معتد خاص نصیر بابا ہیں۔ بے شک مختصر سامان بھی ان کے پہلو میں ہے لیکن یہ سامان یقیناً اتنا کثیر نہیں ہوگا کہ کسی قسم کا تنگ نہ ہوا سکے۔ ہاں، آگے میں بھٹل کی ہر اسی ملازمین کے لیے کنگش اور ترد کا باعث ہو سکتی ہے۔ نصیر بابا کے گداز کے لیے بھٹل کی رفاقت بھی ضروری ہے۔ دور کسی محفوظ مقام پر پہنچتے تک نصیر بابا کو بھٹل کی سیر، اس کی دیوار چاہیے۔ فرداؤں اور یا سمن برقع میں روپوش ہوں گی۔ ملازم انہیں پہچان تو نہیں پائیں گے مگر حیوانوں اور انسانوں کی فوج کا کوئی ایک سبب تو نہیں ہے۔ وہم و گمان آدمی کا طرہ امتیاز ہے۔ کسی کے بھی دماغ میں کتنا کچھ سکتا ہے۔ کانٹے تو یوں بھی خود ہو جاتے ہیں۔

عمارت کے بڑے دروازے پر دو دربان تعینات ہیں، ان میں ایک مسلح بھی ہے۔ ابن، نذر، بشارت اور کئی دیگر ملازم چلی منزل میں منزل لاتے رہتے ہیں۔ ملازم نہیں کہ بھٹل کو کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے، کوئی بھی عین وقت پر رخسار انداز ہو سکتا ہے۔ بھٹل کو ان مزاحمتوں اور بد افیتوں کا بھی طرح احساس ہوگا اور اس نے تمام عواقب و نتائج، ہر پہلو پر خوب سوچ سمجھ ہی کے لیے عزم کیا ہوگا۔ گھر کے سارے ملازم سات آٹھ دنوں میں بھٹل سے خاصے مانوس ہو چکے ہیں۔ برا لگتے ہیں، پہلے ایسا کوئی صاحب دل مہمان یہاں نہیں آیا ہے۔ بھٹل کے در پر وہ ان کا خیال بھی بہت رکھا ہے۔ ہر ایک کو اس کی خدمت سے بڑھ کے نوازا ہے۔ بھٹل پر انگلی اٹھاتے ہوئے، ان کے رگ و پے میں بڑی ایٹھن ہوگی۔ موت سے بڑی زنجیر نہیں ہوتی۔ سب ہی بھٹل کا ورد کرتے ہیں۔ اس کے سامنے سر اٹھانے اور زبان کھولنے کی جرات مشکل سے ہوتی چاہیے لیکن یہ حقیقت بھی بھٹل کے ذہن سے اوچھل نہ ہوگی، اس نے انہیں اتنا نمک نہیں کھلایا ہے، جتنے وہ سید صاحب کے نمک آتشا ہیں۔ اگر واقعی کسی کا دماغ پھر گیا تو

مجبوراً بھل کو دوسرا طریقہ یا اپنا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ نوبت نہ آئے تو اچھا ہے ورنہ بات بہت بگڑ جائے گی اور دور بھی چل جائے گی۔

میرا دل پراگندہ ہو رہا تھا۔ طرح طرح کے دوسے سر میں بھن بھنا رہے تھے۔ شک کرنے کا کوئی ایسا جواز تو نہیں ہے۔ تاہم میں دو خواتین اور نصیر بابا کے ساتھ بھٹل کی ہم نشینی کے کوئی بھی معنی لیے جاسکتے ہیں۔ سنا ہے، دل اور آنکھوں کا گہرا تعلق ہے، دل صاف نہ ہو تو بینائی بھی آلودہ ہو جاتی ہے۔ بھٹل کے لیے ان کے دل میں یوں کوئی آلودگی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اثر بھی قائم کیا جاسکتا ہے کہ جس طرف نصیر بابا اور دونوں خواتین کا قصد ہے، اتفاق سے وہی راستہ بھٹل کو بھی مقصود ہے۔ میں بھی تو بھٹل کے ہم راہ نہیں ہوں۔ ان کی دانست میں مجھے اس وقت ممانا خانے میں واقع اپنے کمرے میں ہونا چاہیے۔ ہمارا سامان بھی یہیں رکھا ہوا ہے۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی گھر میں موجودگی دوسرے کی ادائیگی کی ضمانت ہے۔

رئیس بیگم اور اس کی حاشیہ بردار خادامین مسلسل میری نگاہوں کی گرفت میں تھیں لیکن آدمی کی صرف دو آنکھیں نہیں ہوتیں۔ زنان خانے کے اس کمرے میں میرا وجود ایک سراب کی مانند تھا۔ میں تو چلی منزل پر بھٹک رہا تھا۔ میں تو جانے کہاں کہاں بھٹکا ہوا تھا۔ نیکاب اس خیال نے مجھے اور متلاطم کیا کہ آنا کا مطلب کرنے کا حکم تو بھٹل نے دیا تھا۔ اس نے ابن کو خاص طور سے عمارت کے اندر آنا کا ٹھہرانے کی ہدایت کی تھی۔ ابن نے ذہنیانہ انداز میں اختصار کیا تھا کہ کیا دوسرے کھانے کے وقت تک بھٹل کی واپسی ممکن ہو جائے گی۔ بھٹل نے سرسری سہی مگر جواب اقرار میں دیا تھا۔ بھٹل کے اچھے لہجے سے ابن کسی قدر متذبذب ہوا تھا اور ایک ایسے اطاعت شعار کا جو تیرہ ہوتا ہے، اس نے خاموشی کو ترجیح دی تھی۔ گویا زنان خانے سے دو خواتین کے باہر جانے کے معاملے میں کسی نہ کسی طرح بھٹل کی مشا شامل ہے۔ آج تک زنان خانے سے بھٹل کے کسی ربط ضبط کا کوئی شائبہ نہیں تھا پھر چاکر یہ یہ رسم درہا کس طرح صورت پذیر ہوئی؟ اب جو کچھ بھی ہو۔ میں نے خود کو جمع رکھنے کی کوشش کی۔ جب سامنے کا صاف نظریہ آتا ہو تو آدمی کو پکلیں پہنچا لیتا چاہیے۔

نصیر بابا کو گئے ہوئے دس منٹ کے قریب ہو چکے ہوں گے۔ مجھے کچھ دیر اور یہاں ٹھہرے رہنا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہو۔ میری جانب سے تو شاید کوئی کوتاہی نہیں ہوگی

ہے۔ رئیس بیگم سر جھکائے گنگ بیٹھی تھی۔ سامنے ایک دوسرے میں پوست خادماؤں کی سراسیکی کا وہی عالم قدر کسی کی نظریں بھی مجھ سے چار ہو جاتیں تو اس کا سر اٹھ کر طرح کر جاتا وہ اپنے آپ میں اور سٹ جاتی۔ اب انہی بڑی حد تک اس جبروت نش کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ فردزاں اور یاسمن کی تخصیص سے انہیں گنگ جانا چاہیے۔ فردزاں اور یاسمن کہیں چھپت تو نہیں گئی ہوں گی۔ نصیر بابا کو انہیں برا لانا ہوتا تو اتنی دیر نہ لگتی، کسی کب کی وہ یہاں آچکی ہوتیں۔ وہ گزرنے کے ساتھ رئیس بیگم اور خادماؤں کا یہ شہر پختہ ہو گا کہ ان کی اسیری کا سلسلہ فردزاں اور یاسمن سے وار ہے۔ ممکن ہے، فردزاں اور یاسمن کا فرار ان کے تصور بعید ہو۔ اس کے بجائے کچھ اور خدشہ در آئے ہوں۔ مذموم و مکروہ اندیشہ آدمی کا دماغ بہت بے شمار ہوتا۔ اور ایسی صورت میں تو اور بھی بے سمت، بے کنارہ، آئے وھند بھی ہو تو ہوشی بچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں۔ ان کے علم ہے کہ زنان خانے میں ایک اور ممانا خانہ، میرا سامی اور بھٹل بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کی نظریں اسے سرخسہ کی نظر حاصل ہوگی۔ ہو سکتا ہے، ہر طرف سے آسودہ ہو کے بعد وہ بھی نصیر بابا کی افغانیت سے زنان خانے میں داخل ہو جائے اور۔ اندھیرے میں یہی کچھ ہوتا ہے، اختیار چھن جاتا۔ اندھیرے میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ بہر حال کچھ اور بات ہے۔ کچھ دیر میں ان کی یہ وھند چھٹ جائے گی انہیں اپنے ذہنی فشار، اعصابی ابتری سے نجات ملے گی۔

زنان خانے سے میرے جانے کے بعد ان پر سکوت طاری نہیں رہے گا۔ وہ بھٹتی اور بلبلائی ہوئی سے پہلے فردزاں اور یاسمن کی غلط گاہ پر پوش کر اور عمارت کے گوشے گوشے میں پھیل جائیں گی۔ گوشہ منزل کی طرف دوڑے گی اور ملازموں کو اس سامنے دے گی اور ملازم جب فردزاں اور یاسمن کی روانگی کا گوش گزار کریں گے تو سارے میں کھلبلی مچ جائے گی ایک جانب نصیر بابا کے آنگنے کے چھپے، دوسری جانب صاحب کی تلاش میں ہر کارے دوڑائیں گی پھر یہی مناسب ہے، رانائی شاید اسی میں ہے کہ میں نادریہ رہوں اور انہیں اپنی نظروں کے حصار میں محسوس اس طرح بھٹل اور نصیر بابا کو زیادہ سے زیادہ فاصلہ کا موقع مل جائے گا۔ ہر چند یہاں زیادہ دیر ٹھہرے کسی دخل اندازی کے امکانات اور بڑھ جاتے ہیں۔

بھٹل اور نصیر بابا کے نکل جانے کے بعد پھر کتنی بڑی کا فضا ظاہر جمع رکھنے کے لیے اس دوران میں یوں ہی کسی معمول کے مطابق زنان خانے کا دروازہ کھٹ کھٹا ہے۔ دروازہ کھلا ہے اور کوئی آواز چکار بھی نہیں ہے۔ کمرے سو گھٹا ہوا ہے۔ قرار اس کمرے تک بھی پہنچا ہے۔ وہ سب کے سب تو یہاں نہیں آسکتے۔ زنان خانے کے ملازم کو داخل کی اجازت نہیں ہوگی۔ نصیر بابا کے علاوہ دو ہی امیل اس رتے سے نوازے گئے ہوں گے۔ کسی چاکر آجانے کی افتاد کے کو تو ہم جاں، ہم دم باہر پڑنا تو کچھ ہو گا تاہم دروازے سے قریب رہنے سے بھی کسی آدمی یا دستک پر، ممکن ہو تو از خود کچھ سکون اور کوئی ایسا حربہ آزمایا جائے کہ آنے کو ہوش و خواہش بھار کھنے کی مملت نہ مل سکے اور وہاں پر نظر پر تعینات ملازم بھی ممانا خانے میں مجھے ایک نظر نہ لگ کرنا ضرور چاہیں گے۔ مجھے وہاں نہ پکار ان کے ٹھنکیں گے اور کمرے میں ہمارا سامان جوں کا توں دیکھ کر ان کے اضطراب کا پارا اتارنا نہیں ہو گا لیکن انہیں براغ حاصل کئے بغیر سکون نہیں آئے گا۔ اچھا یہی ہے بھٹل جلد سے جلد واپس آجائے اس کی جلد واپسی سے کچھ تسخیل جائے گا، سنبھلے گا نہیں تو ایسا شدید بھی نہیں

رئیس بیگم کی آواز پر میں چونک پڑا۔ پہلے تو مجھے اپنے باپ کی واپس کا گمان ہوا۔ وہ مجھی سے مخاطب تھی۔ دور اندیش شخص کی طرح اس نے اتنی دیر میں خود کو رک لیا تھا۔ کسی بیٹے پر چہنچہ کیے بعد یہ حوصلہ بیدار ہوتا اس کے شائستہ لہجے میں نہایت عاجزی تھی۔ کہنے لگی جان بچا سکتی ہے کہ ہم نے کیا تصور کیا ہے، یہ ہمیں کس ایک زراعتی جاری ہے؟

نصیر بے ہوشوں پر زہر پھیل گیا۔ جی میں آیا، زور سے ملتا پھاڑوں کہ کسی کو شکل دکھانے کے لائق نہ رہے۔ غلام اپنا تصور پوچھ رہی تھی۔ میں مل کھا کے رہ گیا۔ یہ نہ تو جرم کا ثبوت ہے اور جرح بازی کرنے کا نہیں تھا۔ اسے سمجھتے ہوئے ہوں توں سے کہا "سب معلوم ہو جائے گا" ڈر رہی تھی۔

اس نے پھر کچھ نہیں کہا، پھر چند لمحوں بعد ناتوانی سے ہانڈی کا قلعہ خشک ہو رہا ہے، کچھ پانی اگر۔ "پانی یہاں کہاں ہے؟" میں نے تسلی سے کہا۔ وہ ملا طرف دیکھنے لگا، گئی۔ بے چارگی دے ہی کی

تمام علاقہ میں اس کے چہرے پر سٹ آئیں۔ میں اسے پانی کہاں سے فراہم کرتا۔ وہ کیسا قسم طرفانہ مطالعہ کر رہی تھی "ہندی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دوا جاری ہے۔" وہ انہی زبان سے بولی۔

مجھے معلوم تھا، وہ حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔ مجھے پہلے ہی اس کی کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہیے تھا۔ میرے جواب سے اس کی ہمت سوا ہو رہی تھی۔ انہی زبان کھلی ہے، بعد میں ہاتھ پیر بھی کھلنے لگیں گے۔ نصیر بابا کی زبانی اس کی شیشہ بازی سے مجھے آگاہی نہ ہوئی ہو تو بڑی وحشت ہوئی۔ وہ سارے واقعات رات بھر میری آنکھوں میں گھومتے رہے۔ میرا بس چلتا تو اسی وقت زنان خانے کی میز یہاں پھلانگ کے اس کے سر پہ جا پڑا، رات بھر میرا خون جتا رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اس سے کیا سلوک کروں۔ اس سے پہلے ایسی دو عورتوں سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ ایک وہ بد رکاز نرسن تھی۔ اس کمپنی نے کورا کو مجھ سے جدا کرنے کے لیے جال پھیلایا تھا۔ سات سال بعد جب میں جیل سے لوٹا تو اتفاق سے دوبارہ وہ مجھے ریل کے ڈبے میں نظر آئی۔ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی۔ اس بار اس کے ساتھ خوش نما دوزیں تھیں۔ لگتا تھا، خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے۔ زریں کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ نرسن سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ نرسن کو میں چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیتا، زریں کے خیال نے میرے ہاتھ باندھے رکھے۔ بعد میں بس مجھے نرسن کے چنگل سے زریں کو چھڑا لینے کا وقت ہی مل سکا۔ نرسن جانے اب کہاں ہو؟ خدا است غارت کرے۔ کاش وہ ایک بار اور ٹکرا جائے پھر چپا بیگم کے لیے بھی میرے سینے میں ایسی ہی آگ بھڑکی تھی۔ اس نے فی کو بالا خانے پر بٹھار دیا تھا۔ چپا بیگم نے اپنی زندگی کا طور ہی بدل لیا۔ اس نے اپنا سب کچھ ترک کر دیا۔ چھپے مڑے ہی نہیں دیکھا۔ وہ تو سراپا تو بہ بن گئی، ایک شگفتہ پیشانی اور بجزو انکار، انکار نہ امت کے لیے اس نے میرا عقاب جاری رکھا، جاری رکھے ہوئے ہے۔ کون تعین کرے گا کہ جو عورت، فی کو بالا خانے تک نہ گئی تھی وہی اب فی کے گھر میں اس کی بہنوں کے ساتھ رہتی ہے۔ چپا بیگم تو بالکل کھل گئی تھی۔ اس کے اندر اتنی سیاہی نہیں تھی کسی کوئی کزن ضرور چھپی تھی اور اسے بس کسی کا انتظار تھا۔ مجھے معلوم تھا، اس عورت پر رئیس بیگم کا سرست میں کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ بچے کے بغیر کتنے لوگ یوں گھروں، گلیوں اور بازاروں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ سب ان کے ختم ہوجانے اور ختم

کر دینے کی آرزو کرتے ہیں اور دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ہر کوئی چپا بیگم نہیں ہوتا۔ جو نہیں ہو پانا پھر اسے برتا بھی دوسرے طریقے سے چاہیے۔

آدھ گھنٹے کے قریب وقت ہو چکا ہوگا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی لیکن میں تو ایک ایک بل گن رہا تھا۔ مجھ پر تو یہ عرصہ مینوں اور برسوں کی طرح گزرا تھا۔ ریش بیگم اور خادماؤں سے زیادہ خوار تو میں خود تھا۔ اس کے بدلے ٹیبل میرے ذمے کوئی اور کام لگا دیتا تو ایسی بیزارى اور وحشت نہ ہوتی۔ میں کچھ بھی ملے نہ کر سکا کہ مجھے اور کتنی دیر یہاں ٹھہرے رہنا ہے۔ ٹیبل اور نصیر بابا اب تک خاصی دور جا چکے ہوں گے عمارت سے باہر نکلنے میں انہیں ناکامی ہوتی تو نصیر بابا مجھے اس مجلس سے رہائی دلانے کی کسی طرح لوٹ کے ضرور آتے۔ یہ وقت تو بہر حال جیسے تیسے گزر گیا ہے، باقی بھی گزر جائے گا، آگے بھی کیا ہوگا، آگے گا بس تصور ہی کیا سکتا ہے۔ یہاں سے میرے جاتے ہی ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔

زنان خانے سے بلند ہونے والے شور سے بچلی منزل کے ملازم سرگرم ہو جائیں گے۔ میں تو مسمان خانے ہی میں ہوں گا۔ وہ مجھے ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ ابتدا ہی میں مجھے ان سے دو ٹوک بات کرنی ہوگی۔ انہیں باور کرانا ہوگا کہ میں یہیں موجود ہوں اور ٹیبل بھی واپس آ رہا ہے۔ ٹیبل کی واپسی تک مجھ سے کوئی سوال جواب نہ لیا جائے۔ کمرے میں جاتے ہی احتیاطاً مجھے مچھنا سامان سے نکالنا ہوگا۔ شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔ اب ان سے مراسم کی نوعیت بیکر مختلف ہوگی۔ ان کی نگاہیں بدلی ہوئی ہوں گی۔ وہ مجھ سے خوف زدہ بھی ہوں گے اور مجھے نظروں سے دور بھی نہیں رکھیں گے۔ اگر اس دوران میں مجھ کو بھولے بیٹے سید صاحب گھر آگئے یا انہیں دھندلا کے بلوالا کیا تو ان کا تو غضب بے پناہ ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ پولیس طلب کر لیں۔ ٹیبل کی واپسی تک مجھے بہت صبر بھجھ کرنا ہوگا۔ ٹیبل کو بھی میری وجہ سے جلد واپسی کی فکر ہوگی۔ مجھے اس سے کچھ پوچھنے، سمجھنے اور بوجھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ اس نے کہا اور میں چل پڑا۔ میری طرح اسے بھی کچھ کر گزرنے کی بے چینی ہوگی جو اس نے آگے پیچھے کا مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ غالباً دانستہ۔ اس نے باقی مجھ پر چھوڑ دیا تھا کہ پیش آنے والے خیب و فراز کے مطابق میں خود ہی فیصلہ کرتا رہوں۔ احکام سے آوی پابند ہو جاتا ہے۔ اس نے ایسی ہدایتیں جاری کرنا عرصے سے بند کر دیا تھا۔ لکھنؤ میں رجن کا سامنا کرتے ہوئے بھی اس نے مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا تھا بلکہ

رجن سے زور آزمائی کے لیے میں کھڑا ہوا تو اس نے ٹیبل نہیں روکا۔ چاندنی بانو کے لیے میری بولی پر بھی اس نے باز پرس نہیں کی۔ شمشاد خان کے اڑے پر پولیس آئی تو خاموش بیٹھا رہا۔ میں خود ہی پولیس افسر سے لہجہ کرتا رہا۔ شک اس نے داخل دیکھ کر دیکھا تھا لیکن وہ میری ستمنا ہی نہ سمجھتا تھا۔ میں نے کتنی عاجزی کی کہ فیض آباد تک آئے ہو کچھ دن کے لیے یہیں ٹھہر جاؤ، زریں کو دیکھیں ہوئے ہو گئے۔ وہ بہت ناراض ہوگی۔ ٹیبل نے میری ایک نہ بے اگر ہم وہاں رک جاتے تو اس طرف آنا بل بھی سکتا تھا۔ وہی بات، جیسا لوگ کہتے ہیں، والے والے پر مہر ہوتی۔ مجھے کچھ پر بھی یہی قول صادق آتا ہے۔ آوی سوچتا کچھ ہو کچھ جانا ہے۔ طبیعت کی خرابی، سید کے ہاں قیام، نصیر سے ملاقات، یہاں دو سہ رسیدہ لڑکیوں کو ہماری ضرورت تھی، کیسی شدید ضرورت جیسے کسی نے دھکیل کے نہیں تو بھیجا ہو۔ ہمارا یہاں آنا اچھا ہی ہوا، ہمارے لیے نہیں تو دونوں کے لیے۔ ہم نہ آتے تو ان کی کیمانی کو کون آنا کب آتا۔ ان کا بھی وہی خسر ہوتا جو ان کے والدین کا تھا۔ اب وہ کسی گوشہ اماں میں چلی جا سکیں گی۔ ہمارا کچھ کہا جا سکتا۔ اطراف و جواب میں سید کا دور و اثر ہے۔ ہے۔ وہ ہمارے راستے میں بڑی رکاوٹیں کھڑی کر سکتا ہے۔ جانے کتنی مدت لگ جائے مگر ہمارے پاس روز و شب کی ہے۔

کچھ وقت اور بیتا ہوگا کہ راہ واری کی طرف سے کے تیز قدموں کی چاب ستانی دی۔ کوئی کسی کا نام لے کر آواز مروانہ بھی اور ہیرائی ہوئی۔ زنان خانے کی دروازے کے اس کا بھی حال ہونا چاہیے تھا۔ سامنے بھی خادماؤں میں ایک تہوج سا نمودار ہوا۔ ریش بیگم ڈھیلے ہوئے شانے بھی اکر گئے چاہیں اور قریب آ میں نے جھٹ ریش بیگم کا بازو پکڑ کر اسے کرسی سے اور دوبارہ چاقو اس کے نزدیک کیا۔ خادماؤں کی سٹاکل گئیں۔ میں انہیں خاموش رہنے کی تلقین کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے خود کو روک لیا۔ میری آواز باہر بھی گئی۔ یہ جگت دروازہ کھول کے میں نے ریش بیگم کو رکھنے کے بجائے اپنے پیچھے دائیں ہاتھ کے پلوں میں جانب کیا اور خود دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ بالکل چھپ گئی تھی۔ آنے والے کو دور سے اندر کر فوراً کچھ نظر نہیں آ سکتا تھا تا وقتیکہ وہ کچھ آگے ہڑ کے تصدیق نہ کرے۔ یہ صورت دیگر کسی خادمہ کی

بہر سے نظر آ جاتی تو اندر آنے کے لیے اس کی بے تالی ہڈی بھی ہو سکتی تھی۔ میں معلوم اسے کوئی نظر آیا یا کھلے دروازے سے ہمیں کیا۔ ہر دو صورت میں اس کا اندر آنا یا نہ آنا لازم تھا۔ دروازے پر آ کے اس نے اضطرابی انداز میں ہنگامی بھری کچھ بڑھایا۔ میں اسی لمحے کا شہر تھا۔ جیسے اس نے اندر جھانکا اور قدم بڑھائے، میں نے چشم زدن سے دروازے کی اوٹ سے نکل کے اس کی گردن پر پنجہ ڈالنا اور اسے مروع پر وہ زچھا ہو گیا اور اس کی کلائی میری گرفت میں آئی۔ ہاتھ کی ذرا سی ڈھیل دے کے طاقت سے جھکا دیا۔ اس نے تانواڑانی جگہ نہیں رہتا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی۔ وہ اس کے لیے قطعاً تار نہیں تھا، پاگل سا ہو گیا پھر جس نے چل کے اس کے کونے پر پیر سے ضرب لگائی تو وہ اوندھے تالین پر جا کر اور ڈکرانے لگا۔ اس نے میرا چاقو دیکھ لیا۔ مجھ سے دور ہونے کے لیے اسے فوراً کسی محفوظ جگہ کی ضرورت تھی، اس لیے وہ شدید تکلیف کے باوجود اٹھ کر اس سے پہلے کہ وہ دروازے کی طرف گئے، میں نے اسے خادماؤں کے ساتھ خاموشی سے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ اس صورت حال میں رعایت اس کے لیے بڑی جاں فزا ہوگی۔ وہ ہڑبڑا کے رہتا تو نہ تو تھا اور خادماؤں کی طرف جا پھرتا۔ بہت سے اس کے انہیں باہر نکل آتی تھیں۔ ریش بیگم پر بھی اس نے نگاہ کی تھی۔ چند ثانیوں کے لیے مجھے اس سے دست بردا ہونا تھا۔ موقع غیبت جان کے وہ فرار کی اعتقاد کو شش رکتی تھی مگر وہ قاور کوٹنے میں دیک گئی جیسے دیوار میں ابا کے۔

آنے والے شخص کا نام کچھ اور ہوگا، سب اسے ہانکا لیتے تھے عمر تیس سے اوپر، دلہن پتا، اٹھتا قد، رنگت صاف، فہمی بڑی، فطرتی سرمہ بھری آنکھیں، پیچھے کی طرف سے اور پلٹنے سے نکلی کیے ہوئے لمبے بال اب بے تیب ہو گئے تھے۔ لٹیں ماتھے اور چہرے پر بکھر گئی تھیں۔ ان کے کرتے اور چاہے میں لمبوس تھا۔ اچھی شکل صورت کا تھا مگر کچھ آواز میں بل تھا، کچھ اعضا میں، پلٹے پلٹے اور باتیں کرتے کرتے اچانک لہر اجاتا۔ کئی بار مسمان اسے میں میرے لیے کھانے کا طشت لے کے آیا تھا۔ مذہب اور جاں نثار قسم کا شخص تھا۔ ابن کستا تھا، اس کے انھوں انھوں میں جاوے۔ ایسی باتیں کرتا ہے کہ آوی دوش ہو جائے، سارا جسم چمپن جھٹکا جائے، ہانکے نے متعدد آواز میرے جسم کی باتیں کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، میں نہ گویا تھا۔ وہ خادماؤں سے زیادہ ہراساں ہو گیا۔ دیر تک باؤنڈ کر 6

ہانتا کا پتا رہا۔ میرے جی میں آیا، اس سے پوچھوں، نصیر بابا کہاں ہیں۔ کچھ تو سن سکن لے گی لیکن ریش بیگم اور خادماؤں کو اس کے کسی جواب سے تقویت مل سکتی تھی۔ میں چپ رہا اور میں نے دوبارہ دروازہ بند کر دیا۔ ہانکے کے بعد کوئی اور بھی آ سکتا تھا۔ میں دروازے کے قریب ہی رہا۔ کوئی پانچ منٹ اور گزرے ہوں گے کہ ایک اور اوجیز عمر عورت کو مجھے خادماؤں کے پاس بٹھا دیا۔ راہ واری میں وہ مضطربانہ صدا سنیں لگائی ہمارے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ سیدھی اندر چلی آئی، مجھے کچھ زیادہ زحمت نہیں کرنی پڑی۔ دروازے کے پلو سے اچانک اپنے سامنے میرے نمودار ہو جانے پر وہ پکرا گئی۔ منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، جسم ڈگمگا گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کے خادماؤں کی طرف دھکیل دیا۔ وہ لڑھکتی پڑھکتی ان پر جاگری۔ کچھ خادماؤں نے اس نیم جاں کو سہارا دیا اور جگہ ہانکے اسے سمیٹ لیا۔

ریش بیگم سمیت ان کی تعداد اب چودہ ہو گئی تھی۔ مزید دیر ہو جانے سے یہ تعداد بڑھ سکتی تھی۔ میں اٹھ کھڑا تھا اور میرے پاس صرف چاقو تھا۔ اتنی بڑی نفری میں کسی کی غیرت بیدار ہو سکتی تھی۔ مجھے خون خرابہ بھی نہیں کرنا تھا۔ کو کسی نوادار سے ٹھننے کے لیے ذہن میں پہلے جیسی انجمن نہیں رہی تھی۔ وقت کچھ اور گزر گیا تھا، یوں کھنے کے لگ بھگ لیکر کچھ ملے نہیں تھا۔ آوی خود پر گزرنے والی کیفیات سے وقت کی پیمائش کرتا ہے، تندہ ہو تو ملے ہماڑ بن جاتے ہیں، لطف و کرم پر مائل ہو تو مانند حباب، مانند ہوا ہے۔ میں نے کچھ اور توقف کیا۔ اتنی تن دی سے کھڑے کھڑے ٹانگیں جکڑنے لگی تھیں۔ مسلسل بخار سے ابھی میں اٹھایا تھا۔ دوا جاری تھی اور ڈاکٹر کشن نے زیادہ تحکات سے منع کیا تھا۔ مزید دس منٹ اور گزرے ہوں گے کہ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور آدھا جسم باہر نکال کے راہ واری میں نگاہ دوڑائی۔ سکوت طاری تھا۔ دروازہ بند کر کے میں اندر آیا اور میں نے باہر نکلنے کا ارادہ کر لیا پھر ایک خیال نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم روک لیے۔ ایسے ہی چلے جانے کے بجائے اگر میں انہیں شش و پنج سے دوچار کر کے جاؤں تو کیا حرج ہے۔ مجھے ریش بیگم سے کہنا چاہیے کہ کچھ دیر کے لیے مجھے باہر جانا ہے جو جہاں موجود ہے، وہیں ٹھہرا رہے۔ کسی نے اپنی جگہ سے جنبش کی تو۔ میری مراد یہ تھی کہ میرے جانے کے بعد کسی نیپے پر پہنچنے میں انہیں پس و پیش ہو، ان کی راہ فریاد، ہاؤ ہو میں کچھ تاخیر ہو جائے۔ یہ تب ہی ممکن تھا کہ کتا بیات پلی کیشن

انہیں میرے واپس آجانے کا یقین ہو اور اگر ایسا نہیں ہوا پھر مٹا ایک اور تدبیر میرے دماغ میں گوندی اور مجھے منتشر کر گئی۔ کیوں نہ میں ان سب کو بیٹیں پھوڑ کے رہیں بیگم کو ساتھ لے کے باہر نکلوں۔ میری خواہش پر رہیں بیگم انہیں متنبہ کرتی جانے کی کہ اس کی واپسی تک سب بیٹیں موجود رہیں کوئی بھی باہر نکلنے کی جرات نہ کرے۔ رہیں بیگم کا یہ انتہاء ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ میں رہیں بیگم کو بے سدھ کر کے کسی اور کمرے میں محبوس کر دوں۔ غلاما میں یہاں اس کی واپسی کا انتظار کھینچتی رہیں گی اور رہیں بیگم کسی اور کمرے میں بے خبر پڑی ہوئی۔ یوں کچھ اور وقت مل جائے گا مگر کتنا کیا پھر مجھے نیچے چلے جانا چاہیے؟

○☆☆○

میں زنان خانہ مقفل نہیں کر سکتا۔ میرے باہر جاتے ہی کوئی بھولا بھٹکا اصرار اٹکلا اور مختلف کمروں کی طرف ٹاک جھانک کر مٹا رہیں بیگم کے کمرے تک پہنچ گیا اور محصور غلاماؤں تک! تو کیا حاصل ہوگا، کتنی دیر کی رعایت! اور اگر رہیں بیگم کو دوسرے کمرے تک لے جانے کے دوران میں ہی کسی نے اوپری منزل کا رخ کر لیا تو میری کیا ترجیح ہوتی چاہیے؟ مجھے رہیں بیگم کو سنبھالے رکھنا ہے یا آنے والے شخص کو روکنا ہے؟ رہیں بیگم کو چاقو کی زبردیکھنے کے باوجود وہ شخص پسپا نہیں ہوا، خود کو ترک کرنے یا تعیل حکم پر آمادہ ہونے کے بجائے اگلے قدموں بھاگ کھڑا ہوا تو مجھے رہیں بیگم سے ہاتھ اٹھا کے اس شخص کا تعاقب کرنا چاہیے؟ وہ تو نیچے جاتے ہی ٹپل چلا دے گا۔ مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اختیار واپس کر کے میں اپنی راہ لوں۔ جلد یا بدیر مجھے یہی کرنا ہے۔ اس کشمکش میں چند منٹ اور گزر گئے اور دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ انہیں متذنب رکھنے کے لیے چلتے چلتے یہ تنبیہ و تاکید مجھے ایسی سستی اور غیر ضروری نہیں لگی کہ میں تھوڑی دیر بعد ان کے درمیان واپس آ رہا ہوں۔ میری واپسی تک وہ اپنی جگہ قائم رہیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ باقی اب ان پر تھا کہ میرے غلبہ و تسلط سے نجات پانے میں وہ کتنا وقت لیتی ہیں، خود سے کس قدر جھٹ کرتی ہیں۔

غضب سبزہ زار کی جانب بھٹنے والے دروازے کا زینہ اتر کے میں تیز قدموں سے نیچے آ گیا۔ وہاں دور دور تک کوئی شخص نہیں تھا۔ کھلی ہوا میں آکے پسینہ آ گیا اور ایسا لگا جیسے کسی بڑی مسم سے لوٹا ہوں، میں اندھیرے سے اجالے میں آ گیا ہوں، آسمان پر بادل اتنے کمرے نہیں رہے تھے لیکن

دوبہ بھی نہیں تھی۔ میں نے اپنی رفتار دھیمی کی جسم کھینچ لگا تھا۔ مجھے دیکھ کے بشارت چل گیا اور ٹھکرا۔ ”آپ کدھر تھے چھوٹے صاحب؟“ اس نے دور: ”مردود آواز میں پوچھا۔

”کیوں! کیا ہوا؟“ میں نے درشتی سے کہا۔ ”کچھ نہیں۔“ وہ ٹپل گھاسا ”وہ دہا بن آپ کو تھا۔“

”ابن کہاں ہے؟“ میں نے نسبت غصری ہوئی۔ ”پوچھا۔“ ”آپ کے کمرے کی طرف۔“ بشارت میرے ساتھ رہا، کچھ دور، چند قدم کا فاصلہ میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ وہاں مزدور ایک اور ملازم جس کے نام سے میں واقف نہیں رہے تھے۔ تینوں میری جانب اٹھ پڑے۔ ”کہاں؟“ ”آپ؟“ ”ابن نے وحشت سے پوچھا۔

”زنان خانے کی طرف۔“ میں نے سکون سے دیا۔ ”وہاں! آپ وہاں تھے؟“ وہ ابھتی آواز میں بولا ”ہاں!“ ”میں نے بے اعتنائی سے کہا ”وہیں۔“ ان کے چروں سے ظاہر تھا، میرے جواب۔

تفتی نہیں ہوئی ہے۔ اچھے ملازموں کو چروں اور پچان خوب ہوتی ہے۔ ابن کچھ اور کتنا چاہتا تھا رہا۔ ”پاپا کب گئے ہیں؟“ میں نے سرسری طور پر پوچھا۔ ”نہیں تو دیر ہو گئی۔“ ”کب تک آنے کو کہہ گئے ہیں؟“

”جلدی ہی کا بول گئے تھے۔“ ابن کی آواز کا تھی۔ ایک بات تو واضح ہو گئی تھی کہ ٹھیل اور فروزاں اور یاسمن کو یہاں سے لے جانے میں کوئی پیش نہیں آتی ہے لیکن اس وقت ابن اور دیگر ملازمتدروہ نہ ہو، مہمان خانے سے اتنی دیر میرے غا نے انہیں ضرور متوحش کیا تھا۔ آج تک چوں کہ ہوا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے ہی اپنا جیس دور کر پائے کو زنان خانے بھیجا ہو اور وہ ابھی تک واپس تھا یا آ نہیں سکا تھا۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ابن کی جانب مشروب اور چٹل وغیرہ کی پیش کش پر میں نے

کہا۔ اس نے جگ سے گلاس میں پانی اناڈیلنے اور مجھے نکلنے میں خاصی مستعدی دکھائی۔ آنے والا وقت میرے لیے ایک تجربے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آنے والے وقت میں ٹھیل اور مجھ سے ان سعادت آثار خدمت گزاروں کا کیا در ہوگا؟ انہیں یک بیک اپنی وضع بدلنے میں کس قدر توفیق ہوگی۔ سر جھکا کر ان کا پیشہ ہے، کچھ ہی دیر جاری ہے۔ عجب ندامت آمیز لگتی اور کمدرت آمیز ہوشیاری کا سا لہو ہوا ان کا۔

کمرے میں گھڑی موجود تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ٹھیل اور نصیر بابا کو گئے ہوئے سوا گھنٹے کے قریب رہا تھا۔

ابن کمرے کی چیزیں درست کرنے لگا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ جب بھی ”آپ“ بھی بستر کی چادر، میز پوش، پردے ٹھیک رہنے لگتا۔ ”بھی کر سیں“ میزوں اور صوفوں کی صفائی۔ انظر آ رہا تھا کہ آج اس کے اس شغف میں پہلے جیسی رہی نہیں ہے۔ میں نے بستر، بھائی کی تو وہ مرد شاس بھیجے یا کچھ غلط کی ضرورت ہے۔ چپکے سے وہ دروازہ بند رکے چلا گیا۔ ”سنو!“ میں نے اسے ہکا رات وہ سٹ پٹاتے کے لوٹ آیا۔ ”میں سیں کمرے میں موجود ہوں، کہیں باہر بن جا رہا۔“ وہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھا کیا ”کچھ دیر بابا آجائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”جی! آجی! آجی!“ وہ گوگو کی حالت میں بولا۔ اس نے تھوڑا وقف کیا پھر کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میری سے اتر کے میں نے سامان سے تمچا نکالا اور بستر کے دھیر ہو گیا۔ بس کچھ دیر کا سکوت اور ٹھنڈا پھر زنان نے نے شور بلند ہوگا اور جیسے درود پوار متحرک ہو جائیں گے، نمارے گھر کا موسم بدل جائے گا۔ میرا اندازہ صحیح تھا، میں بیگم اور غلاما میں ابھی تک میری واپسی کی منتظر ہوں۔ میری نظریں گھڑی پر پئی ہوئی تھیں۔ کمرے میں گھڑی مانگ تک گونج رہی تھی۔ صدائیں ایک جیسی اور دھیمی تھیں تو خاموشی اور گہری کسوٹی ہیں۔ وقت دھڑک رہا تھا۔ بادل بھی دھڑک رہا تھا۔ میں نے خود کو ٹھٹھا اور مجھے مانت ہوئی۔ اس دھڑکن میں خوف کی آمیزش نہیں تھی۔ اُسے والے وقت کی لٹاں کسی ہی بے مہربوں وہ دونوں تو ہلاں سے چلی گئیں۔ کچھ تو اس جزا کی سزا بھی نہیں بھگتی ہے۔ میں نے خود کو آسان کرنے کی کوشش کی، آنکھیں بند رکھنے دھڑکن کی گہری کھولنے کی کوشش۔ نہ آنکھیں بند ہوتی تھیں نہ کما کما تھا۔ وقت کم رہ گیا تھا۔ اس اثنا میں بدلنے

روپوں اور توروں سے مزاحمت اور مدافعت کے لیے مجھے اپنا رد عمل ٹھین کر لینا چاہیے تھا۔ سید محمود علی کی عدم موجودگی میں گھر کے کارندے رہیں بیگم کے احکام کی پیروی کریں گے اور رہیں بیگم غصہ و غم میں انہیں کوئی بھی جھوم قسم کا حکم دے سکتی ہے میرے لیے غالباً یہی ایک طریق سود مند تھا کہ ٹھیل کے آنے تک بہر صورت مضبوط اور متحمل رہوں۔ چاقو، سینچے یا اڑے کے کسی زور ٹپل کی غنائش سے وہ اوپر دیکھ سکتے، بھڑک سکتے ہیں۔ ٹھیل کے آنے کے بعد تو میرا کام ختم ہی ہو جائے گا۔

دروازے کے باہر اٹھنے والے شور سے میں چونک پڑا۔ باہر سے بھاگتے ہوئے آدمی کی بے ہنگم چابیوں ایک دم تیز ہو گئیں، دروازہ تزارخ سے کھلا اور خواس باختہ بشارت نامی ملازم اندر آیا، جیسے مجھے ختم کر دینے کے درپے ہو۔ آیا وہ بہت زور شور سے تھا لیکن مسری کے پاس آگے اس نے بہ وقت خود کو تھام لیا تھا۔

میں اٹھ کے بیٹھ گیا ”کیا ہے؟“ میں نے ناگواراری سے پوچھا۔ ”آپ! آپ زنان خانے میں تھے؟“ اس کی آواز قابو میں نہیں تھی۔

”ہاں۔“ میں نے سہلا کے کہا۔ ”بانو صاحب بانو صاحب کیا بولتی ہیں؟“ وہ خفقانی لہجے میں بولا۔

میں کوئی جواب دینے والا تھا کہ دروازے کے باہر پھر شور اٹھا۔ بڑے دروازے پر تعینات بندوق بردار دربان ہالگوں کی طرح تڑختا پھڑکتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ وہ گھٹکے ہوئے جسم کا ادھیر آدمی تھا ”بانو صاحب بولتی ہیں“ اس آدمی کو باہر مت جانے دو۔ نہیں تو نہیں تو۔“ وہ دو حشائے انداز میں بولا ”کوئی انکڑ پھنکڑ کرے تو کوئی مار دو۔“

میں بستر پر بیٹھا رہا۔ دربان نے بندوق مان لیا۔ اس کا رخ میری طرف تھا۔ میں نے ہاتھ اوپر نہیں اٹھائے ”میں یہیں بیٹھا ہوں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میری آواز کھسکی ”تم بالکل فکرت نہ کرو، جاؤ بڑے دروازے پر جا کے چوکی دو، نہیں تو پھر یہیں آرام سے بیٹھو۔ بندوق دیکھ لیتا، ٹھیک طرح چلتی ہے کہ نہیں۔“

وہ تھلا کے رہ گیا۔ اس نے بندوق چینی نہیں کی۔ اتنی دیر میں ابن اور مزدور بھی ہونقوں کی طرح منہ بھاڑے، بولائے ہوئے اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے بانکا بھی لپکا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا اور لمرانی آواز میں بولا ”ہاں ہاں“ بانو

صاحب بولتی ہیں، مالک کے آنے تک اس کہنے ناشرے کو رسی سے ڈنجر سے باندھ رکھو۔ کہیں بھاگ نہ جائے۔ اس نمک حرام نے ہم لوگوں کو بڑا ستایا ہے۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کیا کیا بولوں تم کو۔ خدا خیر کرے، بانو صاحب کی حالت تو بہت خراب ہے۔ اس نے پیچہ پھیلاتے اور جھر جھری لیتے ہوئے کہا ”اس کے پاس بہت بڑا چاقو ہے۔“ ان بانچوں نے مسمری کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ابن کی نظرس جھکی ہوئی تھیں۔ تاہم وہ انہی کے ساتھ تھا ”چاقو کدھر ہے؟“ دربان دھاڑتے ہوئے بولا اور ہندوق سے نشانہ لینے کی ہتھی دینے لگا۔

”چاقو ہے میرے پاس؟“ میں نے جیب تھب تھپاتے ہوئے کہا ”پہلے میری بات دھیان سے سن لو۔ تم لوگوں سے اپنا کوئی واسطہ نہیں ہے تمہارے ساتھ ہم نے اچھا وقت گزارا ہے۔ تمہیں اصل بات معلوم نہیں ہے۔ معلوم ہو جائے گی تو پتہ چلتا ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے۔“ ”ہم کو اس سے غرض نہیں۔“ مذکورہ بھی سے بولا ”ہم تمہارے نوکر نہیں ہیں، جس کے ہیں، اس کے حکم پر چلنا ہے۔“

”تو مالک کو آنے دو۔ وہ اب نہیں تو۔“ دربان نے بھی مجھے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ کڑکتی آواز میں بولا ”چاقو کدھر ہے؟“

”دیکھو! تمہیں بھی علم ملا ہے، ناکہ مجھے یہاں سے جانے نہ دیا کچھ اور؟“ میں نے نرمی سے کہا ”بھروسہ رکھو، میں یہیں موجود ہوں اور رسی، ڈنجر اور جیکڑنے کا شوق ہے تو ٹھیک ہے۔ یہ بھی پورا کر لو لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ تم بانچ ہو، میں اکیلا۔ تمہارے پاس ہندوق بھی ہے۔ میں تمہارا گھیرا توڑ کے کسی طرح جاسکتا ہوں، جانا چاہوں تو مجھے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ میں کب جا چکا ہوتا۔ اپنا کام ختم کر کے زنان خانے سے سیدھا چلا جاتا۔ یہاں اپنے کمرے میں یوں واپس آتا۔ ہمارا سامان بھی یہیں رکھا ہے۔ مجھے بابا کا انتظار ہے اور تمہارے مالک کا بھی۔ ان سے ملاقات کیے بغیر ہم نہیں جاسیں گے۔ بات مت بڑھاؤ۔ اطمینان سے اپنے اپنے کام پر جاؤ یا پھر ادھری میرے پاس بیٹھو۔ ذرا صبر و ضبط سے کام لو۔“

دربان نے سنی ان سنی کر دی ”چاقو نکالو۔“ وہ پھنکارتی آواز میں بولا اور میرے کچھ اور نزدیک آگیا۔ جیب سے چاقو نکال کے میں اس کے حوالے کر سکتا تھا لیکن میں نے دانستہ نال کیا کچھ رو دتھ، جیل و جت کے

بعد انہیں چاقو حاصل کرنے کی سرخوشی زیادہ ہوگی۔ ام طرح وقت گزرا نا بھی مقصود تھا۔ دربان کوئی مشاق اور آزمودہ کار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ سید محمود علی نے پورے دروازے کے لیے دس آدمیوں کے بعد ہی اسے منتخب ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ ملازم میں ایسی درجہ بندی نہیں۔ تاہم اس وقت دربان نے اپنے ساتھیوں کے حاکم پاسوار حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ہتھیار پاس ہو تو آدمی کا غمزہ ہی اور ہو جاتا ہے۔ آدمی بے پناہ بے شمار ہو جاتا ہے۔ دبا نے مجھے کوئی مصلحت نہیں دی اور اپنا ارادہ تبدیل کر کے کو میری جیب سے چاقو نکالنے کا کام بہرہ کیا۔ ابن کے انہی نے بری طرح اسے لٹاڑا۔

ابن کے چہرے پر جال پھیل گیا تھا۔ وہ سمجھتے ہو میری طرف بڑھا۔ اس کی نگاہوں میں تاسف بھی ا معذرت بھی تھی۔ دربان نے ہندوق سے میرا نشانہ لے تھا۔ مجھے بے حرکت ہی رہنا چاہیے تھا۔ وہ اڑے کے ا نہیں تھے جو کوئی وار کرتے ہوئے اوجھتے ہیں سے اپنا کریں۔ اڑے کے آدمی کو خیال رہتا ہے کہ پھر مقابلہ جواب میں ہر طرح کی آزادی لیا جاتی ہے۔ مقابلہ کسی قاعدے اور ضابطے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ سارے گھریلو ملازم تھے، صرف ان کا سرغنہ، دربان انہی خاصا مختلف تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ زندگی میں بھی نہ اڑے پاؤں سے وہ ابٹنی رہی ہے۔

پہنچل کستا تھا، عام لوگوں کے نرے میں اڑے آدمیوں سے زیادہ احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے اد تھا، آقا کی خوشدوگی، اس کی نظروں میں سرخ روئی کی تنہا کسی کی جیانی بھی متاثر ہو سکتی تھی۔ ایک دوسرے پر بے لے جانے اور کوئی معرکہ سر انجام دینے کا سودا کسی کے سر میں ساسکتا تھا۔ ریس بیگم کو اپنی آتش غضب ہوا کا وقت نہیں ملا ہوگا۔ وہ مجھ پر یورش کا حکم دیتے ہوئے کے لیے حدود کا تعین نہیں کر پاتی ہوگی۔

چاقو حاصل ہونے کے بعد ان کی رگوں میں غلہ گردش کچھ اعتدال پر آسکی تھی۔ میرے پاس کوئی چار نہیں رہا تھا کہ مزید چوں و چرا کیے بغیر ابن کو جب سے نکالے دوں لیکن ایک میرے دماغ میں آیا کہ ان بانچوں کسی اور طرح بھی تنہا جاسکتا ہے۔ کچھ اور سوچنے کا نہیں تھا جیسے ہی ابن مسمری کے دائیں طرف میرے کر جب میں ہاتھ ڈالنے کے لیے آیا میں نے دروازے طرف دیکھتے ہوئے ہانک لگائی ”دروازے پر کون ہے“

آزودہ ساحرہ تھا لیکن شاید ہر ایک کا آزمودہ ہے اور اکر گر ہوتا ہے۔

دربان کی جگہ کوئی بھی ہوتا، ایک لمبے کے لیے اس کی دروازے کی جانب میڈول ہو جاتی۔ میں مسمری پر بیٹھا دربان مسمری کی پانستی سے جڑا اٹھا تھا۔ اس کی ہندوق ہال میرے سینے سے ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ ہندوق تہ قرب نہیں رکھنا چاہیے۔ میری نگاہ ٹال پر جمی ہوئی تھی اور نگاہ میں ایسے وقت ڈھیل کے یہ قول بہت مل ہوتا چاہے، ہاتھ نگاہ کا پابند رہے، ہاتھ نگاہ بن بیک وقت ان سب کی نظرس دروازے پر مرکوز ہوتی تھی۔ وہ منٹرو ہوئے اسی دم بستر پر بیٹھے بیٹھے زقد نے کے انداز میں، میں اپنی جگہ سے بلند ہوا۔ ہندوق کی پکڑنے اور ضرب لگانے کے لیے میں نے بائیں ہاتھ خالی اٹھا۔ ہندوق کی ٹال پکڑنے اور لگانے میں پل بھر کا وقفہ مسمری پر کھڑے ہو جانے سے مجھے دربان پر موقع کی تامل حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے سر پہ ضرب لگاتے ہوئے نے پوری قوت جمع کی تھی۔ وہ ہلک اٹھا، عاصی کا خیر کے میں نے اس کے پیٹ پر گھٹنا مارا۔ اس دوری چوٹ کی وہ باند لاسکا۔ ہندوق پر اس کی گرفت متاثر ہوئی چاہیے۔ بائیں چاروں مجھے روکنے کے لیے مسمری پر چڑھنے لگے۔ ان کی پروا کرنا تو دربان کو سانس لینے کی فرصت مل جاتی۔ چاروں کے مسمری پر چڑھنے سے پہلے ہندوق کی ٹال سے پکڑنے کو کر میں مسمری سے نیچے آگیا۔ دربان بے ہوش ہوا تھا۔ نیچے آئے میں نے اٹکے ہاتھ سے اس کے منہ مانچر رسید کیا تو وہ ہندوق پر اپنا تسلط برقرار نہ رکھ سکا۔ اوپر چاروں مجھ سے لپٹ گئے اور جھپٹنا جھپٹی کرنے لگے۔ ان قبضے میں آجانے کے بعد ان چاروں کو سنبھالنا دشوار تھا۔ چنانچہ میں نے ہندوق کی ٹال اور پٹ سے ان پر بے غامضی میں کو افرا تفری کی صورت ہو گئی۔ وہ دور دور سے لگے میں نے فوراً دروازے کا رخ کیا تاکہ کوئی باہر نہ نہ پائے۔

ان کی چٹائیاں سکر گئیں تھیں اور چروں کے رنگ لگے تھے ہندوق کے نشانے پر دربان سمیت وہ چاروں بد طرف ہو گئے۔ دیوار کی طرف منہ کرلو۔ ”میں نے بلند دانستہ۔“

انہوں نے فوراً قہقہہ کی اور صوفے کے پاس دیوار کی اندر کے ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہو گئے ”وہ“

پانچ تھے، ان کے مظل ہو جانے کے بعد ریس بیگم کے اکام پر عمل کے لیے شاید اب تین چار ہی باقی رہ گئے ہوں۔ دروازہ بند کر کے میں نے گلاس میں سبکے ہوئے پانی کے چند گھونٹ سے حلق تر کیا اور دروازے کے قریب کرسی بیٹھنے کے بیٹھ گیا۔ انہیں کھڑے کھڑے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے انہیں بیٹھ جانے کی ہدایت کی۔ بیٹھے ہوئے آدمی کو فعال ہونے میں کھڑے ہونے آدمی کی نسبت کچھ دیر لگتی ہے۔

ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ٹھٹھل کو آجانا چاہیے تھا۔ مہمان خانے سے ابن، مذکورہ بشارت پانکے اور دربان کے نہ بیٹھے پر ریس بیگم اور دیوانی ہو گئی ہوگی۔ اس نے یقیناً دو آدمیوں کو سید کی تلاش میں یا اس کے کسی صاحب حیثیت دوست کے پاس مدد کے لیے باہر بھیجا ہوگا۔ پہلے نہیں تو اب اسے کسی کو یہ خدمت سونپی ہوگی بشرطیکہ کوئی چاق و دیوبند ملازم اسے آسانی سے دست یاب ہو جائے۔ بعض خادماؤں کو مردان خانے میں آمدورفت کی اجازت ہے، وہ گھر سے باہر نہیں جاسکتیں مگر بھاگ دوڑ کرنے والے کسی ملازم یا ان پانچ گم شدگان کے سراغ میں زنان خانے سے باہر آؤں پڑی ہوں کی اور اب یہاں آیا ہی چاہتی ہوں گی۔ میں ان کا منتظر تھا۔ ان کا کیا، کسی کا بھی۔

زنان خانے کے زنداں کی بات اور تھی۔ بانک کے سوا وہاں ساری عورتیں تھیں۔ ان سے نیرہ آزمائی نہ دیکھنے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہاں ہندکروں میں اتنی عورتوں کے ساتھ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ وقت گزرنے کا مکمل معنی، بان نہایت ست تھا اور مسلسل یہ دھڑکا کا ہوا تھا کہ کہیں ان اور نصیر بابا ناکام نہ ہو گئے ہوں۔ یہاں میں سبوتا بہر حالت میں اور بہتر ذرا بے سے تھا۔ آگے پیچھے کمرے کے دروازے تھے، ایک باہر کی طرف جالی کا، دوسرا اندر کی جانب، نام دروازہ۔ جالی کے دروازے پر کوئی چٹنی یا کنڈی نہیں تھی۔ میں نے اندر کا دروازہ دوبارہ کھول دیا۔ جالی کے دروازے سے باہر کا منظر اتنا صاف تو نہیں البتہ نظر ضرور آتا تھا۔ باہر سے جالی کے پار کمرے کا اندر کا کچھ حصہ دیکھنا تھا۔ تاجا جب کمرہ خوب روشن ہو۔ وہ بانچوں پہلے اکڑوں بیٹھے تھے بعد میں چپکے چپکے انہوں نے الٹی پانستی کی نشست اختیار کر لی۔ زنان خانے سے وہائیاں دیتی ہوئی ریس بیگم اور خادماؤں نے میری نسبت کچھ ایسی شدت انہیں باور کرائی تھی کہ کسی اور طرف دیکھنا اور سمجھنا انہوں نے ضروری نہیں سمجھا۔ حالانکہ کمرہ کھلا ہوا تھا، میں بستر دراز تھا۔ ان کی اچانک آمد پر میں نے

کسی اضطراب کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ انہیں جتا بھی دیا تھا کہ میں یہیں موجود ہوں۔ ہر حال میرے لیے تو ان کی سرکشی اور بدحواسی کا اچھا ہی نتیجہ برآمد ہوا۔ اب یہ احساس انہیں بھی شاید ہو رہا ہو۔

ان میں سے صرف ابن نے ایک بار سر ہٹھانے کے دزدیکی سے میری طرف دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے کرسی پر تعینات دیکھ کے اس نے فوراً گردن سیدھی کر لی اور سرگوشی میں اپنے ساتھیوں کو کوئی نمائش بھی کی۔ ظاہر ہے، احتیاط کی۔ ان سپہ سالار، بے چارہ گان کو دیوار کے ساتھ بیٹھنے ہوئے دس منٹ ہو چکے ہوں گے۔ ابھی تک باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رحیم بیگم پر تو ایک ایک بل قیامت کی طرح گزر رہا ہوگا۔ میرے احوال کی تفتیش کے لیے اب تک کسی کو آنا نا چاہیے تھا۔ وہ پانچوں بھی پھولیدلے گئے تھے مجھے ان کی یہ بہت کڑا ناکی بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی مگر اس کے سوا مذاکرہ بھی نہیں تھا۔ یہاں سے ہمارے رخصت ہو جانے کے بعد جانے کون کون سید محمود علی کے عتاب کا نشانہ بنے۔

ابن کو کسمپاشی کے مجھے خیال آیا کہ ان میں سے کسی کو بحال کر دینے میں بظاہر کسی ضرر کا احتمال نہیں۔ میں نے ابن کو پکارا، وہ بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ میں نے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا تو اسے یقین نہیں آیا پھر وہ مجرموں کی طرح سر جھکا کر، پھٹی پھٹی آنکھوں اور آہستہ قدموں سے مجھ سے کچھ فاصلے پر آگے کھڑا ہو گیا۔ ”اپنے ساتھیوں کو پانی پلاؤ۔“ میں نے کہا، ”اور پھل وغیرہ بھی انہیں دے دو۔“

وہ میری رائے کے ایک عالم سے گزرا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ خاموشی سے وہ جگ اور گھاس اپنے ساتھیوں کے پاس لے گیا۔ کسی کو پاس لگی ہوا نہیں، ہر ایک نے جلدی جلدی خود کو سیراب کیا، البتہ پھلوں کے ٹٹٹ کو ہاتھ نہیں لگایا اور انہوں نے اپنے منہ دیوار کی طرف کیے رکھے۔ جگ اور گھاس میز پر رکھ گئے ابن واپس اپنی جگہ چلا گیا مگر میری آواز پر پلٹ آیا۔ عین اس وقت مسمان خانے کی راہ داری میں آئیں گونجیں۔ میں نے کرسی چھوڑ دی۔ وہ دو لڑکیاں تھیں، چادر میں لپیٹی ہوئی۔ جالی کی دیوار کی وجہ سے ان کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔ بڑی برق رفتاری سے وہ تقریباً بھاگی ہوئی آئی تھیں اور میرے کمرے سے کچھ فاصلے پر آگے ٹھہر گئیں۔ ابن کو میں نے روک لیا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کوں، خود دروازے پر جاؤں یا ابن کو بھیجوں یا ابھی انتظار کروں۔ لڑکیاں یہاں تک آچکی

تھیں لیکن وہ کسی ایسے کمرے میں بے دھڑک کر داخل ہو سکتی تھی جو مجھ سے وابستہ ہو۔ انہیں تو دیکھ ہوئے بھی ہول آ رہے ہوں گے۔ میں نے ابن کو دروازے جانے کا اشارہ کیا۔ یہ بے اعتباری بے جواز نہیں تھی خود کو قائل نہ کر سکا کہ ابن جالی کے کھلے دروازے بھاگ سکتا ہے۔ شکر ہے، ابن نے مجھے شرم سار نہیں کر جالی کے قریب کیا اور فوراً واپس آ گیا۔ اس نے سرگوشی میں مجھے بتایا کہ زنان خانے کی دو خادماں میں سے ایک باہر کھڑی ہیں۔

یہ تو میں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ ان کے نام معلوم ہر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ابن میرے دوسرے حکم۔ مستعد تھا۔ میری خاموشی پر وہ ایک طرف ہو گیا اور ام اپنے ساتھیوں کے پاس نہیں گیا۔ باہر دونوں لڑکیاں دوسرے کو ٹوک اور شوک رہی تھیں۔ ان میں سے دروازے کے قریب پھٹنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی کو باہر بھیج کے کسی خلیے حوالے سے انہیں اندر با کوشش کا کچھ حاصل بھی نہیں تھا اور یوں ابن کی شاید ہی اندر آئیں۔ ابن کو دیکھتے ہی وہ طرح طرح شروع کر دیتیں، میری موجودگی میں ان کے سوال جواب ابن کے لیے آسان نہیں تھے۔ وہ کوشش باہر کھڑی رہیں۔ نہ پائے رفتن نہ جانے ناماندا ہوئی ان کی۔ دیر ہو گئی تو کسی ایک نے بہت کی اور چھیچھی ہوئی سی آواز میں اس نے پہلے نذر وشارت پھر بانگے اور ابن کا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے کمرے میں جھانکے بھی کی۔ اندر کمرے میں اندھیرا ہی نظر آ رہا تھا۔ سکوت کے باوجود انہیں کمرے میں داخل ہونے کا مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ میں اگر اندر ہوں تو بے ہی رہنا چاہیے۔ زنان خانے کا آسمن انہیں ضروری نہیں کہ زنان خانے سے وہ سیدھی بیار ہوں۔ پہلے انہوں نے بڑے دروازے پر جا کے دیا والے واحد دربان سے میرے بارے میں تعقیب عمارت کے مختلف گوشوں میں، مجھے ابن، خدوا وغیرہ کو تلاش کرتے ہوئے میرے کمرے کا رخ دیا۔ اس کے ان کی جہتیں اور دہیز، اور شدید ہوا اتنے سارے لوگ پھر کون سی کھوہ میں جا چکے انہیں آسمان نے نگل لیا؟ چند منٹ بعد اتمام چر انہوں نے دوبارہ اپنے ہم قیدیوں کے نام پکار

لی کر زب نمایاں تھی۔ دو چار قدم بڑھ کے انہوں نے زبے پر دستک دینے کی جسارت قطعاً نہیں کی، اس سے ابتر انہیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خادم کے ترک واپار نے خود کو صادق و صفا شرط ہے۔ آخر انہوں نے واپس نہ کا فیصلہ کر لیا اور تیز قدموں سے زنان خانے کی طرف نکلیں۔ اچھا ہوا، وہ واپس چلی گئیں۔ کسی تدبیر سے اندر بلا کے نفری بڑھانے سے بہتر میرے لیے یہی تھا، غالی ہاتھ زنان خانے واپس چلی جائیں۔ رحیم بیگم کی ت میں حاضر ہو کے جانے اب وہ کیسی فسانہ طرازیوں کا ظاہر ہے، اسے اور سننا اور دیر ان ہی کریں گی۔

○●○

نہیں بیچے کے قریب ٹھہل واپس آ گیا اور میں نے جانا، اسے کئی پاڑ ہٹا گیا ہے، میرے جسم سے بندھی رہاں ٹوٹ گئی ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس کے آنے پہلے کہیں سید محمود علی نہ آجائے میں اس سے کسی مہلتے، مفاد و فساد میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے پاس ہی راست تھا کہ ٹھہل کے آنے تک سید کو بھی بھیجے یا ن کے زہر رکھ لوں۔ ٹھہل اتنا تھا کہ ہوا انہیں لگتا تھا۔ لے کا جڑا دیکھ کے اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ”یہ کیا رہے؟“ وہ تنک کے بولا۔

”میں نے انہیں بتایا تھا کہ مجھے تمہارا انتظار ہے۔ ابھی یہاں سے نہیں جانا، یہ نہیں۔“۔۔۔ دربان نے قن تان لیا۔

ٹھہل نے بھاری بھری۔ ”اس نے کچھ زیادہ ہی کھایا۔“ وہ بھڑک کے بولا ”جاؤ رہے، تمہاری ضرورت اور حری ہے۔“

اس نے جب ہاتھ جھٹک کے انہیں باہر جانے کے لیے تہ ان کی سمجھ میں آیا۔ وہ ایک دوسرے پر گرے پڑتے کمرے ہوئے لیکن باہر نہیں نکلے چونکہ دربان دروازے جانب بڑھتے بڑھتے ٹھہر گیا تھا۔ وہ ٹھہل کے آگے ہاتھ لے کر کھڑا رہا، یہی نے اس کی تھکید کی۔ ”تو تنگی مت کر،“ اس کے آگے میں ابھی کوئی دیر نہیں ہے پھر کھولنے پڑ جائیں نہ ٹھہل سے کئی سے کہا۔

یہ ایک سے اس کی طرف اچھال دی۔ بندوق میرے ہاتھ رہاں گردن میں نے پھر کی سے جھک کے اس پر قبضہ کر لیا۔ ہاتھ جوڑتا ہوا بھیل ہوئی آنکھوں سے جھٹل کو دیکھتا۔ خود کو ٹوکے پر وہ حرکت میں آیا اور اپنے ساتھیوں

کے ساتھ سر جھکا کے زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے میں خاموشی چھائی۔ پانی پی کے ٹھہل مسری کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا ہتھ بھنڈا پڑا تھا۔ سر پوش ہٹا کے اس نے انگلی سے چلم کی راہ کرید کر پھر پیری لگا کے لیے بے کش کھینچ لگا۔ وہ اپنے ساتھ کاندہ کا ایک تھیلہ لایا تھا۔ تھیلے پر روغنی دھبے پڑے تھے ”بڑی دیر لگا دی تم نے؟“ میری آواز دھجی تھی۔

”ہاں رے،“ اور ہی گاڑی ٹائم بے نہیں تھی سسری، بڑھو نے گردن میں رسی الگ سے ڈال رکھی تھی گاڑی چلنے نے ہی پھندا بنایا۔“

”وہ بھی ان کے ساتھ تھا، وہ وہ ظفر؟“

”ابھی اس کو اپنے کھونٹے پر کٹنا چاہیے، بعد کو مل جائے گا ان سے۔“

”کس طرف بھیجا ان کو؟“

”کٹ میں وہی ابھا کٹن ہے۔“ وہ بددلتے ہوئے بولا ”دوری کا رستہ ان چھوٹی موبیوں کے لیے ٹھیک نہیں رہتا۔“

میں سمجھ گیا، ابھا کٹن سے اس کی مراد زریں سے تھی۔ ابھی کچھ عرصے پہلے ہم نے سلمی کو وہاں بھیجا تھا، اب یہ تینوں ”فردزاں“ یا ”کٹن“ اور نصیر بابا وہاں چلے گئے۔ منیر علی کا خاندان، نیساں اور اکبر پہلے ہی وہاں تھے۔ خاتم بھی شاید اس دوران میں حیدر آباد واپس آچکی ہو۔ جگہ کی کوئی کی تو نہیں تھی وہاں۔ ٹھہل ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، ابھی انہیں زریں ہی کے پاس جانا چاہیے تھا۔ یہی کاما حوال ان کے لیے بہت اچھی ہوا اور شاید زریں کی طرح ان کی دیکھ بھال بھی کوئی نہ کر پاتا۔ پڑرائی اور نگہداشت میں خاصا فرق ہے۔ زریں تو کسی دریا کے مانند ہے، اس کے پاس بہت سایہ، بہت ٹھنڈک بہت رستم ہے، وہ بھی تو ایسے وقت سے گزری ہے۔ دوسروں کا دھک خوب سمجھتی ہے۔

میں ٹھہل سے اور بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کاندہ کا تھیلہ میری طرف سرکایا، ”کچھ کھالے رے۔“ وہ بو بھل آواز میں بولا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے چونک کے پوچھا۔

”اور ہی اب دانہ دانہ باند ہی جان۔“ بیچ میں دوٹو والا دکھائی پڑ گیا۔ جلدی کر، پھر ٹائم لے نہ لے۔“

”تم نے کچھ کھایا؟“

”اور ہی اڑے پے چائے کی پیالی پی تھی،“ انگریزی دیکھت بھی ساتھ تھے۔“

”مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔“

”تموڑا تنہیج لے، ہاں کچا ہے سارا، بعد کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”تم بھی ساتھ دو۔“

میں نے قہقہے سے دوڑنے نکال کے پہلوں کے لیے رکھی ہوئی رکاوٹوں میں منتقل کیے۔ تازہ کچوروں، سوچی کے طوے، ترکاری اور برتنی کے سموں سے نصف تھلا بھرا تھا۔ ابھی سب چیزیں گرم گرم تھیں۔ دیکھی گھی کی خوشبو لگ سے پچائی جاتی ہے۔ سارے کمرے میں پھیل گئی۔ ایک دو کچوریاں، تھوڑا سا طوہ میں نے لک لک وجہ سے زہر مار کیا اور اس نے میری وجہ سے۔

ساری چیزیں تقریباً کچی تھیں۔ جی ٹھکانے پر نہ ہو تو کسی خوش منظری اور کیا خوش ذائقہ۔ نسل آنکھیں موند کے کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ مجھے بہت الجھن ہو رہی تھی۔ کمرے میں شعلے شعلے ایک بار میں نے دروازے پر جا کے جالی کے بار دیکھا۔ دور راہ داری میں نذرہ اور بشارت گھومتے نظر آئے۔ انہیں یقیناً ہماری نگرانی پر متعین کیا گیا ہوگا۔ پھر تو بڑے دروازے پر بھی خاصا اہتمام ہوگا۔ میں نے نسل کی نقل میں بستر لیٹ جانا چاہا لیکن آوی آوی میں مٹی مٹی کا فرق ہوتا ہے۔ کوئی جیسے میرا جسم نوٹنے لگا۔ بیماری کے دوران میں روز و شب اس کمرے میں رہتے ہوئے گوشے گوشے سے واقفیت ہو گئی تھی۔ یہی کمرہ جو کل تک بلکہ صبح تک راحت و آرام کا سبب بنا ہوا تھا، اب اس کے دروازے پر کٹ کھانے کے درپے تھے۔ کچھ واضح نہیں تھا کہ اس نفس سے کب اور کس طرح رہائی نصیب ہوگی۔ سید محمود علی ہمارے ننگے میں ہار پھول ڈال کے ہمیں رخصت نہیں کرے گا۔ نسل کو بھی کچھ اس کا احساس ہوگا، وہ ہم گم سم سا لگ رہا تھا۔

پانچ بجے گھڑی کی آواز پر نسل نے آنکھیں کھولیں، گھڑی پر اپنی نظریں ڈالی اور بازو جھٹکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں روشنی کم ہو گئی تھی۔ وہ باہر جانے لگا تو میں نے بے تابانہ پوچھا ”کہاں کہاں جا رہے ہو؟“

”ادھر رہی ہوا بھاری ہے، تھوڑا تازہ کی دیکھتے ہیں۔“ وہ منہ بنا کے بولا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی باہر نکلیا۔ ہم دونوں کمرے کے پاس رکھی ہوئی آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ واقعی باہر کی ہوا کمرے سے بہت مختلف تھی، نرم اور خشک۔ دیواروں میں ہوا بھی قید ہو جاتی ہے، آزاد ہوا کی بات ہی اور ہے۔ نذرہ اور بشارت ابھی تک راہ داری میں موجود

تھے۔ وہ ہمارے پاس نہیں آئے تھے اور کچھ آڑ میں ہو کر آسمان سے ابھی تک بادل نہیں بٹے تھے لیکن بارش کے بھی نہیں تھے۔ کئی بار میں نے نسل کو کھینچنے، نڈھالے اور وہ کیا لیکن اسے دلچسپ کے بہت ہی نہیں پڑتی تھی۔ میرے ذہن میں واضح نہیں تھا کہ کون سی عقدہ کشائی مطلوب ہے۔ شاید مجھے کسی گدازی ضرورت تھی اور تھکا تھکا سر دست وہ اس صلاحیت سے عاری ہے۔ اس حالت بھی مجھ سے جدا نہیں، مسائل اور مسائل ایک ہی میں سوار ہوں تو کوئی کیا سوال کرے اور کوئی کیا جواب دے۔

ہمیں باہر آئے دس منٹ سے زیادہ نہیں گزرے۔ گے کے سید محمود علی ایک درمیانہ عمر ایک پختہ عمر کے بھاری بھر کم آدمیوں کے ساتھ راہ داری میں نظر آیا۔ اس کے ساتھیوں کے تن و پوش سے آسودہ حالی نمایاں تھی۔ سفید و حقو اور سلک کے کرتے میں ملبوس تھا، دوسرا پاجامے اور نل نل کرتے میں۔ اس کے گلے میں سونے کا زنجیر بھی پڑی تھی کرتے کے من بھی سونے کے تھے۔ وہ کی رنگت تھنے تانبے جیسی تھی۔ دولت اور اختیاری کی چرے اور آنکھوں سے چھلکتی ہے۔ ان کے پیچھے کچھ سے نذرہ، بشارت، ابن اور دربان کے علاوہ چند اور تھے۔ کندھے سے لٹکنے کے بجائے ہندو دربان کے ہاتھ دی، ہوئی تھی۔ سید اور اس کے ہم راہیوں کی رفتار تیز نہیں سامنے دیکھ کے انہوں نے سبے بغیر تامل کیا اور سید ہاتھ اٹھا کے اپنے عقب میں آنے والوں کو روک دیا۔ انہیں اس تیزی سے ہماری طرف بڑھے اور ہمارے سامنے آگے ٹھہر گئے۔ میری توقع کے مطابق سید محمود علی کے سر سے شعلے لپک رہے تھے۔ تاہم وہ خوں بار آنکھوں سے دیکھا گیا۔ اس کے تھپتھے اور ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ اس کے ایک ساتھی نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے ہاتھ دیا۔ ”کہاں ہیں وہ؟“ سید نے کوئی تہدید ضروری نہیں شدت غصہ سے اس کی آواز بھرا گئی۔

”کس کو پوچھتے ہو صاحب؟“ نسل نے سادگی سے ”تھوڑا رساں سے بات کرو۔“

”کہاں ہیں وہ؟ وہ تئیں؟“ سید محمود علی نے طنز میں تکرار کی۔

”وہ تو دور چلے گئے۔“ نسل نے گہری سانس بھری۔ ”کہاں کہاں؟“ سید بیرخ کے بولا اور پیچھے لگا پوچھتے ہیں؟“

”کیا بات کرتے ہو صاحب! آپ کو کیسے بول دیں۔“

”تو تم نہیں بتاؤ گے؟“

”یہی اسی بات کرتے ہو آپ۔“ نسل نے تڑپ سے کہا۔ ”ہم نے ادھر سے ان کو نکالنے میں ٹھیک کر دیا ہے، یہی ہے نکالنا پوچھتے ہو۔“

”یعنی تم ہی نے انہیں یہاں سے بھیجا ہے۔“ سید نے بڑی کے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بنیادی انداز میں بولا ”دیکھا، دیکھا تم نے! یہ کیا کیا ہے۔ یہ۔“

سید کے معمر ساتھی نے گہنی مار کے جھلکا مشورہ دیا اور طبعی ہوئی آواز میں نسل سے مخاطب ہوا ”تم نے ایسا کیوں کیا تری ماں کی؟“

”اب کیا صاحب! ان کی مرضی یہی تھی۔ ان لوگوں نے ہم سے جی کی تھی۔ ہم نے سارا آگیا پیچھا جان کے ان کو ادھر سے نکال دیا۔“

سید محمود علی پھر اگڑا گھبراہٹ کے پختہ کار ساتھی نے اسے خاموش کروا کے نسل سے کہا ”تم اس گھر کے مہمان ہو یا مالک؟“

”کام کی بات کرو صاحب! ہم نے پی نہیں باندھ رکھی ہے۔ کلا بیلا ابھی طرح سے بیٹھا ہے اپنے کو۔“

”تم کو اس کا انجام معلوم ہے۔“ معمر آدمی کی آواز بھی جھجکی ”ادھر تمہارا بڑا مان کیا گیا؟ تم مہمان رہے ہو۔ تمہارے لیے اچھا ہو گا کہ تم سید جی طرح بتاؤ، کہدھران لوگ کو بھیجا ہے یا بھیجا ہے۔“

”آگے کا پورا جان کے ہی ایسا کیا ہو گا صاحب!“ نسل نے بات لیتے میں کہا ”ایک بات بولیں، آپ ان کے نگلی ماچی ہو، آپ سب سے آگے تو ٹھیک ہے سید صاحب سے ہم بات کر سکتے ہیں۔ سارا سمجھا دیں گے ان کو۔“

”یہ اس طرح نہیں مائیں گے۔“ سید اپنے آپ سے میں نہیں تھا، پھنکار رہا ہوا بولا ”مجھے تو یہ اور قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے انہی کی زبان میں بات کرنی چاہیے۔ ہورا! تم نہیں جانتے، یہ جو اس رستم کے ساتھ چھوٹا سورا ٹھکانے، اس حرام زادے نے گھر کے اندر گھس کے پردہ دار عورتوں میں گھس کے کیا حرم زدگیں کی ہیں۔ بہت ٹوٹ اور کٹائی ہے اس نے۔ کزور عورتوں پر ہاتھ اٹھایا ہے، مارا پیٹا ہے ان کو۔ یہ چاتو لے کے گیا تھا دہاں، اور اور۔“ کیا کیا باتیں تھیں۔ اوپر جا کے خود بانو سے چھو اور دیکھو، اس فحش کی کیا حالت ہے۔ اس حرای نے کوئی کسر نہیں بھرنی۔“ سید نے میری طرف ہاتھ اٹھا کے قہر کو لپٹے میں

”کما“ زندگی میں اتنا بڑا دھوکا نہیں ہوا، یہ مرہا تھا سورا کا پچھ۔ میں نے اسے روکا اس کا علاج کرایا، ابھی نے اس کی خاطر دیکھی۔ ہر ایک آگے پیچھے بھرتا تھا۔ اس کتنے نے کیا سلوک کیا! ”وہ جیونانہ انداز میں سر ہلائے لگا۔“

میری رکس پیچھے گئی تھیں۔ جی میں آیا، اسے زور کا طمانچہ ماروں یا گدی سے پڑو کے زمین پر پڑوں لیکن نسل نے مجھے نہیں اٹھنے دیا۔ اس نے سلگتی آواز میں کہا ”اپنے کو آپ سے زیادہ آتی ہے صاحب! اچھا ان کے بولو تو اچھا ہے۔“

”تم نے کہہ رکھا ہے لڑکی لوگ؟“ سید صاحب کے دوسرے ساتھی نے پہلی بار مدخلت کی ”دیکھو، ابھی کچھ نہیں گیا۔ تم کو نہیں پتا، آگے تمہارے لیے کتنی بڑی مصیبت پڑ سکتی ہے تم کیا سمجھتے ہو، اس طرح شریف گھرانے سے عورت اٹھا کے لے جاؤ اور کچھ نہ ہووے؟ اس؟“

”سید صاحب! ابھی ایسا بولتے تو ان کو اور جواب دیتے۔ شریف وریف کی بات جانے دو صاحب اور زیادہ اونچا بھی مت بولو۔“

”نہیں نہیں۔“ معمر آدمی نے ہونٹ سکڑ کے کہا ”تم ٹھیک کہتے ہو سید! یہ ایسے نہیں سمجھیں گے۔ ایسے لوگوں کو منہ نہیں لگانا چاہیے۔“

”میں تم سے پہلے ہی کہہ رہا تھا، یہ اور قسم کے جانور ہیں۔“ سید نخوت سے بولا ”یہ بچے جراثیم پیشہ معلوم ہوتے ہیں، ایک نمبر کے۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟ تمہارے ساتھ اب کیا کیا جائے؟“

معمر آدمی نے حقارت بھری آواز میں کہا ”جو ہم کو پسند نہیں، اس پر مجبور مت کرو۔ بنگوان کی سولڈ بہت برا ہو جائے گا تمہارے لیے، پیچھا تو گئے۔ آگے ہم نہیں ہوں گے، جو ہوں گے، وہ بالکل دوسرے لوگ ہیں، بالکل بنگلی، دیکھو! ہمارے ہاتھ پیرہ نہیں جو دکھائی دیتے ہیں۔ تم ہم لوگوں کو نہیں جانتے۔“

”جانتے ہیں صاحب! اور! یہ نیچے تک جانتے ہیں۔“

آپ سارے راتے ہمارے لوگ ہو، بادشاہ سلامت۔“

معمر آدمی ہونٹ کانٹے لگا اور شانے اچکا کے بولا ”انسپیکٹر بوس کو بلاؤ سید! وہ ان طرم خانوں سے مل کے بہت خوش ہوگا۔ اس نے بڑے سے بڑے جانور کو سدھایا ہے، یہ دو کوڑی کے کیا پیچھے ہیں۔ دو چار جھٹکوں میں پورا دکھائی سنائی دینے لگے گا۔“

”اور وہ؟ وہ اپنا پاتو، وہ مرکھنا ساند، تاہو کس دن کام آئے گا۔“ ادھیر عمر سفائی سے بولا ”اسی سے کام بہن جائے گا۔“

”نہیں نہیں۔“ معمر آدمی نے ہونٹ سکڑ کے کہا ”تم ٹھیک کہتے ہو سید! یہ ایسے نہیں سمجھیں گے۔ ایسے لوگوں کو منہ نہیں لگانا چاہیے۔“

”میں تم سے پہلے ہی کہہ رہا تھا، یہ اور قسم کے جانور ہیں۔“ سید نخوت سے بولا ”یہ بچے جراثیم پیشہ معلوم ہوتے ہیں، ایک نمبر کے۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟ تمہارے ساتھ اب کیا کیا جائے؟“

معمر آدمی نے حقارت بھری آواز میں کہا ”جو ہم کو پسند نہیں، اس پر مجبور مت کرو۔ بنگوان کی سولڈ بہت برا ہو جائے گا تمہارے لیے، پیچھا تو گئے۔ آگے ہم نہیں ہوں گے، جو ہوں گے، وہ بالکل دوسرے لوگ ہیں، بالکل بنگلی، دیکھو! ہمارے ہاتھ پیرہ نہیں جو دکھائی دیتے ہیں۔ تم ہم لوگوں کو نہیں جانتے۔“

نہیں تو یوں کتنی دور ہے۔ ناتھو کو میں نے پہلے ہی بلا بھیجا ہے۔ آتا ہی ہوگا۔

”بات مت لگاؤ۔“ معمر آدمی نے ٹھٹھل کو تنبیہ کی۔
”ابھی ساری گھر کے اندر ہے۔“

”بات تو آپ لگا رہے ہیں۔“

”ہم لگا رہے ہیں۔“ معمر آدمی جھنجھلایا۔

”ہم ٹوٹوٹ کے کھڑے گئے ہیں۔“

”تو تو کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”ہم جا بھی سکتے تھے پر ہم کو سید صاحب سے کچھ بولنا تھا۔“

”کیا بولنا تھا؟“

”ان کی باتوں میں مت آؤ بسوا! سید چن چنا کے بولا

”ان کے یہاں موجود ہونے میں بھی کوئی پھیر ہے۔ ان

بد معاشوں نے پورا جال پھیلایا تھا، پوری سازش کی تھی۔

زمینوں کی بات کرنے کے لیے مجھے گھر سے باہر بھیجا۔ ایک

آدمی نے اور جا کے چاقو کے زور پر عورتوں کو ایک کمرے میں

بند کیا، دوسرا لڑکیوں کو کتے کے نکل گیا۔ وہ نمک حرام نصیرزہ

کھوست اس کو تو میں دیکھ لوں گا۔ مٹی پلید کی اس نے، آخر

میں۔ ان حرام زادوں نے اسے وام میں پھنسا۔ بڑھا

معصوم لڑکیوں کو پیلے بھانے سے باہر لے گیا۔ یہ دونوں ساتھ

جاتے تو ان کو ڈر تھا کہ زنان خانے سے شوراٹے گا اور یہ ذرا

سی دور پہنچ جائیں گے اور ان کے پیچھے لوگ لگ جائیں گے۔

یہ ایک بڑا والا نصیر بابا کے ساتھ تھا۔ دونوں ساتھ ہوتے تو

انڈھے چوکی دار بھی نہ جانے دیتے، اور دونوں ساتھ ہو کیسے

سکتے تھے۔ زنان خانے میں ایک کو عورتوں پر قبضہ جمانا تھا۔ وہ

وہاں کنڈلی مار کے بیٹھا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ دوسرا

لڑکیوں کو دور لے جا چکا ہو گا تو وہ باہر نکلا اور واپس اپنے

کمرے میں آیا۔

”پلوٹ کے ادھر کیوں آیا؟“ ٹھٹھل نے کیسے لہجے

میں کہا۔

”پھر نکل نہیں سکتا تھا۔“ سید نے بھنا کے کہا ”کمرے

میں سامان بھی پڑا تھا۔ زنان خانے سے عورتوں نے پیچ پکار

مچادی تھی۔ اس سے پہلے نکلنے کی کوشش کرتا تو کتنی دور

جایا، شور سنتے ہی لوگ اس کے پیچھے بھاگ پڑتے۔ ملازم

پہلے ہی اس کے دیر تک کمرے سے غائب رہنے پر ٹھٹھل گئے

تھے۔

ٹھٹھل نے یا میں نے جرح نہیں کی کہ جناب! زنان

خانے سے پیچ پکار تو بہت بعد میں انہی تھی۔ اس سے پہلے اتنا

وقت تھا کہ بڑے دروازے سے نکلنے کی کوشش کی جا رہی

زنان خانے سے بلند ہونے والے شور کے بعد نمک خوار

نے بندوں ترک کر دی تھی۔ بندوں ہاتھ میں آجائے کے

ان کی حالت ایسی کی جاسکتی تھی کہ کوئی اپنے پیروں سے

کے باہر نہ جا سکے پھر بے ہتھیار ایک ہی دربان پر

دروازے پر رہ گیا تھا۔ اس سے نمٹنا آدمی کے لیے کیا

تھا جو کمرے میں پانچ ملازم بے دست و پا کر چکا ہو لیکن

کسی تاویل و تکرار میں پڑنے کی ضرورت کیا تھی؟ جو

رہیں ٹیکم، خادماؤں اور خدام نے اسے باور کرایا تھا، خواہ

شاہد و عیار کا پناہ ہم کمان تھا اس سے ہمیں کیا سروکار

”ایک کامیاب نمبرے رہنا اور دوسرے کا لوٹ آنا

سازش کا ایک حصہ ہے۔ اس میں بھی کوئی بڑی عیار

ہے۔“ سید کی زبان اس کے اختیار میں نہیں تھی۔ وہ گلاب

بکنا رہا اور کہنے لگا کہ ہمیں اس کی حیثیت اور مرتبہ

پوری طرح انگی نہیں ہے۔ وہ اپنے اثر و رسوخ کے بارے

میں کن ترانیاں کرنے لگا پھر نفرت بھرے لہجے میں اپنے

ساتھیوں سے بولا ”یہ غنڈے وقت گزار دی کر رہے ہیں

مجھے کی کوشش کرو۔“

پختہ عمر شخص نے یہ مشکل سید کی زبان کو لگا دی اور

ٹھٹھل سے بولا ”ہاں، یہ کیوں نہیں گئے تم ادھر؟“

”تم سے کیا بولا؟“ ٹھٹھل نے آگے بڑھ کر انداز

کہا ”ہم کو سید صاحب سے تھوڑی بات کرنی تھی۔“

”کیسی بات؟“

”اکیلے میں کریں گے۔“

”اکیلے میں کیوں؟ ہم میں اور سید میں کوئی عید بھا

نہیں۔ بولو کیا بات ہے۔“

”اس حرام الدہر کے دماغ میں کوئی اور بد معاشی ہے

سید دیکھتی آوازیں بولا۔

”کوئی پیسے دیئے کی بات ہے؟“ درمیانہ عمر کے آواز

نے چلے پن سے پوچھا ”ایسا ہے؟“

”کتنادے سکو گے؟“

”اچھا اچھا پیسہ چاہیے، پہلے کہہ دیا ہوتا، بات

ہے۔“ معمر آدمی کی آوازیں غڑا اور تسخری آمیزش کی

”کتنا پیسہ بولو۔“

”بولی تو آپ لگاؤ، دونوں پر یاں ہیں۔ لگتا ہے، ادھر

اتری ہیں۔ وہ دو بولتے ہیں اور والے نے اپنے ہاتھ سے

ہے۔ دور دور تک ان جیسی نہیں ملیں گی۔“

سید آگ بگولا ہو گیا اور مخالفت جتنے لگا۔

پختہ عمر آدمی نے پوچھا ”اب تمہارے پاس ہیں دونوں؟“

”اس میں تم ہی تباہ کرو گے۔ بولو کتنا چاہیے۔“

”ہم لوگ آپ لوگوں کے لیے؟“

”ہم لوگ کی بات چھوڑو، تم نے پنے میں بھی نہیں دیکھا

ہوگا۔ سید ہی طرح بولو کتنا چاہیے؟“

”جانے دو صاحب! آپ نہیں دے سکو گے۔ آپ کو

آوی کا مول کرنا نہیں آتا۔“ سید تمنا کے بولا۔

”دیکھتا تم نے بسوا! سید تمنا کے بولا۔

”دیکھ رہا ہوں۔“ پختہ عمر آدمی کی آنکھیں لال ہو گئیں

”دیکھ ہے سید! یہ تم سے بات کرنا چاہتے۔“ دیکھ لو ان

کو۔“

”کوئی بات وات نہیں کرتا اسے، ہم کو گھما رہا ہے۔ یہ

مارے بھانے ہیں۔ یہ کیا بات کرے گا ہم سے، بس وقت

کانا چاہتا ہے۔ اس کو صاف تباہ کر کے پہلے لڑکیوں کے بارے

میں تباہ بات بعد میں ہوگی۔“ سید نے فیصلہ سنا دیا ”اب

برمت کرو، بہت ہو چکا بہت ہو چکا۔ یہ ایسے زبان نہیں

کھولیں گے۔“ اچانک اس نے پلٹ کے اپنے پیچھے کھڑے

ہوئے آدمیوں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ان کی تعداد پہلے

تے بڑھ گئی تھی اور وہ غصہ پڑھتے تھے کہ دوڑ پڑیں۔

”وہ گینڈا ناتھو بھی آیا ہے۔“ ادھیڑ آدمی جوش میں

اچھل پڑا ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،“ اب وہی ان لوگوں کو دیکھے

گاہت چربی چڑھائی ہے اس نے۔“

وہ سارے زیادہ دور نہیں تھے۔ ان کے درمیان منڈے

ہوئے سر، گول چہرے، سرمئی رنگت، موٹی گردن، کھٹے

ہوئے تھے ہوئے جسم، اوسط قد کا ایک آدمی بھی تھا۔

سید کے کان میں چاندی کی دریا، ہاتھ میں چاندی کا کڑا، گردن

میں سوت سے بنا ہوا لال اور پیلے رنگ کا کٹا، خاکی رنگ

کے کرتے چپاے میں ملبوس تھا۔ جینتیس سے زیادہ عمر نہیں

ہوگی۔ وہ دونوں ہاتھ تنہم سے دوڑ کیے، سر ہلاتا، کسی قدر

مستند انداز میں جھومتا ہوا ان تینوں کے سامنے آ کے ٹھہر

گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شرارے کو کند رہے

تھے، یہی ناتھو ہوگا۔ اس کے دائیں بائیں کم و بیش اس کی

دشمن قطع کے دو آدمی بھی اڑے سے متعلق معلوم ہوتے تھے،

کرمش پنچو اس سے کہ ناتھو نے پہلے ادھیڑ آدمی کو ہاتھ جوڑ

کر کرنا کرنا پھر معمر بسوا اور سید کو۔ ”ناتھو، ناتھو! آیا

راہ! اتنی دیر لگا دی تم نے، اذیت دہر آدمی نے تازہ دراندہ

لہجے میں کہا۔

”دیر کہاں مہاراج! سندھیا پہلے ہی چل پڑے۔ آپ

بلاؤ اور ہم دیر کروں۔ کیوں سوچا آپ نے ایسا۔“ ناتھو کی

آواز اس کے بھاری بٹنے کی نفی کرتی تھی۔ چٹکی سی ٹھٹھکی ہوئی

آواز۔ کہنے لگا ”تم تو میرے ادھر کھڑے ہیں کہ مہاراج اب

دیکھتے ہیں، اب دیکھتے ہیں۔ یہی سوچ کے ٹھہرے رہے کہ ابھی

اپنے کی ضرورت نہیں۔“

”ناتھو! جو تم دو آدمی دیکھ رہے ہو۔“ ادھیڑ آدمی نے

بے مہربانی سے کہا ”یہ کتنے اپنے کھڑے اپنے سید صاحب کے گھر

سے دو عورتیں اٹھا کے لے گئے ہیں۔ تم کو ان حرام زادوں

سے پوچھنا ہے۔ یہ ان کو کدھر لے گئے ہیں کدھر رکھا ہے

اور اب کیا مرضی ہے ان کی۔“

”عورت لے گئے ہیں، ہائیں؟“ ناتھو کے ماتھے پر بل

پڑ گئے۔ ”ایسا کیسے؟“ ناتھو نے اپنے گال باری باری چھوئے

اور حیرت سے بولا ”لاکھی بابو! پھر یہ ادھر کیوں ہیں؟“

ادھیڑ آدمی یعنی لاکھی بابو نے کہا ”یہ انہی سے پوچھو، بکے

حرامی لگتے ہیں۔“ وہ منمنائے ”ہم پولیس بلا سکتے ہیں لیکن

ابھی نہیں، بعد میں ضرورت پڑی تو دیکھیں گے۔“

ناتھو نے پھر پٹی سے اپنا رخ بدلا اور سڑکی ہوئی آنکھوں

سے ہمیں گھورتا رہا ”ہائیں مہاراج! کوئی دھوکا تو نہیں

ہو گیا۔ یہ ایسے نہیں لگتے۔“

”جو ہم بولتے ہیں، اتنا ہی جانو۔“ لاکھی بابو نے بگڑ کے

کہا ”دیر مت کرو، ہماری بھاشا یہ نہیں سمجھتے۔ ذرا اپنی بھاشا

سمجھاؤ۔“

ناتھو کے چہرے پر فکر و تردد کا غبار ہویدا ہوا۔ چند قدم

چل کے وہ بالکل ہمارے مقابل آ گیا۔ ”کیوں بھیا! یہ ہم کیا

سنتے ہیں؟“ وہ دیدے گھما کے بولا۔

ٹھٹھل بے حرکت کھڑا رہا۔

”ہمارے بارے میں ان کو کچھ بتایا مہاراج؟“ ناتھو

نے پلٹ کے لاکھی بابو سے پوچھا۔

”تم خود بتاؤ۔“ لاکھی بابو نے اچکتی آواز میں کہا۔

”ہوں۔“ ناتھو نے لمبی سانس کھینچی ”کیا وچار ہے بھیا؟

ٹھیک ہے۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے نیم جینتیس نیم تہیدی

انداز میں بولا ”پہلے ہم اپنے بارے میں بول دیں۔ نام تو سن

لیا ہو گا ہمارا۔ چھٹ پن میں پٹنا سے آئے تھے پر ادھر لوگوں

نے آسن سول کا راجا جانا کے بیڑی ڈال دی۔“ چند لمبے اس

نے سکوت کیا پھر کہنے لگا ”اور کام کے بارے میں کیا بولیں، وہ

ابھی تم جان لو گے، بہت الٹی میپڑیاں کے ہیں، سیدھوں کے

ساتھ سیدھے، میڑھوں کے ساتھ بہت میڑھے۔“ یہ کہتے

ہوئے اس نے ٹھٹھل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی

کوشش کی۔ ہٹل نے نظریں جھکا لیں ”دیر سے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ جب اٹھ جاتا ہے تو سر اچھر رکتا نہیں پھر اپنے بس میں کچھ نہیں رہتا“ سمجھ۔
ہٹل خاموش رہا۔

”کچھ سنا، ہم کیا بولتے ہیں، ہم سے عمر میں بڑے ہو، کچھ ہمارا دھیان کرو، اپنے سے اوپر والے پہ ہاتھ اٹھانے کا پاپ ہم سے نہیں کرواؤ۔“

”تم سامنے سے ہٹ جاؤ استاد!“ ہٹل نے پہلی بار آہستگی سے زبان کھولی۔

”نا تھو کی آنکھیں چڑھ گئیں“ سامنے سے ہٹ جائیں۔“ اس نے مسکندہ اڑانے والے انداز میں ہاتھ نچا کے کہا ”پھر کیا کرس، پھر بولو گے، ادھر سے چلے جائیں۔ ہمارے ہوتے ہماری نگہیا، ہمارے گھر سے عورت اٹھا کے لے جاؤ، ہم تالی بجائیں پھر؟“ اس کی آواز تیز ہو گئی ”پتا ہے، یہ کون لوگ ہیں۔ یہ بڑے مان سان والے لوگ ہیں۔ اتنی دیر سے لیا، بت ہے۔ یہ تو آگ لگا دیں گے۔ ہم پہ بھروسہ کرتے ہیں جو ہم کو بلوایا ہے۔“

ہٹل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نا تھو خاصا جربز ہوا۔
”کیا بولتے ہیں، ہم، اونچا سنتے ہیں کیا؟ ہماری بات کا جواب دو۔ یہ مون برت کا سے نہیں ہے۔“

”لاکھی بابو کو تاؤ آگیا“ کیا نا تھو! کیوں دیر لگا رہے ہو، باتوں کا سے نہیں ہے، باتیں تو ہم کر چکے ہیں۔“

”آپ شانت رہو، نا تھو کو بلایا ہے تو اس کو اپنا کام کرنے دو۔“ نا تھو نے اپنے منہ کو نرمی سے لتاڑ دیا اور سکون سے ہٹل کو مخاطب کیا ”مناراج! لاکھی بابو کو جلدی ہے۔ ہم ٹھنڈا کر کے کھاتے ہیں پر ان کا بھی کچھ دھیان کرنا ہے۔“ اس نے تند و ترش لہجے میں ہٹل کو آگاہ کیا کہ کسی نارردائی، نازیبائی کے بغیر ہم اسے لڑکیوں کے بارے میں بتادیں تو مناسب ہوگا۔“

”ہم کو جو بولنا تھا، بول دیا ہے۔“ ہٹل نے سر دلیجے میں کہا۔

”کیا بول دیا ہے۔“ نا تھو گرج کے بولا ”ان کو چھوڑ دو، اب ہم سامنے ہیں۔“

”اپنے پاس نیا کچھ نہیں ہے۔“ میری حیثیت تماشائی کی ہو گئی تھی۔ نا تھو نے مجھ پر اب تک کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بس ایک غلط انداز نگاہ ڈال کے رہ گیا تھا مگر یکایک اس کے دونوں سامنے میرے دائیں بائیں آکے کھڑے ہوئے اور ایسی دم نا تھو نے ہٹل کو کھانچا یا مارا

مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ مجھے معلوم تھا، اس کے جواب میں وہ کیسی ندامت سے دوچار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ نا تھو کا ہاتھ بلند ہوا، ادھر تک جھمکے کی مہلت میں اس کی کٹائی ٹھنڈل کے نیچے میں جکڑ گئی۔ نا تھو اس کی توقع نہیں سمجھی۔ میرے سوا کسی کو بھی نہ ہوگی۔ ہٹل کے نیچے میں ایسی گرفت تھی کہ اضطراری طور پر اچھلنے اور جسم کی ساری قوت صرف کرنے کے باوجود وہ اپنا ہاتھ نہ چھڑا سکا۔ ہٹل نے زیادہ دیر نہیں لگائی، دوسرے ہاتھ سے اسے چائٹا رسید کر دیا۔ چائٹے کی ضرب کے ساتھ ہی ہٹل نے اس کی کٹائی سے نیچہ ہٹا لیا۔ ہٹل نے طمانچہ کی شدت کے لیے ہاتھ ڈھیلا ہی رکھا ہوگا۔ نا تھو لڑکھڑا گیا۔ ہٹل نے اسی اکتفا نہیں کی، کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے نا تھو کی پنڈلی کے عین وسط میں ٹھوک ماری۔ پنڈلی کی ہڈی ضرور مجروح ہوئی ہوگی۔ نا تھو توازن قائم نہ رکھ سکا، ڈگمگا تا ہوا فرش پر لڑھک گیا۔

نا تھو کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ لمحہ میں گزرنے والے اس منظر سے سید محمود علی، اس کے دونوں اقبال مند ساتھی اور ان کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگ سیدھے ہو گئے۔ اپنے چشم دیدہ کے لیے حیرت و تجسس کی ایک مہلت انہیں مطلوب تھی۔ ادھر نا تھو کا شرمساری کرنے کے لیے اٹھ جانا ضروری تھا۔ اس کے دونوں حاشیہ بردار مجھے چھوڑ کے ہٹل پر ٹوٹا چاہتے تھے کہ اس نے کراہتے ہوئے انہیں جھڑک دیا اور بمشکل تمام انہیں ٹھک کامیاب ہو گیا۔ اٹھتے اٹھتے اس نے جیب سے چائو نکالا اور کھڑکبا کے کھول بھی لیا۔ پنڈلی کی تکلیف سے اس کا چہرہ بڑھ ہوا تھا۔ ہونٹ کے گوشے سے خون کی دھار پھوٹ آئی تھی۔ وہ بالکل ایک بدلا ہوا آدمی نظر آتا تھا۔ کھڑے ہوتے ہی شط بار آنکھوں سے وہ دوبارہ ہٹل کے قریب ہو گیا اور ڈھٹال سے بولا ”بہت تیزی دیکھائی تم نے بھیا! مزہ آیا۔ کوئی اور سے ہوتا تو بدھائی ضرور دیتے، پر نام کرتے، کیا کریں۔ ادھر دوسرے کام سے آئے ہیں، رام کسم، یہ چکو پورا کا پورا بھائی دستہ سمیت اندر آتا رہیں گے۔ ہم کو بولو، مدھرتے کیا پانی تیری لوگ کو؟“ اس نے جاتو لہراتے ہوئے کہا اور زبردستی کے چائو سیدھا کر لیا، ہٹل کی طرح سیدھا نشانہ لینے کے انداز میں، تاکہ ہٹل سامنے سے آنے کی جرات نہ کر سکے آہستہ آہستہ اس نے فاصلہ کم کیا اور چاقو کی نوک ہٹل کے پیٹ میں گزردی۔ اب دونوں میں کوئی بھی حرکت نہ آتی تھی۔ ہٹل کے پیٹ میں بیڑا ہو جاتا۔ ہٹل بس کچھ جھجھکتے ہوئے باڑی گری

کے اپنا دفاع کر سکتا تھا اور پیچھے اپنی متجانش نہیں تھی۔ پیچھے نزدیک ہی کمرے کی دیوار تھی۔

ہر طرف سکوت ہو گیا تھا، موت کا سا سکوت۔ لاکھی بابو نے ایک بار کھنکار کے ہاتھ کوئی اشارہ کرنا چاہا، شاید احتیاط کا۔ اپنی دیوانہ واری کے باوجود ہاتھ کو بھی احساس ہو گا کہ ہتھل کو کیا مجھے ختم کر دینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اسے اپنا ارادہ متوازن رکھنے کی دشواری پیش آرہی ہوگی۔ وہ اس... شرکارا جاتھا اور خود بھی داؤ پر آچکا تھا۔ اپنی سرفرازی کے لیے اڑے کے آدمی کو بار بار ایسی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بار بار اس امتحان کے لیے اسے تیار رہنا چاہیے۔ وہ یا تو کسی ایسے معاملے میں نہیں پڑتا جہاں ذلت و رسوائی کا اندیشہ ہو پڑتا ہے تو مقابل کو اپنی طرح پرکھ کے ہاتھ اب اس سے واپس بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ایسے شخص پر دیوانگی کا غلبہ ہونا چاہیے۔ اس حالت میں کوئی بھی ریک حرکت اس سے بعید نہ تھی۔ اسے دو مقاصد بیک وقت حاصل کرنے تھے، اپنے محترم و مکرم داعیان کو مطمئن کرنا اور اپنا اعتماد قائم رکھنا۔ دونوں لازم و ملزوم تھے، ہم سے کسی معقول جواب سے زیادہ اسے اپنی فکر ہونی چاہیے تھی۔ ہم سے کچھ حاصل کرنے کی ناکامی اپنی سبکی آئینہ نہیں بتی، خود اس کی ہزیمت اس کی کوشش ہوگی کہ کچھ اور نہیں تو جسمانی طور سے ہمیں پاپا کر دیا جائے۔ یہ اندازہ تو اسے اب تک ہو جانا چاہیے تھا کہ ہم سے کچھ جاننے کی جستجو میں وہ ناکام ہی رہے گا۔

ہتھل بنور ہاتھ کو دیکھتا رہا، کچھ اس ہنر سے بھی مقابل متذبذب ہو سکتا ہے۔ میں اچانک پولو سے اچھل کے ہاتھ کو زیر و زبر کر سکتا تھا، تائید کے لیے میں نے ہتھل کی طرف دیکھا۔ اس کی خاموشی مضبوطی سے تعبیر کی جاسکتی تھی۔ ہاتھ ایک ہاتھ پھیلائے، آگے کی طرف جھکا ہوا، دوسرے ہاتھ سے چاقو، ہتھل کے پیٹ میں کھبے پوری طرح چوڑا تھا اور یہی بل، گھڑکیوں، دھکیوں کا راگ الاپ رہا تھا کہ ہتھل فروزاں اور پارسا من کی وابستگی کا اقرار کر لے ورنہ سب کو سانپ سوگھ گیا تھا۔ بس ایک ہی صورت تھی کہ ہتھل کسی طور ہاتھ کی توجہ منتشر کرے اور اس ایک لمحے کی رعایت میں کوئی تدبیر کرے۔ ہتھل نے ایسا کچھ نہیں کیا۔

”ٹھیک ہے استاد!“ اس نے حتیٰ لے میں کہا ”تم نہیں مانتے“

ہاتھو یہ سن کے اور بے چین ہوا۔ اس کی آنکھوں کی وحشت اور فزوں ہو گئی ”سے تم کو ہم نے پورا دیا۔“

”تم کو بولا تھا استاد! سچ میں مت پڑو۔“

”کیا کیا! ہاتھ کا چہرہ اس کا اپنا نہیں رہا۔“

ہتھل نے مزید سلسلہ کام منقطع کیا اور مٹا اپنا بایاں ہاتھ اس اہتمام سے بند کیا کہ ساتھ ہی ایک قدم پیچھے ہٹ جائے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ کی نگاہ جانی چاہیے تھی۔ ہتھل کے پیچھے بیٹے سے چاقو بھی قدم بھر کے فاصلے پر ہو گیا۔ ہتھل کا مقصد چاقو کے نشانے سے ہٹنا نہیں تھا، چاقو قبضہ کرنا تھا۔ بایاں ہاتھ اوپر کرنا، پیچھے ہٹنا اور لگے ہوئے دائیں ہاتھ سے ہاتھ کی کلائی بکڑنا، تینوں جنبشوں میں ایک آن کی فصل ہوگی۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا جیسی پہلے ہوا ہی نہ ہو بلکہ نظر کا دھوکا ہو۔ چاقو والے ہاتھ کی کلائی بکڑنے ہی اس نے ہاتھ کو منہ پر بائیں ہاتھ سے ضرب لگائی۔ اسے طرانیچہ نہیں کھنا چاہیے۔ اس نے نیچے سے ہاتھ کا زوڑا پ دیا۔ اس کی انگلیاں، ہاتھ کی انگ، آنکھوں اور گالوں میں کھب گئی ہوگی۔ ہاتھ ڈکرائے لگا، ہتھل نے ہتھل کے اس کے جنگاموں میں گھسنا مارا۔ چاقو کی فکر تو بعد کی بات تھی، پہلے اسے خود کو سنبھالنا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ کے ہتھل کی دسترس سے دور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی کلائی ہتھل کے قبضے میں کسی ہوئی تھی۔ اس نے دوسرے کھاتے ہاتھ سے اپنے چہرے پر قابض ہتھل کا ہاتھ ہٹانے کے لیے برت زور کیا لیکن ہتھل کے گھٹنے کی ضرب سے وہ ہرا ہو گیا۔ اس کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چاقو کرتے ہی ہتھل نے اسے پرے دھکیل دیا۔

و غصا اس کے دونوں سامنے ہتھل کی طرف کود پڑے، ہم نے فوراً پیچھے سے دونوں کے بال پکڑ لیے اور ان کے سرایم ٹکرا دیے اور ہاتھ پیر سے دونوں کو پے در پے اتنی ضربیں لگائیں کہ انہیں اپنے آپ کو یکساں کرنے کا وقت ہی نہ مل سکا۔ دربان اور دوسرے آدمیوں کی دخل اندازی کا بھی مجھے خیال تھا۔ میرے پاس منجما بھی تھا، چاقو بھی لیکن ان میں سے کوئی ہمارے قریب نہ پہنچا۔

ہتھل نے فرش پر گر ا ہوا چاقو اٹھا کے ایک نظر اس کی ساخت کا جائزہ لیا اور جھکا دے میں مسودیا۔ ہاتھ اور اس کے سامنے دور ہٹ چکے تھے۔ دربان بندوق تانے ہوئے تھا۔ سید اور اس کے بے قرار دوست مشورے میں مصروف تھے اور ان کی نظرس ہم ہی پر منڈلا رہی تھیں۔ اس دوران ہاتھ بھی کسی قدر اپنے اوسان بحال کر چکا تھا۔ ہتھل نے چاقو اس کی طرف اچھال دیا۔ ہاتھ بری طرح چمک پڑا۔ اسے یقین نہیں آ رہا ہو گا مگر چاقو اس کے سامنے آگیا۔ اس سے چند آنچ کی دوری پر۔ لمبے نے جھٹ اسے اٹھا لیا اور

باکے اسے پھر کھول لیا۔ وہ اپنی جگہ سے نشانہ لے کے ہتھل پر چاقو پھینک سکتا تھا۔ اڑے کے مستند آدمی ایسا نہیں کرے مگر ہاتھ کی حالت بڑی متغیر تھی۔ منہ کھلا ہوا، آنکھیں پٹی ہوئیں۔ یہ اڑے کا کوئی منکرہ نہیں تھا جہاں مقابل کی دوسرے پر چاقو کے داؤ آزمائے ہوئے بے قاعدگی سے بلو جی کریں۔ ہاتھ کو اپنا چاقو واپس مل چکا تھا اور اس کے آئندہ دماغ میں کچھ بھی سا سکتا تھا۔ مجھے اس کی جانب سے ہاتھ اچھال کے نشانہ لینے کے مذموم حربے کی ایسی تشویش میں تھی۔ ہتھل کے ہاتھ سے نیچے بلکہ چاقو گرفت میں لینے کی مشائی ہتھل کو بدرجہ کمال تھی۔

ہاتھ نے جھرجھری لے کے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اس کا سر پھر ہماری جانب تھا۔ ہمارے اس کے درمیان اتنا اصل نہیں تھا۔ چند قدم بعد وہ ہتھل کے رو برو تھا۔ اس رتہ اس نے چاقو اٹھایا پھر لیا نہیں۔ ہتھل سے فٹ ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر آگے وہ مجھد کھڑا ہو گیا۔ لمبے گزر گئے۔ دونوں کے درمیان خاموشی رہی اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک ایک سید اور اس کے پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی جلی جلی آوازوں کی ایک ہوک سی تھی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ہاتھ نے اپنا کھلا چاقو ہتھل کے پیروں میں ڈال دیا ہے اور جھک کے اس کے پیر پکڑ رہا ہے۔

ہتھل نے ہاتھ کا بازو پکڑ کے اسے اٹھایا، اس کی کمرے اٹھ رکھا اور اپنی آستین سے اس کے ہونٹوں سے پینے والے خون کی دھار صاف کی۔ ہاتھ ہونٹ بسورنے لگا۔ اس کی آنکھیں ڈوب گئی تھیں۔ وہ ہتھل سے کچھ کھانا چاہتا تھا لیکن ہتھل نے آنکھوں کے اشارے سے اسے دور ہو جانے کے لیے کہا۔ ہاتھ نے اپنا سر ہتھل کے سینے پر رگڑا اور اگلے ذمہ پیچھے ہٹا اور مڑ کے بڑے دوڑانے کی طرف چل پڑا۔ اگلی بابو نے اسے یوں جاتے دیکھ کے کئی بار پکارا لیکن اس نے جیسے نہ سنا ہی نہیں۔

دربان کو یقینا کسی نے حکم دیا ہوگا، ایک اس کے ہوائی فائر سے ساری عمارت گونج اٹھی۔ یہ ہمارے لیے سید اور اس کے حواریوں کی جانب سے ایک انتخاب تھا۔ فائر کی آواز سن کے راہداری کے آخری سرے سے گزرتے ہوئے ہاتھ پڑا اور بے تحاشا بھاگتا ہوا دربان کے پاس آگیا۔ اس نے ہتھل کے دربان سے بندوق چھین لی۔ سید اور اس کے دوست شور مچانے لگے۔ ہاتھ نے بندوق کے سرے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کے گھٹنے کی ضربوں سے اسے دو لخت کر دینا ہوا۔ بندوق غائب و سالم رہی البتہ ناکارہ ضرور ہو گئی ہوگی۔

ہاتھ نے دربان کو بندوق واپس کرنے کے بجائے راہداری کے پولو میں بیز زار پر پھینک دی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس ہو گیا۔

سید محمود علی اور اس کے ہم مشرب دیکھتے ہی رہ گئے۔ ہاتھ کے او بھل ہو جانے کے بعد وہ رتہ تک جھنجھٹا رہی پھر معسرودا نے جھنجھٹے ہوئے ہتھل سے پوچھا ”تم کون لوگ ہو؟“ اس کی آواز سننا رہی تھی۔

”اب بھی کچھ جانا پوچھنا رہ گیا ہے بسودا!“ سید نے ترختی آواز میں کہا ”تمہیں نظر نہیں آ رہا، ہم تو پہلے ہی کتے تھے“

”ہم نے پولیس بلانی ہے۔“ لاکھی بابو نے دھمکی آمیز لہجے میں ہمیں مطلع کیا۔

”ٹھیک ہے صاحب۔“ ہتھل نے تلخی سے کہا ”بلوائی ہے تو ہم کیا پولیس۔“

”اور پولیس ہاتھ را جانی نہیں ہے۔“

”اس کو پہلے بلوائی لیتے پھر۔“

”ہاں ہاں، ٹھیک بولتے ہو، غلطی ہو گئی۔ ہاتھ حرامی تو گیدڑ نکلا۔“ لاکھی بابو نے دھمکاری آواز میں کہا ”ہا! کیا را جانا پھر تارے کتے کا بچہ۔“

”ک تک آجائیں گے تمہارے بیٹا باجے والے؟“

ہتھل نے ہتھل آواز میں پوچھا۔

”کیوں کیوں، جلدی ہے تم کو؟ بسودا! چک کے بولا۔“

”ادھر ہی سے اب جانا بھی ہے داوا۔“

”کدھر! کدھر جانا ہے؟“ بسودا ڈکدی بجانے والے انداز میں ہاتھ گھما کے بولا ”ایسے ہی چلے جاؤ گے؟“

”پھر کچھ دوا کر دو گے؟ ہار پھول ڈالو گے؟“

”ہار پھول نہیں تو چوڑی ضرور پٹنائیں گے۔ بیٹا بھی بجوا دیں گے۔“

”نہیں بسودا! بس کرو، اب پولیس ہی ان بات کرے گی۔ کیوں ان کے منہ لگ رہے ہو۔“ سید نے برہمی کے ساتھ بسودا سے مزید سلسلہ جنبانی سے پرہیز کی درخواست کی۔

”ہم کو تم سے بات کرنی ہے صاحب!“ ہتھل نے نرم آواز میں سید سے کہا ”ہمارے ساتھ تھوڑے ٹائم کے لیے اندر چلو۔“

”اب بات کرنے کو کیا رہ گیا ہے۔“ سید کے لیے میں غصے اور بیزاری کے علاوہ ناپسندیدگی بھی عیاں تھی۔

”ابھی بت ہے، تمہارے بھلے کا ہے۔“

"میرے بھلے کا!" سید نے پھر کے کہا "میرا گھڑا کا ڈالو"
 پھر میرے بھلے کی بات کر۔ خوب۔"
 "تم سے کہا تا کہ پہلے لڑکیوں کے بارے میں بتاؤ۔"
 لاکھی بابو۔۔۔ کرج کے بولا۔
 "انہی کے بارے میں کچھ بولنا ہے۔"
 "دیکھو" ایک بات کان کھول کے سن لو! ہم کو پہلے دونوں
 لڑکیاں چاہئیں۔ آج ہی کوئی دوسری بات نہیں ہوگی تم سے۔
 پہلے بھی صاف کہا ہے۔ "لاکھی بابو کی آواز بے لچک تھی۔
 "وہ لوٹ کے آنے کو نہیں گئی ہیں۔"
 "لوٹے گا تو تمہارا۔" لاکھی کچھ اور کہتا جا رہا تھا کہ
 اس نے خود کو روکا اور کھیا کے بولا "واپس تو ان کو لانا
 ہوگا۔"
 "آؤ صاحب! گھبرانے کی ضرورت نہیں، کچھ کام کی
 بات ہی کرنا ہے۔" بھلے نے دوبارہ سعید محمود علی کو مخاطب
 کیا اور ایک بار پھر کمرے میں چلنے کی دعوت دی۔
 ساری بات اب پولیس کے سامنے ہوئی۔ پولیس کے
 آئے میں اب دیر نہیں ہے۔ "سید کے بجائے لاکھی بابو نے
 دو ٹوک انداز میں ہمیں بتایا کہ پہلی مرتبہ جب تاقو، بھلے
 کے سامنے تک نہیں پایا تھا، یہی انہوں نے پولیس کے لیے
 ہر کارہ دوڑا دیا تھا۔
 انہوں نے پولیس طلب کر لی تھی۔ انہیں یہی کرنا
 چاہیے تھا۔ تینوں کا حال پہلے سے مختلف تھا۔ تاقو کے چلے
 جانے کے بعد ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے ان کے لبوں میں
 فرق آ گیا تھا۔ ساتھ ہی ان کی خوشنود و خوشنود بھی بڑھ گئی
 تھی۔ وہ بار بار ایک دوسرے سے سر جوئے سرگوشیاں
 کرنے لگتے۔ قریب کھڑے ملازموں کو ڈانٹتے ڈھنڈتے وہ
 انہیں حکم پر حکم دے رہے تھے۔ سید نے اپنی خاص بندوق
 بھی اندر سے منگوائی تھی اور دربان کے حوالے کر دی تھی۔
 رابدار میں می ملازموں نے جلدی جلدی مزید کرسیاں رکھ دی
 تھیں۔ ایک گول میز بھی وسط میں سجادی گئی تھی۔ خاصی دیر
 بعد میں اور بھلے بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے، پھر انہوں نے جیسے
 ہم سے ترک تعلق کر لیا۔ کوئی بات نہیں کی مگر انہیں قرار
 نہیں تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ تینوں کسی ایک فیصلے پر
 متفق نہیں ہو رہے ہیں۔ کوئی ایک رائے قائم کرنا تو دوسرا
 نکتہ چینی کرنے لگتا۔
 یہ وقت میرے لیے بڑا غنیمت تھا۔ بھلے کی مثال بھی
 سامنے تھی۔ اس اثنا میں میں خود کو ترک کرنا رہا۔ کسی نے
 کہا ہے "خود کو ترک کرنا بھی آزادی ہے" خود کو دوسروں

کے حوالے کرنا بھی آزادی کے مترادف ہے۔
 اختیاری کے علاوہ اختیار کو دینا بھی مانند آزادی ہے۔
 والے وقت سے نبرد آزمائی کے لیے میں نے خود کو بڑی
 تک آزاد کر لیا۔ اب مجھے پیش آئندہ کی کدورت و عدم
 سے کوئی غرض نہیں تھی۔ کوئی نئی بات تو سچی نہیں۔
 نوشتہ ہی سب سے معتبر چیز ہے، یہی ہوتا آیا تھا۔ کتنا ہی
 کے "چھوٹ چھوٹ کے قدم رکھو، کتنا ہی اپنے آپ
 چھپائے ہوئے کنارے کنارے چلو" راستے میں دوسرے
 بے شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے جو کتنی مارتے ہیں، اچا
 سامنے آ جاتے ہیں اور دیوار بن جاتے ہیں۔ دوسرے
 راہگیروں کی کج روی کی کیا ضمانت، آدمی کو اپنے لیے
 زندگی ملتی ہے۔ کسی نے یہ یقین نہیں کی "ایک چوتھائی
 نہیں شاید۔ کاش آدمی کا واسطہ آدمی سے نہ پڑا کرتا،
 سے جانوروں کی طرح۔
 مذرو نے اٹھتے ہوئے آکے سید کے کان میں سر
 کی "سید نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا۔ تینوں اور منٹا
 ہو گئے۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ بشارت بھاگا
 آیا، اس نے پولیس کی آمد کی اطلاع دی۔ سید اور سہو
 دہیں روک کے لاکھی بابو خود پولیس کے استقبال کے
 لپکا۔
 وہ تازہ تازہ وردیوں میں لمبوس چار آدمی تھے جو فو
 کی طرح ٹھک ٹھک کرتے تیز رفتاری سے راہداری
 بڑھتے دکھائی دیے۔ سب سے آگے کوئی بڑا افسر معلوم
 تھا۔ ہماری بھر کم "بسم" اچھی بکلی عمر بڑی موٹھیں
 ہوئی سی تنگ اور چمکیلی آنکھیں، عمری باڈی رنگت بھرا
 چہرہ، پیٹ آگے نکلا ہوا "قد درمیانہ" کلمے سمے سے رعب
 دب دے کا شخص تھا، تجربہ کار بھی لگتا تھا۔ اس کا ماتحت ہر
 سے اس کی خدمت تھا۔ عمر کم، جسم چھریا، رنگت کالا، قد
 ہوا، آنکھیں چوڑی اور چرے کی بڈیاں ابھری ہوئی۔ ان
 پیچھے بندوق بردار سپاہی تھے۔ دونوں افسر بھی میزوں
 لیس تھے۔ سید، لاکھی بابو اور سہو سے ان کی پرانی تہ
 ظاہر ہوتی تھی۔ لاکھی بابو نے جلد از جلد ہماری طرف
 اٹھا کے بڑے افسر کی توجہ مبذول کی۔ افسر کی رعوت آ
 نگاہیں ہم پر جم گئیں۔ بھلے نے اسے سلام کیا۔ اس کی
 میں مجھے بھی ہاتھ اٹھانا پڑا۔ افسر نے کوئی جواب نہیں
 کر سکی پر بیٹھے ہی ان تینوں نے کانا بھوسی کے انداز میں نا
 سرگرمی و مستعدی اور برہمی و بر نشنگی سے درود ادا کیا
 کی۔ دونوں افسر سنجیدگی اور حیرانی سے سنتے رہے۔ دیا

میں کئی بار سر گھما کے انہوں نے ہم پر نظری۔ بڑے افسر نے
 سب کچھ اخذ کر چکا ہو، ان تینوں کا احوال اور چوڑا
 رخ کمری کا رخ ہماری جانب کیا اور بلند آواز میں پوچھا "تم کو
 فائدے لے چکے ہیں یا نہیں آدمی کی طرح بات کریں؟"
 "یہ تو آپ پر ہے بالی باب!" بھلے نے دھیمی آواز میں
 کہا "ہم کو آدمی مانو کہ نہیں۔"
 "بھگدھڑیں لڑکیاں؟" افسر نے تیزی سے پوچھا۔
 "آپ بھی یہی بولتے ہو" لڑکی کے جانے والوں سے ان
 کا ناپا پوچھتے ہو۔
 "دیکھا، دیکھا تم نے گھوش بابو!" سہو اور لاکھی بابو نے
 یک وقت تھلا کے کہا۔ گھوش بابو نے انہیں مدخلت سے
 روکا اور بھلے سے بولا "دیکھو! ہم بات کرتے ہیں۔"
 "ہم کو بھی یہ اچھا لگتا ہے۔" بھلے نے سر ہلا کے کہا۔
 گھوش کی آنکھوں میں چنگاریاں سی لگیں "تم کو بھی
 چا لگتا ہے۔" اس کی آواز سننے سے لبریز تھی "پھر کیا چاہتے
 ہو؟"
 "ہم بھی زیادہ بات کرنا نہیں چاہتے۔" بھلے نے صلح
 کی لہجے میں کہا "ہم کو آپ کا انتظار تھا۔"
 "ہمارا انتظار تھا؟" افسر نے طنز و دہرایا۔
 "ہاں صاحب! آپ حاکم آدمی ہو، آپ کی ان کی کتنی
 لاپرواہی تھی ہوئی ہو، آپ آجھ اور کان تو اس ہی رکھتے ہوں گے
 کا میں دیے ہوں گے۔ ہماری آپ کی پہلے سے کوئی گانتھ
 ہی نہیں ہے۔"
 "کیا لگتا چاہتے ہو؟" افسر نے درشتی سے پوچھا۔
 "ہم نے ان لوگ سے کئی بار بولا، ہم کو سید صاحب سے
 کیے میں بات کرنے دو، ہماری بات بے نہ پڑے تو ہم ادھری
 سے لہگے نہیں جا رہے۔ انہوں نے وہی انہیں دیا۔ اب
 آپ آگے ہوں۔ ان کو بولو اس میں ہر جا کیا ہے۔"
 گھوش نے کوئی اور سوال کرنے سے پس و پیش کیا۔ پہلے
 سے سہو، لاکھی بابو اور سید محمود علی نے اس کے کان بھرے
 ہاتھ لیکن افسر نے ہاتھ اٹھا کے انہیں خاموش کر دیا اور
 بھلے سے بولا "کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"
 "وہ تو سید صاحب ہی سے پولیس کے بعد میں ان پر ہے،
 پانچونہ تو تھوڑا دیر۔"
 "ہم کو کس بتاؤ گے؟" افسر نے حاکمانہ تیور سے کہا
 "ہم کی ایک میں بات کر سکتے ہو۔"
 "کیس صاحب! اچھا ہے، زور مت دو۔ ہم کوئی الٹی
 بات نہیں کر رہے۔"

"ایک بات اچھی طرح سمجھ لو، ہم دوسری قسم کے
 پولیس والے ہیں۔"
 "سارے دودی والے ایک جیسے ہوتے ہیں۔"
 "ہم نہیں چھوڑ پالنے کو، آخر تک پہنچاتے ہیں۔"
 "اچھا ہے صاحب! اپنی ان کو گھر تک پہنچانا چاہیے۔"
 "دو جوان لڑکیوں کا کاندہ نیپ، گھر میں گھس کے چاقو کے
 بل پر زور اور زوری، تو کر لوگ سے ہاتھ پائی۔ گھر کے اندر کا
 نہیں معلوم، کتنا گمانا، روپیہ جیسہ دیا اور کس عورت کو
 رہا کیا۔ ہوش ہے، کتنے کیس بنے ہیں تم پر؟"
 "ہے صاحب! پولیس چاہے تو دن کو رات سے، نورب
 کو پچھتم سے پلٹ دے، ہم انکاری نہیں۔ اچھی خون کا گیس
 بھی لگاؤ تو انکاری بھی نہیں۔ پتہ ہے، آپ کو کیا کیا آتا ہے۔
 جھٹولی، حوالات، ڈنڈا، ڈولی، پچھری، جیل، سولی، سارے کی
 جانکاری ہے۔"
 "لگتا ہے پولیس سے نانا پڑتا رہتا ہے۔"
 "پرانی صاحب سلامت ہے۔ جب لڑکی لوگ کو لے
 جا رہے تھے تو پتہ تھا، آپ آسکتے ہو۔ اسی لیے ہم لڑکی لوگ کو
 آگے بھیج کے ادھری لوٹ آئے کہ آپ کو پیچھا کرنے میں
 کوئی کشت نہ ہو۔"
 "اوہ! افسر کا سارا جسم پھڑک اٹھا "ہمارے کشت کا
 وہی ان تھا تم کو؟"
 "ادھر سید صاحب سے تھوڑی بات کرنی تھی اور معلوم
 تھا، ہمارے ادھری لوٹ آئے پر سید صاحب آپ سے ملائے
 بنا جانے نہیں دیں گے۔ تھوڑا تھوڑے پر زور ڈالو گے صاحب تو
 ساری کالک جھٹ جائے گی۔"
 گھوش نے کوئی جواب نہیں دیا "اپنے ماتحت سے مشورہ
 کیا "ٹھک ہے سید صاحب! آپ اس سے بات کریں۔"
 اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "دیکھیں کیا لگتا ہے۔"
 "میں سمجھتا ہوں، اس کی ضرورت نہیں۔" سید
 محمود علی کے چہرے پر دھند چھا گئی "یہ بھی ان کی کوئی چال
 ہے۔ آپ ان کے جرائم اور دیدہ دلیری دیکھیں۔ یہ مجھے بہت
 خطرناک لوگ معلوم ہوتے ہیں، کسی رعایت کے متعلق نہیں
 ہیں یہ۔ پہلے لڑکیوں کی فکر کیجئے، جانے کہاں یہ بد معاش انہیں
 لے گئے ہیں۔ وہ تو، مت معصوم، پھول جیسی پچیاں ہیں۔
 جانے کیا حال ہو ان کا۔"
 "کوئی چھوٹ نہیں سید صاحب! آپ بھروسہ مار رکھو۔ پہلے
 جیسا یہ کہتے ہیں ویسا ہی کرو۔ بعد میں ہم دیکھ لیں گے۔ بڑے
 بڑے چھپے ہوئے بھگتائے ہیں ہم نے یہ بونگ کیا پیچتے

ہیں۔ "گھوش نے آہستگی سے سید اور اس کے ساتھیوں کے کچھ اور بھی گوش گزار کیا۔ ہم تک اس کی آواز نہ پہنچ سکی۔ بھینسا صبر و ضبط کا درس دیا ہو گا اور شاید یہ بھی کہا ہو کہ یوں بھی "اگر ہم نے زبان کھولنے میں دیر کی تو قوت ہی برباد ہو گا۔ گھوش کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ بھٹل سے اس کی مرضی کے بغیر کچھ جاننا اتنا آسان نہیں۔

سید آمادہ نہیں تھا اس نے ناراضگی اور باؤسی سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ لاکھی بابو اور بسودا نے بھی گھوش کی تائید کرتے ہوئے سید کو دلا سے دے "گھوش بابو زیادہ سمجھتے ہیں۔ ذرا دیکھو تو آخر کیا چاہتا کیا بلتا ہے ہم لوگ تو بیٹھے بیٹھے ہیں۔" لاکھی بابو نے بڑے مزے لہجے میں کہا۔ "کتنا سے لوگ؟" گھوش نے آڑی ہوئی آواز میں بھٹل سے پوچھا "ہم تو زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔"

"یہ تو سید صاحب پر ہے۔ کتنی جلدی کروے میں اترتی ہے۔"

"کوئی ایسی دلیلی بات ہوئی تو سمجھ لیتا۔" گھوش نے سختی سے کہا "تمہارا آدمی ادھر ہی بیٹھا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" بھٹل نے کڑی آواز میں کہا "آپ چند تیار کرادو۔"

گھوش نے ہونٹ سمجھنے لے لیے اور معنی خیزی سے سر ہلانے لگا۔

سید محمود علی بادل ناخواستہ کرسی سے اٹھا۔ بھٹل نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ دونوں اس کمرے میں چلے گئے جو گزشتہ سات آٹھ روز سے ہمارا مسکن تھا۔ جاتے وقت اس نے کئی بار شانے اچکائے اور ہونٹ سکڑے، پھیلائے اس کے ساتھی اسے تمیز کرتے رہے۔ سید کو ایک گردن دہلی شخص سے گفتگو پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ وہ تو تیرا اور بھٹل کا خون پینے کے لیے بے چین ہو گا۔

ان دونوں کے کمرے میں چلے جانے کے بعد لاکھی بابو بسودا گھوش اور اس کے ماتحت نے کرسیاں کھینچ کے کمرے کے اور قریب کر لیں۔ ان کے اور گرد و کھڑے ہوئے ملازمین نے بھی گھبراہٹ کر دیا۔ دربان ابھی تک ہندو کھینچے ہوئے تھا۔ دونوں سپاہیوں نے کندھوں سے ہندو قبضہ آمار کے ہاتھوں میں دبا دیے۔ سب کی نگاہیں دروازے پر مرکوز تھیں۔ ابتدا میں کچھ دیر خاموش رہی پھر لاکھی بابو اور بسودا نے باہر جانے والی دروازہ گھوش کو سامنے میں بڑھ چڑھ کے بیانات دینے شروع کر دیے۔ یہ پروا کے بغیر کہ میں ان کے سامنے بیٹھا ہوں۔ بیان کو جتنا ہوا انداز کچھ سے کچھ کر دیتا ہے۔

انہوں نے زبان خانے میں عورتوں سے میری بدسلوکی کا ذکر کرتے ہوئے کچھ ایسے تین کا اظہار کیا جسے سب کچھ ان کے سامنے ہوا ہو۔ کچھ این "بشارت" اندرو وغیرہ نے بھی حاشیہ آرائی کی ہوگی۔ کمرے میں دربان سے ہندو چھین لینے اور بیٹن مارنے کے واقعات میں انہوں نے خوب فرائز طرازی کی۔ گھوش کے انتہاک سے ان کی زبان اور دواں ہوتی رہی۔ وہ ہنسا کرتے اور خیرانی کا اظہار کرتے رہے۔ "جناب! مجھے تو یہ عادی مجرم معلوم ہوتے ہیں۔" گھوش کا ماتحت زیادہ متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے دہلی آواز میں اپنے افسر سے کہا۔

گھوش کچھ فکر مند سا نظر آتا تھا "اس نے کوئی جواب نہیں دیا" ماتحت چپ ہو گیا۔

"آپ کا کیا وچار ہے؟ وہ اپنے سید بھائی سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟" لاکھی بابو نے کسماتے ہوئے گھوش کو اسکا۔

"گھوش کے نغصے پھول گئے" دیکھتے ہیں۔"

"ہم نے پیسوں کی بھی کیا بات کی تھی۔"

"پھر؟" گھوش نے چونک کے پوچھا۔

"پہلے ہم کسی مجھے تھے لیکن وہ اس پر بھی نہیں نکلا۔ بلکہ ایک ہی رٹ لگاتے رہا۔" بسودا نے لقمہ دیا۔

"میرا خیال ہے، میں نے اس آدمی کو پس دیکھا ہے۔"

گھوش نے بد بداتے ہوئے انگریزی میں اپنے ماتحت سے کہا۔

"کہاں کہاں جناب؟" ماتحت نے خیرانی سے پوچھا۔

"کچھ یاد نہیں آ رہا؟" گھوش تذبذب سے بولا۔

"یاد آ سکتا ہے" یاد کیجئے جناب! "ماتحت کا اشتیاق دہلی تھا "اس سے بہت فرق ہو سکتا ہے۔"

"میں سچ رہا ہوں مگر کہاں؟"

"بہت سی جگہوں پر آپ کا تارلہ ہوا ہے۔"

میں نے ذہن پر زور دیا۔ مجھے بھی کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ آسن سول سے کلکتہ اتار دوڑ نہیں ہے۔ لیکن مجھے بھی گلتے میں اس کا تارلہ ہوا ہو۔ بھٹل کے اڑے کے علاقے واپس تھانے میں تو نہیں ہوا ہو گا۔ کلکتہ ایک بڑا شہر ہے ہو سکتا ہے شہر کے کسی اور علاقے میں وہ تعینات ہوا ہو گا۔ بھٹل سے بھی اس کا آمتنا سامنا ہوا ہو۔ جیل میں سات سال کے دوران بھی متعدد افسران آتے جاتے رہے تھے۔ گھوش کی شکل و صورت کا کوئی آدمی میرے ذہن میں محفوظ نہیں تھا۔ جس زمانے میں مجھ پر دہرے قتل کا مقدمہ چل رہا تھا، تب مجھے ایسا کچھ ہوش نہیں تھا۔ کیا معلوم "اسی زمانے

مگھوش نے مجھے اور بھٹل کو دیکھا ہو۔ یہ بات تو طے تھی۔ اس کا ہمارا کوئی خاص ربط ضبط نہیں رہا۔ دت کم از کم" محل کے نقش اس کے دماغ میں دھندلے نہ ہوتے۔

نذر اور بشارت، پھل، خنگ میوے اور چائے کے پتے لے آئے تھے۔ انہوں نے سلیقے سے سالان میز پر جن

کسی کو کھانے پینے سے رغبت نہیں ہو رہی تھی۔ بشارت نے چائے بنا کے پالیاں ان کے سامنے رکھ دیں۔ چائے کے

ایک گھونٹ حلق میں اندیل کے اور میوے کے دو چار نے ٹنگ کے انہوں نے ہاتھ اٹھا لیے۔ گھوش نے جیبی

لاڑی نکال کے وقت دیکھا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ ملازموں نے راپاری روش کر دی۔

بھٹل نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اس سے چاہی بھی نہیں تھا۔ نصیر بابا کی زبانی فروزاں اور یاسمن کا

جرامیں نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ سب سے بڑی توانائی کی ہوتی ہے۔ بھٹل نے مجھے ہدایت کی اور میں زنان

نے کی طرف چل پڑا۔ عورتیں سیدھی طرح قابو میں نہ تھیں تو مجھ سے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ فروزاں اور یاسمن کے

ام آنے کے لیے تو میں کب سے منتظر کب سے مضطرب

مجھے معلوم تھا سید کے ٹھکانے سے انہیں نجات دلانے کی

دروغی بے قیمت نہیں ہوگی۔ ہمیں کوئی بہت بڑی قیمت بھی

کالی پرستی ہے لیکن مطلوبہ سرخوشی ہریت سے ہلا ہوگی۔

بان خانے کے در سے چھ میں فروزاں کی تو میں نے ایک جھلک

نہ دیکھی..... یاسمن کو بہت قریب سے دیکھا تھا، جب

سیریا کے ساتھ رات گئے وہ سہمی سہمی چوروں کے مانند

کمرے میں آئی تھی۔ وہ بچھوٹ بچھوٹ کے روٹی تو بھٹل کی

پراگمیں بھی پھل گئیں۔ بھٹل کی آواز بھی جھرجھرائی گئی

کہ شاید اسی لیے اس نے اسے جلد ہی واپس لے جانے

کے لیے نصیر بابا کو اشارہ کر دیا۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ رات بھر یاسمن کا آنسوؤں بھرا چہو میری نظروں میں کھومتا رہا۔

بھٹل کے پاس سید کو متلاطم کرنے کے لیے بہت کچھ نصیر بابا سے کھل کے کتنی دیر میری بات ہو پائی تھی۔ مسلسل بھٹل ہی سے ان کی چپچپی رہی تھی۔ کئی دنوں سے دونوں میں سرگوشیاں جاری تھیں۔ بھٹل نے خوب سوچ چارے بھری دی تھی۔ بھٹل نے اندر کمرے میں سید کو وہ

کچھ یاد کر رہا ہو گا کہ اس کے اقدام میں یاسمن اور فروزاں کی مشاواہدائیں کس قدر شامل ہیں۔ اندر وہ سید کو آئینہ دکھا رہا ہو گا۔ کبھی سید نے اپنی شکل..... آئینے میں اتنی

جزئیات سے نہیں دیکھی ہوگی۔ بھٹل کی اور طرح بھی فروزاں اور یاسمن کو یہاں سے لے جانے کی تدبیر کر سکتا تھا مگر بہتر یہی تھا کہ ساتھ ہی سید کی آتش غضب سرد کر دی جائے۔ بھٹل کو اچھی طرح احساس ہو گا کہ اس کا واسطہ کیسے شاطر، کینہ خصلت اور دروندہ صفت شخص سے ہے۔ ایسے بے حس، سنگدل، بد باطن اور بھوپنے سے نمٹنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہر آدمی کا ایک دائرہ ہوتا ہے، زندگی بھر وہ اسے سوا کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ سید نے یہی کام تو شد و مد سے کیا ہے۔ اسے اپنے اثر و رسوخ کا بڑا زعم ہے اور کچھ غلط بھی نہیں۔ وہ ثبوت و شواہد کی بات کرے گا۔ بھٹل کے پاس بھی اب دلیلوں کی کمی نہیں۔ فروزاں یا یاسمن اور نصیر بابا اور ہاں ظفر بھی۔ وہ چاروں اب ہماری تحویل میں ہیں بلکہ اب تو وہ اپنی تحویل میں ہیں۔

اپنے خدام کی اعانت کے بغیر تمہارے اتنے سنگین جرائم سرزد نہیں ہوئے ہوں گے۔ اب تک یہ معتد اس کے حصار میں رہے، کسی نے ان کی جان ٹاری و وفا شعار، آزمائش سے دو چار نہیں کی۔ اپنا سب سے زیادہ وفادار سب سے بڑا دوست آدمی خود ہوتا ہے۔ کتنے ہیں ہر امانت جو دوسرے کے پاس ہے، دوسرے کی صوابدید پر ہے دوسرا کتنا ہی معتد اور امین ہو، پہلے اور دوسرے آدمی کی مکمل یکجائی ممکن نہیں ہوتی۔ ترک و فاقا کی توقع ہر کس و ناموس کو سزاوار نہیں ہوتی، محدود سے چند ہی اس رہتے پر فائز ہوتے ہیں اور وہ اور لوگ ہوتے ہیں۔ دو آدمی ہر حال دو آدمی ہیں۔ سید کے تمام خدمتگار جس بازار ہیں۔ اطاعت کی خرید و فروخت اس بازار میں عام ہے۔ نیلام چیزوں ہی کا نہیں ہوتا، کسی نے کہا ہے، ہر آدمی نیلام پر ہے۔ تیسری صورت شاذ شاذ، غالباً خال ہے، آدمی پر غلبہ و تسلط کی دو ہی صورتیں معتد ہیں۔ اس پر مال و زاری کیا جائے یا مال و زر سے عاری کر دیا جائے۔ جو مال و زر سے مغلوب نہیں ہوتا، وہ زور و زبر، زور و جبر سے ہوتا ہے۔ کیونکہ آدمی ہر انداز زندگی کا خواہش مند ہے۔ کوئی سید سے بڑا اقبال مند، طالع آزمایہ سید سے بڑا حاکم و جابر کند انداز ہو تو سید کے موجودہ خدام اس کے خلاف سب سے بڑی شہادت ہیں۔ زنان خانے میں رہیں بیگم کی زیر دست کا سبب میری بالادستی تھا۔ میں تھا، میرا چاقو تھا لیکن دوسرے طور سے بھی اس سے معاملات کی جاسکتی تھی، جاسکتی ہے۔ وہ بے حاشا، بے محابا اپنے نفس کی امیر ہے۔ اب تک رہیں بیگم کا نفس مارہ کسی نے نہیں چھیڑا۔

کتابیات پبلی کیشنز

147

مازی گور

کتابیات پبلی کیشنز

146

کتابیات پبلی کیشنز

سید کی اپنی دو بیویوں، فردواں، یاسمن کی ماں اور باپ اور جانے کون کون۔ آسن سول میں قیام کے بعد سید کا سارا سفر یہ جاہ وحشت، شان وشوکت، کہاں سے کہاں تک کا سفر کسی نے اب تک حرف زنی نہیں کی تھی۔ حرف زنی کے لیے جتو اور حوصلہ بھی شرط ہے۔ سچ اگر بڑی توانائی ہے تو جھوٹ ناتوانی کا باعث بھی ہونا چاہیے۔ دولت بہت بڑی طاقت ہے لیکن دولت مند بہت کمزور آدمی ہوتا ہے۔ سید محمود علی بہت عیار و مکار شخص ہے مگر یہ اس کی خامی ہے اور ہر خامی میں کمی نہ بھی کسی زبان پر ہوتی ہے۔

مجھے امید بھی کہ پینٹل سرخ رو کرے سے واپس آئے گا۔ گویہ امید خواہش پر مبنی تھی لیکن خواہش یا طلب کے بغیر کوئی بھی امید بے مٹی ہے۔ خواہش اور طلب ہی سے امید استوار ہوتی ہے اور اگر پینٹل یوں ہی ناکام واپس آگیا تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہوگا کہ فردواں اور یاسمن کو ترک کر کے آیا ہے۔ وہ کوئی عزم کر کے ہی اندر گیا ہوگا۔

میرا سر کوئی دھکن رہا تھا۔ طرح طرح کے وہم، سکارا، جبت، تاویلیں اور دلیلیں۔ میں وہاں بیٹھا قیاس آرائیاں ہی کر سکتا تھا۔ رات پوری طرح چھا چکی تھی۔ آسمان پر طاری بادلوں نے راہداری کے اطراف پھلپھلا ہوا اندھیرا شدید کر دیا تھا۔ اندھیرا گہرا ہو تو روشنی بھی گہری ہو جاتی ہے۔ راہداری اور روشن ہو گئی تھی۔ لاکھی بابو، بسودا، پولیس افسر، گھوش اور اس کا ماتحت شروع شروع میں بہت سرگرم تھے۔ اب خاصی دیر سے ان پر ایک پچائی خاموشی مسلط ہو گئی تھی۔ میری طرح انہیں بھی سید اور پینٹل کے باہر جانے کا شکت سے انتظار تھا۔ مجھے کم از کم اندر ہونے والی گفت و شنید کی نوعیت کا علم تھا۔ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں گے اور سرے ڈھونڈ رہے ہوں گے اور کچھ ان کے ہاتھ میں نہیں آ رہا ہوگا۔ وقت جیسے لنگڑا ہوا گزر رہا تھا۔ گھوش نے کئی بار گھڑی دیکھی۔ آخر ان دونوں کو اندر گئے ایک لمحے سے اوپر ہو گیا تو گھوش نے ایک سیاہی دروازے پر بھجا۔ اس نے پہلے کان لگا کے سن سن لینے کی کوشش کی، پھر گھوش کی اجازت سے آہستہ سے دنگ دی۔ اندر سے انتظار کے لیے کہا گیا، آواز سید کی تھی۔ سیاہی کے جواب سے انہیں کچھ تسلی ہو گئی۔ شاید یہ جان کے کہ سید ابھی زندہ ہے اور ہوش و حواس بھی قائم ہیں۔

کچھ اور وقت گزرا تو گھوش کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ اس کا ماتحت، پھر لاکھی بابو اور بسودا بھی۔ گھوش چل

قدی کرتا ہوا دروازے کے قریب گیا اور ٹھہرا رہا۔ اندر سے آنے والی آوازیں یا تو دم خم تھیں یا واضح نہیں تھیں۔ گھوش نے سیاہی کے مانند دروازے سے کان نہیں لگائے، وہاں سے ہٹ آیا۔ سیاہی نے اس کی خواہش پر پانی پٹش کیا۔ گھوش نے کھڑے کھڑے سارا گلاس انڈیل لیا اور کچھ دیر یوں ٹٹ رہا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ اندر کیا کر رہے ہیں؟ وہ بیڑے تھے ہوئے اپنے ماتحت سے انگریزی میں بولا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا جناب! ماتحت نے اضطراب لیے میں جواب دیا۔ ہمیں اور کتنی دیر انتظار کرنا چاہیے؟“

کچھ توقف کے بعد لاکھی بابو، بسودا اور گھوش کا ماتحت بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کے شانے دھلک گئے تھے۔ دربان نے بندوں بچی کر تھی۔ سیاہیوں نے بھی بندوں کی باتیں فرش سے نکال دی تھیں۔ ان سب کی نظروں کا دف میں تھا یا کمرے کا دروازہ میری حیثیت کسی پر غمالی کی تھی بلکہ اصل میں تو میں کم اچھوت سے بدتر تھا۔ میرے پیروں میں بیزی نہیں تھی کیل میں نہ کہیں جاسکتا تھا نہ آسکتا تھا۔ میں نے ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔

بسودا اور لاکھی بابو، پولیس افسر، گھوش کا چہرہ ہوا اضطراب محسوس کر رہے تھے اور کچھ پشیمان سے نظر آ گئے تھے۔ چنانچہ اس تاخیر پر وہ تعجب کا اظہار کرنے لگے۔ کی سرگرمی کا نہ جانے کیا عالم ہوتا اگر کچھ اور وقت کی طرح گزر جاتا۔ مگر جلد ہی دروازے پر ہونے والی آہٹ۔ وہ بڑبڑا گئے۔ ہر شخص میں بجلی کی دوڑ مچی۔ گھوش کا ہمہ گیا۔ اس کا ماتحت بھی کسی پریم المیہ تارہ ہو گیا۔

جالی کا دروازہ کھلنے پر وہ دونوں برآمد ہوئے۔ آگے محمود علی تھا۔ میزا و مہر کا ہوا دل ایک لمحے کے لیے توند ہوا دوسرے لمحے سب کچھ عیاں تھا۔ سید کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ دھندلا دھندلا، دھواں دھواں، پیشانی پر سلوسن پڑ ہوئی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں جیسے عمر بڑھ گئی ہو۔ وہ سارے ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ لاکھی بابو، بسودا، گھوش اور اس کے ماتحت نے سید کے قریب آنے کا انتظار نہیں کیا۔ جاکے اس کے گھیر لیا۔ سید کی نظرس جھکی ہوئی تھی۔ کیا بات ہے؟ بسودا نے متوجہ نہیں کی۔

”کچھ نہیں۔“ سید نے بوقت کہا ”کچھ نہیں۔“

”اتنی دیر کیوں ہو گئی؟“ لاکھی بابو نے بے قراری۔

سید کا بازو پکڑ لیا۔

”ہو گئی بس۔“ سید نے پوچھ دیکھی سے کہا۔

”کیا کیا کتا ہے وہ؟“

”بتاؤں گا۔“ سید نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔

”تم ٹھیک تو ہو چکا؟“ لاکھی بابو نے آشفتمندی سے پوچھا۔

”ہاں۔“ سید نے انہیں مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی۔

”میں اب ٹھیک ہوں۔“

”اس نے تمہیں؟“ تمہیں۔“ لاکھی بابو نے بدحواسی سے پوچھا۔

”کوئی چال بازی تو نہیں ہوئی؟“ بولو نا بھیا۔“

پینٹل دروازے سے باہر آگے میرے پاس بیٹھ گیا تھا۔ میری سوالیہ نگاہوں کے جواب میں اس نے آنکھیں موندیں۔ پھر مجھے اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میری رگوں میں خون ہلک رہا تھا۔

پولیس افسر گھوش جیران پریشان سا کھڑا کبھی سید کا چہرہ دیکھا۔ کبھی کرسی پر دروازہ بٹل کا ”کیا کتا ہے یہ؟“ کچھ بتایا؟“

اس نے افسرانہ انداز میں سید سے پوچھا۔

”کوئی جواب دینا سید کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر سے چارگی سے دیکھا اور ابھی ہوئی آواز میں بولا ”معاذی اللہ! میں گھوش بابو! آپ کو زحمت ہوئی۔ آپ کا فاساد تو بڑا ہوا۔“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ گھوش اچھل سا گیا۔

”مجھے کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔“ سید نے معذرت خواہانہ لیے میں کہا۔

”کیسی غلط فہمی؟“

”تفصیلی بات ہے۔ اس وقت مجھ سے کچھ نہ پوچھئے تو بہتر ہے۔“

”کیا بات ہے سید صاحب؟“ گھوش اپنی حیرت و تشویش پر قابو پانے سے قاصر تھا۔

”میں غلط سمجھ رہے تھے۔“ سید نے لفظ چن چن کر کہا۔

”تو کیا؟“

”تو کیا؟“

”وہ وہ ٹھیک جگہ چلی گئی ہیں۔“

”ٹھیک جگہ! پھر یہ سب کیا تھا؟“

”میں نے کہا نا غلط فہمی ہو گئی تھی۔“

گھوش کو یقین نہیں آیا ”صاف کئے سید صاحب!“ اس کا لہجہ حاکمانہ ہو گیا۔ ”یہ کس طرح ہوا؟ آپ سے اس نے کیا بات کی؟“

”مجھے حقیقت معلوم نہیں تھی۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔“

”میں نے ان سے بات کر لی چاہیے تھی۔ آپ سب کو بتا دیتا۔“ سید نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”مجھے صاف گروہ جتنے بڑے ایسے نہیں ہیں، جیسا، جیسا سمجھتے تھے۔“

”کچھ چھپاؤ نہیں سید! تم بہت دھکی لگتے ہو۔“ لاکھی بابو نے آبی سے کہا ”ہماری پریشانی چھوڑو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ دیکھو، دیکھو! اگر ایسی دیکھی بات ہے تو کھل کے ہم سے کہو! ابھی گھوش بابو بیٹھیں۔“

”جتنا میں کہہ رہا ہوں! اتنا ہی سمجھو بھائی۔“ سید نے عاجزی سے کہا۔

”کیسے سمجھ لیں؟ یہ کیا! تمہاری کوئی بات نہ من کو لگ رہی ہے نہ متک کو۔“ بسودا نے شکایت کی ”لگ رہا ہے“ اس نے دھکیا ہے تم کو۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا ”سمجھ لو! یہ دونوں ایسے میراں سے نہیں جاسکتے۔ ہم ابھی زندہ ہیں۔ ہم کو صاف صاف بتاؤ بھیا! بات کیا ہے؟“

”بات مت بدھاؤ بسودا! اب ختم سمجھو، ختم کرو۔“ سید نے دوبارہ ہاتھ جوڑ لیے۔

”ہم انہیں تھانے لے جاتے ہیں۔“ گھوش نے حکم سنایا۔

”نہیں نہیں گھوش بابو! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب میرے ان کے درمیان سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ یہ میرے مہمان ہیں۔“

گھوش کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے پلٹ کے رخ اور غصے سے اپنے ماتحت کو دیکھا۔ کچھ کہہ نہ سکا۔ ماتحت نے مایوسی سے کہا ”یہ جیران کن ہے جناب! انہایت پراسرار۔“

”اس نے ضرور سید کو ڈرایا دھکیا ہے۔“ گھوش نے جھپٹکے ہوئے رائے ظاہر کی، مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

”بے شک جناب! کوئی شکایت نہ ہونے کی صورت میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ ماتحت نے اپنے افسر کی مانند کی۔

”مگر سید کو کہیں بعد میں پریشانی نہ ہو۔ وہ جیسا مجبور اور ہراساں معلوم ہو رہا ہے۔ تم نے اس کا حال دیکھا؟ اب وہ بالکل ایک بدلا ہوا آدمی نظر آتا ہے۔“

”وہ خود انہیں ہمارے سپرد کرنے پر آمادہ نہ ہو تو ہم کیا کر سکتے ہیں جناب۔“

”ہم اپنے طور پر کارروائی کر سکتے ہیں۔“

وہ انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سوچا میں دخل دوں۔ مجھے پہلو بدلتے دیکھ کے پینٹل میری نیت بھانپ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے خاموش رہنے کی تاکید کر دی۔

لاکھی بابو اور بسودا سید کو گھوش سے کچھ فاصلے پر لے گئے تھے اور سید کی قلب مابیت کا سبب جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو کی جھنجھٹا ہٹ ہی ہم تک پہنچ رہی

تمہیں گھوش کے اس خیال پر کہ وہ ہمیں تھانے لے جا کے اپنے طور پر کارروائی کر سکتا ہے اس کے ماتحت نے مودبانہ اسے مشورہ دیا "اور اگر سید محمود علی بن ان کی حمایت پر سید سہر ہو گیا جناب تو کیا ہو گا۔ سید تھانے میں بھی ان کی وکالت کر سکتا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ وہ ہمیں ان کو میاں سے لے جانے کی اجازت بھی دے گا۔"

"اس کی اجازت کے بغیر ہم انہیں میاں سے لے جاسکتے ہیں ورنہ ہم معاملے کی تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔" گھوش نے برہمی سے کہا۔

"وہ مشکل لوگ معلوم ہوتے ہیں۔" ماتحت زیادہ ذہین اور ہوش مند افسر معلوم ہوتا تھا۔ وہ مخاطب لہجے میں بولا "تھانے میں وہ ہمارے لیے پیچیدگی کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ وہ بہت پختہ کار لوگ ہیں۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے سید محمود علی پر برتری حاصل کر لی ہے اور دیکھیں وہ کس اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ یہ اعتماد بے جواز تو نہیں ہو گا جناب! لڑکیوں کو میاں سے لے جانے کے معاملے میں ہو سکتا ہے کوئی اور کہانی کوئی اور رمز بھی پوشیدہ ہو۔ خیال رہے کہ وہ سید کی بیٹیاں نہیں ہیں اس کے مرحوم دوست کی بیٹیاں ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ اغوا نہ ہو، فرار ہو اور اس میں ان لڑکیوں کی مرضی بھی شامل ہو۔ کسی ملازم نے اب تک یہ نہیں بتایا ہے کہ انہیں زبردستی میاں سے لے جایا گیا ہے۔ کوئی ایسی شہادت اب تک سامنے نہیں آئی۔ گھر کا ایک پرانا اور بوڑھا ملازم بھی ان کے ساتھ گیا ہے۔"

گھوش توجہ سے سنتا رہا پھر کدھر آواز میں گویا ہوا "انہیں دو غلاماں بھی تو جاسکتا ہے۔"

"اس کے یہ معنی بھی لیے جاسکتے ہیں جناب کہ وہ میاں خوش نہیں تھیں۔ ان میں ایک لڑکی بڑی عمر کی ہے۔ وہ اتنی نادان نہیں ہیں۔ وہ بڑھی لکھی لڑکیاں ہیں اور جناب! یہ شخص جو ان کے ساتھ گیا تھا، واپس کیوں آگیا؟ وہ سید سے گفتگو کے لیے کیوں اس قدر معر تھا اور اسے غلط ہی کیوں مطلوب تھی۔ ہم اس شخص پر غور کیوں نہ کریں کہ واقعات وہ نہیں ہیں جو ہم سے بیان کیے گئے ہیں۔ ہم نے صرف ایک طرف کا بیان سنا ہے۔"

"لیکن دوسرے کوئی بیان دینا نہیں چاہتے۔"

"انہیں اب بیان دینے کی ضرورت بھی کیا ہے جناب!"

"ہمیں الگ لے جا کے سید کو ٹھونکا جائے؟ سید سے

برانا تعلق خاطر ہے۔ کہیں اسے ہماری مدد کی ضرورت تو نہیں؟"

ماتحت نے اپنے افسرے اتفاق کیا۔ گھوش نے پھر کڑا پس و پیش نہیں کیا۔ لاٹھی بابو اور بسودا سید سے اپنے تھے دونوں افسروں نے سید کو ان سے جدا کر دیا۔ ان کا راز عجبیہ بڑھ زار کی جانب تھا۔ کچھ دور تک وہ نظر آتے رہے اور بھل ہو گئے۔

میں نے نہیں دیکھا، درمیان میں ان کے آقا سید محمود علی نے اشارہ کیا ہو گا، دربان سمیت تمام ملازمین رنو رنو وہاں سے ہٹ گئے۔ دونوں سپاہیوں نے ہندو قبیلہ شالہ پر لڑکائیں۔ ہم سے کچھ دور لاٹھی بابو اور بسودا ایک دوسرے کو قاتل و مقتول کر رہے تھے۔

سید گھوش اور اس کے ماتحت کو گئے ہوئے زیادہ دور نہیں ہوئی ہوگی کہ تینوں عجبیہ بڑھ زار کی جانب سے واپس آتے دکھائی دیے۔ ہمارے دو رہو ہو گئے گھوش گھبرا ہوا، بھٹل کو خشمگین نظروں سے گھورتا رہا "آپ کو پوری تکلیف ہوئی صاحب! بھٹل کی آواز طنز اور تصنع سے عاری تھی۔ گھوش کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اس نے ہنکاری بھری چٹکڑ جھپکائیں اور تیزی سے مڑ گیا۔ لاٹھی بابو اور بسودا اسے پورا جاؤ دیکھ کے بے کل سے ہو گئے۔ گھوش نے پلٹ کے دیکھا کہ ان کی کسی صدا کا جواب دیا۔ وہ سنی ان سنی کرنا راہدار میں بوہتا رہا اور دور ہو گیا۔ لاٹھی بابو اور بسودا بھی اس کے تعاقب میں لپکتے ہوئے دم دم دوشنبوں میں گم ہو گئے۔

سید محمود علی تنہا رہ گیا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ کرسی پر ڈھیر ہو کے وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ اڈریر میں لاٹھی بابو اور بسودا پھولی ہوئی سانپوں کے ساتھ واپس آ گئے اور کرسیوں پر ڈھے گئے۔ سید کی بے نیازانہ انہوں نے رسمی اجازت چاہی تو سید نے رک جانے کے لیے ایک لفظ نہیں کہا۔ ہاں رسمی طور پر شکریہ ادا کیا اور معذرت کی۔ دونوں پھر وہاں نہیں گھمے۔

بھٹل نے بیڑی سلگائی اور چند لمبے کش لے کے ہوا زار پر پھینک دی اور کرسی سے اٹھ کے کچھ فاصلے پر سید محمود علی کے پاس جا کے بیٹھ گیا "ہم کو جانا ہے۔" اس نے بھاری آواز میں سید سے کہا۔

سید چونک پڑا۔ خامے تامل کے بعد اس نے زبان کھلا "آپ سویرے بھی جاسکتے ہیں۔" اس کی آواز غصہ سے بھری تھی۔

بھٹل نے انکار کر دیا "ہم کو ساری چیزیں واپس کرنا

بازاری

راگنا، روپیہ پیسہ، زمین، مکان کے کاغذ، نکاح کا کاغذ، جو بھی ان کا ہے، ابھی اسی نام۔"

سید کا سر جھکا ہوا تھا۔

"کوئی چیز یہ نہ جانے، کہیں ہم کو لوٹ کے آنا پڑے۔"

"مجھے کچھ دیر لگ سکتی ہے۔" سید نے جتنی آواز میں

"پر زیادہ نہیں، ہم کو گاڑی پکڑنی ہے۔"

آہستہ قدموں سے سید محمود علی زنان خانے کی طرف باپا۔ اس کے دور ہوئے ہی بھٹل نے مجھے کمرے سے باہر لانے کی ہدایت کی۔ یہ وقت کچھ پوچھنے کا نہیں میں نے خود پر جبر کیا۔ اتنا ہی بہت تھا کہ ہم سلامتی سے باہر جا رہے تھے۔ پھر ہوا سامان میں نے پہلے ہی سمیٹ لیا 'سامان تھا ہی کتنا۔ دو ایچیباں، ایک 'بھٹل کی' ایک 'ایک بیگ۔ میں نے بھٹل باہر آگیا۔

ابن، سید کے حکم کے بغیر ہمارے پاس نہیں آیا ہو گا۔ ہمارے لپکاتے ہوئے ہمیں سلام کیا اور پوچھا کہ ہمیں کسی کی ضرورت تو نہیں ہے؟ چائے، شربت، پھل وغیرہ؟ کھانا لاتا رہے؟ بھٹل نے منع کر دیا۔ ابن نے جتنے کی پیشکش کی بھٹل سے انکار نہ کیا جاسکتا۔ وہ دوڑتا ہوا کمرے میں گیا۔

ابن نے کمرے سے باقی غسل خانے میں حقہ تازہ کیا ہو گا۔ قہقہہ بھگایا ہوا تھا۔ فرشی پر بھی بوندیں چھلک رہی تھیں۔ ام آغا کے وہ ایک طرف بڑھ گیا اور منٹوں میں واپس آگیا۔ بدلی جلدی چوٹیں مار کے اس نے کونے دھکائے اور منال صعل کے آگے کروی۔ چہلم ابھی پوری طرح دہکی نہیں تھی۔ بھٹل چلم سے شغل کرتا رہا اور یوں ہی حقہ کڑکراتا رہا۔

لوہوں کے مرغولے اس کے منہ سے اٹنے لگے۔ اطراف لائبریری کی خوشبو پھیل گئی۔ ابن ایک طرف ہاتھ باندھے لڑا ہوا گیا تھا۔ اس نے بہت دیر بعد جرات کی اور منستانی آواز میں بھٹل سے پوچھا "آپ جارہے ہو یا؟"

"ہاں رہے، آگے جانا تو ہر جگہ سے پڑتا ہے۔" بھٹل

بھٹل آواز میں کہا۔

"ہم سے کوئی قصور ہو گیا ہو تو۔" ابن کی زبان انک

"جی میں۔" وہ ہٹکانے لگا۔

"تھوڑا دیر سے بھی کھل کر کھا کر۔"

ابن نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

"کچھ باہر میں رکھ۔ پورا راتچ رہا کیا۔"

ابن کو کسی کے آجانے اور دیکھ لینے کی پروا نہیں تھی۔ اس نے بڑھ کے بھٹل کے پیروں پر لپکے۔ بھٹل کا اس کے سر پر پھل دینا اور غضب ہوا۔ وہ تو بڑھ لگا "مجھ کو بھی ساتھ لے لو یا! اس نے بھٹل کی آواز میں کہا "میرا کوئی نہیں ہے میاں۔"

"تیرا مالک ہے ادھر۔"

"نہیں بابا! اب میاں رہنے کو من نہیں کرتا۔" وہ فریادی لہجے میں بولا "میرا ہاتھ بھی تمام لو۔ آپ کی اور چھوٹے صاحب کی خدمت کروں گا زندگی بھر۔ کبھی کوئی شکایت ہو تو جوتے مارنا، جوتے مار کے نکال دینا۔"

"ہم کو لوٹ کے گھر جانا ہے رے، پھر آنا ہوا تو دیکھیں گے یا بلوالیں گے کسی سے۔" بھٹل نے اسے تسلی دی۔ وہ یہی کر سکتا تھا۔

"نانا، بابا! منع مت کرو، منع مت کرو۔" وہ بھٹل کے پیروں سے سر رکڑنے لگا۔ بھٹل کو مکدر دیکھ کے میں نے اسے اٹھایا۔ ابن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بھٹل نے جب سے روئے نکالے اور گئے بغیر اسے دینے چاہے۔ ابن نے ہاتھ نہیں لگایا اور گڑگڑا کے کہنے لگا کہ اسے روئے پیسے نہیں، ہمارا سایہ ہماری سرپرستی چاہیے۔ وہ زندگی بھر ہم سے ایک دمزی کا غلبہ کار ہو تو تلف نہ تھیں۔

"ابھی کچھ نہیں بول سکتے رے، ابھی ادھر ہی پنا ڈالے رکھ۔" بھٹل نے منال ہوئوں سے لگائی۔ میں نے ٹوٹ ابن کی جیب میں ٹھونس دیے۔ جانے کب کے رکے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں سے ابل رہے تھے۔ میں نے اس کی دل جوئی کرنی چاہی اور ناچار اسے چھوڑ کر کرسی پر آ بیٹھا۔ میرا پس چلتا تو فوراً باہر پھیلتا۔ اس نے گزشتہ دنوں ہماری بہت خدمت کی تھی مگر بھٹل نے کچھ سوچ کے ہی یہ بغل کیا ہو گا۔ سو میں اس کی سفارش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے آنسو میرا سینہ جلاتے رہے۔

ابن کی توجہ ہٹانے اور اسے وہاں سے ہٹانے کے لیے بھٹل نے اسے کمرے میں جا کے ایک نگاہ ڈالنے کی ہدایت کی کہ کہیں ہمارا کچھ سامان وہاں رہ تو نہیں گیا ہے۔ ابن ایسا کم عقلا بھی نہیں تھا۔ سمجھ گیا ہو گا۔ وہ چپ چاپ کمرے میں چلا گیا۔

کتابیات پبلی کیشنز

سید کو مجھے ہوئے گھٹنے بھرے اور ہو گیا تھا۔ ابن سے بعد کوئی ملازم اس طرف نہیں آیا۔ ابن بھی تھوڑی دیر بعد کمرے کا سامنے کر کے واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے۔ وہ ایک جانب راہداری کے صدم سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ اس نے پھر غسل سے کوئی منت نہیں کی لیکن اس کی خاموشی بجائے خود ایک التجائی تھی۔

رات اور بڑھ گئی تھی۔ مینڈکوں اور جھینگروں کا شور رات کا احساس اور سوا کر دیتا ہے۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ گھر میں کوئی موت ہو گئی ہو چھے، ایسا سکوت۔ کل یہاں اس وقت بت چل گئی تھی۔ بیوی سکوت کی نساں خانے کی چیخ بکار سے کوئی نسبت نہیں۔ بھسل کے پاس وقت گزارنے کے لیے صفے کا مشغلہ تھا، میرے پاس انتظار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انتظار سے بدترین مشغلہ کوئی نہیں ہوتا اور زندگی بیشتر انتظار ہی سے عبارت ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی انتظار ایک کے بعد دوسرا انتظار، شام سے صبح کا اندھیرے سے اجالے کا انتظار۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بڑے عرصے پر پھلے ہوئے انتظار میں آدمی کو صبر آ جاتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے انتظار بہت جان لیا ہوتے ہیں۔ اب سارے مرحلے نٹ جانے کے بعد سید محمود علی کا انتظار تھا۔ کوئی بعد نہ تھا کہ اس وقفے میں رینگے سیار کے دماغ میں کوئی اور کمیٹی نمودار ہو جائے۔ زنان خانے میں رئیس بیگم نے اس کا حوصلہ بڑھایا ہو گا۔ ابھی ہم اس کے گھر میں بیٹھے تھے۔ امکان تو نہیں تھا لیکن سید پر اعتبار نہ کرنے کے جواز بے شمار تھے۔

بھسل اپنے آپ میں گھن تھا۔ میں نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اب سب کچھ نٹ چکا ہے آزمائش کا ایک دن گزر چکا ہے، کیا طویل اور صبر آزمایہ نہ یہ دن کوئی بھی رخ اختیار کر سکتا تھا۔ اب رفت گزشت کے مصداق سب کچھ فراموش کر دینا چاہیے۔ آنے والا وقت یقیناً ایسا کرخت اور گراں نہیں ہو گا۔ خوش امید کی کسی ہی غیر واقعی ہو، باعث راحت ہوتی ہے۔ ہر امید اتنے برے خواب کی طرح ہوتی ہے۔ تعبیر مثبت نکل آئے یا مایوس کرے۔ تعبیر تو قہر ہے اگر خود بخود بتی سے قرار آجایا کرنا تو نجات ہی نجات تھی۔ آدمی کا سارا جسم اس کے اختیار میں ہوتا ہے، بجز دماغ کے۔ آدمی سب سے بے اختیار اپنے دماغ سے ہوتا ہے۔ لوگ دل اور دماغ الگ الگ تصور کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، دونوں کا مزاج ہی جدا ہے اور دونوں میں کوئی ضد ہی ہے۔ بھی دل غالب آ جاتا ہے، بھی دماغ۔ یہ ساری شاعرانہ باتیں ہیں۔ بے شک دل اور دماغ دونوں جدا جدا ہیں

مذہب کو تو بس دھڑکنا آتا ہے۔ دونوں میں اختلاف و انحراف باہمی کوئی ربط باہم نہیں ہے۔ یہ دماغ ہی ہے جو اپنے آپ سے ضد کرتا ہے اور آپ ہی مان جاتا ہے۔ آدمی کا کوئی ایک دماغ نہیں ہوتا۔ کما جائے، ایک دماغ میں کئی دماغ ہوتے ہیں جو بیک وقت مختلف سمتوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ دماغ آدمی سے بہت شوخیوں کرتا ہے، ستم ناک حد تک یہ آدمی کا ہر وقت امتحان لیتا رہتا ہے، رلاتا، ہنسنا، خود ہی سوال کرتا، خود ہی جواب دیتا ہے۔ سچ چور ہے پر لاکے کبھی اس طرف کبھی اس طرف اشارہ کرتا ہے۔ جانے کب کسی دالٹل مندنے خواہشوں، خوش امیدوں اور اداسیوں کے سارے معاملات دل سے وابستہ کیے تھے، باقی دماغ سے۔ یعنی کیفیت دل سے، کیت دماغ سے مشروط ہے۔ حالانکہ اس تقسیم تفریق کا حاصل ہی کیا، دونوں کا واسطہ آدمی سے ہے۔ دونوں کے وظائف ایک ہوں یا جدا جدا۔ ان پر قابو یا فکلی سب سے بڑا ہنر سب سے بڑا اختیار ہے۔ ایسے ہنر مند اور مختار لوگ بہت کم ہوتے ہیں مگر ہوتے ضرور ہیں۔ ایک تو میرے سامنے ہی بیٹھا تھا، ہر تعبیر کے لیے آمادہ۔

کچھ دیر کے لیے، کم از کم سید کے آنے تک میں اپنے آپ کو بیگانہ رکھنے میں ناکام رہا۔ ہاتھ پیر بکھر رہے تھے۔ اس وقت نیند کا کوئی سوال نہیں تھا۔ کمریک گری نیند کے لیے آنکھیں مچلتی، آنکھیں ترستی تھیں۔ ایک ایسی نیند جو دل دماغ کو فکر و تجسس، اندیشہ و دہم کی آلائشوں سے بے نیاز کر دے۔ ایسی نیند تو کب کی مجھ سے دور ہو چکی تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا، بھسل لاکھ بخت کرے، اس بار میں اڑ جاؤں گا کہ اب کہیں اور جانے کے بجائے ہمیں فیض آبادی جانا ہے۔ کچھ دن وہاں آرام کر کے ہم پھر روانہ ہو سکتے ہیں۔ اسے یقین ہے کہ کسی کھوہ میں چھپے ہوئے مولوی صاحب تک ایک روز ہماری رسائی ہو جائے گی۔ میری آس بھی نہیں ٹٹا ہے۔ یہ جان کا ہی وہاں سوزی کسی نہ کسی دن ضرور بار آور ہو گی لیکن میں اس سے کس طرح کوں، اپنا عذاب مجھے خود بھگتے دو۔ اسے کیا معلوم، اس کی ہم رکابی بار بار مجھے بھی پشیمانی اور آزدگی سے دو چار کرتی ہے۔ دوسرے کو کسی آزار ایک حد تک ہی جھیلنا چاہیے۔ میں نے آگے جانے میں اب اس کی ایک نہیں چلے دوں گا۔ آگے جانے سے قطعاً انکار کر دوں گا لیکن یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو ہم اس گھر، اس زندان میں موجود ہیں۔ سب سے بڑا شرط یہاں سے نکلنے کا ہے۔ جانے کیوں مجھے بہت بے گلی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا، ہم یہاں برسوں سے قید ہیں۔ دروازہ زہر لگ

بک رہے تھے، دیکھئے۔" اس نے مسل کے کاغذات پلٹ کے مجھے نکاح نامہ دکھایا۔ اس پر سید، فزوزاں اور یاسمن کی مان، نصیر بابا، قاضی اور کئی اور لوگوں کے دستخط تھے۔

"سب پورا ہے نا؟"۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"بظاہر تو مکمل ہی معلوم ہوتا ہے" میں نے جواب دیا۔

"آپ اطمینان رکھیے۔" سید کی آواز دھڑک رہی تھی، بالکل فکر نہ کیجئے۔"

"ابھی ہم کو وکیل ادھری بھیجنا پڑے گا، ساتھ میں اپنا آدمی بھی دو گا۔"

"میں ہر وقت حاضر ہوں۔"

"کدھری نکل جانے کا دھیان ابھی من سے نکال دو۔"

"میں، میں کہاں میں کہیں نہیں جا رہا، بیس موجود ہوں جناب!"

"جدھری جاؤ گے، ہم چھپے پتے جانیں گے اور تمہارے لیے۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" سید نے مسل کو بات مکمل نہیں کرنے دی اور صندوق کے پہلو سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کے بھسل کے آگے کر دیں۔

"یہ کیا ہے؟" بھسل نے بے اعتنائی سے پوچھا۔

"مجھے ان کے حساب کتاب کا صحیح علم نہیں ہے، اندازاً پچاس ہزار روپے دے رہا ہوں۔"

"تمہاری طرف سے کچھ نہیں مانگتے، جو ان کا ہے، اتنا ہی لوٹاؤ۔ سمجھ میں آیا؟"

"جی، جی، جی۔" سید اس بانٹے ہوئے لگا "اندازہ ہے کہ اتنا ہی دو گا۔"

"پورا تپ تول کے ہی دو۔"

"جی، جی۔" سید ٹھک کے بولا اور کھینا تا سا ہو گیا۔ یہ کم ہوں تو میں۔"

بھسل نے ہاتھ اتھا کے اسے مزید کچھ نہیں کہنے دیا۔ تم سے بولا تا، جو ان کا ہے، بس دی لوٹا تا۔" اس نے بھڑکتی آواز میں کہا، "مول مت سوچنا، اس الٹ جائے گا پھر۔"

سید محمود علی نے پھر کچھ نہیں کہا۔

بھسل کا یہ طرز خطاب میرے لیے حیران کن تھا مگر اس سے کچھ دیر پہلے کمرے میں اس کے اور سید کے درمیان ہونے والی گفتگو کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

بھسل کی ہدایت پر میں نے صندوق اور نوٹوں کی گڈیاں اپنی میں منتقل کر دیں۔ اپنی میں جگہ بنانے کے لیے

کچھ سامان نکال کے بیگ میں رکھا، کچھ دوسری اینٹی میں منتقل کر دیا۔

”تاکہ سگوان۔“
بٹھل کے کہنے کی دیر تھی کہ سید فوراً ایک جانب لپک پڑا۔ اسے کوئی ملازم قریب ہی کہیں نظر آیا تھا جو وہ یہ بگلت واپس آگیا۔ چند لمحوں میں بشارت اور نذر بھی آگئے اور راہداری کے اس حصے میں ہمارا سامان لے آئے جہاں سے بڑا دروازہ نزدیک تھا۔ تاکہ آئے میں بھی دیر نہیں لگی۔ سید ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ تاکہ سوار ہونے سے پہلے بٹھل نے عین اس کے مقابل جا کے سرو لیجے میں کہا ”تم کو اے چھوڑ کے جانے کا بیچتا رہے گا“ پر لڑکیوں نے ہاتھ جکڑ رکھے ہیں۔ تم کو تمہاری جگہ پہنچانے کے لیے ان کو بھی انٹی سیدھی جگہ جانا پڑے گا۔“
سید معمولی بت بنا کھڑا رہا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

”پھندا تھا سے کبھی دور نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہی بٹھل تاکہ میں بیٹھ گیا۔

ایشن اتار دو نہیں تھا۔ سڑکیں صاف اور دھندلی دھندلی تھیں۔ سنانے میں گھوڑے کی ٹانگیں سارے راستے گونجنی رہیں۔ آدھ گھنٹے سے پہلے ہم ایشن پہنچ گئے۔ ایشن بھی سنان پڑا تھا۔ خوب روشیاں تھیں مگر انکھ سی رہی تھیں۔ جہجہم میں روشنی بھی ترشور ہو جاتی ہے۔ کو جو ان نے ہمیں بتایا تھا کہ منسل سرائے کی طرف جانے والی گاڑی دو گھنٹے بعد اور گھلتے کی طرف جانے والی دھاتی گھنٹے بعد یہاں سے گزریں گی۔ ابھی گیارہ بجے تھے۔ ہم سنے سازو سامان سے آراستہ فرسٹ کلاس کی کشادہ اور صاف ستھری انتظار گاہ میں آگئے۔ یہاں کوئی اور نہیں تھا۔ انتظار گاہ کے کمران نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور بٹھل کی فرمائش پر چائے اور بکٹ کا انتظام کر دیا۔ سید پر بٹھل بازار سے پتوہریاں وغیرہ لایا تھا۔ اسی وقت ہم نے کچھ کھایا پیا تھا۔ حلق ویسے بھی سوکھ رہا تھا۔ چائے پی کے توانائی اور تازگی سی محسوس ہوئی۔ ہم دونوں باری باری منہ ہاتھ دھو کے کچھ تازہ دم ہو گئے تھے۔ لی کو بتا کے میں تو باہر نکل آیا۔ سارا جسم ہلکا ہلکا لگ رہا تھا۔ ہوا میں نرمی اور کمی تھی۔ لگتا تھا جیسے جسم کے بندور سے مکھل گئے ہوں اور خوب ہوا، خوب روشنی در آئی ہو۔ آسن سول ایک بڑا جھنشن ہے۔ دیر تک میں یوں ہی شملتا رہا۔

اتفاق سے اس وقت میرا رخ انتظار گاہ ہی کی طرف

تھا۔ دور سے میں نے تین آدمی انتظار گاہ میں داخل دیکھے۔ وہ مسافر نہیں معلوم ہوتے تھے۔ بھاگنے۔ فارم پر موجود لوگ محکوک ہو جاتے، میں نے اپنی رفتار اور دروازے پر پہنچ کے اندر جانے سے پہلے چاقو بڑھ نکال کے ہاتھ میں دیا۔ آہستگی سے میں نے دروازہ کھینچے چاقو جب میں واپس رکھنا پڑا۔ وہ ناخوشاوار اور سامی تھے۔ تینوں فرش پر بٹھل کے پیروں میں بیٹھے تھے اس کے کپڑے پکڑ رکھے تھے۔ میں قریب پہنچا تو اس کے ساتھیوں نے ہاتھ جوڑ کے مجھے پر نام کیا۔ میر کی جنیش سے انہیں جواب دیا۔ ناخوش بٹھل سے معا آیا تھا کہ رہا تھا، اس نے اپنا ایک آدمی سید محمود مکان کے باہر تعینات کر دیا تھا کہ جب بھی باہر آئے اسے مطلع کر دے۔ سید کے ہاں سے آئے کے بعد وہ اپنے آپ کو سرزنش کرتا رہا کہ اس نے بٹھل۔ بدکامی کیوں کی۔ اس سے بٹھل کو پہچاننے کی چوکر ہو گئی۔ ایک بار زک اٹھانے کے بعد اس نے چاقو دوبارہ بٹھل کے سامنے آنے کی جرات کیوں کی۔ آ سید کے مکان میں سب کے سامنے بٹھل سے معا کر لی تھی لیکن وہ کہہ رہا تھا، اس کا دل مطمئن نہ دوبارہ سید کے مکان میں جانا مناسب نہیں تھا۔ بعد پولیس بھی آچکی تھی اور اسے یقین تھا کہ پولیس بھی ہو کے جائے گی۔ اگر پولیس بٹھل کو تھانے لے جا کر تھانے میں حاضر ہو جائے۔ وہ بھی بٹھل کو بابا کے قہر مخاطب کر رہا تھا۔ پہلے مجھے شبہ ہوا تھا کہ کہیں دیا اور ساتھی بٹھل کو پہچان تو نہیں گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ بٹھل خاموشی سے اس کی بے قراری کی دوازہ رہا۔ ناخوش دہائیاں دینے لگا اور کہنے لگا کہ اگر خدمت بجالانے کا موقع دیا جائے بٹھل اسے کوئی اور مناسب سمجھے تو اپنے گھر کا پتہ بھی بتا دے۔ ناخوش اس کے تئیں کوئی کھوت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ”ابھی دور جانا ہے، دیکھو جلدی پھر ادھر آنا تو بٹھل نے نرمی سے کہا ”تم کو بول دیں گے۔“ ناخوش کو اپنا واس کھو رہا تھا۔ ناخوش عازری اور بٹھل کی پندلیاں دبانے لگا ”تم نے معاف کر دیا نا وہ وہیں بیٹھا رہتا۔ بٹھل نے آرام کی خواہش کا وہ ڈھیر سا ہو گیا اور سر رکھائی ہوئی آواز میں بولا کہ آجائے تک اسے بیٹھے رہنے کی اجازت دی جائے۔“ جبارے اب آگے چھان چمک کے ہاتھ جہجہ کو

”ہی تو باب ہوا اپنے سے۔ ہماری آنکھیں نکال لو۔ یہ ابھی نہیں تو کس کام کی۔“
”ہم آسن کی رے، سنبھال کے رکھ۔ پہلے دیدے کو نے کہ چاقو تو دیدہ ہی گھماتا ہے۔ ہاتھ تو آیا کا پالن کرتا ہوا تھا۔“

ہاتھ نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے سنا اور اچھل پڑا لی ٹھیک بالکل ٹھیک بولتے ہوئے۔ ”اس نے اپنے منہ پر غبارے اور دیواری سے سر جھکنے اور تکرار کرنے لگا پڑا اس کو معافی دیا بابا!“

”ابھی تو ادھر ہی، انتہا ہے۔ یاد رہے گا تو بھی۔“

”اپنے کچروں سے دور مت کرو۔“

”آسن گے رے ادھر ہی لوٹ کے۔“ بٹھل نے بولے لیجے میں کہا اور اپنے پیر سمیٹ لیے۔ ہاتھو جانا میں چاہتا تھا۔ اس کے ساتھی نے کہنی مارا اسے ٹوکا تو وہ کسمسا کے اٹھا اور ہاتھ جوڑتا ہوا اٹلے دن دروازے تک گیا اور باہر جاتے جاتے واپس آگیا اس کو اپنی کوئی بیعت دے دیا بابا!“ اس نے بھکاریوں انداز میں کہا۔

بٹھل نے جب سے چاقو نکال کے اچھال دیا۔

ہاتھو نے مشافی سے اسے پکڑ لیا اور آنکھوں سے لگایا۔ جادو مارا ”اس دپ جلائے بیٹھا رہے گا۔“ اس نے لی ہوئی آواز میں کہا اور انتظار گاہ سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بٹھل کے برابر کی کرسی پر ایک اس سے پوچھنے کے لیے سر میں بے شمار باتیں گردش رہی تھیں لیکن میری طرح اسے بھی گزشتی کا غبار دور نے کے لیے ایک عرصہ سکون و سکوت درکار تھا۔ سب سے بار تو کہتا ہے ابھی ہم آسن سول میں تھے کسی جگہ نسبت سے جسم وہاں پر چھائی ہوئی دھند میں فاصلے بھی نہ ہوتے ہیں۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے دور ہو جانا ہے تھا۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ اس نے بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ کچھ دیر بعد اسے خیال آیا ”اچھتی آواز میں اس نے غمگینانے کے لیے کہا اور جب میں ہاتھ ڈالا۔

”ہم نے کچھ دوپے ہیں میرے پاس، تم ہی نے دیے“ غرض قیاس نہیں ہوئے۔ میرے لیجے میں غیر ارادی طور پر ایک آئینہ ہو گئی۔ ”کہاں کے ٹکٹ لائیں؟“

”اس نے تمل کیا پھر بے پروائی سے بولا “آگے کے لے

”آگے کہاں کے؟“

”ادھر ہی سے بردوان شہری بڑا پڑتا ہے۔“
”بردوان جاتا ہے؟“ میں نے چلا کے کہا ”وہاں کیوں؟“
”آگے اب وہی تو ہے رے۔ سچ میں درگا پور بھی ہے پڑ اس کو بعد میں دیکھیں گے۔“

”کیا اب بھی آگے ہی چلنے کا ارادہ ہے؟“

”اب ادھر ہی ہیں تو سارا اٹھنا کے چلیں۔“

”اب اٹھنے ہی چلیں گے ادھر ہی، جس کام کے لیے نکلے ہیں، پہلے اس کو تو پورا کر لیں۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔“ اپنے لیجے کی تنہی پر مجھے

شرمندگی بھی ہوئی۔

”تو کدھر ہی جائے گا؟“

”ادھر ہی تو جانا ہی ہے۔“ وہ مفاہمت کے لیجے میں بولا

”تجہ کو کیا اب مولوی کا دھیان نہیں ہے؟“

”یہ کون کہہ رہا ہے، میری بات سمجھتے کیوں نہیں۔“

”سمجھارے پھر۔“ اس کی توری پر بل پڑنے لگتا ہے،

آسن چھوڑ دی تو نے۔ آج نہیں توکل، کسی جگہ پر تو کھرے گا

مولوی پر کھو بے بنا کیے، گھر بیٹھ کے تو نہیں آجائے گا پاس

اپنے۔

”میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔“ میں نے چڑ کے کہا ”میں

صرف کچھ دنوں کی بات کر رہا ہوں۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

اگر ہم کچھ دن فیض آباد ٹھہر کے روانہ ہوں۔ نہیں اندازہ

نہیں، ہمیں وہاں سے آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا۔ بابا جان کو

جب ہم بت سے لائے تھے تب وہاں ٹھہرے تھے۔ درمیان

میں فرصت ہی نہیں ملی اور کیا کیا حادثے ہوتے رہے۔ کبھی

حیدر آباد، کبھی سمیٹی، مراد آباد، کھنڈو، کون، پیچیم، یوپی ہمار

اور اب بنگال۔ کتنے صوبے، شہر، قصبے، کچھ معلوم ہے، کتنا

وقت گزر گیا؟ صرف خط لکھ دینے سے تم سمجھتے ہو بات بن

گئی، تمہاری ذمے داری پوری ہو گئی۔ وہ بھی ہمارا گھر ہے۔

ابھی کچھ عرصے پہلے ہم نے سسلی کو وہاں بھیجا ہے۔ ٹھیک

ہے۔ اس کے ساتھ جواور زور دیتے ہیں اب فروزاں اور

یا منن وہاں پہنچنے والی ہیں۔ میں نے بٹھل کو ہمارا کرنے کی

کوشش جاری رکھی۔ میں نے کہا ”فروزاں، یا منن اور نصیر

بابا کے لیے زریں کی حویلی بالکل اجنبی ہوگی۔ ہماری موجودگی

ان کی اجنبیت دور کرنے میں معاون ہوگی۔ شروع شروع میں

انہیں ہمارے گداز کی بڑی ضرورت ہوگی۔“

”وہ سارا لکھ لے گی، وہ بڑی گنی ہے۔“ میرے لیجے کی

تپش اور نیت کے صدق کا بٹھل پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

کہنے لگا کہ وہاں اور لوگ بھی ہیں۔ میرے علی کا خاندان ہے۔

جہاں گیر ہے، نیساں ہے، ملا زمین ہیں۔ ہو سکتا ہے، جہو اور زور ابھی انہی دہیں ہوں اور خام حیدر آباد سے اچکی ہو۔ نصیر بابا کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ زریں کے نام چند سٹری خطا بھی لکھا اس کے نصیر بابا کے حوالے کر دیا ہے۔

میں اسے اپنی بات سمجھا نہیں پا رہا تھا وہ سمجھتا نہیں چاہتا تھا۔ شاید میرے ہی ادعا میں کوئی نقص تھا۔ میں اس سے کہہ نہیں پا رہا تھا کہ سالوں کی طرح میرے ساتھ یوں گئی کوچوں میں اس کی خواری مجھے اچھی نہیں لگتی۔ ایک حد تک ہی آدمی، آدمی کے ساتھ چل سکتا ہے، ایک حد تک ہی کسی کو دوسرے کے بوجھ میں شریک ہونا چاہیے۔ میں غلط بھی کیا کہ رہا تھا، میں نے دیکھا تھا، زریں کے پاس جا کے لیل کے چرے پر کیا سکون چھا جاتا ہے۔ زریں تو واقعی کوئی شجر سایہ دار ہے۔ وہاں جا کے بھل، زریں کے اشاروں کا فکھر رہتا ہے۔ آدمی کو فیل حکم میں جہاں آسودگی ملے، لیل کے لیے زریں کی حویلی ایسی ہی ایک جگہ ہے۔ وہاں جا کے وہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا ہے۔ اس نے اڑا ترک کر دیا تھا، جہاں عرصے سے اس کی حکومت قائم تھی، اس نے اڑے کے ساتھیوں سے کنارہ کر لیا تھا جو غلاموں کے مانند اس کی جنبش ابو کے اسیر تھے۔ اپنے ساتھ مجھے اس کی بے آرائی کا بدم احساس رہتا تھا۔ مجھے بھی تو کچھ اس کا خیال کرنا چاہیے۔ میں یہی کچھ اس سے کہنا چاہتا تھا لیکن لفظ ہی کھو گئے تھے۔ شاید مجھے اس کی دل برداشتگی اور ناراضگی کا خدشہ تھا اور خود مجھ پر واضح نہیں تھا کہ میری فضا کیا ہے۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، میری امید میں پہلے جیسا عزم اور یقین نہیں رہا ہے۔ مولوی صاحب ہی مجھ سے دامن کش رہتا چاہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ جہاں جہاں ہم ان سے قرب جیتتے رہیں گے، وہ ہم سے دور اور ہوتے جائیں گے۔ وہ ایک جگہ ٹھہرے رہتے تو ان تک پہنچنا کوئی دشوار نہیں تھا۔ یہ نہیں تھا کہ ان کے تعاقب میں ہم ناکام ہی رہے ہوں، کئی جگہ بس آگے پیچھے کی بات رہ گئی۔ ہم ان گھروں تک پہنچ گئے تھے جہاں ان کا قیام رہا۔ جیسا میر، مراد آباد، گھریا سادات، حیدر آباد۔

یا پھر یوں تھا کہ میں ہی زریں کے پاس جانے کے لیے مضطرب تھا۔ سن کی طرح وہ میری ذمہ داری بھی ہے۔ میں اپنی شبیہ کی عیالی کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا اور جواز کے لیے بھیل کے سامنے ولیوں وضع کر رہا تھا۔ وہ میری آس کی باتوں کی بات کر رہا تھا۔ آدمی اپنا حال خود ہی بہتر جانتا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ درمیان میں ہی طرح طرح کے

حادثے اور سانحے جو دیوار بن جاتے ہیں تو مجھ پر کیا ہے۔ میں کسی ان ہونی میں شامل نہ بھی ہوں تو ان کے ساتھ ہو سکتا ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے شامل ہونا پڑتا ہے۔ بابا کی زبانی فروزاں اور یا سمن کی روداد سن کے ہم اپنا بھی لے سکتے تھے۔ ریل میں سسلی کا احوال جان کر مجبوری کا عذر کر سکتے تھے۔ فروزاں اور یا سمن اپنے ہار کی طرح سید محمود علی کی بیعت چڑھ جاتیں۔ ارشاد آسرا سسلی کا پھر کہیں اور سودا کر دیتا۔ سسلی کے چرانے ہوئے ہیرے جو اہرے کے کہیں چلتا ہوتا۔ یہی مقصود تھا۔ اگر میں بروقت مداخلت نہ کرتا تو حملہ آور کو ختم کرنے کے ارادے ہی سے آئے تھے۔ کرشنا کی لیے بالکل اجنبی تھے۔ کوئی کتنا ہی اجنبی ہو، آدمی کی نسبت تو آدمی سے ہے پھر کرشنا کی نے میرے بیروں پر ڈال دی۔ انہوں نے میرے لیے کیا کیا نہ کیا۔ شے چھوٹے بھائی کی طرح عزت دی، ساری جائداد میرے گئے۔ ابا جان تک ہم انہی کی کوششوں سے پہنچ پائے۔ ریل ہی میں مجھے زریں ملی تھی۔ اسے اس فاشٹیز چنگل میں دیکھ کے میں کس طرح ہاتھ پیر توڑے بیٹھا تھا، زریں کو کیا اس کے حال پر چھوڑ دیتا۔ آدمی اپنے بھی تو کرتا ہے۔ راستے کے پتھروں کا آدمی کیا کرے۔ موسوں کا کیا اعتبار۔ میرا ستم تو مستزاد تھا، اپنے درد کے فشار میں یہ پتھروں اور موسوں کا آزار، جو خود مجبور ہو، وہ کسی کی دادرسی کیا کرے، کس قدر کرنا۔ بھول کو میں کیا بتانا کہ میں اس کے ساتھ ہوتے ہو کیا تھا رہتا ہوں۔ میرے سینے میں مسلسل ہوک آ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے، دیواروں سے سر پھوڑ لوں، اپنا لوں، کہیں کسی دیر لانے میں جا ہوں۔ کوئی میری پر کرے۔ میں کوئی پاگل تو نہیں ہوں، اپنا اجمار ہوا ہوں، مجھے رنگوں کی تیز ہے، خوب اچھی طرح دیکھا دیتا ہے لیکن میں کیا کروں بہت خود کو ٹوٹا ہوں، اپنے سمجھتا ہوں کہ میری استطاعت بس اسی قدر ہے۔ محدود ہے۔ بس ایک دائرے میں دیکھتے، سننے اور مدد کی توفیق رکھتا ہے۔ یہ دنیا آدمی سے بہت بڑی ہے۔ کوئی شمار، کوئی حد و حساب ہی نہیں، بے شمار اس میں ہے۔ پناہ اس کے فاصلے۔ کوئی مقدرت کے ہما بھاگ سکتا ہے۔ بیل سے آنے کے بعد میں نے کئی گنوا، میں تو بھاگتا ہی رہا۔ میں جو نظر آتا ہوں ہوں۔ ایک آدمی کا اندرون دوسرے کو کتنا نظر

مل لیں کوئی نظر آتا ہے، وہ اتنا نہیں ہے، جتنا میں خود سے نہرو رہا ہوں۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا، بے شک، زریں کے بال سے لطف و راحت کا احساس ہونا ہے لیکن جانے ہیں، جب وہ سامنے آتی ہے، کہیں سے کورا بھی پکے سے لے کے بھلو میں آکے کھڑی ہو جاتی ہے پھر میری آنکھیں اور لے لگتی ہیں، میرا سینہ اور کھٹنے لگتا ہے۔ بھیل سے میں کیا تاکہ فیض آباد میں زریں کی حویلی ہو یا سمن میں ابا جان کا ل، میں رہا کے ساتھ ششی سوار ہوں اور لرس جھولا جھلا ہی ہوں اور رہا کا نہایت بیخ و شاکستہ، دل نشیں، اثر آفریں لہام جاری ہو۔ وہ جو لیکن ہو جس کی معیت میں زریں جیسی ماؤں، غنڈہ اور جذب و کیف ہے۔ میں کسی نہایت سر تپا ف و عنایت شخص کے رو بہ ہوں یا کسی نظر فریب، خوش اظہر کے سامنے۔ میرا دل بہت جلد ٹھہرانے لگتا ہے، مجھے تو فتنان سا ہونے لگتا ہے۔ میں تو مسلسل اس کی آوازیں لاتا ہوں، جیسے وہ مجھے بکار رہی ہو، میری طرح وہ بھی آرزوہ۔ کوچہ گردی کی اس تدبیر میں کم از کم ایک طمانیت تو ہے۔ لہو یں ہی کسی دن میں اس کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔ مگر کچھ کے تو کچھ نہیں ہوگا، مگر بیٹھے تو دعائیں ہی کی جا سکتی ہیں۔ وہ تو اب بھی میرا رواں رواں کرتا ہے۔ دعا کے لیے حرف دعا زم نہیں، خاموشی کی زبان خدا سے زیادہ کون سمجھتا ہوگا۔

”کہہ رہی تھو کیا رہے۔“ مجھے چپ دیکھ کے بھیل نے کہا۔
”کیس نہیں، بس یوں ہی۔“ میں نے مل کھا کے کہا۔
”کیا چار ہے تیرا؟“
”جو تم سمجھتے ہو، وہی ٹھیک ہے۔“ میں نے چرماتی آواز میں کہا۔

”تو بڑا کتنا ہے، ایسا کہ تو ادھر چلا جا، بنایا کے پاس نہیں آؤں۔“
”اور تم تم۔“

”میں مولوی کی ٹوہ میں آگے نکلتا ہوں۔“
”اس کے الٹ بھی تو ہو سکتا ہے۔“
”ادھر جا کے جلدی لٹکانا نہیں ہوگا۔“ فیض آباد اسٹیشن پر ہم سسلی کو رخصت کر رہے تھے اور میں نے اس سے اصرار کیا تھا، تب بھی اس نے یہی عذر کیا تھا۔
”وہ کیا بیڑی ڈال دے گی؟“
”اس سے بڑی بیڑی کیا ہے، اس کی آنکھیں دیکھی گئیں، نہیں جانتا رہے، وہ کیسی ہے؟“
”ہاں، میں کیا جانوں، تمہاری سگی ہے وہ۔“

باری گری 6

”اور تو سب کا سوتلا ہے۔“
”اس بات کا مجھ پر چھوڑو، میں اس سے بات کر لوں گا۔ ایک بار تو خود اس نے مجھ پر زور دیا تھا کہ مجھے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔ وہ بڑی سوجھ بوجھ کی اور حوصلہ والی ہے۔“
”پتا ہے، چپ ہو جائے گی، اس کا مان تو پاس ہی رہتا چاہیے کہ جب چاہے وہ ہماری لگاؤ کھینچ سکتی ہے۔“
”اے زریں اس قدر عزیز تھی۔ مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ دیا جا سکا۔“

”تو بھی ٹھیک ہی بولتا ہے،“ وہ سر ہلا کے بولا، ”چل پھر،“
ادھر ہی پلٹے ہیں۔ دیکھ لیں گے، اس کو بھی۔“



راستے میں موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے ریل کو کبھی جگہ ٹھہرا پڑا۔ رفتار بھی سست رہی۔ آسن سول سے مغل سرائے کا فاصلہ سو اتین سو میل ہے اور وہاں سے فیض آباد ایک سو پالیس میل کی دوری پر ہے۔ مغل سرائے میں ہم نے گاڑی بدل دی۔ بارشوں نے موسم بھی خوش گوار کر دیا تھا۔ میں تو بیشتر کھوئی کے پاس بیٹھا رہا اور کہتوں، باغوں، دیواروں اور پہاڑیوں کے دلکش مناظر دیکھا کیا۔ بھیل تو تقریباً آرام ہی کرتا رہا۔ میں مختلف اسٹیشنوں پر اترے، محوم آتا اور بھیل کے لیے ہر ایک کچھ نہ کچھ لے آتا، پان، بیڑی، چائے، پوریاں وغیرہ۔ ریلوے کی طرف سے اول درجے کے مسافروں کے لیے کھانے کا انتظام عمدہ تھا۔ سفر کا احساس ہی نہیں ہوا۔ فیض آباد آتے آتے رات کے گیارہ بج گئے۔ وہاں بارش نہیں تھی لیکن بادل اٹے ہوئے تھے۔ سڑکیں سوچنی تھیں۔ کہیں کہیں پان بیڑی اور چائے کی دکانیں کھلی تھیں اور گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے۔

آدھ کھٹنے کے اندر اندر ناگائا میں حویلی کے سامنے لے آیا۔ میرا تو عالم ہی دگر تھا۔ ناگائا ابھی ٹھہرا ہی تھا کہ میں کوکے اتر پڑا۔ حویلی پر نیارنگ وروغن کیا گیا تھا۔ بہت دھلی دھلی روشن روشن نظر آتی تھی۔ مکان کا کمین کے ذوق سے گرا تعلق ہوتا ہے اور خوش ذوقی خوش سیرتی دو مختلف چیزیں ہیں۔ زریں کے ہاں دونوں خوبیاں تھیں۔ سید محمود علی کا ذوق جتنا اعلیٰ تھا، بے باقتی بھی وہ اتنا ہی تھا۔ وہ کینہ میرے دماغ سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ زریں کے ہاں فحاشت کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ خود بھی وہ بیٹھ نہیں لباس پہنتی تھی۔ کرتا، آڑا، یا جامہ اور ستاروں بھرا دوپٹا اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ سفید رنگ اسے بے حد مرغوب تھا۔ اس کے بعد گلابی، گلابی رنگ تو خود اس کا پتا تھا، وہ تو سر تپا گلاب تھی۔

دروازے پر تعینات ہو جاؤ دربان ممانگے کی آواز سن کے پوری طرح بیدار ہو گیا۔ نام تو اس کا کچھ اور تھا، زمانے سے جھگت ممان بن چکا تھا۔ سن رسیدگی کے باوجود جسم کسرتی تھا، جوانوں کی سی چھرتی تھی۔ شیرا کو ہٹانے کے استاد جامو نے اسے یہاں رکھا تھا۔ ہم اسے بہت سے پتلے سے جانتے تھے۔

زیریں نے دروازے پر اس تبدیلی کے بارے میں ہمیں لکھا تھا۔ ممان بھی نشانے کا بڑا کھرا تھا۔ کسی جاگیردار کے ہاں ملازم تھا کہ جاگیردار سے کسی کا قتل ہو گیا۔ ممان نے الزام اپنے سر لے لیا۔ اسے پھانسی ہو جاتی لیکن شادی میں منتر کر دی گئی تھیں۔ صرف سزا ہوئی۔ مقتول کا کوئی عزیز اصل دانے کا شاید تھا۔ وہ ٹانگ میں رہا، موقع پر اس نے جاگیردار کا خون کھینچا اور فرار ہو گیا۔ پولیس اسے کبھی نہ پکڑ سکی۔ ممان نے اپنی سزا پوری کی پھر جامو کے اڈے پر آ گیا۔ حویلی کی ڈیوڑھی سے ملحق گراماں کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ عموماً رات کو وہ چوکی دیتا تھا، دن میں اس کا بیٹھا گھرائی کرتا تھا۔ حویلی میں تو اتارے مختلف لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ممان ہی ان کی خاطر مدارات کیا کرتا تھا۔ اصل میں ممان دربان ہی نہیں، حویلی کے بعض معاملات کا منتظم بھی تھا، تاہم اسے اتارنے والے مسافروں کو پچان کے ممان کا عجیب حال ہوا۔ اس نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ دیوانہ واری سے چوترے کی سیڑھیاں پھلانگ کے آیا اور شور مچانے لگا "ہائیں، ہائیں" ہم کیا دیکھتے ہیں، اپنے بابا صاحب آئے ہیں۔"

بھٹل نے بڑھ کے اسے ٹھکے لگایا، پھر ممانجھ سے لپٹ گیا اور اس کی آواز جھرجھرائی۔ بار بار میرے ہاتھ جکڑتا اور سینے سے لگا تا۔ ٹانگے سے سامان اتارنے کا بھی اسے ہوش نہ رہا۔ کوچوان نے اٹیچیاں نیچے رکھیں۔ ہمیں چھوڑ کے ممان نے تیزی سے چوترے کی سیڑھیاں طے کیں اور اپنے کمرے میں جا کے غائب ہو گیا۔ اس کے کمرے سے ڈیوڑھی میں راستہ نکلتا تھا۔ اندر جا کے اس نے ڈیوڑھی کا وسیع دروازہ کھول دیا اور اندرونی دروازے پر بے تماشاً دستک دینے لگا۔ کسی ملازمہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا بات ہے ممان؟ خیریت تو ہے؟"

"بہت خیریت ہے شکور بی! دروازہ کھولو، دیکھو کون آیا ہے؟" ممان نے وارفتگی سے کہا "ارے بابا صاحب آئے ہیں اور اسے شہزادے کلفام، بابریاں۔"

شکور نے اندرونی دروازے میں نصب روزن کی لکڑی ہٹانے کے بعد تھوڑی سی۔ روزن سے اس کی آنکھیں اور پیشانی ہی دکھائی دے سکی۔

"جاؤ بھاگوان، بیٹا کو خبر کرو، جگادو سب کو۔" ممان نے چکر کہا۔

"ساروں کو نہیں، صرف بیٹا کو بولو،" بھٹل نے ہلکے کی۔

بھٹل کی آواز سن کے شکور دوڑ پڑی۔ ہمارے انو آنے کے لیے اسے دروازہ کھولنے کا بھی خیال نہیں رہا۔

"ارے دروازہ تو کھول خوش بخت!" ممان آواز دیتا رہا "کیسی باؤلی ہے، ڈکٹی۔"

"آجائو کی۔" بھٹل نے ممان کو قتل کے لیے کہا اور پوچھا "نئے ممان کب پہنچے، اصری؟"

"نئے ممان؟" ممان اچھٹ کیا۔

"وہ درویشیاں اور بوڑھا۔"

"وہ۔ وہ تو دوسرے پہلے آئے تھے۔"

میں نے آنکھیں میچ لیں۔ بھٹل کو بھی فرحت احساس ہوا ہو گا۔

"بہت اچھے تھے، گتے لگتے تھے۔ بیسیاں بھی گھرائی تھیں۔ خیریت سے پہنچ گئے،" ممانے بتایا۔

دروازہ کھلے اور ہمارے اندر جانے کی دیر تھی کہ ممان حویلی جاگ گئی۔

سب سے پہلے وہی مجھے نظر آئی۔ سب سے پہلے اسی کو دیکھنے کی تمنا تھی۔ وہ اندر سے بھائی ہوئی آئی تھی ہاتھ رہی تھی۔ وہ بالکل نہیں بدلی تھی۔ سفید روپے اس کا سر ڈھکا ہوا تھا اور بدن پر عنابی رنگ کی چادر لپی تھی۔ اس کا چہرہ دیکر رہا تھا، آنکھوں میں شرارے کود رہے تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر وہ ٹھک کے رک گئی۔ اسے بھی آ رہا ہو چیسے یا اسے اندیشہ تھا کہ وقت نے ہمارے واسطوں کو گرد آلود تو نہیں کر دیا ہے۔ لمحوں تک وہ دم رہی۔ بھٹل بھی اسے دیکھتا رہا۔ پھر چند قدم آگے جا کے نے بازو پھیلا دیے۔ زیریں کے بدن میں تلاطم سا اٹھا، اختیار وہ بھٹل کے بازوؤں میں اتر آئی اور بھٹل بددلتا ہوئے جانے لگا کہ کیا کہہ کر زیریں کو صبر کا پار نہ رہا۔ بری طرح ٹھٹھکتی لگی۔

پھر تو دیکھتے دیکھتے وہاں ایک جھوم سا ہو گیا، شور مچا۔ جہاں کیر، نیساں، زہرہ اور منیر علی کا سارا خاندان ہاں، زہرہ سے پیوستہ، جھکتے رخساروں کے ساتھ سلی وہاں نظر آئی، اس نے مجھے آواب کیا۔ میری نگاہیں فرار اور یا ممان کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ بھی ایک کونے میں دھکی ہوئی وہاں موجود تھیں۔ انہیں اس گھر میں آئے

ایک پہری ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی وہ جتنس اور خیر سے اس منظر کی تماشائی ہیں۔ فروزاں میرا سامنا دوسری بار ہوا تھا اور اس مرتبہ بھی مجھے بس کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع ملا۔ جہاں کیر اور نیساں نے گھیر لیا اور کہیں سے اچانک خانم میرے سامنے آگئی۔ آئی آپ! آپ کب آئیں آپ؟" میں نے حیرت سے

"آپ تو دو مہینے کے قریب ہو رہے ہیں" وہ ٹھٹھکتی آواز بولی "تم بتاؤ، تم کیسے ہو؟ کتنا تو نہیں چاہیے مگر کچھ دہلے لگ رہے ہو۔"

"ہاں، ہاں ایسے ہی۔ بہت دنوں سے سفر میں ہوں، ادھر لپٹے پھرتے رہا بھی ہو گیا تھا۔"

"خدا خیر کرے" وہ تشویش سے بولی "اب کیسے ہو؟"

"اب تو بہت ٹھیک ہوں آپ! لیکن مجھے پورے ہفتے ہسپتال میں رکھا۔"

نیساں میرے ایک بازو پر، دوسرے پر جتا گیر بھول گیا

دیر تک ہم جھجھکے رہے۔ زیریں کو بازو میں دوپٹے نے بھٹل ہر ایک کے پاس گیا اور ہر ایک سے اس کا حال پوچھا۔ فروزاں اور یا ممان کے پاس جا کے وہ ٹھہر گیا۔ "کوئی بات تو نہیں ہوئی رستے میں؟" اس نے مشتاقانہ انداز میں

"نہیں بابا! یا ممان نے پچکا تے ہوئے جواب دی

لی بھی نہیں، بہت آرام سے آئے یہاں سب لوگ اچھے ہیں۔"

"سب اچھے ہی رہیں گے ری،" بھٹل نے پر عزم لہجے لکھا "اور نہ دین تو تم کو صاف بولنا۔"

یا ممان کے چہرے پر رنگ آ جا رہے تھے۔ اس کے برابر زان سر تھکا لے کھڑی تھی۔ بھٹل نے اس کے سر پر ہاتھ اتارنے کے ہونٹ مسکے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ اور نہ رہے، زیریں نے اسے اپنی طرف مٹھنے لیا اور اس کے لالہ ہاتھوں کو بوسہ دے فروزاں، زیریں کے پہلو میں

حویلی کا بڑا کھرا کھول دی گئی۔ یہ ڈیوڑھی سے متصل تھا۔ درگاہ دھرم کے اعتبار سے کسی ایوان سے مشابہ۔ عموماً لالہ بھنگ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ارد گرد مسمانوں کے لہرے کمرے تھے۔ حویلی کا یہ حصہ حویلی میں شامل بھی

نہ تھا۔ الگ بھی۔ ہمیں اٹیچیاں کھولنے کی ضرورت

نہیں پڑی ہم دونوں کے کپڑے تیار تھے۔ زیریں نے ہماری آمد کی امید میں کب سے اہتمام کر رکھا تھا۔ ملازمہ نے بتایا کہ بھٹل کے لیے ہر ماہ یا خیرہ آتا تھا تاکہ بھٹل جب بھی گھر آئے، حق کے بندوبست میں دیر نہ لگے۔ منہ ہاتھ دھو کے اور نیا لباس پہن کے باہر آیا تو بھٹل کا ہاتھ سلگ رہا تھا۔

مردانہ بیٹھک کی ترخیں و آرائش نے سرے سے کی گئی تھی۔ سازو سامان اس قدر زیادہ تھا اور ساواہ بھی تھا لیکن سادگی میں ملحقہ سب سے بڑی آرائش ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ سے مطابقت رکھتی تھی جیسے اسی جگہ کے لیے بنائی گئی ہو۔ کہیں بھی گرو کا نشان نہیں تھا۔ ہم ریل میں رات کا کھانا کھا چکے تھے۔ انہوں نے ہم سے پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔ ہمیں آئے ہوئے ایک ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا ہو گا۔ انہوں نے چوکی پر دسترخوان بچھا دیا۔ ہمیں تو اس وقت معلوم ہوا جب زیریں نے دوسرے کمرے میں چلنے کا حکم صادر کیا۔ انکار کی مجال نہیں تھی۔ بھٹل کے اٹھ جانے پر میں بھی اٹھ گیا۔ ایک جاتا تھا، ایک آتا تھا۔ وہ سب کی سب بھائی بھائی پھر رہی تھیں۔ انہوں نے جانے ہمیں کیا سمجھ رکھا تھا جیسے ہم صرف دو نہیں بلکہ بہت سے بھوکے پیاسے گھر آ گئے ہوں۔ دسترخوان پر اقسام کی اتنی کثرت نہیں تھی جتنی مقدار کی۔ سارے کھانے تازہ تازہ تھے۔ بھاپ اٹھ رہی تھی اور خوشبو کمرے میں پھیل گئی تھی۔ بیٹھے چاول بھی تھے۔ زیریں کو یاد تھا کہ مجھے بیٹھے چاول کس قدر مرغوب ہیں۔ اس نے اسی کو نہیں دیکھا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا، امی نے خواب میں آکر اسے ترکیب بتائی ہو، بالکل وہی ذائقہ تھا، وہی خوشبو۔ میں نے زیریں کے خیال سے سیر ہو کے کھا لیا۔

کھانے کے بعد سب نے چوکی پر ہمارے گرد بالہ سا بنالیا۔ نیساں اور جتاگیر، بھٹل کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ بہت مطلوب اور محبوب لوگوں کے لیے ایسا اشتیاق ہوتا ہے۔ بھٹل بھی بہت لگا چکا تھا۔ لگا رہا تھا۔ گھرائی کو کتے ہیں جہاں آوی بے وزن ہو جائے۔ زیریں کی حویلی تو بہت پہلے تعمیر ہوئی تھی، اسے زیریں کا گھر بھٹل ہی نے بنایا تھا۔ میں بھٹل سے یہی کچھ تو کہہ رہا تھا کہ ہم اس گھر کا جزو ہیں، کیونکہ یہ زیریں کا گھر ہے۔ مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ ہمیں یوں غالی ہاتھ نہیں آتا چاہیے تھا۔ گوان کے لیے سب سے بڑی سوغات یہی تھی لیکن خندہ دوز کی اپنی ایک دلکشی ہوئی ہے۔ اس کا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کل صبح بھٹل سے کچھ نقدی لے کے بازار جاؤں گا اور ہر ایک

کتابیات پبلی کیشنز

کے لیے کچھ نہ کچھ خرید کے لاؤں گا۔

بٹھل کے استفسار پر جھانگیر نے بتایا کہ جمرو اور زورا دس دن پہلے ہی یہاں سے گئے ہیں۔ یہاں قیام کے دوران میں انہوں نے کئی خط بھیجے۔ یہی جواب آتا رہا کہ ہم ابھی تک وہاں نہیں پہنچ سکے ہیں۔ وقفہ وقفہ سے ہمیں اور فیض آباد کے لیے چند سطرئیں خبریں تھیں۔ آدھا اطمینان تھا۔ یہ ایک طرف رسم و رواج بھی خوب تھی۔ ہم صبح و شام شہر سے رہتے تھے اور اپنا کوئی مستقل پتہ بتا ہی نہیں سکتے تھے۔ بہر حال اس طرح فیض آباد میں زیریں کو، ہمیں میں اباجان کو ہماری خبر خبر سے کچھ نسی ہو جاتی ہوگی۔ ان کی کوئی انجمن یا باری خیر نہیں مل پاتی تھی۔ جھانگیر کہہ رہا تھا، چند روز دن کا وقفہ ہو گیا اور ہماری طرف سے کوئی خط نہیں آیا تو زورا اور جمرو کو بے چینی ہونے لگی۔ انہوں نے لکھتے تار بھیجا حالانکہ تار کا جواب فوراً آیا تھا مگر انہوں نے لکھتے جانے کا قصد کر لیا۔ اب وہ لکھتے ہیں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے وہ کب تک یہاں ٹھہرے رہتے۔ ہم لکھتے کے قریب ہمارے اور بٹھل کی بستیوں کی خاک چھانستے رہے تھے۔ انہیں امید ہوئی کہ اب ہم جلد ہی لکھتے پہنچا چاہتے ہوں گے۔

جہاں گیر کی زبانی معلوم ہوا کہ مینے بھر پہلے منیر علی بھی ہمیں سے یہاں آئے تھے۔ جانے انہیں ہمیں میں کون سا ہم کام تھا جو واپسی کی ایسی گلت تھی۔ اپنے گھر ہفتے بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ اباجان کے بغیر انہیں چین نہیں آ رہا ہو گا۔ دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ ہمیں میں نے ان کی ایک جانی اور ہم نوا دیکھی تھی۔ اباجان تو اب اپنی حسرتوں کی تجسیم کر رہے تھے اور منیر علی سے زیادہ متبرہ و محترم، راست باز دوست انہیں کہاں میسر آ سکتا تھا۔ دولت کو دوستوں کی بڑی ضرورت پڑتی ہے، دوست، مصداق یا غلام، منیر علی نے جیسلمیر میں بڑی محدود زندگی گزار لی تھی۔ فیض آباد میں ماحول، میکسیر جیسا تھا لیکن ہمیں ایک مختلف شہر تھا۔ انہوں نے پہلی بار اتنی بدلی ہوئی دنیا دیکھی تھی اور جہاں دولت ہو وہاں تو دنیا کے تیور ہی اور ہوتے ہیں۔ دنیا کو دولت بہت مرغوب ہے اور دولت کو دنیا۔ اباجان نے گورا کی لائی ہوئی دستاویزوں کی تحقیق و تفتیش میں برسوں ریاضت کی تھی۔ انہوں نے اپنا آبائی گھر کھڑا تھا، ایک جوان بیٹی کو لائی تھی۔ ان کے دو بیٹے بھی ان کے لیے تو مری چکے تھے۔ اباجان مزید اور کچھ کھونے کا بھی حوصلہ رکھتے ہوں گے۔ اس ایثار کا انہیں کوئی تو ثمر ملنا چاہیے تھا۔ منیر علی نے جیسلمیر سے ہجرت

کر کے فیض آباد میں زمینیں خریدی تھیں۔ انہیں اپنی زمینوں کی بھی فکر نہیں تھی۔ اباجان کی جاہ و شہرت کے آگے اس جاگیر کی کیا حیثیت تھی۔ اوھر زیریں کی حویلی کی طرف سے بھی وہ پخت ہوں گے، اس سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ اور کیا ہو سکتی ہے کہتے ہیں، پھرنے کے بعد اپنا گھر بہت آگے آئے، اپنا گھر اپنا محلہ، اپنا شہر مگر تمام یادیں سنے مائل اور نئی بستیوں کی پذیرائی پر خسر ہیں اور یادوں کا تو یہ ہے یاد رکھی جائے تو ہر بات ایک یاد ہے، جیتا ہوا ہر ایک یاد سے بڑے سے بڑا نقش ماند پڑ جاتا ہے اور ایک نوک خار زندگی ہر رگ جاں تملائے رکھتی ہے۔ ہجرت بھی بہت راس آتی ہے۔ آدمی پلٹ کے دیکھتا ہی نہیں چاہتا۔ منیر علی گھر سے بلے گھر ہماری وجہ سے ہوئے تھے اور گھر کیا، وہ تو شہر در ہو گئے تھے۔ روپیہ جیسا ہی نہیں، احباب، اعزاء، واقف کار بھی اٹانے کے مانند ہوتے ہیں۔ منیر علی سے یہ دولت چین کی تھی۔ اس کے ازالے کے لیے انہیں بہت سایہ بہت اطمینان چاہیے تھا۔ یہاں ان کا گئی گیا ہے تو بڑی قیمت کی بات ہے۔

خانم کے سوا کسی کو وقت کا احساس نہیں تھا۔ دو بج چکے تھے۔ خانم نے کئی بار اشارے کیے۔ وہ مسلسل انہیں ٹوٹی رہی کہ رات بہت ہو گئی ہے۔ ہمیں سفر کی تکان ہو گئی۔ میں نے خانم سے نہیں کہا کہ یہاں آگے تو ساری کلفت ہو گئی ہے۔ بٹھل بھی چپ رہا۔ میری طرح ات بھی ان سب کے آرام کا خیال ہو گا۔ خانم کے تکیے کے لیے پر آخر ان سب کو اٹھنا پڑا۔

دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ نیند کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ حالت سکون میں بھی لازم نہیں کہ میان رہے مگر سکون بجائے خود ایک نیند ہے، ایک نشہ ہے۔ مجھے نئے وشت نہیں تھی۔ گھر شاید اسی کو کہتے ہیں۔ کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ نرم نرم بست، صاف چادر اور تکیے، سرہانے چھوٹی میز پر بک اور گلاس، پٹی بڑی سے ڈھکی ہوئی پیلوں کی ایک مختصر قلاب۔ اس کمرے میں پہلے بھی ٹھہرا تھا۔ اب تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ کمرے میں بول کے آرام وہ کمرے کا انداز تھا۔ پھول دار باغوں کا چمکتا ہوا فرش، دیواریں اجلی اجلی کھڑکیوں پر رنگین پتے پڑے ہوئے اطراف میں دیوار کے ساتھ کمرے کی ایک چمک، گریساں، دیوان اور سنگھار میز، سیلفی، شیشے کی ایک چمک، الماری میں کتابیں جتنی ہوئی تھیں اور پتوں کے لیے کئی ایک بڑی الماری ایک کونے میں کھڑی تھی۔ زیریں گرا

بازی گرا

اباجان کی محل جیسی کوٹھی میں ہونا چاہیے۔ اباجان کے بہت کام آ سکتی تھی۔ میرا جی چاہا، اسے بلاؤں۔ اس سے بت سی بائیں کرنے کو جی اٹھ رہا تھا۔ وہ ابھی جاگ رہی ہوگی لیکن بس میں سوچا رہ گیا اور جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ کسی نے مجھے جگایا نہیں تھا۔ میری آنکھ کھلی اور گھڑی پر غرض تو پڑا کہ اٹھ بیٹھا۔ نونج رہے تھے۔ دیر سے اٹھنے پر مجھے بیٹہ عزامت ہوتی ہے۔ نمادھو کے میں باہر آیا تو بجلی بجلی ہمار پڑی تھی۔ موسم بہت خوش گوار تھا اور حویلی میں زب چل پل تھی۔ امیں میرے بیدار ہونے کی خبر پہلے سے ہوئی تھی۔ مردانہ بیٹھک میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بٹھل حاکموں کی طرح بیٹھا تھا۔ نصیر بابا اور منیر علی کا ہانجا رہا۔ دونوں بیٹے خور اور جو اس کے سامنے موجود تھے۔ لہجے میں نصیر بابا اٹھ کھڑے ہوئے اور بے تابانہ مجھے گلے سے لگایا۔ ”چھا ہوا، آپ آگے، میرا دل رعایاں کر رہا تھا“ بھرائی ہوئی آوازیں بولے ”بابا نے تو منع کروا تھا۔“ ”یہاں سب ٹھیک ہے نا؟“ میں نے سمجھتے ہوئے

اباجا۔ ”اللہ کا شکر ہے، اس کا لاکھ لاکھ احسان ہے، نصیر بابا کی ہمیں چمک انہیں، ”یہاں بہت سکون، بہت آرام ہے۔“ ”ماں تو لوگ ہی دوسرے ہیں۔ اللہ، یہ جنت آباد رکھے اللہ ب کو خوش رکھے۔“

”اور ان کا کیا حال ہے، ان دونوں کا؟“ ”وہ تو خود ان سے پوچھ لیجئے۔ راستے بھر سہی ہیں۔ جانے کیا گھر کیا ہو، کن لوگوں سے واسطہ پڑے۔“ ”ماں راستے میں تسلی دیتا رہا۔ سچ پوچھتے تو خود میری حالت کو بھی تھی۔ جب بابا کا اور آپ کا خیال آتا تو جی کو قرار نہ آتا۔ سوچا تھا، اگر بابا کی اور آپ کی طرح یہ لوگ نہ ہوئے اور بچوں کا دل نہ لگا تو کہاں جاؤں گا، پھر خیال آتا تھا، بابا نے مان کہہ دیا ہے، خدا نخواستہ ایسا کچھ ہوا تو وہ دوسرا انتظام لکویں گے۔ راستے بھر میں یہی سوچتا رہا اور دل دھڑکتا رہا۔ نصیر بابا کی آواز بک رہی تھی ”اللہ نے بڑا کرم کیا، بابا، وہ کہنے لگے، ”ایک اور فکر کھائے جارہی تھی۔ آپ بابا لکھتے تھے بابا دیر سے پہنچے ہوں گے۔ تنہا کس طرح لکھنے کے بعد کون کس حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کے بڑے لے لے رہے ہیں۔ پولیس، پکری، تھانا، اس کے بائیں ہاتھ کا کھانا، وہ تو قیام مل ہو جائے گا۔“ ”ابا، ابھی تو ہو گیا تھا، میں نے مسکرا کے کہا۔“

161

خوف زدہ ہونا چھوڑیے!
جینا شروع کیجئے!



قیمت 40 روپے ♦ ڈاک خرچ 23 روپے

خوف ایک بیماری ہے۔ ایسی بیماری جو زندگی میں زہر گھول دیتی ہے اور صلاحیتوں کو ختم کر دیتی ہے۔

اس لئے اس کو سمجھنے اس کے اسباب معلوم کیجئے اور اس کا تدارک کیجئے!

کتاب کی قیمت ڈاک خرچ و ڈاک
نگینہ میٹروپولیٹن مارشل گریں

کتاب کی قیمت ڈاک خرچ و ڈاک
نگینہ میٹروپولیٹن مارشل گریں
74200
5802552-5895313
5802551
kitablat@hotmail.com
kitablat@yahoo.com

کتابیات پبلی کیشنز

160

کتابیات پبلی کیشنز

”آپ ہی لوگوں کا جگہ تھامیں! میں تو ایشیہ سے آیا
کے واپس جانے کے حق میں نہیں تھا لیکن آپ وہاں رہ گئے
تھے مجھے ہول آ رہے تھے۔ دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ اب
بھی مجھے یقین نہیں آتا آپ نے کیا جادو کر دیا۔ اس خون
خوار آدمی، آدمی کیا اسے تو بھیڑنا کتنا چاہیے اسے تو۔“
نصیر بابا کی آواز حلق میں انگ گئی۔
”اب جانے دیجئے جو بیت کیا“ اس کا کیا ذکر سمجھئے وہ
کوئی خواب تھا اب آگے کی سوچئے۔“
”ہاں میاں!“ نصیر بابا نے گردن میں پڑے ہوئے رومال
سے آنکھیں پونچیں اور کسی قدر اعتماد سے بولے ”اب
آگے کی مجھے فکر نہیں میرا کام پورا ہو گیا۔ اب آرام سے
موت آئے گی۔ میں سب سے بڑا گناہ گار ہوں۔ سب دیکھتا ہوا
اور چپ رہا۔ اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے۔ شاید اسی طرح
اللہ نے میری نجات کی سبیل پیدا کر دی۔“
منیر علی کے بڑے بیٹے خوبر، چھوٹے بیٹے جو اور بھانجے
ارشاد نے مجھے گھیر لیا۔ وہ منتظر تھے کہ نصیر بابا کی باتیں ختم
ہوں تو اپنے تاک کا اظہار کریں۔ وہ باری باری مجھ سے بغل
گیر ہوئے خوبر نے منیر علی کے گڑب گڑ پونہ روشنی سے ایم ایس سی کر لیا
تھا۔ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نے سرکاری ملازمت
کے لیے مختلف امتحانات دیئے ہیں اور جلد کسی موزوں
عہدے پر تعینات ہونے کا امکان ہے۔ وہ ایک صحت مند
دراز آدمی، دجیر اور ذہین نوجوان تھا۔ چھوٹے بھو کو جب ہم
جیسے میرے میاں لائے تھے تو اس کی عمر بارہ سال تھی۔ اب
اس نے کچھ قدر نکال لیا تھا اور نو برس جماعت کا طالب علم تھا۔
منیر علی کے بھانجے ارشد کی حالت بھی اب درست معلوم
ہوئی تھی۔ بمن کے مرنے کے بعد منیر علی اسے اپنے گھر لے
آئے تھے۔ بی بی اے تک ارشد نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اچھا
ابھرتے ہوئے قدر کا جامہ زیب نوجوان تھا۔ جیسے کہ میں جب
مولوی صاحب منیر علی کے مکان میں جا بے تھے تو منیر علی نے
کورا کے لیے ارشد کا پیغام دیا تھا۔ مولوی صاحب کے انکار
اور ایک دن اچانک ان کے گھر سے چلے جانے کے بعد ارشد
علی کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔ اسے دور سے پڑنے
لگے تھے ہاتھ پاؤں اڑ جاتے۔ کھانے پینے کا ہوش رہتا تھا نہ
لباس کا۔ کئی کئی دن کے لیے گھر سے نکل جاتا اور چاک
گریباں، برے حال احوال میں گھر واپس آتا۔ منیر علی کی
مرحومہ بہن نے ان کی بیٹی زہرہ کے لیے ارشد کا رشتہ مانجا تھا
اور بی بی طے تھا کہ زہرہ کی شادی ارشد سے ہو جائے گی لیکن
کورا کو دیکھ کے ارشد سے اپنی ماں کے بیان کی پاس داری نہ

کی جاسکی۔ ماموں نے اپنے بھانجے کا میلان دیکھ کے مہر
صاحب سے سلسلہ چھینائی کی۔ ان کے بہ قول ”کیوں کہ
کورا (زہرہ) بانو) کو بھی اپنی بیٹی زہرہ کی طرح سمجھتے تھے؟
مولوی صاحب نے اپنے محسن منیر علی سے تمام قوتوں
باوجود انکار کر دیا۔ پھر ارشد پر ایک قیامت گزری۔ فیصل
آگے بھی بہت دنوں تک وہ اپنے آپ کو جیتاتا رہا اور
پس پا ہو گیا۔ شاید کہیں سے اسے بھنگ مل گئی تھی کہ کورا
مطلوب تو کوئی اور ہے اور اس کا مدھی تو کوئی اور ہے۔
اور کب سے اسے گلی گلی، کوپے کوپے آوازیں لگا رہی
کسی اور کا حال ارشد سے بڑی دیوانگی کا ہے۔ ارشد
ایک تین، بردبار شخص کی حیثیت سے میرے دربار
منیر علی کی ہدایت پر ان کی خریدی ہوئی زمین اور زیر
آبادی جاگیر کی دیکھ بھال اس نے شروع کر دی تھی۔
ان تینوں میں بڑا انکار تھا، خوش خلقی اور جذبہ
آخر منیر علی جیسے شرف النفس، نجیب الطریقین شخص سے
کا تعلق تھا۔ تینوں کے ہاں میرے لیے ایسی گرم جوشی تھی
میرا ایسا لحاظ کر رہے تھے جیسے میں کوئی بہت بزرگ
ہوں، میں کوئی حاکم ہوں، اس حویلی کا مالک ہوں۔ ا
زمانے میں کچھ وقت کے لیے تو خیر میں مالک تھا بھی۔ ز
نے اپنی حویلی اور جاگیر میرے نام کر دی تھی، میں
کاغذات لوٹا دیے تھے۔ مالک تو میں ہوں بھی تھا کہ زہرہ
بے حد عزیز تھی اور مجھے معلوم تھا مجھ سے زیادہ وہ مجھے
رکھتی ہے اور اس کی جانب سے مجھے اس کی ہر چیز پر تعز
حق حاصل ہے۔ کاش یہ اعتماد بھی اسی سے دے سکتا۔
وہ تینوں، خوبر، جو، ارشد جھپکتی بلیوں سے مجھے د
تھے۔ جانے کیا کچھ میرے بارے میں انہیں بتایا گیا
میرے پاگل پن کے قصے، میری بے جگری اور دولت مند
واستائیں۔ ان کی آنکھیں بخش و حیرت، شوق و مسرت
معصوم تھیں۔ انہیں میاں آئے ہوئے اب ایک وقت
تھا لیکن اب بھی بہت کچھ ان کے لیے کسی خواب کی
ہوگا۔ اس حویلی کا سلسلہ ہی جدا تھا۔ بنجل کی بخاری اڑ
کے آدمیوں کی آمدورفت اور گھرائی ان کی مخصوص
ورغاست اور وضع قطع اور میں امیری خاک بر سر اور
نوردی کے فسانے۔ بہر حال زہرہ نے تو اپنی زبان بند
رکھی ہوئی گھر کسی کی بات پہنچ کر کہاں ہے۔ آدمی میں
صلاحیت کم سننے اور زیادہ اٹھ کرنے کی بھی خوب ہوتی۔
ان تینوں کی نگاہیں مجھے اپنے چہرے پر چسپائی اور
محسوس ہو رہی تھیں۔ اچھا ہوا، جہاں گھر درمیان میں
بازی گر

بائستہ کے لیے سب کو بلانے آیا تھا۔

چوکر میاں سے وہاں تک دسترخوان بچھا تھا اور قایم
ہوئی تھیں۔ منج قیصر، تزکاری، پوریاں، طوطے، پرائے،
سوان، خانگینہ اور جانے کیا کیا۔ ہم سات مردوں کے علاوہ وہ
بھی ایک جانب بیٹھی ہوئی تھیں۔ فروزاں، یاسمن، نیساں،
زہرا، خانم، سلسلی اور سلسلی۔ اب میاں دو سلمانیں ہو گئی
تھیں۔ ایک منیر علی کی چھوٹی بیٹی، دوسری ہمارے ساتھ
پیدا ہونے والی ہوئی۔ زہرہ ان میں نہیں تھی۔ وہ ناشتے
کے اہتمام میں مصروف تھی۔ خانم کے اصرار پر وہ بھی کچھ
برہن ہمارے درمیان آگے بیٹھ گئی۔ رات کو تورات کی
مدد چھائی ہوئی تھی۔ دن کی روشنی میں ان کے چہروں کی
لٹائی سی چمک اور بھی۔ سب کھلے کھلے ہوئے تھے، نوکلفت
بولوں کی طرح۔ کہتے ہیں، چہرے آدمی کے دروں کا آئینہ
دے ہیں۔ ان کے چہرے چمک دمک رہے تھے۔ یہ گفتگوئی
در تابانی ان کی قلبی طمانیت کی مظہری ہوئی۔ انہیں بہر
لی ضرورت بھی کیا تھی۔ میں نے کن آنکھیں سے کئی بار
روزاں اور یاسمن کو دیکھا۔ انہیں حویلی میں قدم رکھنے
دیں گئے بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ ایک تکلف سا ان
کے طور اطوار میں نظر آتا تھا۔ فروزاں کے بارے میں نصیر
باج کہتے تھے۔ وہ تو چہرے پر ستان سے آتی ہو، پوری اپنے پر چہرے
میں کھوئی ہو۔ وہ تو سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ خال و خد
نک و نگار اپنی جگہ لیکن تناسب و توازن پہلا وصف ہے۔
بگ تو پھر مستزاد ہے۔ اس کا رنگ گلابی شامی تھا، بڑی بڑی
آنکھیں، غزال آنکھیں شاید اسی کو کہتے ہیں۔ رخساروں پر
نقہ چھوٹ رہی تھی۔ اس کے برابر بیٹھی ہوئی یاسمن کسی
زرعہ و مردود نظر آتی تھی مگر یہ اضطراب، حزن و ملال، بے
ارنگی و نامیدی کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ سنے ماحول، سنے
بول سے مطابقت و مفاہمت کے لیے آوازیں ہی کافی نہیں
وہ۔ دقت بھی اپنے چکر پورے کرتا ہے۔ آدمی آئینہ نہیں
وہ کہ کوئی کم لے بغیر دیتے چہرے اور منظر افروز کرتا رہے۔
انہیں کو صرف سامنے آنے والے سے غرض ہے، مگر جانے
اسے واسطہ نہیں۔ آدمی کے آئینہ بصارت پر چہرہ و منظر
کی طرح ہی رہتی ہیں اور سنے نقش کا جذب و قبول کرنا
نک کی مشرت سے بھی مشروط ہے یا پھر سنے نقش کی اپنی چنگلی
فر و تابی پر۔ فروزاں کو ضبط کرنا آتا تھا۔ یاسمن ابھی چھوٹی
کی وہ دوسری بڑی سیاب صفت لگتی تھی۔ اچانک بے
اسب ہو جاتی تھی جیسے پنڈے میں کوئی سیلی چٹکی بھرے۔
اس کا یہ بیان اسے اور دل کش کر دیتا تھا۔ لگتا تھا، کچھ بڑی

بازی گر

ہو کے وہ اپنی بہن کا تو ہوگی۔
زہرہ، بیٹل کے آگے چیزیں سرکاتی رہی۔ اتنی بہت
سی چیزیں تھیں کہ ذرا ذرا سی بھی چٹکی جا میں توجی
بھرجائے۔ کھانے میں پھر کیا اختلافات ہوں گے۔ بیٹل نے
ابھی ہاتھ کھینچا ہی تھا کہ نیساں نے اپنی جگہ سے اٹھ کے اس
کے سامنے منظر کی چٹکی کا حربا بن رکھ دیا۔ بیٹل نے اس کا
کان پکڑ لیا ”مائیے میں آئے ہیں ری تیری سرسال میں
نہیں۔“
نیساں بری طرح لجا شرانگی۔ بیٹل نے اسے بازو میں
دبوج لیا ”یہ اس نے بیانی ہے“ خانم نے مسکراتے ہوئے کہا
”اسے کھانا پکانے کا بہت شوق ہے۔“
”پر یہ آپ تو کھاتی بیٹی نہیں لگتی، یہ تو بڑی اکرہ
ہے۔“
”ہاں، یہ عجیب بات ہے۔ جتنا پکانے کا شوق ہے اتنا
کھانے کا نہیں۔ دوسروں کو کھلا کے خوش ہوتی ہے۔“
”لا، پھر نکال اپنے ہاتھ سے“ بیٹل نے فراخ دلی سے
کہا۔
نیساں نے جلدی جلدی طشتی میں چٹنی نکالی۔ بیٹل
نے پوری کے ٹکڑے سے اسے کھایا اور طشتی میری طرف
برہادی۔ میں نے بھی ایک لقمہ لیا۔ واقعی مزے دار بھی اور
نفاست سے بنی ہوئی تھی۔ بیٹل نے نیساں کی کمر چٹکی اور
دیر تک اسے پہلو سے چٹنے لگا۔
ناشتے کے بعد سب منتظر ہو گئے۔ بیٹل حویلی کے وسیع
صحن میں چل قدمی کرنا رہا۔ اب صحن کسی گھٹاں کی نظیر
تھا۔ دیواروں کے ساتھ کیریاں کھدو کے پھولاری لگادی
گئی تھی۔ جا بجا گلوں کی افراط تھی۔ ان میں رنگ برنگ
پھول کھلے ہوئے تھے۔ سبھی کچھ بدل دیا گیا تھا۔ والان،
دروازوں، عمارتوں کی ازسرنو تزئین کی گئی تھی۔ طرز تعمیر
پرانی تھی باقی سارا کچھ تازہ تازہ نیا نیا لگا ہوا تھا۔
صحن میں بیٹل کو روک کے اور نقدی لے کے میں کسی
سے کچھ کے بغیر باہر نکل گیا۔ ڈیوڑھی کے باہر مجھے دیکھتے ہی
مما تا ناگ لے آیا۔ میں پیدل ہی جانا چاہتا تھا لیکن دیر تک
مسلل پھوار سے راستے کیلے ہوئے تھے۔ پھوار اب بند
ہو چکی تھی۔ مما سمجھ رہا تھا کہ میرا ارادہ اڑنے کی طرف
جانے کا ہے۔ اڑے جا جانا چاہیے تھا لیکن وہاں جاکے تو میں
گھر جاتا، پھوار صحن میں چلی، پھر اٹھتی، ہوجاتی۔ میں نے ماما کو
بھی منع کر دیا کہ ہماری آمد کی خبر وہ اڑے کے کسی آدمی کو نہ
کرے اور اچھا ہے، پہلے بیٹل سے معلوم کر لے۔

مجھے خریداری بالکل نہیں آتی تھی۔ نہ مول تول کا علم تھا۔ بازار جا کے اندازہ ہوا کہ دوسرے کے لیے کسی چیز کا انتخاب کس قدر مشکل ہے۔ کپڑے کی اقسام، معیار اور رنگ وغیرہ کے بارے میں مجھے کچھ نہیں آتا تھا۔ سونے کی چیزوں کے لیے تو آدمی کو خاصا تجربہ چاہیے۔ ادھر ادھر بھٹکتا ہوا میں سناڑ کی ایک بڑی دکان پر جا کے ٹھہر گیا۔ شیشے کی الماری میں رکھا ہوا ایک گلوبند مجھے اچھا لگا۔ ان سبھوں کی کتنی کر کے میں نے اس قسم کے آٹھ گلوبندوں کی قیمت پوچھی۔ دلا پتلا، تیز و طرار درمیانہ عمر کا سناڑ میری شکل دیکھا گیا اور قیمت بتانے کے بجائے اس نے میری نگاہ کی تعریف کی اور گلوبند کی بناوٹ اور خالص سونے کی مقدار کے بارے میں زمین آسمان کی باتیں کرنے لگا۔ کئے لگا کہ کھنڈے کے بہت سے صاحب ذوق نوآیین کی طرح نواب اعظم رضا کو بھی اسی کے ہاں کے بنوائے ہوئے زیورات پر اعتماد ہے۔ یہ خاص انہی کی فرمائش پر بنوایا گیا ہے۔ اس کا کاریگر کبھی اپنے فن میں یکتا دیکھا نہ ہے۔ بمصری کٹنے جڑے ہوئے ہیں اس میں۔ بہر حال میں اسے لے جاسکتا ہوں۔ ایسے قدر دان کو لوٹایا کیسے جاسکتا ہے۔ نواب صاحب کے لیے وہ جلد ہی اور بنوائے گا۔ اس نے معذرت کی کہ سرمدت اس کے پاس دو ہی عدد ہیں۔ دو ہفتے میں وہ مزید عدد تیار کر والے گا۔ میری مایوسی پر اس نے یہ مدت ایک ہفتہ کر دی۔ بڑی مشکل سے میں نے اس سے جان چمڑائی اور مجھے ایک تریب سو بھی کیوں نہ میں سب کو یکساں نقدی سپرد کروں، وہ خود اپنی مرضی کی سوغات منتخب کر لیں لیکن لائی ہوئی چیز کی بات ہی اور ہوتی ہے، پھر مجھے خیال آیا کیوں نہ صرف ایک گلوبند ہی خریدا جائے۔ میں چپکے سے کسی وقت اسے زریں کے حوالے کروں گا، باقی کا پھر دیکھا جائے گا مگر کیا یہ مناسب ہوگا؟ زریں کے لیے تو کوئی بہت بڑا تحفہ ہونا چاہیے بلکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ بھٹوں کو کوئی نہ کوئی تحفہ نذر کیا جائے۔ زریں کو اس رسم سے دور رکھا جائے۔ زریں کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ تو اپنی اس شخصیت پر نازاں ہوگی۔ غلطی میری ہی تھی۔ مجھے زریں سے مشورہ کر کے بازار کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ میں بازاروں میں یوں ہی بھٹکتا رہا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اپنی اس ناموزنی اور بے مانیگی سے مجھے الجھن ہونے لگی۔ جو اوروں کو آتا ہے، وہ مجھے کیوں نہیں آتا۔ میں تو جسے اس دنیا کا آدمی ہی نہیں ہوں۔ کچھ بھی وجہ ہوگی جو حویلی میں سب مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں کوئی عجوبہ ہوں۔

انکا میرے ساتھ تھا۔ میں نے اسے واپس چنے کی ہدایت کی اور وہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ واپسی کے راستے میں ایک جگہ تانے کو رک جانا پڑا۔ آگے بہت بھڑکتی تھی۔ میر نے اتر کے دیکھا چاہا اور ٹھہر گیا۔ پیچھے اور سواریاں آجائے سے تانگا واپس ہونے اور کسی اور راستے سے جانے کا امکان بھی مسدود ہو گیا تھا۔ شور بڑھتا گیا اور جھج جھج میں سے لے کیا، تانگا جھوڑے کے پیدل ہی چلوں۔ تانے والے کو پیر ادا کر کے کنارے کنارے راست بناتا ہوا میں آگے نکلا گیا۔ چند قدم بعد راست اور تنگ ہو گیا اور ہجوم عبور کرنا دوبار ہو گیا۔ لوگوں نے پیچھے ہٹنے دینا نہ دیا تھا۔ ہرا ہرا کر پکار پکار کر میرا ہاتھ ٹھکا۔ وہ فیض آباد کے اڈے کا پرانا آدمی تھا۔ ہمیں سے کچھ اور عمر ہوگی، بھڑ اور جامو کا خاص آدمی تھا۔ ہرا کا نام سن کے مجھ سے ٹھہرا نہ گیا اور میں لوگوں کی ہیز کا ہوا دائرے میں آگے کی طرف چلا گیا۔ وہ ہرا ہی تھا اور ایک چاقو بردار نوجوان سے زور آزمائی کر رہا تھا۔ میں نے لوگوں سے واقف کی تو غصہ پوچھی مگر انہیں تماشا دیکھنے ہی سے فرصت نہیں تھی۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ۔ ان کے اپنے ہوئے کلمات سے اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ کوئی لڑکی وچہ زار ہے۔ ایک سن رسیدہ آدمی نے اعانت کی، کچھ اس کی زبان اور کچھ دوسروں کے بیان کے مطابق خلاصہ یہ تھا کہ کوئی نوجوان لڑکی کے باپ نے فیض آباد سے باہر دور کے ایک رشتے دار کو اپنی لڑکی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لڑکے کے والدین مال و زر میں حیثیت مند تھے۔ انہوں نے طرح طرح زور ڈالا اور آخر لڑکی کو یہ جبر لے جانے کی دھمکی دی۔ لڑکی کے باپ نے ہرا کے پاس جا کے وہائی دی۔ گزشتہ دن ایک رات لڑکے والے اپنے شہ زوروں کی مدت لڑکی کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ ہرا ان کے راستے پتھر بن گیا۔ اس نے انہیں مار بھگایا اور لڑکی کو یہ سلامت والدین کے پاس پہنچا دیا۔ اب لڑکے والوں نے اس رات اپنی ناکامی کا صدمہ منانے اور لڑکی کے باپ کو سبق سکھانے کے لیے اس شہرہ پشت نوجوان کو فیض آباد بھیجا ہے۔ نوجوان نے سر ہرا ہرا کو لٹکا اور حملہ کر دیا۔

میں سامنے نہیں ہوا، لوگوں کی آڑ سے دیکھتا رہا۔ ہرا اپنا چاقو نکال چکا تھا اور چاقو بدست نوجوان کو زیر کرنے کی جتن کر رہا تھا۔ دونوں کو زخم آئے تھے اور خون رس ہوا تھا۔ لیکن دونوں وحشیانہ انداز میں ایک دوسرے پر جاری تھے۔ لے لے داؤ آ رہا ہے تھے۔ ہجوم میں بستر ہرا کے جانے تھے۔

اتنے بہت سے لوگ اپنے محلے، اپنے شہر کی لڑکی کی دس کے لیے ایک نوجوان کو قابو میں نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اوجھل کرتے تو نوجوان کو اس دیدہ دلیری کی جرات نہ لے۔ سب نگارہ بازی کر رہے تھے اور شاید نوجوان کے غلبہ تو روں سے زیادہ اس کے کھلے چاقو سے ہیبت اٹھتی۔ ہتھیار کی اپنی دھماک ہوئی ہے۔ نوجوان یقیناً اکیلا نہیں ہو گا۔ اس نے لوگوں اور خصوصاً ہرا پر اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے اپنے ساتھی یا ساتھیوں کو الگ ہو گا۔ ہرا تھا کھٹکا لگ رہا تھا۔ نوجوان میں پھرتی زیادہ اور اسے اپنے زور پر کوئی نازی ہو گا جو اس اچھی شہر میں ازادہ ممبر کا آ رہا تھا۔ وہ ہرا کو تقریباً تیار ہاتھ لگا اب تو اسے جیسے آٹھ پچھلی کھیل رہا تھا۔ ہرا کی ہر کوشش ناکام ہی تھی۔ اس کا تعلق جمرو اور جامو کے اڈے سے تھا۔ دیکھ کر تو وہاں داخل ہی نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ اتنی تک چاقو کے بغیر اپنا دفاع کوئی کہ نہ مشق ہی کر سکتا تھا تاہم کو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے تھا کہ اس کا حریف، رتی نہیں نوجوان ہے تو پانچتہ کار بھی ہو۔ وہ صاف اڈے کی تھا۔ کسی مقتدا استاد سے اس نے تربیت حاصل کی اور استاد کی نگہ داری کتنی ہی اہم ہو، اڈے کا آدمی تو جو ہرا ارادے، اپنی جستجو اور ریاضت سے بنتا ہے اور ناہور تجربے سے اس پر اور نکھار آتا ہے۔ ہرا نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے مقابل کے سوا اسے اور طرف دیکھنے کی فرصت بھی کہاں مل سکتی تھی۔ میں اپنے آپ کو چھپانے ہوئے تھا۔ جلد یا بدیر اڈے پر اس ہتھیار کی خرچہ چانی تھی اور اڈے کا کوئی بھی آدمی کسی یہاں آسکتا تھا۔ فیض آباد کا اڈا میرے لیے کوئی غیر جگہ تھا۔ یہ جمرو اور جامو کا اڈا تھا۔ ہم میں بھائیوں کا رشتہ بھائی کے رشتے کے لیے بھائی ہو نا لازم نہیں ہے۔ جامو شہر کی خاطر اپنی فیض آباد کا اڈا ترک کر دیا تھا اور نکلتے انے کی عمرانی کر رہا تھا۔ اس نے اب جاپان کی تلاش میں ارکانے میں جامو پیش پیش تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی نے بھی ہماری وجہ سے اپنا اڈا خیر باد کہہ دیا تھا اور عرصے تک وہ اپنا گھر، اپنا شہر، اپنے گھر کے کھتے میں ہم دونوں کا منتظر رہا۔ ایک فیض آباد کا اڈا، شہر میں اس کا اور میرا ہی اڈا تھا۔ اپنے ہاتھ کی شخص مشکل وقت سے دوچار تھا۔ میرے ہاتھ میں انٹرنس ہونے لگی۔ میں نے خود کو ٹوکا، پھر مجھے کیا

پڑ سکتی ہے۔ اڑے کے تقریباً سارے آدمی مجھ سے واقف ہیں۔ میں اس وقت گھر سے نہ نکلتا یا ہم اس شہر میں ایک دن کی تاخیر سے پہنچتے تو! انھوں تک میں خود سے جنت کرتا رہا اور میں نے سرانجام کے آخری بار وائرس میں جھانک کے دیکھا۔ ہر ایک تک اپنا دفاع کر رہا تھا اور نوجوان اس کی ذلت کے درپے تھا۔ میں بھوم کے دائرے سے باہر آیا لیکن اپنی ہی تاویل میں میرے رگ دپے سے چٹ گئی تھیں۔ مجھے کیا کیسی کرنا چاہیے تھا؟ جامو اور جمو کے کسی عزیز ترین شخص کا یہی طور ہونا چاہیے؟ کسی کو میاں میری موجودگی کا علم نہیں ہے مگر میں خود تو جانتا ہوں۔ میں میاں بہ تمام ہوش و حواس حاضر و ناظر تھا۔ اس اقدام سے تو ناردانی، بے غیبتی، کم ہمتی اور خود غرضی کی بسانہ آتی ہے۔ اگر یہ گریز کسی بڑی بھلائی کے لیے ہے تو آسف و ندامت کا کانا کیوں سینے میں ٹھک رہا ہے۔ میں دور ہوتا رہا اور میرے پیرا پیچھے رہے۔ بھوم کا شور میرا حجاب کر رہا تھا۔ نہ معلوم، میں نے کتنا فاصلہ طے کیا، دو سو قدم، تین سو، چار سو۔ ایک ایک میں نے پلٹ کے پھر بھوم کا رخ کیا۔ میں اب کچھ اور سوچتا نہیں جانتا تھا۔ بھانگتا ہوں وائرس تک پہنچا اور بھوم حیران ہوا اندر داخل ہو گیا۔

وائرس کے اگلے حصے میں کھڑے ہوئے لوگ تیسرے شخص کی اس ناگمانی آمد سے ہڑباز تھے۔ وہ دونوں، ہر ایک اور نوجوان اس وقت وائرس کے وسط میں ایک دوسرے کو بھپکایا دے رہے تھے۔ دونوں منتشر ہوئے، حیران بھی۔ دونوں کو ٹھہر جانا پڑا۔ کسی جھجک کے بغیر میں ان کے درمیان جا کھڑا ہوا تھا۔ نڈھال ہر ایک بغیانی انداز میں چیخا "اڑے لاؤ لے میاں! تم! اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔"

میں نے ہاتھ اٹھا کے اسے پر سکون رہنے کی تلقین کی اور مگر بھری دوری پر وہ کے نوجوان سے پوچھا "کیا ہو رہا ہے یہ؟"

"تم۔۔۔ م۔۔۔ اکون ہو تم؟" اس نے بھڑکے کما "دکھائی نہیں دیتا تم کو؟"

"دے رہا ہے، اچھی طرح دکھائی دے رہا ہے پر کیوں کیوں؟"

میری بات اس نے پوری نہیں سنی۔ وہ قہر و غضب کی حالت میں تھا۔ میرا سرد اور نمناک لہجہ اسے گراں گزرتا چاہیے تھا بلکہ چڑھائی چاہیے تھی۔ وہ دباؤ کے بولا "ہٹ جاؤ ایک دم ادھر سے۔"

میں نے آہستہ سے کہا "ہم کو بولو، بات کیا ہے، کیوں خون خرابا کرتے ہو۔"

"وہ اس حرام کے بیٹے ہی پوچھنا" نوجوان نفرت بولا "اس نے اپنے ہاتھ صاحب کا رستہ روکا ہے پر آن ہو جائے گا۔"

"یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے" میں نے اپنی آواز نرم "کوئی فیصلہ کرنا ہے تو اس کا اڈا کھلا ہے، وہاں جا کے کرو۔"

"اڑے ہو" وہ گرج کے بولا "تم کوئی ٹھیکے دار، اس نے میرے سینے پر ہاتھ مار کے مجھے دھکیل دیا اور لہرائے گا۔"

اس کے دھکیلنے سے میں ایک قدم پیچھے ہو گیا تھا اور کچھ ڈرگاہ بھی کیا تھا۔ وہ نوجوان کے سامنے ہوں گے، نے پکارتے ہوئے مجھے مشورہ دیا "جاؤ بھیا صاحب! کرو، تم سچ میں مت پڑو، تمہارا میاں کوئی کام نہیں ہے۔ کوئی جواب دینے کے بجائے میں ایک قدم بڑھ۔"

نوجوان کے ساتھ ہو گیا۔

"کیا کام تم کو! اس نے دوبارہ میرے سینے پر دوا چا، میں خود پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اصول قاعدے کا تو نہیں رکھنا تھا۔ میں اڑے پر نہیں تھا، نہ یہ اڑے کی اپنا حق جتانے کا کوئی معاملہ تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا کرنا تھا لیکن چند تہمدی کلمات تو ضروری تھے۔ امکان اس خوش فہمی کا بھی تھا کہ وہ ایسے ہی باز آؤ نشان دہی ہونے کے بعد اس کے دونوں سامنے بھی میری نظر میں تھے "جاؤ، جاؤ، اپنا کام کرو" وہ مجھے دھک لگا۔

"اپنا چاقو تو مجھے دے دو" میں نے رساں سے کہا۔ وہ کچل پڑا "اس نے کئی بار بل کھائے" چاقو۔ تمہیں ہیں، کھلا کاٹو گے تم اس کا یا اپنا، اپنے ساتھ طرف دیکھ کے وہ طنز و حقارت اور مضحکہ اڑانے والا میں بولا "کیا بولتے ہیں صاحب ہمارا چاقو دے دوں لے چاقو" اس نے اپنا چاقو والا ہاتھ تیزی سے اس میری طرف بڑھایا جیسے واقعی چاقو میرے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ میرے ہاتھ بڑھانے پر اس نے جلدی سے ہاتھ ہٹا دیا۔ اس نے یہی کھیل کیا۔ بچوں کو ان کی کوئی پینڈ ہو کے لیے جیسے لطف لیا جاتا ہے۔ چاقو حاصل کرنے۔ میرا شوق و اضطراب اور میرے پھیلے ہوئے ہاتھ، اپنا ہاتھ پیچھے کر لیتا۔ مجھے جلت کی فکر تھی لیکن اپنی برادری کی توقع نہیں تھی۔ دوسری بار میری پیچھی پھر ایک بار وہ اپنا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے نہیں گا۔

نہیں بچے کی گرفت میں تھی۔

میں نے معلوم تھا، پہلے تو وہ شہر ہو گا پھر سارے جسم کا صرف کرے گا۔ وہ بری طرح بولکھا جائے گا۔ میرے ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ سے ضرب لگائے گا یا میرے سینے پر دے مارے گا۔ یہ تبھی ممکن ہو تا جب میں اسے کوئی ت دیتا۔ ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پر پنجہ ڈال کے میں دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر طعنہ رسید کیا اور اس پاؤں والا ہاتھ پکڑے پکڑے ادھر مکمل ہاتھ سے پے در پے ہیں اور مسلسل ٹھوکریں لگائیں۔ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اسے جو اس باختم ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ دیکھ کے ہائے دوں سامنے کچھ پر جھپٹ پڑے۔ ایک کو تو میں نے لہار کے دور کر دیا۔ جانے کہاں اسے چوٹ لگی تھی کہ وہ بین دہرا ہو گیا۔ دوسرا میری زور پر نہ آ سکا۔ اس نے عقب میری پیٹھ اور گردن بے دریغ کھوں سے نشانہ بنائی۔ مجھے نہیں برداشت کئی تھیں اس لیے کہ مجھے اپنی ساری توجہ وہاں کی کلائی پر مرکوز رکھنی تھی اور ایک جگہ کھڑے رہنے، ہائے گھوم پھرے ہی میں اسے بے حال کر سکتا تھا۔ اس سامنے نے پیچھے سے میری گردن جکڑنے کی کوشش کی لیکن میں نوجوان کو کھینچتا، اس کے ہاتھ کو جھٹکے دیتا رہے میں میاں سے وہاں گردش کرتا رہا۔ اس کا دوسرا ٹھکی بھی اٹھ کے مجھ سے چٹ چکا تھا، وہ میرے ایک جگہ رہے نہ رہنے سے کام یاب نہ ہو سکا۔ میں بل بل کر میں اپنا نا تبدیل کر لیتا تھا، پھر اوپر سے ہر ایک حالانکہ میں نے ٹائٹل اس خاموشی سے کھڑے رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ پہلی رائی نے دیکھا کہ ہر ایک بھی اکیلا نہیں ہے۔ اڑے کا ایک رائی اس کے ساتھ تھا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ نوجوان کے ساتھیوں پر نوٹ پڑے۔ یوں مجھے کچھ یک ہونے کی فراغت مل گئی۔ میری پہلی اور آخری ترجیح یہی تھی کہ کسی طرح جلد سے جلد نوجوان کو چاقو سے دستبردار کر دوں۔ اس اذیت سے بے پروا ہو کے کہ وہ کہاں کہاں مجھ فریض لگاتا ہے، میں پیٹر جب بھی موقع ملا، اس کے چاقو الے ہاتھ کی کلائی اور بازو پر ترجیح سے ہاتھ سے وار کرتا رہا۔ کائنات میں دور لگایا تھا مگر تمہارا زور کافی نہیں ہوتا۔ زور کے ساتھ ایک بھر بھی چاہیے۔ اس کے چاقو والے ہاتھ پر ٹی فریض میں کوئی ایک کاری ہوئی چاہیے تھی۔ اس کی بازو یا بازو اس کے ایک جگہ ہوئی۔ چاقو چھبے ہی اس ہاتھ سے چھوٹا، میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ ہاتھوں کو پکڑا تھا، لڑکھنڈا ہوا بھوم پر جا کر اسے اسٹائش

بجٹی جلد ممکن ہوا، میں نے چاقو زمین سے اٹھا کے اور چند لمحوں اپنے پاس رکھ کے ہر ایک طرف اچھال دیا۔ میرے اشارے پر ہر ایک اور اس کے ساتھی نے نوجوان کے سامنے چھوڑ دیے۔ وہ کچھ ادھ موئے اپنے سرخندہ کاحال دیکھ کے بھی ہو گئے تھے۔ اب مزید زحمت کی ضرورت نہیں تھی لیکن پیش بندی کے لیے میں نے دونوں کو سنبھال لیا اور جب تک وہ زمین پر ڈھیر نہیں ہو گئے اور ان کے ہاں التجا اور رحم طلبی کے آثار نمودار نہیں ہوئے، میں نے ہاتھ نہیں روکا۔ اس میں کچھ انہی کا بھلا تھا۔ آئندہ وہ منہ اٹھائے کسی طرف نہیں چل پڑیں گے، دس بار عواقب پر ضرور غور کریں گے۔

پھر میرے وہاں ٹھہرے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر ایک نے تم جاں نوجوان کے بال پکڑے "اس کے سر کو جھٹکے دیے اور گرنے لگا" دوبارہ تو نے اگر اس شرم کا۔ اس کے بعد مجھے کچھ سناٹی نہیں دیا۔ لوگوں نے مجھے اپنی طرف آنا دیکھ کے دھکم پیل کرتے ہوئے راستہ دیا۔ مجھے احساس تھا کہ ان کی نظریں مجھ پر منڈلا رہی ہیں لیکن میں نے پلٹ کے نہیں دیکھا اور سر جھکائے تیز رفتاری سے بڑھتا رہا۔



میرا گریبان چاک ہو چکا تھا۔ سڑک گلی تھی۔ پانچویں پر کچھ تھپ گئی تھی۔ کمرے کرتا بھی پھٹ چکا تھا۔ اس حالت میں حویلی جانے کو جی نہیں جانتا تھا۔ ایک صورت تھی کہ اڑے جا کے کھڑے نہا جو ڈاٹنگواؤں گھر اڑے پر جا کے جلد چھوکارا نہ ملتا۔ اس طے میں بازووں سے گزرتا مشکل ہو رہا تھا۔ لوگ میری طرف حیرت سے دیکھتے تھے۔ اس وقت بھی ترکیب جو بھی کہیں سے نئی چادر یا شال خریدوں۔ ناگنا پکڑے اور مطلوبہ دکان تک سفر کر کے میں نے سفید کشمیری شال خریدی اور جسم پر لپیٹ لی۔ جس طرح حکیموں اور ڈاکٹروں کے پاس بیمار جاتے ہیں، میں حویلی میں داخل ہوا۔ دو بج چکے تھے۔ سب میرے منتظر تھے۔ کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ میری اس ہیئت کذا علی پر انہیں مضطرب ہونا چاہیے تھا، ان کے کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ان کے سامنے جا کے مجھے ایسی ندامت نہیں ہو رہی تھی۔ میرا جسم ہلکا ہوا تھا۔ لباس تبدیل کر کے میں باہر آیا تو دسترخوان پر کھانا چن دیا گیا تھا۔ لگتا تھا، بھی صبح سے بس کھانے کا اہتمام کرتی رہی ہیں۔ طرح طرح کے خوان میاں سے وہاں تک سجے ہوئے تھے۔ صبح دیر سے ناشتا کیا تھا لیکن طبیعت حاضر ہو، سر پہ کوئی بوہ نہ

ہو اور وہ جو کہتے ہیں، آدمی علیٰ باطین ہو، نشاط خاطر والی کیفیت ہو تو بھوک بھی اچھی لگتی ہے۔ پھر داخل ہی کھانے کا تھا۔ برسات کی نسبت سے انہوں نے برسات میں کھائی جانے والی چیزوں کا خیال رکھا تھا۔ کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آیا۔ بستر پر ڈاکر نکالی تو آنکھیں بھاری ہونے لگیں۔ نوجوان کے سامنے میری کمرے پرست کے مارے تھے۔ درو تو نہیں تھا لیکن تھوڑی تھوڑی در بعد کک سی اٹھی۔ کچھ مرغیں کھانوں کا خمار کچھ گھری فراغت و راحت کچھ یہ اطمینان کہ جہر اور جامو کا سامنا کرنے میں پیشانی سے پسینہ نہیں چھلکے گا، مجھے نیند آگئی اور دروازہ بند کیے بغیر میں شام تک سو رہا۔

شام کو جہاں گیر کی دستک پر آنکھ کھلی۔ وہ بتانے آیا تھا کہ بہت سے لوگ ملاقات کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم تھا، وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ منہ ہاتھ دھو کے میں بیٹھک میں آیا تو چوکی پر فل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے اڑے کے عمر اس سلامت عرف سلائی نے تو در تک مجھے سینے سے چٹانے رکھا۔ ہر ایک بھی وہاں تھا یعنی نسل کو سارے واقعے کی خبر ہو چکی تھی۔ یہ چھٹی بھی کیسے رہ سکتی تھی۔ جلد یا بدیر معلوم ہونا ہی تھا۔ درمیان میں بہت سے لوگ تھے۔ میں ٹیبل سے دور چوکی کے کنارے پر بیٹھ گیا، ہر ایک اور اس کے ساتھیوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ہر ایک سے زور آزمائی کرنے والا نوجوان گورا کے لقب سے مشہور ہے۔ ساتھ میل دور بارہ بجی سے اس کا تعلق ہے۔ اڑے کے پرانے استاد کو نکال کے اس نے چوکی پر قبضہ جمایا تھا اور دور دور تک اپنے چاقو کی دھاک بٹھادی تھی۔ اصل میں وہ شاکر ہر دو کا پروردہ تھا۔ شاکر کے نوجوان اور اوباش لڑکے مل دیو نے قریبی شر ایودھیا میں تیرتھ یا تار کے دوران میں فیض آباد کے اوسط درجے کے ایک تاجر کشمی داس کی نوجوان حسین و جمیل بیٹی پر رکھا کو کہیں دیکھ لیا تھا۔ اس نے تیرتھ اتھان ہی میں پر رکھا سے زیادتی کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ پھر اس نے فیض آباد میں باقاعدہ کشمی داس کو پر رکھا کے لیے پیغام بھیجا۔ یہ ظاہر یہ رشتہ کشمی داس کے لیے عزت و حریت کا باعث ہونا چاہیے تھا۔ شاکر ایک صاحب حیثیت آدمی تھا، اس پاس کے نئی ملاقاتوں میں اس کی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں لیکن جہاں دیدہ کشمی داس کو اس پیغام کے پیچھے شاکر کے مذموم ارادوں کا اندازہ تھا۔ شاکر کے بیش و عشرت اور زور و اثر کی باتیں اطراف و اکناف میں عام تھیں۔ لوگ اپنی نوجوان

لڑکیوں کو پردوں میں چھپائے رکھتے تھے۔ کشمی داس کو معلوم تھا کہ انکار کے جرم میں وہ کیسے عبرت ناک انجام سے دوچار ہو سکتا ہے لیکن اپنی سخت جگر کو وہ جیتی جیتی سب پنجہ جازر بوجھتے جسم میں تو نہیں دھکیل سکتا تھا۔ وہ ہانے کرتا رہا۔ شاکر کو بہت جلدی تھی۔ اس نے دھمکیاں دیں اور شاکر کو دس۔ کشمی داس نے ہائی نہیں بھری تو تھا کرنے لگا۔ مگر گوں کے ذریعے پر رکھا کو اغوا کر لیا۔ اڑے کے لوگوں پر وقت خبر ہو گئی اور انہوں نے شاکر کے کارندوں کو رات میں جالیا اور مار بھگایا پھر شاکر نے فیض آباد کے اڑے کے لوگوں پر دباؤ ڈالنے یا انہیں آزمانے کے لیے گورا کو مار بھیج دیا یا گورا خود اپنے مالکوں کی ہلکی کی خبر سن کے دوبارہ ہوا۔ کم و بیش یہ وہی داستان تھی جو میں نے مختلف لوگوں پر ایک بوڑھے تماشائی سے سنی تھی۔ ہر ایک اور اڑے کے گورا آدمی رازدارانہ انداز میں مجھے شاکر کے جاہ و اقبال اور شقاوت و سفاکی کے قصے سناتے رہے اور مجھے ایسا لگا۔ مجھے بتا رہے ہوں کہ گورا کی ہزیمت سے مراد یہ نہیں ہے شاکر مل دیو نے بھی شکست قبول کر لی ہے۔

ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اندر خولی سے ان کے لیے کھانے پینے کا سامان آتا رہا۔ چائے، شربت، نمکین مٹھائیاں، پان حقہ، بیڑی، سگریٹ کا دور مسلسل چل رہا تھا۔ پھر اندر اندر گورا ہوجانے پر ممانے آکے کشمی داس کی آواز اطلاع دی۔ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کدوں۔ میں یہ معاملہ آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا لیکن ہر ایک سفارش پر میں نے اسے ملا لیا۔ وہ ایک ادبیز و رازدارانہ پتلا ہندی رنگ کا خوش پوشاک شخص تھا۔ دھوئی کرتے اور بند گلے کے کوٹ میں لبوس تھا۔ ممانے اسے میرے پار پہنچایا۔ اس نے اوپ سے مجھے پر نام کیا اور میرے ہاتھ جھونے چاہے تو میں نے اسے روک دیا۔ میرا شکر ادا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ بہت دل برداشتہ نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا، وہ ایک عزت دار آدمی ہے، چھوٹا کاروبار ہے۔ اچھی گزیر رہ رہا ہے۔ زیادہ کی ہوس نہیں اس نے اپنی بیٹی پر رکھا کو بی اے کی تعلیم دلائی ہے۔ پر رکھا علاوہ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ دو بیٹے ہیں جن میں سے ایک دوسرے بیٹے کی ولادت پر بیوی بھی جدا ہو گئی تھی۔ پر رکھا اس نے ماں کی طرح پالا ہوا ہے۔ وہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ کئی رشتے اسی لیے مسترد کر دیے۔ پر رکھا داس دل سوزی سے کہہ رہا تھا کہ وہ شاکر مل دیو کے زور و اثر سے یہ خوبی واقف ہے۔ کسی طور وہ اس کا ہم سر نہیں رہے گا۔

بازی گار

اس کے سامنے بات کرنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا۔ اغوا ہوا قلعے کے بعد پر رکھا کی حالت نہایت اتر ہے، وہ بیٹھے بیٹھے یک پڑتی ہے۔ نہ کچھ کھاتی ہے، نہ پیتی ہے، ساری رات اریں سختی رہتی ہے اور کبھی کبھی بری طرح کپکپانے لگتی ہے۔ وہ بہت خوف زدہ ہے۔

میں نے اسے قہریلے لہجے میں "سب ٹھیک ہو جائے گا" ملے رکھے، میں یہی کہہ سکتا تھا۔ گو مجھے اپنے لفظوں کی بے قدری کا خوب احساس تھا۔

ہر ایک کشمی داس کو میرے پاس سے اٹھانے کے نسل کے نسل لے گیا۔ میں نے دور سے دیکھا، کشمی داس نے نسل کے بچہ کو لیے اور بلک بلک کے اپنی روداد سنائے لگا۔ اس کی از مجھ تک اس قدر نہیں پہنچ رہی تھی۔ نسل نے حس رکت بیٹھا سنتا رہا۔ جہاں دیکھو "آدی" "آدی" کا تعلق کر رہا ہوا "آدی" "آدی" سے بھاگ رہا ہے۔ کشمی داس کی حالت رستہ جی تو یہی کرتا تھا کہ شاکر کے ملاقات میں جا کے اس کا یہی بیٹھ کے لیے ختم کردوں۔ موزی جانور بھی تو مار دے تے ہیں۔ ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ مٹی بھر "آدی" انسانوں کے ہجوم کی زندگی عذاب کر دیتے ہیں۔ ہر جگہ یہ دنیا کتنی کے بی ہی خراب کرتے ہیں۔ کوئی ان کا پیٹھ نہیں لپکتا۔ سب مٹ رہے جاتے ہیں۔ آدم خور و دندوں کی طرح آدم خور میں کو بھی لوگ گھیر کے اکٹھے ہو کے مار دیا کریں تو دنیا ہی جا جائے۔

کشمی داس جلد ہی چلا گیا۔ اڑے کے کئی آدمی رات بیٹھے رہے۔ ان کے جانے کے بعد کھانا ہو سکا۔ میں نسل کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ کھانا بھی اس نے موشی سے کھایا۔ مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ سکوت میری بات سے تو نہیں ہے؟ ممکن ہے، ہر ایک اور گورا کے معاملے میں ملے ملافت سے وہ ناخوش ہو۔ میں کیا صفائی پیش کرتا۔ میں نے خود کو بہت روکا تھا۔ میں تو وہاں سے ہر ایک کو اس کے حال پر موڑنے چل ہی رہا تھا کچھ مجھ سے آگے نہ جانا چاہا۔ میری لہو ہوتا تو کیا کرتا؟ کھانے کے بعد وہ بیٹھک میں آ بیٹھا۔ لا وقت لوگ کم تھے، جہاں گیر، نیسان، منیر علی کے دونوں بیٹے اور نصیر آباد میں موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ اسے کدوں کو بھیجے کوئی سہرا ہی نہیں مل رہا تھا۔ کوئی اور بات سمجھ میں نہ آئی تو اس کا ہودہ توڑنے اور دھیان بنانے کے لیے میں ذاتی یاد دلایا "وہ فروزاں اور یا سمن کی چیزیں" میں نے ہادی آواز سے پوچھا "تم نے ان کے سپرد کر دیں؟"

آدی گار

169

کتابیات پبلی کیشنز

"ہاں رے" وہ تو یاد ہی نہیں رہا، "وہ کسما کے ہوا" اس کی آواز بھاری تھی "دے دے ان کا سارا۔"

"میں میں کیا؟" میں نے ہلکے سے کہا "تم خود ان کے حوالے کرو" میں سامان لے آتا ہوں اور انہیں بلالیتا ہوں۔

وہ پھر کب تک گم ہو گیا۔ میں نے جہاں گیر سے فروزاں اور یا سمن کو بلانے کے لیے کہا اور کمرے میں جا کے اپنی سے ان کا صندوق اٹھالیا۔ ان دونوں کے ساتھ وہ بھی آگئیں۔ خانم زریں، زہرہ اور دونوں سہائیں۔ صندوق میں نے نسل کے سامنے رکھ دیا۔ "ادھر ہی آجاؤ گی؟" اس نے فروزاں اور یا سمن کو مخاطب کیا۔

دونوں گھبرائی ہوئی تھیں۔ ایک لمبے کے لیے انہیں تردد ہوا پھر سہجائے اپنا سراپا چرائے ہوئے وہ نسل کے قریب جا کے بیٹھ گئیں۔ لے لے خانم کو صندوق پر کھولنے کا اشارہ کیا۔

"کیا ہے اس میں؟" خانم نے حیرانی سے پوچھا۔ حیرانی میں اشتیاق کی آمیزش غالب تھی۔ نسل نے ہتے کا لباس کش کھینچ کے بدلاتے ہوئے کہا۔

"ناگن ہے اس میں۔" سب اپنی جگہوں سے کھٹکتے ہوئے نسل کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھیں تجست سے چمک لگی تھیں۔ خانم نے احتیاط سے صندوق کھولا اور پلکیں جھپکائے لگی۔ "ہائیں" یہ کیا ہے؟ اتنا سارا؟ اس نے اور رکھا ہوا بیہوں جزا ہار اٹھا کے دیکھا۔ اس کے ہیرے جگمگ کر رہے تھے۔ سبوں نے باری باری وہ بار دیکھا۔ فروزاں اور یا سمن تو مبسوٹ ہی ہو گئی تھیں۔ حیرت و مسرت سے انہوں نے سسکاری بھری۔ ان کی دیدے بھی بیہوں کے مانند دیکھنے لگی۔ وہ اپنا بار بچان لگی، ہوں گی۔ دونوں ہمیں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگیں۔ انہیں جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔

"دیکھ لو اچھی طرح" نسل نے ہتھکڑی "تم کو معلوم نہیں اس کتنے نکتہ نما رہا۔ پورا نہیں تو ہم کو بولو" چلے جائیں گے پھر اس کے پاس۔

خانم ایک ایک کر کے سارے زور صندوق پر قہقہے نکالنے لگی۔ وہ خاصا بڑا زچہ تھا سید محمود علی کے گھر تو ہم نے سرسری طور سے دیکھا تھا۔ اس وقت تو حالت ہی دوسری تھی۔ زیورات کے پہلو میں دلی ہوئی نوٹوں کی گڈی اور زمین، مکان کے کاغذات، خانم نے ایک نگاہ ڈال کے فروزاں اور

کتابیات پبلی کیشنز

کتابیات پبلی کیشنز

یا سمن کے آگے رکھ دیے۔ ہنسل نے مختصراً انہیں نقدی اور کاغذات کے بارے میں بتایا اور کہنے لگا ”ابھی تو ڈاکٹر کے آدھی ادھری بیٹج دیں گے۔ مکان، زمین کا سودا کرنے کو، یا جیسا تم بولو۔“

دونوں بہنوں کی آنکھوں میں آنسو اٹھ اٹھے۔ ان سے کچھ نہ کہا گیا۔ فروزاں نے دوپٹے سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ یا سمن کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ خانم اور زریں نے انہیں ہانسون میں پھنسا لیا۔ نصیر بابا کی آنکھیں بھی پھٹی ہوئی تھیں۔ کبھی ہنسل کو دیکھتے تھے، کبھی مجھے اور فروزاں، یا سمن کو اور ہاتھ اٹھا کے شکر ادا کرتے تھے۔

جانے کیوں یہ منظر دیکھنے کی مجھے بہت آرزو تھی۔ زریں کے علاوہ یہ بھی ایک وجہ تھی جو میں فیض آباد آنا چاہتا تھا۔ آدمی کبھی کبھی اپنی مرادوں، امیدوں سے خود آگاہ نہیں ہوتا، وہ بر آتی ہیں تب اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی تو تمان خانے میں کہیں جا کر نہیں تھا۔

یہ سب کچھ اتنا واقف تھا کہ فروزاں اور یا سمن آسودگی سے زندگی بسر کر سکتی تھیں مگر ہنسل کے یہ قول یہ مال و زر ان کے مال باپ کا بدل نہیں تھا۔ ہنسل نے ان سے کہا کہ ہمیں ان تک پہنچنے میں بہت دیر ہوگئی تھی۔ ساری زندگی یہی دیر سویر ہوئی رہتی ہے۔ وقت پر پہنچ جانے کا موقع تو آدمی کو کم کم ہی ملتا ہے۔ دونوں بہنوں سے ضبط نہ ہو سکا۔ کہتے ہیں ”آنسوؤں میں برا زہر ہوتا ہے، جتنا نکل جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔“ انہی دونوں کی عمر ہی کیا تھی۔ شاید آنسوؤں پر قابو پانا تکنیکی پہنچائی ہے۔ وہ بچوں کی طرح ہڑکتے، ہلکتے لگیں۔

زریں اور خانم نے انہیں اپنا جزدوبانے رکھا تھا۔ ایک کے آنسو دوسرے کے لیے کچھ کم غماز نہیں ہوتے۔ وہ فروزاں اور یا سمن کو سنبھال رہی تھیں اور خود انہیں اپنا یا رانہیں تھا۔ پھر نصیر بابا اپنی جگہ سے اٹھ کے فروزاں اور یا سمن کے سامنے بیٹھ گئے اور طرح طرح سے ان کی دل جوئی کرتے رہے حالانکہ ان کی آواز بھی چھلک رہی تھی۔ کہنے لگے، مگرا ہوا بھول جانے ہی میں بہتری ہے۔ ”جھو“ اس کی فضا بھی تھی، اور اس کا کوئی کام مصلحت کے بغیر نہیں ہوتا۔

انہیں اب شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایک قیامت ان کے سر سے گزر گئی۔ اب آگے، اللہ نے چاہا تو سارے دکھوں کا دوا ہو جائے گا۔ وہ بہت مہربان لوگوں میں آگئی ہیں۔ ایسے لوگ قسمت والوں ہی کو ملتے ہیں۔ زندگی کا حاصل یہی ہے کہ کتنے اچھے لوگوں کی رفاقت نصیب ہے۔

نصیر بابا کی باتوں میں بڑی درومندی اور دل نشینی تھی۔

چچ کا اپنا اثر ہوتا ہے۔ پھر ہنسل نے ظفر کا ذکر چھڑک کر چرخ روشن کر دیے۔ دونوں کے ہاں ظفر کے نام سے تھوڑے سا نمودار ہوا۔ ہنسل نے انہیں مزہ سنایا کہ جلد ہی ظفر میں یہاں آجائے گا اور کوشش یہی ہوگی کہ ان کا اپنا ایک کمر ہو جائے۔ یہ بھی اتنی کانکھ رہے اور ان کی مرضی پر ہے، وہ یہاں رہیں یا اپنے گھر، اس شہر میں یا کسی اور جگہ۔ ہم ان سے کہیں بھی دور نہیں رہیں گے۔ جب بھی ہماری ضرورت پڑے، وہ اپنا حق سمجھ کے ہمیں بلا سکتی ہیں۔ وہی حق جو انہیں اپنی ماں اور اپنے باپ کی طرف سے حاصل تھا۔

میرا بھی جی چاہتا تھا، میں بھی ان سے کچھ کہوں۔ میرے دل میں بھی بہت سی باتیں چل رہی تھیں۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ خود کو کبھی تنہا، بے یار و مددگار نہ سمجھیں۔ ظفر کو وہ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں نے بھی اس کے بارے میں سب کچھ اچھا ہی سنا ہے۔ یقیناً وہ ان کے لیے بڑا سارا ہوگا۔ اب آگے اسی کا کام ہے لیکن کسی مرحلے پر وہ ان کے اعتبار پر پورا نہ اترے تو وہ بدل داشتہ نہ ہوں، خاطر بق رہیں اور صرف ظفر ہی نہیں، نصیر بابا، ہنسل اور زریں اور خانم کی نہیں، ایک میں بھی ہوں۔ اور ان میں کوئی بھی نہ ہو تو میں ہوں اور میں اکیلا بھی بہت ہوں، اور بہت سے میری مراد ہے کہ میرے سینے میں ان کے لیے بے پناہ احساس موزن ہے شاید سب سے زیادہ، اور یہ محض ہم ودی ہے تو ہم ودی کوئی کمر تو رہے گا جذبہ نہیں ہوتی۔

میں سوچتا رہ گیا۔ زریں اور خانم انہیں وہاں سے اٹھا لے گئیں۔

○●○

دوسرے دن صبح میرے بیدار ہونے سے پہلے انہاں کر کے نسل اڑے چلا گیا تھا۔ وہ رات گئے واپس آیا اور کچھ دیر بیٹھک میں نشست کے بعد اپنے کمرے میں روپوش ہو گیا۔ وہ الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ اگلے دن صبح بھی ہوا۔ وہ سویرے سویرے نکل گیا۔ اس روز میرا بھی اڑے پر جانے کا ارادہ تھا لیکن جہاں گیر نے گزشتہ کل کی طرح ہلا بھلا بچھا دی۔ جہاں گیر نے گزشتہ کل کی طرح ہلا بھلا دی۔ میں نے عرصے بعد ظفر کو ہاتھ لگایا تھا۔ گیا میں اسکول کے دنوں میں ظفر خوب کھیل سکتی تھی۔ اب تو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ خانم کے ساتھ چند بائیاں بیٹھنے کے بعد خانے اور میرے کمرے میں آئے۔ لگے لگے، چپچی، چپچی اور کئی طرح کے دردناک کھیل ان کے روز مرہ میں شامل تھے۔ عمارت کے عقب میں واقع باغ کے ایک حصے میں فرش پختہ کر کے بیٹھنا کا ہاتھ

مازی گری

ی کیا گیا تھا۔ زریں نے اوپر کی منزل میں درمیانہ درجے کا یک کمرات خانے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہاں کتابوں، برسوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ یہاں نے مجھے بتایا تھا کہ راہ اس ذخیرے میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ زریں کی دیکھا بھی تھی کہ مطالعے کا چکر پڑ گیا ہے۔ کتابوں کی حفاظت کے لیے یہ طور خاص شیٹیں کی اٹاریاں بنوائی گئی تھیں اور ’اودھنی اور خاموشی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ فروزاں اور یا سمن کا تو پھر یہاں بہت جی لگتا چاہیے۔ کتابوں اور سالوں سے ان کا تعلق تو موروٹی تھا۔ گیا میں انگریزی کا دھار پروفسر کتا تھا، کثرت مطالعہ سے بہتر، منتخب مطالعہ۔ بہ کثرت مطالعہ کو کثرت حافظہ بھی چاہیے اور وہ کتا ادیب ضرور پڑھنا چاہیے، ادب آدمی کو مذہب کرتا ہے۔ مارا موضوع کوئی سا ہو، متفق ہو یا ریاضی، طبعیات ہو یا نباتات۔ ایک دولی صمد ادب یا لٹریچر کی تنقید رکھتی ہے۔ مجھے یاد ہے، میں نے پوچھا تھا ”اور کھیل؟“ اس نے جواب دیا تھا، وہی کھیل کھیلے جائیں جن میں دونوں فریق بت سکیں، کسی کی بار نہ ہو۔ کھیلوں میں فریق مخالف کی بار پر لہار مسرت ایک غیر اخلاقی رویہ ہے۔ کتا تھا، مغربی ملکوں کا بانگ بہت مقبول ہے۔ کھیل میں دو مخالف ایک دوسرے کے برساتے رہتے ہیں اور لوہان ہو جاتے ہیں، جتنی ضرریں لگائے اور جو جتنی ضرریں کھائے۔ دیکھنے لے اس تماشے پر خوب اچھلے کوڑتے ہیں۔ یہ کیسی اذیت دہی ہے۔ وہ ورزش اور بھاری کے کارناموں کا حامی تھا۔ جہاں گیر مجھ سے بہت ربا تھا اور اسے ایک نہایت آمیز خوشی بھی تھی۔ ظفر بھی عجیب نشہ ہے۔ ارد گرد سے آدمی بگاڑ ہو جاتا ہے۔ نصیب یہاں کہتے تھے، آدمی کسی کام کا نہیں رہ جاتا۔ گھر بیٹھے وافر آمدنی کی صورت ہو تو اس سے غماز بھٹک بھی کوئی نہیں۔ آدمی ساری زندگی ظفر کی ناکت میں گزار سکتا ہے۔ ایک زمانے میں نصیب میاں کو لڑنے کا عارضہ تھا، ایک دن اچانک چھوڑ دی۔ میں نے پوچھا لیں؟“ کہنے لگے ”میاں! ساری خواب میں بھاٹ پختے لگی، لڑا، مہرے گردش کرتے رہتے تھے“ عادی تھی جزی بدن ہوئی اور غالباً ضد ہی ان کا ایک علاج ہے۔ میں نے لڑنے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کچھ جہاں گیر کی خاطر کیا، کچھ میں دیکھ کر حیرت میں قیام کے دوران میں اپنے آپ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ میں شاید کوئی تجربہ کر رہا تھا۔ یوں بھی یہ زبان، مائوں کی خوشنودی کا ناظر رکھتے ہیں تو مہمانوں پر بھی اپنے ہاتھوں کی دل جوئی لازم ہے۔ میزبانی کے بھی آداب ہوتے

ادبی گری

171

ہیں، مہمان نوازی کی طرح اسے میزبان نوازی کہنا چاہیے۔ تویر بھی میرے اور جہاں گیر کے درمیان بازی میں شریک ہو گیا تھا اور جہاں گیر کی التجاؤں کے باوجود مجھے مشورے دینے سے باز نہیں آیا۔ کچھ دیر میں خانم بھی ہمارے پاس آ کے بیٹھ گئی اور جہاں گیر نے بتایا کہ خانم سے کسی کا جیت جانا بہت مشکل ہے، انہوں نے زہرہ اور زریں کو بھی ماہر کر دیا ہے۔ خانم کو دیکھ کے جہاں گیر بھلا کے آگے سے ہٹ گیا۔ اس کی ادھوری بازی خانم نے جاری رکھی اور وہ مجھے مسلسل بات دیتی رہی۔

سوئے، کھانے اور کھیلنے میں دو دن ایسے ہی گزر گئے۔ وقت کا کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ ہنسل پھر رات کو واپس آیا۔ رات کو اس کے چہرے کا غبار مجھے کھٹنے لگا۔ یہ محسوس نہیں تھی۔ اڑے پر بھی وہ آرام ہی کر رہا ہوگا۔ وہاں کون سے مل تیل جوتے ہوں گے پھر کیا ہے؟ وہ اڑے پر اتنی دیر کیوں بیٹھا رہا ہے؟ وہ تو اب اڑوں پاؤں سے دور دور رہتا ہے۔ اسے زریں کا خیال بھی نہیں ہے۔ یہاں آ کے تو وہ ہمیں کا ہو جاتا ہے۔ زریں کچھ دیر کے لیے اوجھل ہو جاتی ہے تو اسے بلی بلی ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے تو وہ فیض آباد آنے سے کترا رہا تھا کہ پھر یہاں سے جلد نکلنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ زریں مزاحم ہو جائے گی۔ زریں کے سامنے تو وہ بہت ناتواں ہو جاتا ہے۔ اس سے کچھ پوچھنے کے بجائے میں نے طے کیا کہ کل اڑے جا کے خود کیوں گا؟ ایسی کیا بات ہے۔ ممکن ہے، مجھے یوں ہی وہم ہو رہا ہو۔ جامو اور بھوکے چلے جانے کے بعد ظاہر ہے، اڑے کی پہلے جیسی حالت نہیں رہتی چاہیے۔ اڑا تو مضبوط استادی سے ٹھیک طرح چلتا ہے۔ کوئی کتنا ہی زور اور، چاٹو کا دھکی ہو، اڑے کے ٹکراؤ کو دوسری خوبوں سے بھی متصف ہونا چاہیے۔ اڑے کا تعلق جامو اور جرو سے تھا۔ ہنسل نے ضرور کوئی ایسی بات دیکھی ہوگی جو اسے صبح سے رات تک وہاں بیٹھنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

تیسرے دن، میں جلدی اٹھ گیا تھا یا اسے دیر ہوگئی تھی۔ وہ اڑے جانے کے لیے تیار ہوا تو میں نے بھی اس کے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔

”میں رے“ اس نے صاف منع کر دیا بلکہ دھکا دیا

”تو ادھری رہ، دو میں ایک کو ادھری ہونا چاہیے۔“

”مگر تمہیں روز اتنی پابندی سے وہاں جانے کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے؟“

”ہے رے۔“

کتابیات پبلی کیشنز

170

کتابیات پبلی کیشنز

”کیوں؟ ایسی کیا بات ہے؟“

”اڑے کو تو ہوا دیکھنا ہے۔“

”کیا دیکھنا ہے؟ اڑے پر بیٹھنے یہاں آئے ہو؟“

”دو ایک دن میں کیا ہو جائے گا۔“

”بس رہے!“ اس کی تیوری چھ گئی، اس نے کچھ اور کہنے سننے کا موقع نہیں دیا، دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ جا سکتا تھا لیکن اس جگہ سے اس کی ناکواری کا امکان تھا۔ میں چپ ہو گیا۔ میری خاموشی میرا شگہ تھی۔ سے بھی اس کا احساس ہوتا چاہیے۔ اس نے پلٹ کے میری طرف دیکھا ہی نہیں، وہ چلا گیا اور سارے دن کے لیے مجھے اجڑن کر گیا۔

دن بھر میرے سر میں ریت اڑتی رہی۔ اس دن شام جو ملی میں اڑے کے لوگوں کی آمد ہوئی اور دوسرے دن سے بھسلنے اڑے پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ اس وقت اور اتنے اتنے وقت کے لیے اڑے پر اس کی حاضری کی علت کے بغیر غیر ضروری سمجھی گئی ہے یا دانستہ مجھے الگ رکھا جا رہا ہے۔ بار بار ایک ہی غصہ مجھے ڈنک مارتا تھا کہ بھسل کی اس تندی اور سرگرمی کا سبب لکشی داس اور اس کی بیٹی پر رکھا تو نہیں ہے۔ ہریا اور لکشی داس نے خاکہ ہر دو کے زوردار اثر کے بارے میں جو کچھ مجھے ذہن نشین کرایا تھا وہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ اس روز ہریا اور گورا کے درمیان مکرر آرائی کا فیصلہ ہو چکا تھا لیکن وہ فیصلہ قصہ تمام ہوجانے کی ضمانت نہیں تھا۔

شام کو ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ بھسل آگیا، مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، اس کے ساتھ جامو تھا۔ جامو نے مجھے دیکھتے ہی لپک کے بازوؤں پر اٹھالیا۔ سننے کی زبان سینہ خوب سمجھتا ہے۔ اس کے ہاں ایسا جذب تھا جو کسی بہت ہی محبوب اور مطلوب شخص کے لیے ہو سکتا ہے۔ دیر تک وہ مجھے بہت کچھ کہے رہا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو میں نے حیرت سے پوچھا ”جامو بھائی! تم کیسے یہاں؟“

”بس آگے بھیا!“ وہ فوراً مسرت سے بولا۔

”کمال ہے!“ میں نے چنبٹائی آواز میں کہا۔ ”اتفاق“

”یا تمہیں معلوم۔“

”بس آگے استادلو، جو بولتے ہیں، چلی کا پھر کتنا کیا بولتے ہیں اس کو“ وہ ہنستے ہوئے بولا ”جی تم کو دیکھنے کو بیٹہ کر آ تھا۔“

میں نے جمل کیا۔ جامو اپنی اچانک آمد کے بارے میں

چچ کے اظہار کے گریز کر رہا تھا۔ ہمیں یہاں سے جلد ہی بنگال کی طرف جانا تھا۔ دو ایک شہروں کے بعد نکلتے پہنچ ہی جاتا تھا۔ جامو کے ساتھ جمرو اور زورا بھی نہیں تھے۔ بلانا تھا تو بھسل کو پہلے انہیں بلانا چاہیے تھا۔ ”سب خیریت تو ہے جامو بھائی؟“ میری آواز کا تردد اس جہاں دیدہ سے او بھسل نہیں رہا ہو گا۔

”ہاں بھیا، بھسل مشکل، سب ٹھیک، ایک دم۔“ بھسل اسے چوکی پر لے گیا۔ زریں بھی بھاگی بھاگی آگئی۔ جامو نے جلدی سے اٹھ کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ زریں بھی اس کی غیر متوقع آمد پر پلکیں جھپک رہی تھیں۔ میری طرح اس نے بھی تعجب سے پوچھا۔ جواب میں جامو مسکراتے لگا اور اس نے وہی جواب دیا ”بس آگے بھئی!“

”بہت اچھا ہوا، آپ کو دن بھی کتنے ہو گئے۔ میں نے تو خط میں بھی لکھا تھا، جامو بھیا! ہمیں بھول گئے گیا۔ جمرو بھائی کے ہاتھ خط بھیجا تھا“ زریں چپکتی آواز میں بولی۔ ”خط مل گیا تھا“ خط میں اور تمہارا گاجر کا طوطہ بھی۔ جی کرتا تھا، اسی دم چل پڑوں پر کوئی نہ کوئی۔“ جامو پلک کے بولا ”طوطہ سبھی نے کھایا۔ سب اٹھ چائے تھے۔ ہم نے بولا“ یہ میری بہانے اپنے ہاتھ سے بنا کے بھیجا ہے۔

”وہ تھا ہی کتنا، زریں کی آنکھیں چپک رہی تھیں۔“

”کم چیز زادہ اچھی لگتی ہے۔“

”پھر تو اس کا کم ہونا اچھا ہوا۔“

”نہیں، نہیں،“ جامو نے کھیرا کے تردید کی ”ایسی بات نہیں ہرنا! ادھر تو کتنا ہی زیادہ بچھتیں پٹ ہو جاتا۔“

”اور“ اور جمرو بھائی آپ کے ساتھ نہیں آئے؟“

زریں نے مومنو بیل کے جامو کو عافیت دلائی۔

”ادھر ان کا تھوڑا کام تھا“ جامو صاف بہانے بازئی کر رہا تھا۔ جمرو اور زورا سے تو ہمارے فیض آباد پہنچ جانے کی خبر سن کے رہا نہیں جا رہا ہو گا۔ جامو نے بھی انہیں مشکل سے روکا ہو گا اور یہ بات تسلیم ہی کی ہو سکتی ہے۔ اتنی دیر میں جہاں گیر، نیساں، تنویر اور ارشد آگے جامو سے ان کا خاص رہا ضبط معلوم ہوا تھا۔ وہ اسی گمراہ کوئی فرد گمراہ رہا تھا، بالکل ایک مختلف آدمی، جیسے اڑے سے اس کا واسطہ ہی نہ ہو۔ کسی کو بھی شاید معلوم نہیں تھا کہ جامو، اڑے کا کیسا پتہ کار آدمی ہے، چاقو اس کے اشاروں تابع رہتا ہے، زور آور وہ بلا کا ہر ہے۔ جو بڑے اڑے اس سے پہلو بجاتے ہیں۔ اس کے اڑے سے وابستہ توئی اس کے سامنے سر نہیں اٹھاتا، سوچ سمجھ کے زبان کوئی

بازی گرا

دے۔ میں اب آرام ہی کرنا چاہتا تھا۔ شاید بھسل کا مشورہ صائب تھا کہ مجھے ہر طرف سے بے نیاز ہو کے آرام کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ سب کچھ اتانتا نہ ہو جتنا مجھے نظر آ رہا ہے۔ میں تو یوں بھی اس کے بے قول آدھا دیوانہ ہوں۔ میری نگاہ یا تو کم دیکھتی ہے یا بہت زیادہ۔ مجھے تسلیم کر لینا چاہیے کہ میں ایک ادھورا آدمی ہوں۔ دنیا میں ایک مکمل آدمی کے لیے جو معیار مستند قرار دیے گئے ہیں، میں ان پر کس قدر پورا اترتا ہوں۔ ایک بے توازن شخص کو انہیں دور ہی رکھنا چاہیے۔

گھرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا لیکن آدمی کتنا ہی تنہا ہو، وہ اپنے ساتھ بھی تو ہوتا ہے۔ کوئی آدمی شاید ایک آدمی نہیں ہو، کبھی وہ دو ہوتا ہے، کبھی اس سے زیادہ۔ کبھی ایک حاوی آ جاتا ہے، کبھی دوسرا، تیسرا اور کبھی بہت سے ایک پر غالب آ جاتے ہیں۔ یہ جو آدمی ایک نظر آتا ہے، یہ ایک نہیں ہوتا، جانے کتنے آدمی ایک آدمی میں شامل ہوتے ہیں۔ اسے خود نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا کون سا آدمی کس وقت کس رنگ اختیار کر سکتا ہے۔ بیک وقت اسے طرح طرح کی تڑپیں ملتی رہتی ہیں کبھی پہلا آدمی اپنے دوسرے آدمی کے سامنے بہت بے بس ہو جاتا ہے، کبھی دوسرا پہلے کے سامنے۔ ایک آدمی، ایک آدمی ہوا کرے تو پھر ایک ہی آدمی کا ارادہ ہوا کرے۔ یہ جو ایک آدمی میں بہت سے آدمی نماں ہوتے ہیں، یہی اسے منتشر کرتے رہتے ہیں۔ بہت کم، یہ کہیں متفق ہوتے ہیں۔ صرف ایک آدمی ہوا کرے تو فکر و خیال کی ایسی یورش نہ ہو اور زندگی کیسی آسان ہو جائے۔ میں اپنے آپ پر غلبہ و تسلط حاصل کرنے اور ایک سو ہو جانے کے جنون کر رہا، سکون بھی جبری ہو تو کیسا عجیب ہوتا ہے۔ میں نے نرمی اور متانت سے خود کو باور کرانے کی کوشش کی کہ بدگمانی سے اجتناب میں میرے لیے بہتری ہے اور بھسل کی نسبت تو کسی بدگمانی کا قصور بھی نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے دور رکھنے یا الگ رکھنے میں ضرور میری آسودگی کا کوئی پہلو مضمر ہے۔ دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں یا تو کوئی ایسا واقعہ ہی نہیں جو مجھے قریب رکھے، مجھے زحمت دینے کی ضرورت پیش آئے یا کوئی برا واقعہ

درپیش ہے جس میں میرے زباں کا احتمال ہے یا پھر میری شرکت میں میری جانب سے کسی کو تباہی یا کوہاہنی کا کوئی شبہ بھسل کو لاحق ہے کہ یہی ہوتا رہا ہے۔ میرا ضرر اسے گوارا نہیں یا یوں ہے کہ میری شرکت میرے ہی خواہوں اور دردمندوں کے لیے کسی ضرر کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ دونوں صورتوں میں میرے پاس کیا چارہ ہے؟ میں خاموش بیٹھا

کتابیات پبلی کیشنز

سورج طلوع ہوتے اور غروب ہوتے دیکھتا رہوں۔ بھسل کے خیال سے گوشہ گیری ہی میں میرے لیے عافیت ہے۔ اس کی خواہش کا احترام بہر حال مجھ پر واجب ہے۔ یہ تو عین سعادت ہے۔

بے شک کچھ در کے لیے میں خود کو یک جا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن کج فہم خویہ نگاہ کو قرار کہاں سزاوار ہے پھر وہی خشرات میرے جسم سے چمٹ گئے اور میری نگاہیں دیواروں کے پار بھٹکنے لگیں۔

فیض آباد کا اڈا ایک پرانا اور مضبوط اڈا ہے۔ یہاں جامو اور جمرو کے تربیت یافتہ آدمی موجود ہیں مگر تبت سے ہماری واپسی کے بعد جامو گلگتے میں بھسل کی مسند کا ٹکرا ہوا ہے، جمرو عرصے سے ہمارے ساتھ کوچہ گری کر رہا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی عدم موجودگی کے باعث اڈے کے نظم و ضبط میں غفلت لازم ہے۔ بھسل نے جامو کو فیض آباد طلب کر لیا ہے لیکن جامو کی ضرورت اسے اڈے کی استواری کے لیے نہیں پڑی ہوگی۔ جامو اس لیے طلب کیا جانا چاہیے کہ وہ اس علاقے کے گوشے گوشے سے آشنا ہے۔ وہ ٹھاکر ہردیو سے بھی واقف ہوگا۔ اڈا چاہے استاد جامو یا استاد جمرو کی تحویل میں ہو یا ان جیسے کسی بدلے استاد کے قبضے میں، ٹھاکر ہردیو کے جاہ و خشم کے آگے بہت بے حیثیت اور کم حیثیت ہے۔ ٹھاکر کے پروردہ اور فرستادہ نوجوان استاد گورا کے راستے میں رخنہ اندازی کا شائبہ کسی طور ظاہر ہو سکتا ہے۔ اب تک مجھ سے بھی ٹھاکر اچھی طرح متعارف ہو چکا ہوگا۔ میرے ممکن، زریں کی حویلی کا محل وقوع بھی اسے اچھی طرح نقش کرادیا گیا ہوگا۔ میں اور بھسل آج نہیں تو کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ کل پھر یہ حویلی معمول کے مطابق اڈے کے لوگوں کی نگرانی میں ہوگی۔ وہ تمام بڑے جاں باز، ایشیا پریٹ لوگ ہیں۔ ایک دوس کے مساوی ہے۔

بھیاں ساتھ ہو تو بے شمار بھی ان کے سامنے بیچ ہیں تاہم وہ ٹھاکر کے لاؤ فلکس کے آگے کسی دیر دیوار بنے رہیں گے۔ لاؤ فلکس کے اعتماد میں قہر و غضب بھی شدید ہوتا ہے۔ شرمیں اپنی حویلی کے فسانے بھی کم نہیں ہوں گے۔ چھوٹے شروں کے لوگوں کے کان بڑے ہوتے ہیں۔ چھوٹے شروں میں گھروں کی دیواریں کتنی ہی اونچی ہوں، لوگوں کی نگاہیں بڑی کاری ہوتی ہیں۔ لوگوں کی نگاہیں روزن تراش لیتی ہیں۔ چھوٹے شروں کا پسندیدہ مشغلہ ایک دوسرے سے باجبر رہنا ہے۔ زریں کی حویلی سے تو ایک داستان منسوب ہے۔ بہت سوں کو آگئی ہوگی کہ حویلی کی دنگزاری کس طرح ممکن ہوئی تھی،

بشت پر کون سورما تھے کون کون یہاں اقامت گزریں ہے کتنے لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے وغیرہ۔ انہی عواقب پر مشورت کے لیے بھسل نے چاہ طلب کیا ہوگا۔ یقیناً لکشی داس نے بھسل کے رویہ پر وہ ہونے بڑی دہائیاں دی تھیں، اس کی نوجوان لڑکی ابودھیا میں تیرتھ کے دوران ٹھاکر کے شکتے میں بس آئی تھی کہ بال بال بچ گئی۔ دوسری بار بھی نرسے میں آجائے باوجود اڈے کے آدمیوں نے اسے بچالیا تھا۔ ادھر میر ٹھاکر کے حاشیہ نشین گورا کو خستہ حالت میں واپس بچا ہے۔ علاقے میں ٹھاکر کی حرص و ہوس، سینہ زوری، تیزی کی کمائیاں زبان زد ہیں۔ صاحبان زر چھوٹے بادشاہ ہوتے ہیں اور بادشاہ تو بادشاہ ہی ہوتا ہے، سرکار کی، عمال ان کے۔ زر سب سے بڑا زور ہے۔ جس کے جتنا، اتنا ہی وہ پرانا۔ دولت آدمی کو آدمی کا غلام بنادیتی ٹھاکر کے ولی عہد کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے، وہ اس کا نہیں ہے۔ یہ مزا تھیں تو ایک کج نگاہ کی توہین کے حرا ہیں۔ کہتے ہیں زردار کا کینہ بڑا ہلاکت خیز ہوتا ہے۔ د مندوں کو انکار سے چڑھتی ہے۔ دولت سے مراد اقرار اقرار کا اختیار ہے۔

سو گلگتے سے استاد جامو کی آمد کا مقصد محض لکشی کی بیٹی برکھا کو ٹھاکر کی آتش نفس سے محفوظ کرنا ہی نہ بھسل کو یہ آنچ اپنے قریب بھی محسوس ہو رہی ہوگی۔ اور ہرا کے معاملے میں میری مداخلت سے پہلے ٹھاکر کو لکشی داس کا گھر معلوم تھا یا فیض آباد کا اڈا۔ اب تیسرے راستے، حویلی کی طرف جانے والے راستے کی ذمہ داری ہو گئی ہے اور بھسل کے لیے یہ حویلی تاج محل کا رکھتی ہے مگر کیا واقعی مجھے وہاں سے لوٹ آنا چاہیے۔ بھسل نے اس ناوانی کی بات مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا شاید وہ بھی ایسی صورت حال میں یہی کچھ کرتا میں نے غلط بھی نہیں کی تھی۔ ہر پہلو پر غور کر کے قدم بڑھایا۔ ٹھاکر کی منزلت و مرتبت کے تخمینے میں البتہ مجھ سے بڑھتی ہوگی تھی۔ بلکہ میں نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ آدمی اتنی ستوں میں دیکھنے کی احتیاط کرے تو پھر کچھ کر سکے۔ پھر تو وہ دیواروں میں نکل جائے، جنگوں میں جا لے اپنے سر میں بھن بھناتے ہوئے ہمدم دم ہونے کی صورت گری سے مجھے کچھ اطمینان ہوا اور اس توجہ لینے نے مجھے اتھوڑت و استقامت عطا کی کہ دخل انداز میرا فیصلہ براہ اختیار سے صائب تھا۔ یہ فیض آباد کے اڈے کی بازی گرا

اور جمرو سے متعلق اڈے کے بھرم، اس کی وقعت کا لہ تھا۔ مجھے کمرے کے خلوت سے بیزاری ہونے لگی۔

ایک وار دھوپ بکھری ہوئی تھی مگر دھوپ میں تیزی نہ تھی۔ ملازما میں فرش، طاؤں اور عمارتوں کی صفائی میں بول تھیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ دھو کر دیکھوں۔ کئی دن مجھے گھر میں بند رہنے ہو گئے تھے لیکن پھر میرے قدم زریں کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ زریں سے ابھی تک کوئی بات ہی نہیں آئی تھی۔ ہر وقت مجھے کوئی نہ کوئی گھیرے رہتا تھا میں خود اترتا تھا۔ وہ بھی کبھی تنہا دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں اس کمرے کے قریب پہنچ چکا تھا کہ نیساں اچانک کسی طرف نکل آئی۔ وہ اب خاصی بڑی بڑی لکٹی تھی۔ رنگ روپ خوب نکھر آیا تھا۔ یہ حیدر آباد کی وہ ٹھٹھ نیاں تھی نہیں جسے میں نے پہلی بار خانم کے بالا خانے پر دیکھا تھا۔ دیکھ کے اس کا سراپا کل انھا۔ دوڑی دوڑی بار بھائی، بھائی کا درد کرتی، چپکتی ہوئی میرے پاس چلی آئی اور رے بازو سے چمٹ گئی اور زیر زبر سانسوں سے پوچھنے لگی میری طبیعت تو ٹھک ہے۔

میں نے مسکراتے کہا، "کیوں، کیا میں بیمار لگتا ہوں؟" "آپ صبح ناشتے کے دوران میں بہت خاموش خاموش رہے تھے پھر اپنے کمرے میں جا کے آپ نے دروازہ بند کیا۔ ہم لوگوں نے کئی پیکر لگائے۔ دروازہ بند دیکھ کے لوٹ گئے۔" وہ پریٹنا تھیں کرتی تھی۔

میں نے شرمندگی سے کہا، "ہاں کچھ سر بھاری تھا۔" "اب کیسے ہیں آپ؟" وہ پریشانی سے بولی، "درد تو نہیں ہے، لائے، میں دباتی ہوں۔" خانم تو مجھی سے مالش کرانی۔ "کتنی ہیں، میری انگلیوں میں جاوے، اور زری آپا بھی۔" ناخن شرط ہے۔ "وہ مکمل کھانا لگتی۔"

"ناچ۔" "میں نے دیدے گھما کے کہا، "دیکھیں لکشی کیوں تمہارا کرشمہ۔"

"کون کیوں؟" آن اور ابھی کیوں نہیں۔ "وہ دار فکشی ہوتا، ہاں بار بھائی!"

"ابھی تو ناکل ٹھیک ہے۔" میں نے ات بازو میں لپٹا لیا، "تم خوش تو ہوینا؟"

"کی جی ہاں۔" وہ چونک سی پڑی، "کیوں؟ آپ نے یہ کیا پوچھا؟"

"کیسے ہی، تم بتاؤ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو چپکے سے

کان میں مجھے بتاؤ۔" "آپ کیا کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ بے کل سی ہو گئی۔ "میرا مطلب ہے۔" میں نے جلدی سے صراحت کی، "تمہیں کسی بات، کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔" "زری آپا کے ہوتے ہوئے یہاں کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے۔"

وہ اب بڑوں جیسی باتیں کرنے لگی تھی۔ میں تو اسے یوں ہی چھیڑ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی غفلت و شادابی اس کی باطنی لطافت کی غماز تھی۔ میرے لیے تو وہ کسی تخلیق کے مانند تھی جیسے میں نے اسے تراشا ہو۔ اسے شادماں دیکھ کے مجھے ایک سرشار سی محسوس ہوتی تھی۔ اس سے بہتر خریداری کیا ہو سکتی ہے۔ کرشنا جی کی روح ان کے لیے ہوئے پیسوں کے صحیح تصرف سے بہت خوش ہوگی۔ ساٹھ ہزار روپے کی پیش کش پر نیساں کی خود ساختہ ماں شوکت آرانے میری دماغی حالت پر ٹھک کیا تھا، خاصی حیران ہوئی تھی کہ میں نے اتنی بڑی رقم کی بولی کیوں لگادی۔ یہ تو شوکت آرا آگے نہیں بڑھی، میں تو نیساں کے لیے کرشنا جی کی بخشی ہوئی ساری دولت اس کے آگے رکھ دیتا۔

"آپ بتائیے بار بھائی، نیساں چل کے بولی، "یہ آپ کا سربک ختم ہوگا؟" مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ دیا جاسکا، "دیکھو!" میں نے بھتی بھتی آواز میں کہا۔ "سب ختم ہوتا ہے، کسی دن تو ختم ہونا ہی ہے۔"

وہ ایک ذہین اور حساس لڑکی تھی۔ اسے فوراً احساس ہو گیا کہ اس سوال کا جواب میرے لیے گراں باری کا سبب ہوگا، "میں نے آپ کے لیے بہت دعاؤں کی ہیں بار بھائی!" وہ واللہ انداز میں بولی۔ "مجھے معلوم ہے۔"

"اور مجھے یقین ہے، میری دعاؤں میں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ ہاں، دیر سو ربی بات اور ہے۔"

"بس تم دعا کرتی رہو، کسی دن تو۔" میری آواز گھٹنے لگی۔ "خانم آپا کہتی ہیں، آدمی کو ناامید نہیں ہونا چاہیے۔"

"امید ہی سے تو سلسلہ جاری ہے۔" میں نے پڑھوگی سے کہا اور موضوع بدلنے کے لیے زریں کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا۔ اس کا دریا رواں ہو گیا۔ کتنے گلی کے زریں کو وقت ملتا ہی نہیں۔ خالی بیٹھنا اسے آتا ہی نہیں۔ ہر ایک کی خبر خبر کھنا، جہاں گیر نیساں اور زہرہ کی چھوٹی بہن کی

کتابیات پہلی کیشنز

نصابی تعلیم میں مدد کرنا، انہیں نوکے رہنا، حقے تحائف تقسیم کرنا۔ حویلی میں آئے دن اکھاڑ چھاڑ ایک معمول بن چکا ہے، آج یہ تبدیلی، کل وہ تبدیلی۔ بار بار نئے ساز و سامان کی خریداری۔ سکرود کی آرائش و زیبائش، نئے نئے کھانوں کا تجربہ، باغ کی نگہداشت، دو درو سے طرح طرح کے پھولوں کے بو سے منگوانا اور گلہ سے بنانا، روزانہ تقریباً آدھ گھنٹے بیڈ منسٹن کھانا، ورزش اور یوگا کی مشقیں، مینے میں ایک بار شیم خانے کے بچوں کے لیے کھانا بھیجنا، خط لکھنا، بھیجا جان کو بھیجی، لکھتے ہیں جامو کو۔ لاہوری پر اس کی خاص توجہ ہے۔ تازہ رسالے اور کتابیں آتی رہتی ہیں۔ بہت دنوں تک انگریزی کا ایک استاد، انگریزی کے استاد پڑھانے کے لیے آتا رہا تھا۔ کسی اور شہر میں اس کا تیار ہوا جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ اب موقوف ہو گیا ہے۔ رات کو در تک مطالعہ کرتی رہتی ہے اور جب بھی فراغت ہو، خانم سے ستار بجانے کی فرمائش کرتی ہے اور ہاں۔ یہ تفصیل بتا کے نیناس پچکنی آواز میں بولی "وہ ہاں، ایک اور دھیف، صبح و شام بابا (نمل) گویا کرنا، آپ کا ذکر کرنا اور اس بات پر کڑے رہتا کہ اتنے دنوں سے آپ لوگوں کا خط کیوں نہیں آیا۔ جب کہیں سے آپ کا خط آجاتا ہے، ذری تباہی خوش دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔"

میں اضطراب آمیز اشتیاق سے سنتا رہا۔ اضطراب یہ تھا کہ کہیں نیناس کے منہ سے ذریں کے معلق کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے مگر ذریں کا گلہ پڑھتے ہوئے اس کی زبان رکھی، تھکتی ہی نہیں تھی۔ اتنا کچھ نہ کہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا ہے وہ میری حقہ بیان گوارا رہی ہو۔ اپنے اوصاف سن کے آدمی کو جو سرت ہوتی ہے، وہی حال میرا تھا۔ میں نے ہی جانے کے لیے نیناس کو کرایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ حویلی میں نہ منیر علی کا خاندان اپنے قدیم گھر سے بچھڑ جانے کے ملال سے آلودہ ہے نہ کوئی اور۔ خانم، نیناس، جہاں گیر اور حیدر آباد سے آئی ہوئی سلمیٰ بے تمام و کمال اس گھر میں شامل ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فرداں اور یاس بھی اس گھر کا حصہ بن جائیں گی کیونکہ میاں ذریں ہے سمندر کے مانند بے گراں۔

گزشتہ کئی دن سے وہ میرے سامنے تھے۔ ان کی آنکھیں چپکتی تھیں اور چہرے دسکتے تھے۔ ان کے اطوار، ان کی باتوں سے سکون جھلکتا تھا لیکن آدمی کے اتنے رنگ دیکھ لے تھے کہ مشکل ہی سے دیکھ اور نہ ہونے پر اعتبار آتا تھا کوئی۔ خانہ آدمی جتنا گرا نہیں ہوتا۔ ساتویں در میں بھی آدمی کے

اسرار نہیں بکلتے۔ اپنی خوشی، دکھ، کینہ اور حسد چھپانے میں آدمی کو بڑی مہارت ہوتی ہے۔ نوٹنگی میں ہی لوگ بہت نہیں بھرتے، ہر شخص اس ہنر پر قادر ہوتا ہے۔ بس یہ عام آدمی کا معلوم نہیں ہوتا نوٹنگی میں، سو پ عیاں رہتا مگر اعتبار کی خوش گمانی کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔ لیکن ایک آدمی، ایک آدمی ہوتا ہے، دوسرا آدمی، دوسرا آدمی، دوسرا آدمی ہیں۔ کوئی زود حس، زود روح، کوئی سنگ دل اور کوئی باطن، کوئی راگ رنگ کا دیوانہ، کوئی سو زد کا از سے عاری لوگ کہتے ہیں، کئی آدمی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو برعکس طرح کھڑے ہیں۔ اختلاف و انحراف ان کا شیعہ بلکہ غار ہے۔ اختلاف تو فرشتوں نے بھی کیا ہے، حویلی کے کہیں تو یہ بھی آدم زانو تھے۔ آدم زانو تو ابتدا ہی سے ایک دوسرے کے دورے پر آزار ہو گئے تھے۔ حویلی کے کہیں ابھی تک اتنے در گزر جانے کے باوجود جتنے ہوئے، جڑے ہوئے ہیں تو یہ قیمت ہے، شاید اس لیے کہ یہ بڑے حاویوں اور سامنوں۔ بعد میاں تک پہنچے ہیں۔ منیر علی کو اپنا آبا کی گھر خیاں کھانا تھا۔ اگر ہم بد وقت انہیں جیسا سیر سے میاں نہ لے آتے جانے ان پر کیا قیمت گزرتی۔ گو اس عتاب و عذاب کا بھر بھی ہی تھے خانم بھی تھمت و شام کے ایک دورے گز کے میاں آئی ہے۔ بالا خانے پر کوئی عورت، عورت نہیں رہتی، وہ کچھ اور ہو جاتی ہے۔ وہ موری ہو جاتی ہے۔ خانم۔ خود کو بہت محدود کر رکھا تھا لیکن تعلق تو اس کا بالا خانے سے تھا۔ نیناس اتنی بڑی نہیں تھی پر ہوش مندی کی عمر اس نے بالا خانے کے دن دیکھے تھے۔ سوتے دنوں اور جا راتوں کا وہ زمانہ، وہ دن اسے خوب یاد ہوں گے۔ وہیں ہوئی رقص و موسیقی کی تعلیم سے آراستہ ہو کے محفل میں بیٹھ ہوئی اور اگر ہم سلمیٰ کو بے آسرا چھوڑ کے چلنے سے ڈرو کہ خصلت ارشد علی، سلمیٰ جیسی نرم و نازک، خوش و نازک، پاک باز لڑکی کو کس رسوائی سے دوچار کر دیتا۔ اس نے اس کو چور تو بنایا دیا تھا اور ذریں کا بھی یہی کچھ باجرا تھا۔ وہ اس فاحشہ نسرین کے چہنڈے میں پھنس چکی تھی۔ اتنے بالا خانے میں سجادا جا۔ وہ بھی تھکتی ہی بن گئی ہوئی۔ ذریں یہ ذلت برداشت نہ کیا۔ وہ چوڑیاں نہیں کے چپاک کی حویلی کی زندگی سب کے لیے نئی زندگی تھی اور نئی زندگی انہیں اس لیے عزیز ہوئی چاہے تھی کہ جیتے وقت سے ان سے بہت خاصیت اور عداوت کی تھی۔ وہ سارا کچھ ان کے لیے کسی بدترین خواب کے مانند ہونا چاہیے۔ ذریں نے زندگی نوٹنگی، نرمی اور کشادگی بے حساب تھی۔ یہ گھر اور

ہے بالکل مختلف تھا۔ میاں دو مشترک کی بنیاد پر رشتے استوار ہوئے تھے۔ یہ قول شاعر، "بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل فربہ سہی" میاں آدمی، آدمی کی بنیاد تھا، آدمی کا قدر و اہاں اور ذریں ان کے درمیان تھی۔ وہ ترک کی رجز سے ہٹا تھی۔ ترک کیا ہے؟ ترک ایثار ہے اور شاید سب سے اعلیٰ انسانی وصف ہے۔ میں نے دیکھا تھا۔ وہ سب ذریں ہی کو بھارت سمجھتے ہیں اور ذریں نے اپنا اختیار ان پر بٹا کر دیا ہے اور ذریں کی مثال ان کے لیے درس کا درجہ رکھتی ہے۔ ب نے اسی طور میں امان سمجھی ہے۔ وہ سارے ایک دوسرے کو رعایت دیتے ہیں۔ ہر کوئی میاں خود بخود ہے اور کوئی بھی اپنے اختیار کا داعی نہیں۔ انہیں دیکھ کے زندگی پر غبار آتا ہے۔ آدمی میں ایک خوبی اچھائی کی بھی تو ہوتی ہے۔

مجھے بھی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ حویلی کو کسی کی نظر نہ لگ اسے آدمی کی یادداشت خاصی کم زور ہوتی ہے۔ وہ پرانے وقت کے نقش محفوظ رکھیں گے تو نئے وقت کی روشنی نرمی و کشادگی کا احساس تازہ رہے گا۔ آدمی جلد بھول جاتا ہے لیکن نگ و تارک راستوں سے گزر کر وہ کسی سایہ دار رخت تک پہنچ پاتا ہے۔ عجیب بات ہے، سائے، خوشبو، دشتی اور گلہ زائے شکر اور کیساں سے بھی وہ آتا جاتا ہے غور اور کون بھی جھیلوں میں شامل ہے اور جبلت کا لڑکی کا کرے کل کی کوئی شانت نہیں تھی کہ کل بھی یہی ہون ران رہے گا مگر کسی کے پر میں زنجیر نہیں پڑی تھی۔ محل نے انہیں بتایا تھا کہ ہر شخص کا ارادہ اس کے پاس ہے وہ کسی وقت، کسی بھی لمحے دوسرا راستہ منتخب کر سکتے رہے۔ وہ سلمیٰ رکھیں کہ کوئی دلیل دے گا نہ کوئی حرام ہوگا۔ بھان مجھے بتا رہی تھی کہ میاں سب ہی ایک دوسرے کے لیے مقدم و محترم ہیں اور سب ایک دوسرے کے حکم کے تابع، کوئی اس وقت تک کسی کو نہیں ٹوکتا جب تک وہ خود غور کا طالب نہ ہو۔ ان کی احتیاط خون ان کی جانب سے پان پر قحط روی کا کوئی دباؤ نہیں۔

کے جمال میں تھا اور یہ جمال محض تراشے ہوئے لب و رخسار، شفق گوں رنگت اور سانچے میں ڈھلے ہوئے سراپا کا نہیں ہوتا یہ تو ذکاوت، حلم، ایثار اور پاک سے بھی عبارت ہے۔ کوئی پری زاہد، ماہ یک، بہت بے ذوق، نگہ کم اور ستم شعار، کوئی بے تناسب اور کم رذائیت نرم و شرس خوش نظرو خوش اطوار ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ ذریں کی جستجو میں نیناس مجھے حویلی کے اس حصے میں لے آئی جہاں منیر علی کا خاندان مقیم تھا۔ حویلی کا ایک گوشہ ان کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ منیر علی کی بڑی بیٹی زہرہ ایک طرح فیض آباد آئی تھی اور میں اسے آپ سے مخاطب کر رہا ہوں تھی کہ اس نے جیسا سیر میں کورا کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئی تھیں۔ زہرہ نے کورا کے بارے میں مجھے بتی باتیں بتائی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ زہرہ (کورا) کو توجہ دیکھو، اسے آپ میں کم رہتی تھی، ذرا سی آہٹ سے چونک پڑتی، جیسے کسی کا انتظار ہو۔ وہ بہت کم کسی سے بات کرتی تھی، ہر وقت جیسے خواب دیکھتی رہتی ہو۔ صبح ناشتے پر زہرہ سے آنا سامنا ہوا تھا لیکن اب اپنی طرف میرے آنے سے وہ بڑی بے تاب ہوئی اور غاٹھ میں لگ گئی۔ مجھے اناس کا رس پایا، مگر کوری بنا کے لائی۔ وہاں اس کی چھوٹی بہن سلمیٰ کے علاوہ حیدر آباد سے آئی ہوئی سلمیٰ بھی تھی۔ سلمیٰ سے اب تک میری رسمی بات چیت ہی رہی تھی۔ فیض آباد کے اسٹیشن پر جب ہم نے اسے دورا اور جھو کے ساتھ ذریں کی حویلی کے لیے دواغ کیا تھا اور ہم آگے سفر کے لیے نکل گئے تھے تب سے اب تک میں نے گزر گئے تھے اس دوران میں ذریں، خانم، زہرہ نیناس اور جہاں گیر نے اسے میرے اور بھیل کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہوگا۔ زہرہ کسی بھی کوئی اپنا نہیں جاتا تھا جب ہمارا ذکر نہ ہوتا ہو۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے سلمیٰ کے ہاں بہت جوش اور شوق تھا۔ شناسائی کے بغیر یہ پذیرائی نہیں ہوتی۔ میری نظروں میں بار بار وہ سلمیٰ جھلکتی تھی ہم نے پہلی بار ریل گاڑی میں دیکھا تھا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی اور بدیا من ارشد علی اسے ڈبے میں تھا چھوڑ کے فرار ہو گیا تھا اور پولیس آگئی تھی۔ پولیس کی توجہ سلمیٰ کی طرف سے ہانے کے لیے ہم نے سارا زور صرف کر دیا تھا پھر جب سلمیٰ نے زیورات اور جواہر سے بھری ہوئی بوتلی بھیل کے آگے رکھی تو ہم سب ہی حیران رہ گئے۔ بھیل کے استفسار پر وہ پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔ وہ سہمی ہوئی دبی ہوئی سلمیٰ اب

بالکل بدلی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ رخساروں پر لالی بیوٹ رہی تھی۔ حسین تو وہ پہلے ہی کچھ کم نہیں تھی۔ اب تو بات ہی بچھ اور تھی۔ آدمی بھی سارے نہیں تو اکثر چھوٹوں اور پودوں کے مانند ہوتے ہیں، موافق موسموں کے پابند۔ سہلی نے ایک عرصہ حیدر آباد کے ایک بڑے نواب کے ہاں گزارا تھا۔ محلات کی بود و باش سے وہ خوب واقف تھی۔ ایسی لالہ رخسار لڑکی کو وہاں کی بیگمات نے زنان خانے ہی تک محدود رکھا ہو گا کیونکہ وہ انہی جیسی ہوگی۔ شہزادیاں کیا سونے کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ سہلی نے بتایا کہ وہ بڑی بیگم کی منظور نظر تھی۔ ایک عام خادمہ کی حیثیت سے محل میں داخل ہونے والی سہلی نے بہت جلد اپنی فرض شناسی، فہانت اور سادہ شعاری سے بھی کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ وہ تو ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ ایک بڑے گھر سے اس کا تعلق ہے لیکن سوچنے کی قسمت کیا کئے۔ سہلی کی آوازیں ٹھنکی اور شائستگی تھی، ٹھک اور لپک۔ وہ ہر لمحے مستعدی نظر آتی تھی، کسی اشارے کی منتظر کوئی خدمت نبھانے کے لیے کمر بستہ۔

میں وہاں بیٹھا رہا۔ عرصے بعد اس طرح فراغت سے ان لوگوں کے درمیان بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ ان کی نظروں میں میرے لیے لطف ہی لطف تھا۔ وہ سب ہی میری قربت کے خوگر تھے اور میرے لیے دعا کرتے تھے اور میرا انتظار کرتے تھے۔ ہمیں میں فرخ، فریال، فادہ، غیتا، اس کی ماں جو لین، اس کی ماں شہ پارہ اور چچا بیگم کا بھی یہی حال تھا اور ہاں! اس کا تو معاملہ ہی دگر ہے اسے کون بھول سکتا ہے۔ وہ کسی اور دنیا کی لڑکی ہے۔ میں خود کہنے والا تھا کہ زہرہ نے مجھے میرے منہ کی بات چھین لی۔ ناز برداریاں انداز میں کہنے لگی "بابر بھائی! آپ ہمیں ہمیں کب لے جائیے گا؟" میں نے اس سے وعدہ کیا کہ بس جلد ہی۔ اب شاید زیادہ دیر نہ لگے۔ واقعی انہیں وہاں جانا چاہیے تھا یا فادہ، فرخ، فریال، اور جو لین وغیرہ کو یہاں اتنا چاہیے تھا۔ دونوں ایک ہی گھر تھے اور گھر کے بیش تر افراد نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً منہ علی نے ہمیں سے آکے ابا جان کی خریدی ہوئی کو بھی کی کشادگی اور خوش غنائی کی جزئیات اور ہمیں شری روتق، سمندر، میر گاہوں، بلند دہلا عمارتوں اور روشنیوں کا حال احوال سنا کے انہیں اور بے تاب کیا ہوگا۔ پھر کانٹے، مارلی اور پیرو داوا کا ذکر آگیا۔ زہرہ نے ان تینوں کو دیکھا تھا۔ ان کے ذکر وہ خود بھی آزدہ ہوئی تھی مجھے بدل کی گریہ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ درمیان میں جہاں میرا دور تویر

بھی آگئے تھے۔ زیریں اور خانم اس طرف نہیں آئیں۔ ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ دونوں باورچی خانے میں مصروف ہیں۔ بیٹل کے لیے دوپہر کا کھانا بھیجنا ہے۔ اڑے کھانا بھیجتے سے مراد تھی کہ انہیں ایک چھوٹی موٹی برات کے لیے کھانا تیار کرنا ہے۔

○●○

رات کو بیٹل ڈیڑھ بجے کے قریب واپس آیا۔ دونوں باتیں پریشان کن تھیں۔ ایک تو اتنی دیر سے اس کی آمد دوسرے اس کے ساتھ جامو نہیں تھا۔ میں بیٹھک میں بیٹم دراز ان کا منتظر تھا۔ کچھ دیر اور ہو جاتی تو مجھے کسی اور کا اڑے بھیجا پڑتا یا خود جانا پڑتا۔ میرے پوچھنے پر بیٹل نے کہا ہوا کہ جامو شہر سے باہر گیا ہوا ہے، اپنے گھرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں چوکی سے اٹھ کے لپکتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔ "کب تک کے لیے؟" "پول نہیں سکتے، کب لوں گا، لوں گا، کبھی کے نہیں۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے کبیدگی سے کہا۔ "اس کو کام ہے۔"

"کیسا کام؟" "اس نے با تو سنا نہیں یا ان سنی کرتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا لیکن میں نے خود کو روک لیا۔ مجھے اتنی سیجھتا چاہیے تھا جتنا وہ بتانا چاہتا تھا یا جتنا میری فہم کے مطابق تھا یا میری صحت کے لیے بہتر۔

حسب معمول وہ صبح سویرے اڑے چلا گیا اور رات کو پھر تہا آیا۔ وہ میرے سامنے آیا تھا۔ نہ میں نے کوئی سلسلہ جنبانی کی نہ اس نے مجھ سے کلام کرنے کی ضرورت تھی۔ اس وقت وہ جلد واپس آگیا تھا۔ بیٹھک میں حقہ کاری کر رہا۔ گھر کے تقریباً سب ہی لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اس لیے کہ وہ گزشتہ کئی روز سے پورے پورے دن کے لیے اڑے چلا جاتا تھا۔ صبح ناشتے پر کچھ ہی دیر کے لیے اس سے ملاقات ہو پاتی تھی۔ نصیر بابا کو ارشد علی اپنے ساتھ ڈینوں لے گیا تھا۔ نصیر بابا اطراف کے سبزہ زاروں کی خوب صورتی اور شکار کی کثرت کا ذکر کر کے بیٹھک کو آکھاتے رہے۔ رات گئے تک محفل جی رہی۔ خنکی بڑھ گئی تھی لیکن سردی لگنا نہیں تھی۔ ہر محفل بہ قول نصیب میاں "چند نم خرم" کے بغیر ادھوری رہتی ہے۔ خانم اور بڑی سہلی فحشوں میں توجہ بھر کے سب کو پلائی ہیں اور خشک میوے کی ششزبان ادھر

بازی کر رہا

مردش کرتی رہیں۔ بیٹل کے حقے کی خوشبو بیٹھک میں اٹھتی تھی۔ رات کا آخری پیر تھا۔ خاص دروازے پر بڑا کڑا کھٹ اٹے اور گھٹنا بیٹنے کی آواز پر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بیٹل کے ایک گوشے میں دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی ذخیرہ خانہ اندر عمارت میں پھٹت سے ٹکا ہوا مندروں کی طرح کھڑا گھٹنا بیٹنے لگا تھا۔ بہت ضروری موقعوں پر بیٹنے کی طرح لٹکی کی اجازت تھی اور شاید پہلی بار یا بہت عرصے بعد بت آئی تھی۔ میں ادھر سے باہر نکلا، ادھر سے بیٹل۔ ہم سب ہی جاگ گئے تھے سب ہی کا رخ دروازے کی طرف تھا ملازمہ شکون نے پہلے دروازے کے وسط میں چند انچی قطر کے سوراخ کی لکڑی کو کھسکا کے پوچھا "ناہ؟"

جواب میں ماما کی گھرائی ہوئی آواز گونجی "اے رب! بابا سے بولو! استاد سلامی آئے ہیں، ضروری کام"

اعتقاد میں نے کرتے کی جب میں تمبھار اور چاقو رکھ لیا اور میرا ہاتھ جیب ہی پر تھا۔ بیٹل نے حیران و پریشان رہے خوبی کے کیلنوں کو اپنے اپنے کمروں میں واپس جانے مارا کیا۔ وہ جانا نہیں چاہتے تھے لیکن بیٹل کو دوبارہ ہاتھ نے کی ضرورت نہیں پڑی، وہ دور ہو گئے۔ شکون نے اڑے کھل دیا۔ ماما کے ساتھ تین آدمی حواس باختہ انداز اندر آئے ان میں اڑے کا گھراں استاد سلامی، بیٹل کو کے چھینا ہوا اس کی طرف بڑھا اور ادھر ادھر نگاہیں مارتے ہوئے اس نے کچھ کھٹا چاٹا، بیٹل نے اسے روک "اندرا چل۔"

تینوں کے چروں پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ بیٹھک کی باڑ بیٹھے سے پہلے استاد سلامی نے سنسنائی آواز میں کہا "تاغ غیب ہو گیا۔"

بیٹل نے آنکھیں میچ لیں۔ سلامی کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے تڑپتی سے بتایا کہ ابھی گھٹنے ڈیڑھ گھنٹے پہلے ہیرا اور ماسکے چھوٹے بھائی کچھو کو حتم کر دیا گیا ہے۔ اڑے سے وکے ہیرا کچھو کے ساتھ لکشی داس کے محل میں معمول ہوا ہے پھر تھا کہ انہیں چاقو تار کے ہلاک کر دیا گیا۔ ایسا ظلم ہوتا ہے، اندھیرے میں تاک لگائے ہوئے آدمیوں نے ہلاک ان پر حملہ کیا۔ دونوں کو بیٹھک کی مہلت ہی نہیں ملے پھر وہ دار کے گھسے حملہ کرنے والوں کی تعداد بھی

انکر گرا

زیادہ ہی ہوگی کہ ایسا شور مچل نہ ہو سکا۔ دونوں کی لاشیں قریب کی اندھیری گلی میں پھینک دی گئیں۔ ادھر انہوں نے ہیرا اور کچھو کو حتم کیا، ادھر ان کے دوسرے ساتھی لکشی داس کے گھر میں داخل ہو کے اس کی لڑکی پر کھاکو اٹھا کے لے گئے۔ چند دن ہوئے، لکشی داس نے گھر کے ایک حصے میں ایک ادھڑ میاں بیوی کو ملازم رکھ لیا تھا۔ مرد اچھا جان دار اور جی دار شخص تھا۔ عورت کے بیان کے مطابق اس کے شوہر نے لکشی بیٹھک میں بیٹھ لیا اور ایک دو گونجی کر دیا تھا لیکن وہ تعداد میں کئی تھے۔ انہوں نے اس کے شوہر کے پیٹ میں چاقو گھونسا دیا۔ عورت کی آہ دیکھا، لکشی داس کی چیخ دیکھا، پر کوئی بڑی مدد کو نہیں آیا۔ دبلے پٹے لکشی داس نے بساط بھر مزاحمت کی کوشش کی مگر انہوں نے اس کے سر پہ کسی بھاری چیز سے ضرب لگائی یا اس کا سر دیوار سے ٹکرایا،

وہ بے ہوش ہو گیا، عورت بھی یہ منظر دیکھ کے اپنے حواس کھو چکی تھی۔ لکشی داس نے ہیرا کے مشورے پر ایک گور کھا دریاں بھی تعینات کیا تھا۔ سب سے پہلے دہائی شانہ بنا۔ لکشی داس کو زخمی حالت میں بڑے اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ اس کے بیٹے کی امید کم ہے۔ پولیس ہیرا اور چھو کی لاشیں تھانے لے گئی ہے۔

بیٹل خاموش رہا اور استاد سلامی کے چپ ہو جانے پر اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"ایسا یہاں کبھی نہیں ہوا۔" سلامی کی آواز تہمتا بھی رہی تھی، ماتم و کٹناں بھی تھی "ایسا کبھی نہیں ہوا استاد! ہیرا اپنے اڑے کا ہیرا تھا۔"

بیٹل بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

"ادھر اڑے پر وہ سارے بہت پاگل ہو رہے ہیں۔ مشکل سے ان کو روک کے آیا ہوں۔ ان کے سر پہ خون سوار ہے۔ بولتے ہیں، ہیرا، کچھو کی ادھی پر ان حرامیوں کے خون سے رنگی چادر چڑھا میں کے تپ ہی ان کو جبین آئے گا۔"

"تو کیا بولتا ہے۔" بیٹل نے تڑپ سے پوچھا۔ "میں، میں کیا بولوں۔" استاد سلامی اضطرابی انداز میں بولا "میری پوچھتے ہو تو اپنا خون بہت کھول رہا ہے استاد! قسم سے تم کو کیا بولوں۔ اپنا دماغ گھوم رہا ہے۔ اپنے کو معلوم ہے، کس طرف جانا ہے۔ بس تم اجازت دو۔" "مجھ کو اب اڑے پر نہیں بیٹھنا چاہیے۔" بیٹل نے ناگواری سے کہا۔ "کیوں؟ کیا کیا بولتے ہو استاد؟" سلامی بوکھلا گیا۔

کتابیات پہلی کیشتر

بھٹل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے سناٹا طاری رہا پھر بھٹل چوکی سے اٹھ گیا اور سلامی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اس نے پچھلی دی اور سوچی ہوئی آواز میں بولا "تھوڑا دلب کے رکھ کا۔"

سلامی پچھی پچھی آنکھوں سے اسے دیکھا کیا۔
"چل دیکھتے ہیں ادھری چل کے۔" بھٹل نے اتہمتی سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

سلامی کی حالت دیگرگوں تھی۔ اس نے اپنا سر میرے شانے سے ٹکایا اور ہڑکنے لگا "نہیں نہیں سلامی بھائی! اسے نہیں 'حوصلہ رکھو' ذرا صبر سے کام لو۔" مجھ سے اس کی تسلی بخشی نہیں کی جاسکی۔ خود میرا حال اس سے مختلف نہیں تھا۔ "خیر ہے" ابھی رات کو اڑے سے نکلے ہوئے ہریا کیا کہ رہا تھا۔ "سلامی زار زار آواز میں بولا "مگر رہا تھا" استاد کئی دن ہو گئے۔ اپنے لاڈلے راجا کے درشن کیے ہوئے کیا خیال ہے، کل سویرے ان کی طرف چلتے ہیں۔ تمہارا تو وہ دیوانہ تھا بھیا! کہتا تھا "ان سے بچی کروں گا" اپنے کو بھی دو چار جادو کے ہاتھ سکھا دو۔ اس دن کے بعد سے اٹھتے بیٹھتے وہ تمہارا ہی نام جیتا تھا۔" استاد سلامی کی آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے۔ "ہائے مر گیا حرا۔"

"میری آنکھیں بھی جل رہی تھیں اور دل بیٹھا جا رہا تھا۔" ایک مجھے جامو کا خیال آیا "میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا "اور یہ جامو بھائی کہاں ہیں؟"

سلامی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا "اتنا ہی کچھ جو بھٹل نے مجھے بتایا تھا، کہنے لگا کہ جامو صرف ایک دن کے لیے آیا تھا اور پورا دن بھی کہاں گھسرا۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر چلا گیا اور کچھ معلوم نہیں کہاں گیا ہے، کب واپس آئے گا۔ اس سے پہلے کہ میں سلامی سے کچھ اور پوچھتا، بھٹل تیار ہو کے آگیا "میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تو ابھی ادھری رہ، ضرورت پڑی تو بلا لیں گے۔" بھٹل کی آواز بڑی ہوئی تھی۔

"میں جلد واپس آجاؤں گا میں چلنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں رے" ابھی نہیں۔"

"ابھی کیوں نہیں؟" میں نے درشتی سے کہا۔

"ابھی تجھ کو ادھری رہنا ہے۔"

"میاں میں کیا کروں گا؟"

"ادھری بھی کیا تیرا مارے گا۔"

"مجھے ہریا اور پھمو کے کپڑا کر میں شریک نہیں ہونا؟"

"تیرے بتا بھی چٹک جائیں گے سور کے جنے۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں، میں میاں اکیلا الجھتا رہوں گا۔"

"پھر میں ادھری گھر جاتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"مطلب ایک ہی ہے رے، ایک آدمی کو ادھری رہنا ہے۔"

"ہاں لاڈلے بھائی! استاد ٹھیک بولتے ہیں۔ سمجھا کر۔"

سلامی نے مجھے نرمی سے مشورہ دیا "ادھر پولیس کا چکر مٹا گا۔ ابھی تو لوگوں کو معلوم نہیں، سویرے شہر کا کیا نقشہ ہوگا کیا کہا جاسکتا ہے، تم الگ ہی رہو بھیا!"

بھٹل نے کوئی تاخیر نہیں کی۔ وہ تینوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ڈیڑھ میٹر داخل ہو کے اندر سے مل گیا ہو گئے۔ سلامی تانگے میں آیا تھا۔ دیر تک تانگے کی آواز گونجتی رہی پھر معدوم ہو گئی۔

میں نے کمرے میں جا کے کھڑی دیکھی۔ سواتین رہے تھے کمرے میں مجھے وحشت ہوئی تو میں نے محن کا کر کیا۔ میرا سر بہن بھنا رہا تھا۔ محن میں کچھ فاصلے پر محراب کے درمیان مجھے سائے سے نظر آئے۔ وہ خانم، زریں اور زہرہ تھیں۔ مجھے دیکھ کے وہ روشنی میں آئیں۔ "خیریت؟ یہ میاں؟"

خانم نے عکسی ہوئی آوازیں پوچھا۔

"کچھ نہیں کوئی ایسی بات نہیں یہ تو ہوتا رہتا ہے ہوتا رہے گا۔" میرے لہجے کی تیش سے وہ اور ہراساں ہو گئیں میں نے وہی آوازیں کہا "آپ آرام کریں آئی! آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"ہو سکے تو کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔" خانم نے ہچکچاتے ہو۔

پوچھا۔

"کیا بتاؤں۔" میں نے جھنجھلا کے کہا "مجھے خود اتنا نہیں معلوم۔"

خانم نے مزید باز پرس نہیں کی۔ اسے چوں اور بھو کی اچھی پہچان تھی۔ وہ تینوں وہاں سے ہٹ گئیں۔ میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ کے بستر پر دراز ہو گیا۔ مجھے کسی چین نہیں تھا۔ ہریا کا چہرہ بار بار نظروں کے سامنے آتا زندگی کیسی بے وقار ہوتی ہے۔ زندگی اور موت میں ایک گمان کا فاصلہ ہے۔ آدمی ہر وقت موت کے قریب ہے۔ موت کے پہلو میں۔ میں کانٹا ہی رہا۔

شام تک اڑے سے کوئی نہیں آیا۔ اندھرا کر رہا ہوا باہر کا بھی اور میرے اندر کا بھی۔ میں نے ڈیڑھ میٹر بازی کر

ماتے بات کی۔ اس کا ہتھیار مجھے ٹکرا گیا۔ اس نے بتایا کہ دن بھر شہر میں ہو کا عالم رہا ہے۔ صبح سے لوگ گلی کوچوں میں ڈالیاں بنائے کھڑے تھے کہ پولیس نے دفعہ ایک سوچا لکیر نافذ کر دی۔ سارے شہر میں سپاہی گشت کرتے رہے۔ اڑے کے لوگ ہریا اور پھمو کی لاشیں صبح اسپتال سے اڑے لائے تھے۔ اڑے پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ چار بیڑے کے قریب دونوں کی اڑتیاں اٹھالی گئیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پاپہوں کی ایک بڑی نفری موت کے جلوس کے ساتھ چلتی رہی۔ لکشی داس کے لازم اور گورنگے چوکی دار کی اڑتیار لگ اٹھائی گئیں۔ شمشان گھاٹ پر ایک اڑتیار تھا۔ ادھر اڑے پر لوگ بین کرتے رہے۔ بھٹل اس رات نہیں آیا۔ اڑے کے ایک آدمی کو اس نے نیا جوڑا منگوانے کے لیے بھیجا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ استاد جامو ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ وہ فیض آباد کے آس پاس ہوتا تو ہریا اور پھمو کی آخری رسوم کے لیے اس کا انتظار ضرور کیا جاتا۔ بھٹل نے جامو کو کیوں طلب کیا اور وہ اتنی جلدی واپس کیوں چلا آیا؟ بھٹل نے صاف طور سے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ جامو کلتے واپس چلا گیا ہے۔ وہ کلتے واپس جاتا تو مجھ سے اور زریں سے ملے بغیر کیسے چلا جاتا؟ جامو کی اچانک آمد کا طلب سمجھ میں آتا تھا لیکن اس کے اس طرح غائب دجانے کے عقد سے اے ل ہی واقف ہوگا۔ یہ کوئی قیاط ہی ہو سکتی ہے کہ اڑے کے گھراس، جامو کا دست است اور چائین استاد سلامی بھی اپنے مرلی کے حال خوال سے بے خبر تھا۔ میں نے اپنے طور پر اندھیرے میں تھ پاؤں مارنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی سرا ہاتھ نہیں لیا۔

بھٹل دوسرے دن بھی اڑے پر رہا۔ دوسرے دن میں نے اڑے جانے کی ٹھان لی تھی اور حویلی سے نکل بھی گیا تھا کہ کچھ دور جا کے واپس آگیا۔ مجھے خود اعتماد نہیں رہا تھا۔ آدمی کاسب سے بڑا انتشار خود اس کی بے اعتباری ہے۔ یہ قہار بھٹل کو بھی مجھ پر نہیں تھا اسی لیے اس نے مجھے حویلی کی تنقید کر دیا تھا۔ دوسرے دن رات کو بھی بھٹل گھر نہیں آیا۔ ہریا اور پھمو کے کپڑا کر کے بعد تیرا دن تھا، ماما کے بیٹے نے مجھے بتایا، صبح سویرے تحریروں کو لکشی داس کی بیٹی دکھا کی مہرہ لاش گھر کے قریب سڑک پر پڑی نظر آئی۔ ایک کرام بچ گیا۔ برکھا کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ جن دلوں نے یہ منظر دیکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ جس پر جا پہنچے گھر کرنے کے نشانات تھے۔ برکھا کا باپ لکشی داس

ہسپتال میں ہے اور معلوم نہیں اسے اس سانحے کی اطلاع دی گئی ہے یا نہیں۔ لوگ کہتے ہیں وہ خود موت اور زندگی کی کشمکش میں ہے ہوش میں آتا ہے تو جیتنے چلائے لگتا ہے کچھ لوگوں کا یہ بھی کہتا ہے کہ وہ پاگل ہو چکا ہے۔ میں نے برکھا کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کا ماجرا سن کے ایک ششاسنی سی ہو گئی تھی۔ براہی نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ بے حد حسین اور ذہین لڑکی ہے۔ اس کے باپ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ گریجویشن تو اس نے کر لی تھا۔ اپنی بیٹی کے شوق علم کی خاطر باپ نے اس کی شادی مؤخر کر دی تھی۔ وہ اس کی اگلی لڑکی تھی۔ لکشی داس کہتا تھا کہ برکھا میری بیٹی ہی نہیں میرا بیٹا بھی ہے۔ کہتا تھا وہی میری زندگی ہے۔ اب لکشی داس کو بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ معلوم نہیں جو لوگ برکھا کو لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے وہ انہی کے قبضے میں بھی پھر انہوں نے اسے مار کیوں دیا۔

مما کے جیتنے سے یہ رودادنا کے میرے جسم میں الگ لگاؤ ہے۔ اس رات استاد سلامی جب ہرا اور پھوکی موت کی خبر سن کے حویلی آیا تھا تو اس نے بٹھل سے اجازت مانگی تھی اور کہا تھا اسے معلوم ہے کس سمت جانا ہے مجھے بھی سمت کا اندازہ تھا۔ شہر کے سمت سے لوگوں کو علم ہو گا۔ پولیس بھی جانتی ہوگی کہ کون اتنا شفاک اتنا بدروند ہو سکتا ہے۔ برکھا کے ختم ہو جانے اور اس کے باپ کے پاگل ہو جانے کے بعد یہ قصہ تمام ہو گیا ہے مگر کیا یہ قصہ عیس ختم ہو جانا چاہیے؟ میرا بی کرنا تھا اسی وقت گھر سے نکل پڑوں۔ جن جن کے ایک ایک کو ختم کر دیا جائے ایسے آدمیوں کی کمی سزا ہونی چاہیے۔ اس شہر میں بے شک مجھے کچھ لوگ جانتے ہیں لیکن اطراف میں کوئی واقف نہیں ہے۔ استاد سلامی کی طرح بٹھل سے میں کوں گا تو وہ الگ بگولا ہو جائے گا۔ مجھے خود ہی نکل جانا چاہیے۔ پوچھتا پوچھتا اپنی منزل پر پہنچ ہی جاؤں گا۔

تیسرے دن رات کو ہرا اور پھو کے تیرے کی رسم ادا کر کے بٹھل گھر واپس آیا۔ وہ بس اپنی صورت دکھانے اور ہماری صورتیں دیکھنے حویلی آیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد چلا گیا۔ رات اور صبح ناشتے کے دوران میں اس سے بات کرنے کا موقع ملا تھا مگر میں نے خاموشی اختیار کی۔ دن بھر حویلی میں میرا کام جہاں گیر خانم، تنویر اور نیسا کے ساتھ شطرنج اور کیرم کی بازیابانہ جمانے، بیہوشی کی مشق کرنے، انواع و اقسام کے ذائقے آزمائے، حویلی میں ادھر ادھر مڑ گشت

کرنے اور اپنے کمرے میں یا اپنے حجرے میں بند ہو کر گزراں وقت سے آنکھیں چرانے اور وقت دھیلے رہنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وقت بھی کیا آئینے کے مانہ ہوتا ہے آدمی کبھی اس سے ہمت آنکھیں چراتا ہے اور درگزر کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وقت آئینہ بھی تو نہیں ہے توڑ دیا جائے جس سے من چھپایا جائے وہ سامنے کھڑا رہتا ہے اور ٹھیک گدھا رہتا ہے۔

ہرا اور پھو کے تیرے کے بعد دودن اسی طرح گزر گئے۔ بٹھل کا وظیفہ بھی وہی تھا۔ صبح جا کے رات کو بھی جلدی کبھی دیر سے واپس آتا۔ اڑنے پر اس قوت سے اس کی آمدورفت کسی سبب کے بغیر نہیں ہوگی۔ اسے نصیب ہی ملا چاہیے ہمارے نصیب میں سکون نہیں لکھا تھا شاید یہی بہتر ہو تاکہ ہم آسن سول سے آگے بڑھ جاتے۔ فروزاں اور یاسمن کا سامان ہمت مینتی تھا لیکن آسن سول سے نکلنے دوری کتنا تر گیا تھا۔ درمیان میں دو تین جگہ رکتے ہوئے بھی نہیں چند دن بعد نکلنے پہنچ جاتا تھا۔ نکلنے میں یاسمن اور فروزاں کا اثاثہ کسی معتبر شخص کے حوالے کیا جاسکتا تھا۔ وہاں جانو تھا۔ جمرو اور زور تھے۔ مگر یہاں آنے کے لیے میرا اصرار اتنا بے جواز بھی نہیں تھا۔ یہاں آئے ہوئے ہمیں ایک وقت گزرنیکا تھا۔ ذریں جہاں گیر نیساں وغیرہ کے خیال سے زیادہ حویلی میں نوادہ فیروزاں اور یاسمن کی دل داری مقصود تھی۔ صرف ایک روز بعد یہاں ہماری آمد اسے انہیں یقیناً بڑی طمانیت اور تقویت ملی ہوگی۔ انہیں اس گداز کی ہمت ضرورت تھی۔ اس لیے بٹھل بطور خاص ان سب سے زیادہ ان کی پرستش کرتا تھا۔ میں بھی صبح وشام انہیں پوچھتا رہتا۔ یاسمن تو اب مجھ سے خاصی مانوس ہو گئی تھی اور تقریباً بھی سے مکمل مل گئی تھی۔ آسن سول سے آگے بڑھ جانے کے بعد ہمارا کیا ٹھیک تھا؟ کہاں کون راستہ روکے کھڑا ہو پھر نہ جانے کب اس طرف آنے کا موقع ملے۔ یہاں آنے کے بعد مجھے ہمہ دم یہاں کے مقصد کا خیال رہا۔ حویلی کے کینوں کے روز و شب اور معاملات و مشاغل میں ہمہ جاں شامل رہنے کے تاثر میں شاید میں نے کوئی گناہی نہیں کی۔ شاید کسی کو احساس نہ ہوا ہو کہ میری یہاں موجودگی برائے وضع و محوت ہے ورنہ میں تو کوئی اور آدمی ہوں۔ میں صرف اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے پھرنا ہوں۔ ان کی جانب میری نگران نگاہیں میری شائستگی اور اداے فرض پر محمول کرنی چاہئیں۔ یہی نگاہیں تو جانے کہاں کہاں پھٹکتی ہیں۔ کسی ایک جانب مرتجہ نگاہوں سے یہ مراد نہیں کہ آدمی اسی جانب مصروف رہے

بہ کسی جگہ میری موجودگی سے مراد میری موجودگی نہیں، میں ہوں اور نہیں بھی۔ غالب نے کہا تھا، پرہیز کیں کہ ہے نہیں ہے۔ اپنی اس جگہ کی خفت مٹانے کے لیے میں زیادہ سے زیادہ ان کے درمیان رہتا تھا۔ کبھی کبھی شبہ ہوتا کہ انہوں نے میری چوری پکڑ لی ہے، میرے اندر کا احوال باہر لیا ہے، مگر حرف شکایت زبان پر لانے میں پاس وضع، پاس دواہ لازم ہے ان کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔ انہیں میری خود سری، میرے اصرار کی توانائی اور اپنی اختیار کی باتوانی کا خوب اندازہ تھا۔ سو یہی قریبہ موزوں تھا کہ وہ مجھ پر اپنی نوازشوں کی اذیتاں کریں۔ مجھ بچہ جانا، میرے اشاروں کی جستجو میں رہنا انہوں نے شمار نہ کیا تھا۔ کچھ اسی طرح مجھے زنج کیا جاسکتا تھا یا شرمندہ کیا جاسکتا تھا۔

اس روز میں لاہوری کی طرف نکل گیا۔ یہ ایک رسکون جگہ تھی۔ یہاں نئی اور پرانی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ شروع شروع میں میرا دل کھرا لیا۔ اوروں کا نہیں معلوم اتنی کتابوں کے درمیان مجھے تو بے ہوشی ہو کر تڑپ لگے۔ یہی کا احساس ہوا ہے۔ میں نے وہاں بیٹھے رہنے کی ضد کی۔ ضد بیز ہے اور جبر سے اپنے نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں میں نے افسانوی ادب کی کتابیں تلاش کیں۔ آدمی کا دل سب سے زیادہ کتابوں میں لگتا ہے۔ کتابیں اور پتھروں اور پتھروں کی طرح ہوتی ہیں، نظروں میں جھانک کے دیکھو تو عجب عجب ناظر سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیا میں ہمارا بوڑھا روڈ فیسر نہ تھا؟ نقد کتابوں میں جی نہ لگے تو افسانوی کتابیں پڑھاؤ۔ یہ وقت کا بہترین مصرف ہے۔ افسانوی کتابیں گداز پیدا کرتی ہیں اور خیال و خواب بیدار کرتی ہیں۔ کتاب کی ایک طرح کی یاسنت ہے۔ سیاحت میں جس طرح نئے نئے تجربے ہوتے ہیں، کتابیں بھی زندگی کے نئے نئے رنگ دکھاتی ہیں اور وہ لکھا تھا، کتاب کی ہر کتاب نہیں پڑھنی چاہیے، زندگی اتنی بڑی نہیں ہوتی کہ فضول کتابوں میں وقت گنوا یا جائے۔ نئے بغیر ہر طرح کی کتاب پڑھنے سے دماغ منتظر ہوتا ہے، منتخب کتابوں کا کوئی زنج نہ پڑنا چاہیے۔ کتاب کی قدر وقت اس کی ضمانت ہے نہیں، متن سے ہوتی ہے۔ متن خیال انگیز، فکر افروز ہو بھی کتاب ختم کرنی چاہیے ورنہ ادھوری چھوڑ دینی چاہیے اور باں پڑ فیسر نہ تھا، پرانی کتابوں سے زیادہ نئی کتابوں پر توجہ کرنی چاہیے۔ پرانی کتابوں کی فکر بھی بوسیدہ ہو جاتی ہے زمانے کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے اشارے، نقل و نثر، لہجہ بدل جاتے ہیں۔ آدمی کو ہمیشہ اپنے عہد میں رہنا چاہیے اور آنے والے وقت کے لیے مستعد پرجوش

پیش قدم اب اتنا وقت گزرنے کے بعد اس کی باتیں مجھے بہت یاد آتی تھیں اور زیادہ سمجھ میں آتی تھیں۔ وہ کچھ انتہا پسند بھی تھا۔ کبھی بہت عجیب باتیں کیا کرتا تھا۔

میں نے کئی چھوٹی بڑی کتابیں ختم کرالیں۔ یہ اچھا مشغلہ ثابت ہوا۔ مجھے کچھ اپنی بساط کا بھی اندازہ ہوا کہ مجھے کچھ آتا ہی نہیں، میں تو ہمت پس ماندہ ہوں۔ اچھی کتاب پڑھ کے کیسی سرشاری ہوتی ہے۔ اچھی تحریر کوئی نشہ ہے۔ ہرا اور پھو کی موت کا پانچواں دن تھا۔ رات کو بٹھل اڑے سے جلدی واپس آگیا۔ رات کا کھانا بھی اس نے سب کے ساتھ کھایا۔ میں نے اڑے کے بارے میں اس سے کوئی بات کرنا ہی بند کر دیا تھا۔ بٹھل اس وقت ہلکا بھلا سا لگ رہا تھا۔ کھانے کے بعد بٹھک میں محفل گرم کی۔ حدت سا لگا دیا گیا۔ نیساں کچھ طے کر کے آئی تھی۔ بٹھل کی خوش گواری دیکھ کے اس نے چپکے سے کہا "بابا! ایک بات کون؟"

"بول ری۔" بٹھل فحاشی سے بولا۔ نیساں نے بھی دلی زبان سے یہی نال دیکھنے کی فرمائش کی تھی کہ بٹھل نے کسی تردید کے بغیر زری سے معذوری ظاہر کر دی اور اسٹکی سے بولا "ہم نہیں جاسکتے پڑ دیکھتے ہیں تیرا کوئی انتظام کرتے ہیں۔"

"نہیں بابا! نیساں نازیداری سے بولی "ہمیں تو آپ کے اور باہر بھائی کے ساتھ جانا ہے۔"

"پھر اچھی نہیں ری۔ اپنے کو اب واپس جانا ہے۔ ادھری لوٹ کے جہر ہو لے گی، ٹھیکیں گے۔ لگام تیرے ہاتھ میں دے دیں گے۔"

"واہ! اب آپ کو جانے کی جلدی ہے۔" نیساں شکایتی لہجے میں بولی "انہی آئے ہی کتنے دن ہوئے ہیں۔"

"ہاں ری! اب جانے کا نام ہو گیا ہے۔"

"تو کم وقت کے لیے آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تیرے درشن کو۔" بٹھل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے چوم لیا۔

"نہیں بابا! نیساں حکم سے لہجے میں بولی "ابھی آپ نصیرے چلے نئی تال مت چاہیے۔"

"اب کے جلدی لومیں گے ری پھر تو ادھری رہنا ہے۔"

کیوں نہیں ہلتیں۔" نیساں نے زری کو میسر کرنے کی کوشش کی۔

زریں نے مضطرب آنکھوں سے پہلے... دل کی پھر میری طرف دیکھا اور یاسیت بھری آواز میں بولی "بابا کو کام ہے ورنہ نہ جاتے۔"

"دیکھاری بیٹھا جانتی ہے اور سمجھتی ہے۔"

دل نے روانگی کے لیے تین چار دن بتائے تھے گویا

اب وہ فیض آباد کے اڈے کے کاموں سے نمٹ چکا تھا۔

فیض آباد کے علاقے یعنی بھٹل کے علاقے میں ایک نوجوان

لڑکی اغوا کر لی گئی اور ختم کر دی گئی۔ ایک شخص پاگل ہو گیا

اور جاں کنی کے عالم میں ہے۔ اس کے دو بے نگاہ ملازم مار

دیے گئے۔ اڈے کے دو آدمی ہریا اور پھونٹانہ بنادے گئے

اور چپے کیڑ نہیں ہوا، چپے ان سب کو تو مرنے ہی تھا۔ کوئی

واقعہ نہیں ہوا تھا۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ بھٹل کو

اب واپس جانا چاہیے چنانچہ وہ واپس جا رہا ہے استاد جامو

بھی اتنے بڑے سانسے کے بعد فیض آباد نہیں لوٹا۔ کلکتے میں

ہرمو کو بھی خبر ہو گئی ہوگی۔ وہ بھی نہیں پلٹا۔ شاید انہوں نے

خاموشی بہتر سمجھی ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے۔ چھوٹا حاکم بڑے

حاکم سے مغلوب ہو جاتا ہے یا پھر وہ کسی مناسب موقع کے

منتظر ہیں اور اس درمیان میں کوئی اور حادثہ پیش آسکتا ہے۔

بڑا حاکم اپنے اس غلبے پر کیوں قانع کرے گا۔ اسے اپنے کم

تر کو سانس لینے کی مہلت بھی نہیں دینی چاہیے۔ حاکمت کو

اپنے اثر و تسلط کے مسلسل انکار کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہریا

اور پھو کے بعد کوئی اور۔ وہ مجھ سے بھی واقف ہو گئے

ہیں۔ اڈے کی چوکی پہ بھٹل کے مستقل قیام پر بھی وہ نظر

رکھے ہوئے ہوں گے اور اڈے سے حویلی کی خاص وابستگی

بھی ان کے علم میں ہوگی۔ میرے دماغ میں بہت سے سوال

سراٹھا رہے تھے لیکن نہ یہ موقع تھا نہ بھٹل سے توقع تھی کہ

وہ جواب دہی کی زحمت کرے گا۔

رات بہت ہو گئی تو بھٹل نے انہیں آرام کا مشورہ دیا۔

آہستہ آہستہ سب ہی چلے گئے، صرف خانم موجود رہی۔ سب

کے چلے جانے کے بعد اس نے بھٹل سے کہا "بابا! آپ سے

بات کی سنی گئی تھی۔ قطع کا گمان ہوتا تھا مگر اس کا یہی طور

تھا۔ سب اس تکلم کے عادی ہو گئے تھے۔ ممکن ہے کہ

طرح کسی اور کے جی میں یہ خواہش المانی ہو کہ کاش یہ آواز

مجسم ہو جائے۔ اس وقت خانم کا تینوں خاصا مختلف تھا اس

کے لب و لہجے پر بخوبی کا عنصر حاوی تھا۔

"کیا اور میری حیدر آباد کی کوئی بات ہے؟" نواب لوگ

کی؟"۔ سب اللہ کے بولا۔

"نہیں بابا! وہ داستان تو ختم ہو گئی۔ وہ لوگ بہت نہیں

کر رہے تھے لیکن میرے رکے رہنے سے نواب صاحب کو

واپس تو آنا نہیں تھا۔ اتنے عرصے تک ان سب کے اصرار

نے مجھے مجبور کیے رکھا۔ میرا دل تو نہیں لگا ہوا تھا۔ بے شک

نواب بڑے کی نوازشوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ چھوٹے نواب

عالم تاب کی بیوہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ اپنے شوہر کی مثالی

سمجھ کے مجھے اپنے پاس ہی رکھیں۔ وہ ایک عالی ظرف خاتون

ہیں۔ میں نے ان سے التجا کی کہ میرا ایک بھرا پر ابھرے جو

مجھے سارے جہاں سے زیادہ عزیز ہے۔ وہاں میری بہنیں

میرے بھائی رہتے ہیں۔ وہ میری راہ دیکھتے ہوں گے کیا

بتاؤں، انہوں نے کس مشکل سے اجازت دی۔ چلتے وقت

بہت سختے سختے دینے چاہے، میں نے معذرت کر لی۔"

"اچھا کیا، ہم سوچتے تھے تموزا نام اور بیٹے اور فیم

جانے کے بعد تم کو لوانے کے واسطے ایک پھیرا اور میری

لگا دیں گے۔" بھٹل نے بوجھل آواز میں پوچھا "پر تم کو اور

کیا بولنا ہے خانم؟"

"بہنیں کبھی اس گھر اس حویلی کے بارے میں۔" خانم

ادھر ادھر نظرں گھماتے ہوئے کسی قدر بے چینی سے بولی۔

"مجھے خیال ہوا کہ میں میری موجودگی سے تو خانم کی آواز

میں گرہ نہیں لگ رہی ہے۔ میں اٹھ گیا۔

"اے تم، تم، تم کہاں چلے؟" وہ گھبراہٹ سے "تم آخر کیوں؟"

نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ تم کیا سمجھے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کسمکسے کہا "بس یوں ہی۔"

"جو بات میں کرنا چاہتی ہوں، اس کا تعلق تم سے بھی

ہوگا کہ اس حویلی پر خدا کا لطف و کرم بے اندازہ ہے۔ دنیا

ہر چیز میں میرے جو نہیں ہے، اس کی کسی کو جتنو بھی

ہے جتنا کچھ انہیں فراہم ہے، وہ کتنوں کو نصیب ہوتا

ہے۔ حویلی بہت کشادہ ہے۔ اس کی نسبت یہاں کینوں کی

بھی بہت کم ہے۔ منیر علی کے خاندان کے پانچ افراد،

پھولی سلی، شوہر، ارشد، بھو اور زریں، نیساں، خانم

اور جو غریبہ، کبھی ہم، میں اور بھٹل آجاتے ہیں تو حویلی

بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہاں اور بہت سے لوگ سما سکتے ہیں۔

ایک کشادگی اپنی جگہ میراں کے کینوں کے دل اس سے

اکشادہ ہیں۔"

مجھے شبہ ہوا، کہیں خانم، فروزاں اور یاسمن کی آمد پر تو

بہاری محسوس نہیں کر رہی۔ بظاہر وہ کبھی شہر و شکر نظر

ہیں۔ فروزاں اور یاسمن بھی بہت کھلی کھلی لگتی ہیں

اندر کا حال مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ جلد ہی خانم نے

دھند دور کر دی۔ کہنے لگی کہ خدا ہمیں اس نیکی کا اجر

دے گا۔ ہم نے اتنے ستم رسید گاہ کو اس حویلی کی پناہ

باعتزات مانیت اور مسرت کی ایک نئی زندگی کا موقع دیا

کون کسی کے لیے اتنا کچھ کرتا ہے لیکن کیا اس بات اسی

ہو جاتی ہے۔"

خانم نے توقف کیا تو بھٹل نے لڑکی ہوئی آواز میں کہا

۔ بولو خانم!"

"مجھ میں نہیں آتا، کس طرح بات کروں۔" خانم

تے ہوئے بولی "شاید آپ نے غور نہیں کیا۔ حویلی کے

میں میں تین تین نوجوان لڑکیاں ہیں۔ زریں، زہرہ، پھولی

در بڑی سلی، نیساں، فروزاں اور یاسمن۔"

"ہاں ہاں، کیا ان کو کسی نے کچھ بولا؟" بھٹل کی آواز

نہیں نہیں، یہ مراد نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"کیا کیا یہ سب ایسی گھر میں بیٹھی رہیں گی؟"

"بھٹل کی آنکھیں پھیل گئیں۔"

"آپ نے ان کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ یہ لڑکیاں

"میں، میں کیا سکتی ہوں۔ یہاں حویلی میں آس پاس

کے خاندانوں سے واجبی قسم کا تعلق ہے۔ حویلی کے بارے

میں معلوم نہیں، باہر کیا کیا مشہور ہے۔ یہ آپ مجھ سے بہتر

جانتے ہوں گے۔ اس کیفیت میں مجھے شبہ ہی ہے کہ اس شہر

سے کوئی رشتہ آئے۔ زریں کے اعزہ مستقل کنارہ کشی کیے

ہوئے ہیں۔ ہم بھی کہیں نہیں جاتے۔ جیسلمیر سے آنے کے

بعد بڑے صاحب منیر علی کا اپنے عزیز و اقارب سے کوئی

واسطہ نہیں رہا ہے۔ رشتے میل جول، رسم و رواج سے آتے

ہیں۔ ہماری لڑکیاں ہر اعتبار سے مثالی ہیں لیکن شاید یہاں

کوئی رشتہ نہ آئے، پیغام ایسے نہیں آجاتے۔"

بھٹل ہم گم گم ہو گیا۔

چند لمبے سکوت کے بعد خانم آزدہ لہجے میں بولی کہ منیر

علی بھی جاکے ایسے ہے جس جیسے یہاں ان کی ضرورت ہی نہ

ہو۔ بزرگ ہی یہ سلسلے بڑھاتے ہیں، انہی کی زبان سے سنا

ہے، وہاں بھی میں ایسا جان نے ایک عالی شان کو بھی خریدی

ہے۔ اس کی تین و آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے لیکن

وہاں بھی یہی کچھ صورت ہے۔ وہاں بھی نوجوان لڑکیاں ہیں،

فرخ، فریال، فارہ، جولین، گیتا، شہ پارہ وغیرہ۔ اباجان نے ان کے

بارے میں معلوم نہیں کیا سوچا ہے۔ آج نہیں توکل، انہیں

اس طرف توجہ کرنی ہوگی۔"

بھٹل چپ بیٹھا رہا، اس کے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔

"بس یہی کچھ کتنا جانتی تھی۔" خانم دھیمی آواز میں بولی

"یہاں کوئی پریشانی نہیں، یہ گھر تو جنت کے مانند ہے۔ وہ

زندگی ایسے بھی گزار سکتی ہیں لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ فروزاں

کے متعلق سنا ہے، اس کا رشتہ والدین طے کر گئے ہیں اور

آپ سے معلوم ہوا ہے، وہ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ ظاہر

ہے، والدین نے سوچ سمجھ کے ایسی میرا لڑکی اس کے لیے

منتخب کی ہوگی مگر اس کے بعد یا سمن یہاں، اور دوسری بھی

ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" طویل وقفے بعد بھٹل بڑبڑا

کے بولا۔

خانم نے پھر کچھ نہیں کہا، اپنے آپ میں گم بیٹھی رہی پھر

اس نے بھٹل سے کسی چیز کی خواہش کے بارے میں پوچھا۔

بھٹل کے انکار پر وہ اٹھ گئی۔ بھٹل کے پاس تو حقے کا بھٹل

تھا۔ میں اپنی انگلیاں توڑنا ناخن کر رہا تھا۔ جب تک بھٹل

نے اپنے کمرے کا رخ نہیں کیا، میں وہیں رہا۔

اس رات میری طرح بھٹل کے رگ و پے میں بھی

ایضاً ہوری ہوگی۔ خانم تو جیسے کانٹے بکیر کے چلی گئی تھی۔

کوئی دوسرا آئینہ دکھاتا ہے تو اس کا عکس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے۔ اس نے ایسا کوئی انکشاف نہیں کیا تھا مگر آدمی کتنی حقیقتوں سے آشنائی کے باوجود کیسا غافل رہتا ہے۔ غفلت بھی جہالت ہے۔ آدمی کو بیش تر اپنے عجیب و غریب و شام گروڈپش اپنے سامنے ہی کا نظر آتا ہے۔ عقب کا دور کا، اطراف کا اس قدر نہیں۔ دنیا کے اپنے رنگ دھنک ہیں۔ آدمی دنیا کا پابند ہے دنیا آدمی کی نہیں۔ آدمی کو انہی راستوں پر چلنا پڑتا ہے جو ہمارا کر دیے گئے ہیں۔ لڑکیاں جہاں پیدا ہوئی ہیں وہ ان کا گھر نہیں ہوتا۔ شہزادوں کو بھی محل چھوڑنے پڑتے ہیں۔ جنہیں ہم نے خانم کے بہ قول عزت و عافیت کی زندگی سے ہم کنار کیا ہے، وہ ایک ادھورا کام ہے، یہ عارضی پناہ گاہ ہے۔ ابھی انہیں کہیں اور جانا ہے۔ آگے ان کے فیصلے بھی نہیں کرتے ہیں۔ ان سب کو چلے جانا ہے۔ زریں جو اس حویلی کی دھڑکن ہے اسے بھی یہاں سے چلے جانا ہے۔ یہ حویلی اس کے بغیر کیسی لگے گی۔ میرے لیے اس منظر کا تصور ہی دشت انگیز ہے کہ زریں کسی انجمنی یا شناسا کے ساتھ یہاں سے وداع ہو رہی ہے۔ گویا زریں ہماری ملکیت نہیں ہے اور ہم پر اس کا اختیار عارضی ہے۔ لڑکیاں پیدا ہی کیوں ہوتی ہیں اور ہوتی ہیں تو ایسا ہی کیوں ہوتا ہے۔ خانم کا مخاطب میں بھی تھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ میری بات تو جدا گانہ ہے۔ میں تو کوئی اور آدمی ہوں۔ مجھے اپنے آپ ہی سے فرصت کہاں ہے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میری بھی تین جوان بہنیں ہیں۔

میرا سر جیسے دھنک رہا تھا۔ بھٹل بھی جاگ رہا ہو گا، بی میں آتا تھا اس کے پاس جا کے بات کروں لیکن یہ سوچ کے رہ گیا کہ اسے اور تنگ کروں گا۔ اس کے پاس کون سی جادو کی چمڑی ہے۔ وہ تو بیش تر اڑوں یا زوں میں رہا ہے۔ میرا بھی ایک زمانے سے کون سا گھر سے تعلق ہے۔ سات سال قبل میں گزرے اور کئی سال سے سفر جاری ہے۔ ہم دونوں کو کسی گھر کے قواعد و ضوابط کا تجربہ ہی لگتا ہے۔ ہمیں تو چاقو بازی کا تجربہ ہے، اونی چڑیا کو نشانہ بناتے ہیں مگر ہر جگہ زور و بازو کام نہیں آتا نہ دولت کام آتی ہے۔ گویا ب کی سب حسن و جمال میں یکساں ہیں، ایک سے بڑھ کے ایک، ملتے شعار، خوش گفتار، تعلیم یافتہ اور صاحب کردار۔ ان کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے بھی پھر انہی جیسے ہونے چاہئیں۔ خانم کتنی تھی یہ حویلی کسی جنت کے مانند ہے مگر یہ جنت تو ایک جزیرہ ہے۔ ایک جزیرہ جہاں باہر کی دنیا کی معدودے چند لوگوں کے سوا کسی سے کوئی رابطہ واسطہ نہیں۔ باہر کے

لوگوں کو حویلی میں آباد لوگوں کے صفات و کمالات کی کیا کون انہیں بتائے کہ یہاں کیسے نادار لوگ بستے ہیں۔ یہ لوگ کے مانند ہیں، انہیں پھولوں سے شغف ہے، نہ گلابیں، نہ ہیں اور نہ دل نشین بائیں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا احترام ان کا شعار ہے اور ان میں ایک دوسرے کو مار کرنے، رعایت دینے کی خود راجہ کمال ہے۔ شہر میں سب کو معلوم ہے کہ اڈے کے آدمی زریں کی حویلی اس کے غائب رشتے داروں سے بڑا کرائی ہے۔ فہمیدہ کا واقعہ بھی وہ نہیں بھولے ہوں۔ فہمیدہ کا تعلق بھی بازار سے تھا۔ بہت سوں نے دیکھا بازار سے فہمیدہ کا جنازہ حویلی میں آیا تھا۔ انہیں معلوم لگتے ہیں مقبرہ فیض آباد کے اڈے کا مشورہ زمانہ استرا فیض آباد کی۔ حویلی میں ٹھہرتا ہے۔ اس کے چھوٹے جرو کا قیام بھی یہیں رہتا ہے۔ یہ سب ان کا چشہ وہ حویلی میں ایک بڑا استاد، استاد بھٹل بھی کبھی آگے ہے، جب وہ حویلی سے نکلتا ہے اور فیض آباد کی سڑکوں گزرتا ہے تو اڈے کے آدمی اسے جلوں لیے ہوتے اڈے پر اس کے زوردار کے فسانے بھی انہوں نے ہوں گے۔ ابھی چند دن ہوئے میں نے بھی ہرا اور، سچ میں بڑے انہیں کچھ بتایا تھا۔ وہاں بہت سے لوگ اجتماع تھا۔ کتنے لوگوں نے میری شجاعت چاقو پر میری کا تماشا دیکھا تھا۔ کون کس کو باور کرائے کہ ایسا بڑے ہے، جیسا وہ سمجھتے ہیں، جیسا انہیں تلقین کیا گیا ہے۔ سے وابستگی سے یہ مراد کہاں ہے کہ یہ حویلی اڈے کا حصہ ہے۔ اڈے کے ہر آدمی کو یہاں آنے کی اجازت ہے۔ جو یہاں آتے ہیں وہ یہاں کے ٹیکٹوں کے ساتھ نہیں اٹھاتے۔ وہ جیسے کسی عبادت گاہ میں آتے ہیں۔ آگے وہ اڈے کے آدمی نہیں رہتے، وہ گھر میں آتے۔ کون اتنے لوگوں کی بد گمانیاں رفع کرے گا کہ ان کا گناہ جانا ایک بہتان ہے۔ میلے پڑے دھل کے اٹلے ہیں، غسل سے ناپاک آدمی پاک ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے مندر ہو جاتے ہیں۔ بڑی کمری سیاہیاں مٹ جاتی ہیں۔ کسی حادے یا سامنے کی وجہ سے کسی لڑکی کا واسطہ باز ہو جائے تو سمندر بھی ٹاکائی ہے۔ عبادت گاہوں سے آگے لوگ کیا دوبارہ ناپاک نہیں ہوتے۔ بازار کی ترک کر دینے کے باوجود کیا کوئی کبھی پاک صاف ہو سکتا۔ لوگ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کون اپنی مرضی سے سے وابستہ ہے اور کون وہاں کے چہرے میں پھر پھر

خیر، کانک لگانے والے خطا کار کون تھے۔ سارے بازار اے بازار میں پیدا نہیں ہوتے۔ سنا ہے، خدا بڑی بڑی طاقتیں صاف کر دیتا ہے، مگر آدمی آدمی تو بہت تنگ دل ہوتے ہیں۔ خانم نے اپنا نام نہیں لیا تھا لیکن خانم کی عمر کون سی اور کتنی تھی۔ وہ دس زریں کی بڑی بہن معلوم ہوتی تھی۔ رنگہ دو محنت میں کسی سے کم نہیں تھی۔ وہ لیسٹی بے پناہ ہوں ہی کی وجہ سے حیدر آباد کے رئیس اعظم مرحوم نواب آں کو مطلوب ہوئی تھی۔ اس کا نقش اتنا گہرا تھا کہ بے اس کی جدائی پر برداشت نہ ہو سکی۔ خانم کے انداز غلام میں ایسی دل کشی تھی کہ نواب کے پس ماندگان اسے پسند ہی نہ رکھنا چاہتے تھے۔ حیدر آباد کے بازار محبوب کی دل کی بات اور تھی۔ وہاں کے رسم و رواج الگ ہوتے۔ یہاں خانم ایک گھر میں رہتی تھی۔ اس کے آگے بھی بہت سے زندگی بڑی تھی۔ تاہم وہ اپنی زبان سے کس طرح نکالے اس کا بھی اپنا ایک گہر ہونا چاہیے۔ اس نے مختصر سے میں اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔ حویلی کی چھاؤں، اس کے دل کی سرخوشی، راست بازی اور پاکیزگی کتنا ہی بڑا چاہ ہو، کے لوگوں کی توفیق ان کی سند کے بغیر ایک واحد ہے۔ کے لوگ اسے مستتر قرار دیں گے، سمجھی یہ مستتر ہوگی۔ خانم نے ہمیں میں اباجان کے گھر کی طرف بھی اشارہ کیا۔ گویا ایسی بات نہیں تھی۔ ہمیں ایک بڑا شہر ہے۔ وہاں ایک دوسرے کے قریب رہ کے بھی قریب نہیں تھے۔ وہ نوہمیں گئے رہتے ہیں۔ انہیں اپنی ہی بھاگ دوڑ، ہزمت نہیں ملتی۔ بڑے شہر کے لوگوں کی یادداشت بھی نہ گزرتی ہوتی ہے۔ ہمیں میں اباجان اپنی شان و شوکت کے بارے میں خود گزرتے تھے اور خود غامد کردہ شدائد اور بے لگائی تھی۔ وہ شاید ساری دنیا خریدنے کے لیے تھے۔ دولت مندوں کی بات تو ہر جگہ بالا ہوتی ہے مگر یہ شہروں میں غریب اور ناتواں لوگوں کی خوب پردہ پوشی ہوتی ہے۔ بڑے شہروں میں ذات بات، چھوت چھات، کھانسی کے ماضی و مستقبل سے ایسا سرکار نہیں ہوتا۔ مارا جیسی شعلہ صفت لڑکیاں رہتی ہیں، ہر دم کچھ نیا پتہ بنا کر کے لیے بے تاب اور کیلاش جیسے نوجوان۔ غلامی مقام خانوادے کی وہ نوجوان لڑکی۔ بڑے ذوق و تہمت اباجان کے گھر آتی ہے اور سب سے گھل مل جاتی ہیں۔ اس کی بے باکی، روشن خیالی اور آزادی۔ میں کسی قسم سے ملال نہیں ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ گھر لو

تعلیم و تربیت کے علاوہ ما کے ہاں کچھ خود اس کی افتاد طبع، کچھ بڑے شہر کے بے نیازان اور فراخ دلانہ ماحول کا بھی بڑا دخل ہے۔ اس کی رفاقت میں کوئی تلامذہ سامنے میں بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ میری دوست کی مدد ہی ہے اور بس، اس کے سوا اس کا کوئی ادعا نہیں۔ وہ کہتی ہے "میں میرا تعلق خاطر میرا اپنا معاملہ ہے۔ تم اپنے بھتیجی رد عمل کی زحمت میں نہ پڑنا، ہاں میری کو خوش ہوگی، میری آرزو ہے کہ تم مجھے محسوس کرتے رہو۔" ایک بار اس نے ایسا ہی کچھ کہا تھا۔ وہ مجھے کتنی میں بٹھا کے دور باتوں میں لے جاتی ہے اور میرا سر اپنے زانو پر رکھ کے میری چارہ سازی کے لیے بے قرار رہتی ہے اور اس کا بھائی، خوش کلام و جامہ زیب نوجوان، ڈاکٹر کیلاش اوسط درجے کے گھر سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی جو لین کا طلب گار ہے۔ جو لین کے لیے وہ اپنے باپ کے آن جہاں بیج دوست کا بڑا ترکہ قریان کر دینے کے روپے ہے۔ یہ کیسا عجوبہ ہے، ہر جگہ ایک جیسے آدمی ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ ان کے توبہ لے ہوئے ہیں۔ دنیا کے طوطے طریقے جگہ جگہ جدا ہوتے ہیں۔ بڑے شہروں میں چھوٹی بڑی بستیوں سے آگے لوگ آباد ہوتے ہیں اور کیسے مختلف ہو جاتے ہیں۔ کچھ اباجان کو بھی احساس ہو گا۔ وہ ایک دور اندیش آدمی ہیں۔ ہر طرف ان کی نگاہ جاتی ہے۔ جزئیات میں تو وہ بے مثال ہیں۔ انہیں احساس ہونا چاہیے، وہ کتنے ہی محل تعمیر کر لیں، نمونہ کاریں، چار گھوڑوں کی سواری، مصائب اور خدمت گاروں کا لاؤ فنکر جمع کر لیں، ان کے وابستگان کی آسودگی کے بغیر ان کی بادشاہت ادھوری ہے۔ بادشاہ کا سکون، رعایا کے سکون سے پیوستہ ہے۔ اباجان کوئی بڑے آدمی نہیں ہیں، وہ ہمیں میں اتنے لوگوں کو اپنے گھر اپنی قلم رو میں جمع کیے ہوئے ہیں تو یہ ان کی خوں خروانہ ہے۔ وہ اپنے لیے بطور خاص الگ محل بھی بنا سکتے تھے۔ دولت کی ان کے پاس کی نہیں ہے۔ شاید یہی بہتر ہے کہ فیض آباد کی حویلی کے سارے کمین ہمیں منتقل ہو جائیں۔ ویسے بھی سب کو ایک ہی جگہ ہونا چاہیے۔ دونوں گھر ایک ہی ہیں۔ ہمیں اور فیض آباد میں قاصد بھی زیادہ ہے۔ ہمیں شہر ان سے ایسی مفازت نہیں برتے گا مگر وہ ہمیں ہو یا فیض آباد کوئی اور جگہ لوگ سڑک پر بڑے ہوئے تو نہیں مل جاتے۔ ایتھے آدمی بہت کم پایا ہوتے ہیں۔ دولت کتنی ہی کرشمہ کار ہو، ہر آدمی پر اس کا ظلم کارگر نہیں ہوتا اور ایتھے آدمی کا تو کوئی مول بھاؤ نہیں ہوتا۔ صرف اباجان، بھٹل اور میر علی کی تن دی،

مستعدی کافی نہیں، مجھے بھی یوں ہاتھ توڑے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ آگے کسی سفر سے پہلے مجھے اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ میری سرگرمی انہیں بھی سمجھ کرے گی۔ چند روز بعد پینل یہاں سے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں انکار کروں گا۔ خانم ٹھیک کہتی ہے، وقت تو پھر اسی طرح گزرتا رہے گا اور مزید غفلت کی گئی تو اور دور چلا جائے گا۔ وقت کی کمی نہیں سنتا، اسے اپنی رفتار سے غرض ہے۔ آگے سفر میں کوئی مدت طے نہیں ہے۔ کچھ بھروسہ نہیں کہ کہاں کس جگہ کوئی ثواب ثروت... یا سید محمود علی راہ میں مزاحم ہو جائے۔ مجھے اپنا یقین استوار رکھنا چاہیے کہ کتنی ہی دیر ہو جائے، وہ میرا انتظار کرے گی۔ مولوی صاحب اسے مجھ سے دور رکھنے کے کتنے ہی جتن کریں، انہیں باپوسی ہوگی، گورا کی آس نہیں ٹوٹے گی۔ میری امید قائم ہے تو اس کی بھی یقیناً قائم ہوگی۔ میرا دل یہی کہتا ہے۔ مولوی صاحب کیا جائیں، میرا اس سے کیا تعلق ہے۔ میں نے اس کے لیے گھر چھوڑ دیا ہے۔ مولوی صاحب خود گواہ ہیں، میں نے اس کے لیے دو آدمیوں کا خون کر دیا تھا اور سات سال جیل میں گزارے تھے۔ میں تو ابھی تک کسی زندان میں ہوں اور اندھیری رات میں بدھ گیا ہے اپنے اتالیق اور واحد سرپرست کے قتل کے بعد جان بچا کے جب میرے گھر آئی تھی تو یوں ہی نہیں آگئی تھی، کسی اعتماد میں اس نے میرے گھر کا رخ کیا تھا۔ اپنے مشتاق اتالیق کی موت کے بعد اسے حوصلہ ہار دینا چاہیے تھا لیکن کوئی یقین ہی اس کی توانائی کا باعث تھا۔ اسے معلوم تھا، وہ اب اپنی نہیں ہے۔ کوئی اور بھی ہے جو اس کے لیے بازو پھرنے لگا ہے۔ وہ بھی کچھ طے کر کے آئی تھی۔ وہ خود کو ترک کر کے آئی تھی اور اس نے خود کو میرے سپرد کر دیا تھا۔ مولوی صاحب کیا جائیں، ہم دونوں ایک دوسرے کی امانت ہیں۔ دو آدمی ایک نہیں ہو سکتے لیکن ایک اگر دوسرے کے لیے خود کو ترک کر دے، صدق طلب ہو تو ترک بھی حصول مراد کا ایک قرینہ ہے۔ مولوی صاحب، بت عالم آدمی ہیں مگر اس رمز و عیاں سے آنا آشنا ہیں۔ کب تک وہ جت کرتے رہیں گے ایک دن وہ قائل ہو جائیں گے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں تو یک جا جانی کے بغیر دونوں ہی ادھوے، دونوں ہی محفل ہیں۔ وہ تو میرا جدو ہے اور میں تو اس کا وجود ہوں۔

مجھے ایک بار گھریا سادات میں حافظ عبدالحق کے پاس اور جانا چاہیے۔ فیض آباد سے گھریا سادات اتنی دور نہیں ہے۔ ممکن ہے، اس دوران میں مولوی صاحب نے اپنے

دوست حافظ صاحب سے رابطہ کیا ہو یا حافظ صاحب کے موجودہ ٹھکانے کا کچھ علم ہوا ہو۔ حافظ عبدالحق سے وعدہ کیا تھا اور وہ ایسے آدمی نہیں ہیں، انہیں بات کریں گے، نہیں کریں گے تو انہوں نے اچھی طرح بات تھاکر ہمیں دوسرے انداز سے بھی بات کرنا خوب آتا۔ وہ رات اسیں یاد ہوگی جب بھٹل نے اپنے اپنے اور میرے کی کلانیوں پر چاقو سے لکیر کھینچ دی تھیں۔ یہ لکیر کلانی پر ابھی تک کندہ ہے۔

مجھے نیند نہیں آتی لیکن کسی غم کی طمانیت سے بھرا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے طے کیا کہ کل پہلے زور پھر بھٹل سے بات کروں گا۔ ذریں کے لیے اس کوئی کہنا آسان نہیں ہو گا۔ مجھے اس سے عارضی طور پر کی بات کرنی چاہیے۔ مستقبل کی بات ہی نہیں کرنا، بہت سی جاکے دیکھا جائے گا۔ وہاں سے فوراً واپس آئے اس کا جی نہیں چاہے گا اور اسے آنے کوں دے گا۔ طرح وہ بھٹل کی چیتنی ہے، اسی طرح اباجان کی، منہ پر وہاں فرخ، فریال، فارہ، اسے پکڑیں پر بٹھائیں گی۔ وہاں ہے اور اس کی نہایت خوش نما ہمارا اور شہ پارہ ہے۔ وہاں اس کی ملاقات رہا ہے۔ دونوں میں باتیں مشترک ہیں۔ بہت سی میں سمندر ہے اور بہت دور ہیں، کشادہ سڑکیں، اونچی عمارتیں، باغات، وہاں فیلر جیسی چار دیواریاں ہیں، ایسے گھر نہیں ہیں، زندان مانند۔ فیض آباد تو بڑے بڑے گھروں کا شہر ہے۔ جانے کس وقت میری آنکھوں میں نیند آتی۔

○

صبح ناشتے کے بعد حسب معمول بھٹل اڑے میں نے اسے نہیں ٹوکا کہ اب تو ہمارا اور پھر کا بچا گو ہے اور اڑے کے لوگوں نے گزشتہ نوشہ دیوار پر قبول کر لی ہے تو اب وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کے چلے جانے پر میں لاہوری کی طرف نکل آیا۔ اس کتابوں میں میرا جی نہیں لگا تاہم ہر تک مختلف کتاب ابتدائی صفحات پڑھ کے انہیں واپس ان کی جگہ رکھتا دوسرے کھانے پر سب کے ساتھ ذریں بھی موجود تھیں انھوں کے لیے وہ بیٹھے چاول کی قاب رکھنے میرے لیے تو سرگوشی میں اتنا کہنے کا موقع مل گیا کہ مجھے اس سے کہنی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے چوگی، پت پانی بکھر اس نے میری جانب دیکھا اور اس کے چہرے کی سرخی ہوئی پھر وہ سبھل گئی۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں

کے کمرے میں جا سکتا تھا یا اسے اپنے کمرے میں آنے کے لیے کہہ سکتا تھا لیکن کوئی بھی کسی وقت دخل انداز نہ تھا۔ دن میں متعدد بار میرا اس کا آتما سامنا ہوتا تھا۔ اب تک غلط میں بات کرنے کی کوئی صورت نہیں بنی تھی۔ مجھے اس سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ کچھ اطمینان تھا کہ ابھی تو دونوں تک میاں رہتا ہے یا پھر کچھ ایسا تھا کہ اخذی گر بڑاں تھا۔ اس کے سامنے جاتے ہوئے کوئی نہ ہوتی تھی، کسی پیشانی کا احساس غالب تھا۔ اس کے نامندر کا خوف لاحق تھا یا اس کے ایسے سوالوں کا اندیشہ کہ جواب میرے پاس نہیں تھا۔ غالباً کوئی ایسی ہی بات یا پھر میری خواہش تھی کہ وہ خود کسی وقت موقع نکال کے رہے پاس آئے۔ مجھے خود نہیں معلوم، یہ کیا تھا کچھ بھی نہ تھا۔ نہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا نہ میرے ہا اعتبار کرتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ میرے سینے میں اس یا مرتبہ ہے، وہ مجھے کسی قدر عزیز ہے، خوئی میں سب سے وہ اپنے چھوٹی بھائی جہاں گیر سے بھی زیادہ اور یہ حقیقت مجھ پر روشن تھی کہ وہ بہر حال میری باحار دی، کامرانی کی رہتی ہے۔ میری نسبت، بے شمار آرزوئیں اس کے باخانے میں موجزن ہیں۔ اسے تو میری خوشنودی سے

بھٹل رات کو دیر سے واپس آیا۔ اس کے انتظار میں رہنے لگا تھا نہیں کھا یا تھا۔ کھانے کے بعد سب بیٹھک میں ہو گئے۔ بھٹل پر گزشتہ رات خانم کی آئینہ نمائی کی گرائی آبادہ اڑے سے کوئی بوجھ لے کر آیا تھا کہ جلدی اٹھ گیا۔ اس کی وجہ سے جی ہوئی تھی پھر یکے بعد دیگرے سبھی گئے۔ میں نے ذریں کی طرف استفساری نظروں سے دیکھا۔ خواب میں اس نے آنکھیں میچ لیں۔ میں نے اسے کسی رس پر حمل کیا اور قتل کی تلقین کے سوا کچھ اور قیاس نہ کیا۔ خانم اس کے پتلومیں کھڑی تھی اور کوئی صراحت نہ تھی، ان دونوں کے چلے جانے کے بعد میں اپنے رے کے باہر بے ارادہ ٹھٹھا رہا۔ نیساں نے سر کی باتیں نہ اور جہاں گیر نے شہرچہ کی ایک بازی ہیلنے کی پیش کش کی۔ میری نا آادگی پر دونوں بچھ سے گئے اور مجھے اپنی اس لک پر ملال بھی ہوا لیکن میں انہیں منع کر چکا تھا۔ میں ناش چلا آیا۔ چاندنی اور رات کی رانی کی خوشبو ہر جانب رکھ ہوئی تھی۔ چاند آتنا نزدیک نظر آتا تھا جیسے خوئی کے ناش اترنا چاہتا ہو، اس کے اطراف ستاروں کا جھرمٹ! آتما جیسے آسمان میں موتی ٹپکے ہوں۔ اتنے چھوٹے

چھوٹے تاروں کے درمیان اتنا بڑا چاند، خصوصاً چودھویں کا چاند کچھ بے ہنگم معلوم ہوتا ہے۔ یا تو چاند کچھ چھوٹا ہوتا یا بڑے کچھ بڑے ہوتے تو تابکب کی یہ کمی محسوس نہ ہوتی۔ لوگ کہتے ہیں، چاندنی بیشہ پر سکون ہوتی ہے، نرم نرم، نازک، نازک، دھیمی دھیمی، ہلکی ہلکی، شرابی لچائی سی، بالکل دھوپ کی ضد۔ میں تو کتا ہوں، چاندنی میں کوئی اداسی جیسی ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد میرا تو قی ڈولنے لگا تھا۔ میں جلدی اپنے کمرے میں آ گیا مگر میں نے دروازہ کھلا اور کمر روشن رکھا۔ مجھے شبہ تھا، ذریں آسکتی ہے یا نہ بھی آئے۔ کیوں نہ میں ہی اس کے کمرے کا رخ کروں پھر ایک اور خیال نے مجھے آرزوہ کیا۔ وہ یہاں آئے یا میں اس کے پاس جاؤں، دونوں صورتوں میں اس طرح رات کو چوری چھپے اس کا اتنا یا میرا اس کی طرف جانا مناسب لگتا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو جانے کیسے کیسے گمان اس سادہ شمار کے دل میں نمودار ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ کل دن میں کسی وقت ذریں کو لاہوری میں آنے کے لیے کسوں۔ وہاں خاصا سکون ہوتا ہے۔ ذریں ایک ہوش مند لڑکی ہے۔ وہ خود بھی احتیاط کرے گی، البتہ وہ فکر مند خاصی ہوگی، آخر وہ کون سی بات ہے جس کی مخاطب صرف وہی ہے۔ جانے کیوں دیر تک اس کی آمد کا ایک مہوم سا امکان بھی میرے دماغ سے چٹا رہا اور آخر طرح طرح کی تاویلیں اس امکان یا خواہش یا امید پر غالب آ گئیں اور یوں مجھے کچھ قرار آیا۔ بے بسی بھی ایک طرح کا قرار ہے۔ میں نے بہتر سے اٹھ کے دروازہ بند کیا اور آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی مگر نیند تو اپنی مرضی سے آتی ہے۔ بہتر کے سہانے رکھی ہوئی چھوٹی الماری میں سجے ہوئے رسالے اٹھا کے میں نے پڑھنے شروع کیے۔ ساتھ ساتھ مطالعہ بھی لوری کا کام دیتا ہے۔ یہ کلیہ بھی فضول ثابت ہوا۔ سارا اول و آخر دماغ ہی ہے۔ آنکھ کے کسی ایک جگہ مرکوز ہونے سے بصارت مراد نہیں ہے۔ کسی بلند صدا کی رسائی جیسی ممکن ہے جب دماغ متوجہ ہو یا پھر آواز یا سحرانگیز، اتنی توانا اور منظر ایسا نادریا حیران کن ہو کہ دماغ کو اپنی جانب مہینچے لے۔ لوگ دلکش تو کہتے ہیں، دماغ شش کیوں نہیں کہتے۔ میں ایک کے بعد ایک رسالہ الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا اور کسی جگہ نظر ٹھہرتی ہی نہ تھی کہ کمرے کے باہر قدموں کی چاپ پر اٹھ کے بیٹھ گیا۔ چند لمحے اس تذبذب میں گزرے کہ باہر جا کے دیکھوں۔ ایک ایک دروازے پر ہلکی دستک ہوئی اور میں اچھل سا پڑا۔ دروازہ بند تھا لیکن چپٹی لگی ہوئی نہیں تھی۔ بہتر سے اٹھ کے میں نے جلدی جلدی چپل پسئی اور لپک کے دروازے کا رخ کیا۔ مجھے

یقین تھا، وہ زیر ہوگی، اور اسے اپنے ساتھ دیکھ کے مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ وہ کسی ملک یا شہر کی مانند دروازے کے پار گھڑی تھی۔ سر تپا نیلگوں لباس، نیلے دوپٹے میں اس کا گلابی، شہابی رنگ دک رہا تھا۔ میری آنکھیں چند ہی لمحوں اور میں بت بنا اسے دیکھ گیا۔
”سو تو نہیں گئے“ وہ مترنم آواز میں دھیرے سے بولی۔

”نہیں نہیں، ابھی کہاں، آؤ آؤ اندر آؤ۔“ میں نے بے رعبی سے کہا اور اسے اندر آنے کی جگہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گیا۔ ”میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ خودی تمہاری طرف سے۔“ میری آواز جھک رہی تھی۔ وہ آہستہ قدموں سے اندر آئی۔ ”میں نے آج آنے کو کب کہا تھا۔“ وہ ہلکتی آواز میں بولی۔

”نہیں کہا تھا مگر مجھے تمہارا انتظار تھا۔“ میں نے کرسی کھینچ کے مہسری کے سامنے کروی ”چھا ہوا، تم آگئیں۔“
”میں کہیں باہر سے نہیں آئی ہوں۔“ اس نے شگفتگی سے کہا۔

”معلوم ہے،“ میں نے آئی ہو لیکن فاصلے مقامات ہی سے طے نہیں ہوتے۔“

اس نے نگاہیں اٹھائی تھیں کہ پھر جھلکیں۔
”اتنے دن ہو گئے، تم سے کوئی بات ہی نہیں ہو پائی۔“
میں نے اذنی آواز میں کہا۔

”میں تو ہر وقت موجود تھی۔“
”لیکن، لیکن اور لوگ بھی تو تھے۔“
”کوئی ایسی بات تھی کیا؟“ اس کی آنکھیں جگنو کی طرح جلتے بچنے لگیں۔

”میں، ایسی کوئی خاص بات نہیں۔“ میں نے شانے اچکا کے کہا۔ ”بس یوں ہی، تم سے پوچھنا تھا، اتنے دن تم کیسی رہیں۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔ تم، تمہاری باتیں، تمہاری اپنی باتیں، بس یہی کچھ۔“

”میں نے بہت اچھا وقت گزارا۔“ اس کی ساوگی میں ایک عجب تیکھا پن تھا۔ ”میں اس کی چیز کی نہیں، اور کیا چاہیے۔“

”پھر بھی، لیکن ٹھیک ہے، تم ایسے کیوں کچھ کوگی۔“
”کچھ ہو تو بتایا جائے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”تم کیا محسوس کرتے ہو؟“
”بظاہر تو واقعی کچھ نہیں ہے۔ میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر۔“ مجھ سے کچھ کمانہ جا سکا۔

”مگر کیا؟“ وہ تجسس سے بولی۔

”مگر کچھ نہیں۔“ مجھے تو یہ سب دیکھ کے رشک آتا ہے اور ج تو یہ ہے، ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ نظر کا میں قائل نہیں لیکن کچھ بھی اچانک ہو جاتا ہے۔ میرا تو اب اعتبار ہی اٹھتا جا رہا ہے۔ سخر میں ایسے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ کیا بتاؤں! آدھی کے بت روپ دیکھے ہیں۔ مگر گرت گول گرتے ہیں گریے آدھی تو بیل میں رنگ بدلتا ہے۔

”کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔“
”ہاں، نئی تو نہیں مگر ہر ادھ پختا ہے۔“
”زیادہ توقع ہی نہ کی جائے۔“ اس کی آواز کھوی گئی۔
”یہ بھی آسمان کام نہیں، واسطہ تو صبح و شام انہی انسانوں سے پڑتا ہے، طرح طرح کے لوگوں سے اور بار بار، چوک ہو جاتی ہے۔“

”مگر دنیا ایسی بری بھی نہیں ہے۔“
”ہاں، کہتے ہیں کہ ابھی پھول کھلنے بند نہیں ہوئے، ہوتی ہے اور زور زور سے نکلتا ہے، خزان کے بعد ہماری آواز ہے۔“ میں نے خود کو دکھا، کہیں میں اول فول تو نہیں بک رہا ہوں۔ میں نے منتشر لہجے میں کہا ”میری مراد ہے، بے شک ابھی سارے لوگ خراب نہیں ہوئے اور جو کما جاتا ہے، دنیا انہی کے دم سے جاری ہے اور، اور ان میں سے ایک بھی ہو۔ کبھی میں سوچتا ہوں، تم کیا ہو۔“

”کیوں؟“ کرسی پر اس کا سراپا مٹلاطم سا ہو گیا ”میں؟“

”تم ایک مثال ہو۔“
”میں کچھ کہنے کے لیے تم نے مجھے بلایا ہے؟“ اس نے سر جھکا اور آنکھیں بند کر لیں، پھر کی قدر کرتا کے بولی ”تم کے لیے کوئی اور بات کرو، ایسا تم کو۔“

”ٹھیک ہے، نہیں کتا مگر ہے تو یہ ایک واقعہ۔ تم نے ایک اور بات ثابت کی ہے۔ میں دیکھتا ہوں، تم کسی حاکم ہے، تاج، بے تخت کی حاکم، کسی جگہ کبھی پڑھا تھا، بے پڑا حاکم اخلاص و صاف والا ہوتا ہے۔ اس حاکم سے برا جو خدائیں ہوتی ہے اور حکم صادر کرتا رہتا ہے مگر جس کے بار مسلسل انکسار، مسلسل ایثار ہے اس پر لوگ دیوانہ وار عاشق ہوتے ہیں۔ یہاں بھی دل و جان سے تمہاری عزت کرتے ہیں۔ یہ مرتبہ تمہیں یونی حاصل نہیں ہوا ہے۔ یہ تمہیں کس وراثت، کسی حادثے اور زور و زر سے نہیں ہے۔ یہ تمہاری تمہارے کمال سلوک سے ملا ہے۔ حاکمیت کا یہ پہلو بھی خوب ہے۔“ وہ سر جھکا کے اٹھکیوں میں آچل مروڑی تھی۔

”دو بے ترجمی سے پوچھا، کیوں کیا میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں؟“ اس کی آنکھوں میں شوخی بھر گئی۔ ”معلوم ہے، آج شربت سبز میں زور بیاں کی اچھی مشق کی ہے۔“
”تم اسے کچھ بھی کو، لیکن میں جانتا ہوں میں مطمئن نہ کیوں بول رہا ہوں۔“
”تمہیں جھوٹ بولنا آتا بھی نہیں۔ تم شاید بول بھی سکتے۔“ اس کے لہجے میں فصیح کی رمت میں تھی، کہنے میں لازم نہیں، تمہارے انداز سے اور قیاس اور اری تعبیریں درست بھی ہوں۔“
”میرا سوچا ہوا غلط ہو سکتا ہے مگر میرا دیکھا ہوا تو۔“
”اب جانے بھی دو۔“ اس نے مجھے بات پوری نہیں لے دی اور چلتی آواز میں بولی ”تم اپنی کوئی تباہ سفر کیا اب کے تو مت دن ہو گئے۔“

”ہاں، دن تو بہت ہو گئے، لمبی روداد ہے۔“ میری آواز باہت عود کر آئی۔ ”لیکن ایک بات کہوں، ہم کبھی تم سے نہیں رہے۔ نہ میں، نہ بیٹل بھائی۔ تم ہمیں یاد آتی رہا بت یاد آتی رہیں۔“
”مجھے معلوم ہے۔“ اس کے رخساروں پر شفق چھا گئی۔ ”خبر ہے، آسمان سول میں بیٹل بھائی آگے سخر کے لیے تھے۔ میں نے خد کی کہ اب فیض آباد چلو، زری کیا کتنی اہم مشکل سے وہ آتا رہے۔“

”ابا بتا رہے تھے۔“ اس کی آواز لرزے لگی اور ایک لمحوں کے بعد وہ کسی قدر ناز سے بولی ”ہو سکے تو تفصیل بتاؤ، کہاں کہاں جانا ہوا اور کس حد تک۔“ وہ شاید ابلی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی کہ میرے آئینے کے ماتے رک گئی اور جھک کے کہنے لگی ”تم نے عرصے میں تو دنیا کو ہم لی ہوگی؟“

”کہاں یہ دنیا بتاؤ، بڑی ہے پھر بھی بس گھومتے رہے۔ یہاں کل وہاں، صبح کہیں، شام کہیں۔ اب تو ششروں کے لہ کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ تفصیل سے بتانا شروع کیا ابو جانے کی۔“

”مگر کیا ہو؟ رات ابھی ہے۔“
”رات تو اپنی ہے مگر اسے کیوں اذیت سے دو چار کیا۔“

”میں جانا چاہتی ہوں۔“ وہ بے کلمی سے بولی۔
”اس کے اصرار پر میں نے شکستہ آواز میں کہا ”کیا کرو گی اسے۔“

”میں نے آگے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اس نے مجھے روک دیا۔“ کو تو چاہئے یا تو وہ بنا کے لے آؤں؟ کسی اور چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ، خشک میوہ یا گھوڑی وغیرہ۔“

”کسی چیز کی خواہش نہیں۔ بس تم یہیں بیٹھی رہو، ایسے ہی۔“
وہ ہر تن گوش تھی۔ مجھے بتا ہوا دہرائے اسے ابھن ہوتی تھی لیکن اس کے اضطراب، آمیز اشتیاق سے مجھے پسپا ہونا پڑا۔ گزرا ہوا، بھرا ہوا حال نمٹنے میں میں نے کچھ تامل کیا۔ اسے بہت بے تابی تھی۔ مجھے کم دیکھ کے بچوں کے سے انداز میں اس نے مجھے ٹوکا ”کہاں کو گئے؟“

”نہیں نہیں۔“ میں نے چوک کے کہا ”سوچتا ہوں، کہاں سے شروع کروں۔“
”میں بتاؤں۔“ وہ ہلکے بولی ”یہاں سے پہنچی جاتے ہوئے تم ایک پہر کے لیے مراد آباد گھر گئے تھے وہاں سے حیدر آباد چلے گئے۔ ظاہر ہے، مراد آباد سے پہنچی جانے کے بجائے حیدر آباد کا سفر کرنے کی کوئی بڑی وجہ ہی ہو سکتی ہے۔“ وہ تو اب رانی بات ہو گئی۔

”میرے لیے سب کچھ نیا ہوگا۔ کچھ کچھ مجھے معلوم ہے اور کچھ اندازہ ہے لیکن تمہاری زبانی تو۔“ وہ تجسس سے بولی ”وہ اصل بھی ہوگا اور نیا بھی، اور مجھے معلوم ہی کتنا ہے۔“

ابتدا میں میری زبان انک رہی تھی کہ کیا بتاؤں، کیا نہیں لیکن سننے والے کا اشتہاک کہنے والے کے لیے ترغیب کا درجہ رکھتا ہے۔ بعد میں خود مجھ پر مکلف ہوا کہ اس نے جس سے نجات پانے کے لیے مجھے اس جیسے کسی سامع کی ضرورت تھی۔ درد مند سامع بھی کسی میٹھا کے مانند ہوتا ہے۔ زور کلام، شوخی، سماعت سے مشروط ہے، آئو، آنکھیں ہلکی کر دیتے ہیں اور سینہ ہلکا کر دیتے ہیں کیونکہ آنسوؤں کا فانی تو سینہ ہوتا ہے۔ سینے میں یہ لگ ہی بھڑکائے رہتے ہیں۔

اس کے چہرے پر اس کے نماں خانے کا پیمان صاف نمایاں تھا۔ کسی میں شمولیت کے بغیر، اضطراب ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے کہا ”یہاں سے پہنچی جانے کا ارادہ تھا مگر مراد آباد راستے میں پڑا تھا۔ میں نے سوچا، یہاں سے گزر رہے ہیں تو کون نہ شہر جا کے ایک بار اور مولوی صاحب کے بارے میں پوچھ آئیں۔ پھر نہ معلوم، کب اس طرف آنا ہو۔ راستہ کھوٹا کرنے کا نتیجہ کچھ بہتر ہی نکلا۔ معلوم ہوا، مولوی صاحب اس دوران مراد آباد آئے تھے۔ مسافر خانے کے روزنامے میں ان کا پتہ درج تھا۔ میری التجار پیر بھائی بہنیں

جانے کے بجائے حیدر آباد چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ گویا جان کو جلد سے جلد بچھڑی چھپنے اور اپنے بیٹے اور بیٹیوں سے ملنے کی بڑی بے چینی تھی لیکن وہ بھی تیار ہو گئے۔

دلی کے بعد میں نے ریل میں کلکتہ جیل کے جیلر صاحب کی لڑکی سونپا کے واسطے سے اجتناب کیا۔ زمریں شاید اس سانچے کی متحمل نہ ہوتی یا شاید بھی میں اس کے عادیہ بیان کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے اسے بتایا "حیدر آباد میں ابا جان کو ہوٹل میں گھبراہٹ میں نے اور پھر بھائی نے اس سے پتے پر پہنچنے میں کوئی تاخیر نہیں کی جو ہمیں مراد آباد کے مسافر خانے کے روزنامے سے ملا تھا۔ وہ ایک مذہب نواب ثروت یار کی عالی شان کو بھی تھی۔ بہت زب و ذہنت تھی اس کی مگر مولوی صاحب کچھ عرصے پہلے وہاں سے جا چکے تھے۔ نواب نے بتایا کہ وہ جلد ہی واپس آئے گا کہہ گئے تھے لیکن جانے کیوں آئے نہیں۔ ہم نے نواب سے کہا تھا کہ مولوی صاحب کی کوئی امانت لوٹانے کے لیے ہمیں ان کی تلاش ہے۔ کیا سی مناسب ہو؟ مولوی صاحب آجائیں تو انہیں ہماری میاں آمد کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے اور ہمیں سمیٹے مطلع کر دیا جائے۔ ہم خود مولوی صاحب کے وہ بے روح حاضر ہو کے ان کا شکور دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ نواب سے وعدہ لے کے ہم رخصت ہو گئے۔ حیدر آباد میں اب ہمارا کوئی کام نہیں رہا تھا لیکن ایک مقام پر اچانک کچھ لوگ ہمارے آڑے آ گئے۔ تلخ کلامی سے بات ہاتھ پائی تک جا پہنچی۔ نتیجے میں پولیس آگئی اور ہمیں حوالات میں بند کر دیا گیا۔

"کیا؟" زمریں کی آنکھیں پھیل گئیں "اس طرح کیسے؟ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔"

"ہاں" ان کا ہمارے راستے میں مزاحم ہونا دانش تھا۔ ان کا مقصد ہمیں کسی طور حوالات پہنچانا تھا۔ یہ سازش کا حصہ تھا۔ اتفاق سے حوالات میں تھانے دار کے ایک ملاقاتی کو حوالات میں داخل فرما دیا کرتے ہوئے ہم دو ستم زدگان پر ترس آ گیا۔ وہ صاحب ہم انجینیئر کی ضمانت لینے کی سخاوت پر اثر آئے ہم ان کے ممنون احسان تھے جب انہوں نے ہماری تواضع کے لیے اپنے گھر چلنے کی درخواست کی تو ظاہر ہے، ہم منع نہ کر سکے۔ ہمارے سان و گمان میں نہیں تھا کہ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے۔ اس شخص نے ایک بہت بڑے نواب، جہاں تاب کی عظیم الشان حویلی میں لے جا کے ہمیں نواب صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ نواب نے ہمیں خانم آپلی کے کوائف بتانے کے لیے مجبور کیا۔ ہمارے انکار پر ہمیں حویلی کے ایک کمرے میں محبوس کر دیا گیا۔ پھر سے دار بٹھا دیے

گئے۔ ہم نواب کو خانم آپلی کے بارے میں کہے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے بھائی نواب عالم تاب کو خانم آپلی حیدر آباد سے ہجرت، ان کی جدائی بہت شاق گردی تھی۔ بہت عرصے سے وہ بستر نشیں تھا، مگر کیا۔ "میں نے رگ زمریں سے پوچھا "تمہیں آپلی نے کچھ نہیں بتایا؟"

"کسی قدر۔ میں نے خود تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھا، کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ آپلی کے لیے یہ ذکر تکلیف ہو سکتا ہے۔" وہ ہچکچاتا ہوا بولی۔

"بس" ہم اپنے طور پر وہاں سے رہائی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ پھر اچانک تھا۔ ایک روز نواب عالم تاب بیگم اور بہن جرات کر کے حویلی کے آداب بالا سے ملنے کے غامدوں کو کسی طرح رام کر کے چھٹی چھاپی ہم تک گئیں۔ وہ نہایت شائستہ نفس طبع اور نازک اندام نواب تھیں۔ انہوں نے بہت عاجزی کی، بڑی منتیں کیں، ایک اپنے شوہر، دوسری نے اپنے بھائی کی زندگی کی بھگمائی کے واسطے دیے۔ کتنے لکھیں کہ خانم ہی ان کے جان بیا شوہر اور بھائی کا دوا کریں۔ ہم ان کے حال پر رحم کریں۔ کی آہ و زاری نے ہمیں بہت آزرہ کیا۔ ہم نے ان سے کہہ میاں سے آزاد ہونے کے بعد ہی ہم کچھ کر سکتے ہیں۔ تو ہمیں خانم سے بات کرنی ہوگی۔ یوں ہم خانم کا پتہ نہ کر سکتے۔ اس قید و بند میں کئی روز گزر گئے۔ نواب طرح سے ہم پر زور ڈالتا "ہمارا حوصلہ آزما مارا پھر ایک دن جان ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ ہم نے بڑے نواب سے ملے خواہش ظاہر کی۔ گویا پھر سے داروں کو پھر ڈالنے کا نواب کے پاس جا کے ہم نے تجھنے کا مطالبہ کیا۔ وہ راضی ہوا۔ تخلیک ہوتے ہی بیرو بھائی نے بے غلت است میں کیا اور باہر سے پھر سے وار کیا تو میں نے اسے اپنی بندوق کے ساتھ نواب کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کی میں ہم حویلی سے دور ہوتے گئے اور ایک محفوظ جگہ پر ہم نے نواب سے ہاتھ اٹھایا اور موثر سے اتر گئے۔

میں نے زمریں کو نہیں بتایا کہ اس کے بعد ہمارے خنجر ابا جان کے پاس جانے کے بجائے بیرونے وہاں سیدھے بازار کے آڑے کارخ کیا اور مجھے اڑے کی بھجھل کو بیٹھا دیکھ کے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یقین تھا کہ اتنے دنوں میں بھٹل کو ہماری خیر خبر لینے آباد سے حیدر آباد آ جانا چاہیے اور حیدر آباد کے ان ہوتا چاہیے۔ زمریں نے بھی کوئی کرید نہیں کی۔ میں "ادھر ابا جان شدت سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے نواب کو خانم آپلی کے بارے میں کہے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے بھائی نواب عالم تاب کو خانم آپلی حیدر آباد سے ہجرت، ان کی جدائی بہت شاق گردی تھی۔ بہت عرصے سے وہ بستر نشیں تھا، مگر کیا۔ "میں نے رگ زمریں سے پوچھا "تمہیں آپلی نے کچھ نہیں بتایا؟"

میں نے زمریں کا چہرہ دیکھا۔ وہ بہت بے بسی ہوئی تھی "سن رہی ہو؟" میں نے اسے ٹوکا۔

صاحب کے اس التفات، ان احساسات کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا؟

"ہو نا تو وہ حیدر آباد سے چلے آئے پر کیوں آمادہ ہو تیں۔ نواب کو حیدر آباد سے ان کی ہجرت کی اطلاع ملی تو اس نے نذرانے بھرے طشت کے ساتھ پیغام بھیجا تھا، خانم آپلی نے اپنا ارادہ نہیں بدلا اور جب ہم روگائی کے لیے ریل گاڑی میں بیٹھ چکے تھے تو نواب عالم تاب نے اسٹیشن آگے خانم آپلی سے عرض گزار کی تھی۔ اس کا جہاں پہرا اور طہلی ہوئی آنکھیں میں نہیں بھول سکا ہوں مگر خانم آپلی نے کچھ سوچ کے ہی اسے نامراد و ناشاد واپس کیا ہوگا۔ وہ ایک متوازن خاتون ہیں۔ نوابوں کی اپنی ایک روایتی طرز زندگی ہوتی ہے۔ آپلی نے سوچا ہوگا، وہ کہاں، کس حد تک نواب کے ماحول میں موزوں ہو سکتی ہیں۔ کچھ عرصے میں نواب کا جوش و جذبہ سرد نہ پڑ جائے۔ مال و زر والوں کو ایک گداز اپنے مال و زر کا تو ہوتا ہی ہے۔ ان کی طبیعت میں قرار نہیں ہوتا۔ مال و زر کی آزادی انہیں کچھ نیا دیکھنے، نیا کرنے پر اکساتی رہتی ہے۔ ممکن ہے، خانم آپلی نے نواب کو شاید اتنا محسوس نہ کیا ہو جتنا نواب نے انہیں محسوس کیا تھا یا شاید آپلی کو اپنا احوال، اپنی قلبی کیفیت منتقل کرنے کی کو تابی نواب سے ہوئی ہو۔ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک آدمی کسی کے بہت قریب ہو اور کسی کو بہت عزیز سمجھتا ہو تو ضروری نہیں کہ دوسرا بھی اسی نسبت سے یہ احساس قوت اخذ کرنا ہو یا اس کا عرفان رکھتا ہو یا جواب میں اسی شد و مد سے تپاک کا اظہار کرے۔ ٹھیک ہے نا؟" میں نے اسے گم سم دیکھ کے تذبذب سے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" زمریں کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے، ایک کے جذبہ و احساس کے یقین و اعتراف کے باوجود دوسرے کے اپنے تحفظات ہوں، اس کا بھی اپنا ایک ارادہ، ایک اختیار ہوتا ہے۔"

زمریں نے سر جھکا لیا اور کسی قدر تاوان آواز میں تائید کی "ہاں" دوسرا بھی تو اپنا اختیار رکھتا ہے۔

بات کی تھی؟“ زریں تجھس لہجے میں بولی۔
 ”اس کا موقع نہیں ملا، شاید آبی جانتی ہوں گی کہ مغلوب نواب ان کی ہر بات تسلیم کر کے گالین کتنے دنوں تک کوئی خوشگوار صورت حال جاری رہ سکتی ہے۔ نواب کے قول و قرار سے زیادہ خاتم آبی کو اپنے اختیار میں ضمانت محسوس ہوتی ہوگی۔ کچھ ایسی ہی بات ہوگی۔“
 ”ہاں، ہوش مندی تو یہی تھی۔“ زریں زیرِ لبی سے بولی
 ”مگر سب کچھ ہوش ہی تو نہیں ہوتا۔“
 میں اسے دیکھا کیا اور مجھ سے کوئی جواب نہ دیا جاسکا۔
 ”پھر نواب عالم تاب شاید زندہ رہتے۔“ وہ اواسی سے بولی۔

”یہی کہا جاسکتا ہے کہ خاتم آبی کو نواب کے خلاف طم کا پوری طرح اندازہ نہیں تھا، احساس میں نہیں کہ رہا۔ وہ ایک حساس اور نرم و نازک خاتون ہیں۔ نواب کی موت کے بعد شاید انہوں نے اسے جانایا پچھتاوا کچھ بھی کہے۔ نواب کے انتقال کے بعد عرصے تک اس کے سوگوار گھر میں ان کے قیام کی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ میں سوچتا ہوں نواب کی کم ہمتی، اس کی نفرت تھی، اس نے بیرونی کیوں نہیں کی، وہ اپنے گھر سے کیوں نہیں نکل گیا۔ استیشن سے وہ گھر واپس تھیں چلا گیا؟ ایک آدمی تو کبھی کسی کے لیے ساری دنیا سے بڑا ہوتا ہے، ساری دنیا ہوتا ہے۔ نواب کو معلوم نہیں تھا، ایک آدمی کے لیے کبھی ساری زندگی ترک کرنی پڑتی ہے۔“
 ”اور انہوں نے ترک کر دی۔“ وہ یاسیت سے بولی۔
 ”یہ ترک سے زیادہ پسیالی ہے۔ وہ اسی پر کیوں مایوس ہو گیا۔“

”اور اگر بے روی کے بعد بھی یہی صورت ہوتی۔“
 ”ہو سکتا ہے لیکن، لیکن۔“ میں نے جز بڑھو کے کہا
 ”بہر حال اس نے وہ تبدیلی میں غلط کی۔ اسے خاطر جمع رکھنی چاہیے تھی کہ اب نہیں تو کل، بعد میں آبی، جواب تک نہیں جان سکی ہیں، جان لیں گی۔ یوں کسی دن وہ آبی پر اثر انداز بھی ہو سکتا تھا۔“

”اور اگر ایسا نہ ہوتا؟ یہی حاصل رہتا؟“
 ”تو تو۔“ میری آواز بھج گئی، ”ہاں تو پھر یہی ہوتا۔“
 ”ممکن ہے،“ نواب عالم تاب اسی نتیجے پر پہنچے ہوں کہ اب مزید عرض حال جنت کے مترادف ہے۔ پھر وہ کیا کرتے؟
 فتنیں تو نہیں کی جاسکتی تھیں، وہاں تو نہیں دی جاسکتی تھیں۔ خاتم آبی کے ہاں انہوں نے کوئی گوشہ نہیں دیکھا تبھی پھر انہیں کیا کرنا چاہیے تھا؟ دوسرے آدمی پر تو بہت

کچھ منحصر ہے۔ دوسرے آدمی میں اتنا سمندر نہ ہو یا اور منظر کے تحریش ہو۔ دوسرے آدمی کا ہمسارے بڑا ارادہ، اپنے تحفظات، اپنے اندیشے اور اپنی ہوش ہے۔ جستجو اور طلب بھی تو کسی کے اختیار میں نہیں، کوئی کسی کی شدید طلب کے باوجود اس سے محروم رہنے ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو وہ اپنے مطلوب کی اس دے، اس سے کنارہ کش ہو جائے، اسے فراموش کر کوشش میں اپنے آپ پر قدرت حاصل کر لے۔ یہ تو ہو تو مطلوب کی یاد، اس کا تصور ہی متاعِ جاں سمجھے، قناعت کرے لیکن یاد سے تو طلب اور سوا ہوتی ہے۔ نواب اپنی مراد پر آنے سے مایوس ہو گئے ہوں گے لیکن نقش مٹانے پر قادر نہیں ہوں گے۔ وہ دوست بردار ہوئے تھے۔ وہ تو اور وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ ہوش مند منزل سے دور جا چکے تھے شاید بہت دور جا چکے تھے۔ اس بس میں کچھ نہیں رہ گیا ہوگا۔ کسی کے لیے یہ کیا بخیر کہ اتنی امنگوں، اتنی قربتوں کے بعد کوئی دوسرا اس کی مائل نہ ہو۔ اور ظلم و جارحی بھی اپنی ایک انا ہوتی ہے اس سرکشی پر اسکی ہے تو شکست بھی تو ہوتی ہے۔ آدمی پر آپ کو تمام کر لیتا ہے۔ یہ تو بآبی کی عنایت ہوتی، انہوں آبی کو وہاں پہنچانے کا وعدہ کر لیا اور نواب کو آخری میں سکون کی سانسیں نصیب ہو گئیں۔“

میری حیران نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ اس کے میں بڑی اثر انگیزی تھی۔ زریں کی سوچ بوجھ کا میں کیا قائل۔ تھے لیکن یہ کتنے آفریں کلام، یہ شدتِ اظہار، مندی اور دل سوڑی۔ ان معاملات میں اس کی نظر آڈ اور تیز ہے، اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ گلتا تھا، ابر گزشتہ عرصے میں کثرت سے مطالعہ کیا ہے۔ ما درستیہ کھولنا، تمہیں روشن کرنا ہے۔ وہ چار دیواری بند رہتی تھی، مگر کتابوں سے کچھ کم مشاہدہ نہیں ہونا مشاہدہ کے لیے جستجو اور فکر بھی تو لازم ہے۔ مجھے رشک آ رہا تھا۔ مجھے زیادہ آتی، وہ بھی ایسی فکر آفریں کرتی تھی، اور ہاں جو میں بھی، اپنے چہرے پر میری محو نگاہوں سے وہ سینے لگی اور کچھ شراب سی گئی۔ اس کا چہرہ ہو گیا، ”شاید تمہی ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے بے در سے کہا، ”تم تو تم تو۔ کمال ہے۔“

اس نے موضوع بدل دیا اور رک رک کے بولی،
 ”نواب عالم تاب کے انتقال کے بعد۔“
 ”پھر، پھر ہم کئی دن تک اس کے گھر ممان۔“

اب جہاں تاب نے ہمیں۔ اصرار روک لیا تھا پھر وہاں ہم نواب شہت جنگ کے توسط سے ابا جان کی خریدی دلی حویلی میں منتقل ہو گئے۔ حویلی کیا تھی، کوئی محل تھا۔ اب شہت جنگ ابا جان کا والد و شیدا ہو چکا تھا۔ اس نے فوج و جاہ کے دل وادہ اپنے ہم شرب نوابوں کو ابا جان کے رکے ہوئے گھرے کا دیدار کر لیا تو کبھی دنگ رہ گئے۔ طرح طرح کے امرا، روسا ابا جان کے پاس نوادری امید میں آئے رہ گئے۔ ابا جان کی معذرت قبول نہیں کی۔ ایک رات ہی میں سے ایک جنونی نے ابا جان کی نو خرید حویلی میں شب بیا مارا، اسلحہ آدمیوں کا دستہ دیواریں پھانڈ کے اندر گھس باور ہم سب کو گھیر لیا۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ہم اپنا اہر کا خزانہ ان پر ظاہر کریں، انہوں نے ہم سب کو ایک کمرے میں جمع کر دیا اور بطور خاص ابا جان کو بدھ بنایا، جنگلی کی انتہا کر دی۔ ہمارے سامنے ابا جان کو گالیاں بکس، رہبان پر ہاتھ ڈالا، طمانچے، کے، خربیں، لباس تار تار کر دیا، رہنمائی داد فریاد کرتے رہے۔ ابا جان کے پاس محفوظ وہ نادر میرے ان کے منہ پر مارے جاسکتے تھے۔ ابا جان کے ہاں ان کی کوئی کمی نہیں تھی مگر پھر تو ریاست میں ہم سب کی لوہوں میں آجاتے۔ ریاست سے ہمارا انکنا شکل ہو جاتا۔ وہ رائے کے آدمی تھے، بڑے شور و پست، اول درجے کے بے رحم و بے لطف کے آئے تھے کہ انہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹنا۔ انہیں بھینٹے، کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے ہم سبھی نے اپنی اپنی کوشش کی، پھر کانٹے سے ضبط مل ہوا۔ اس نے خود کو واؤ پر لگا دیا، ترغیبت کے سامنے اے کھڑا ہو گیا اور الجھ پڑا۔ اس جرات کی اسے قیمت ادا کرنی پڑی۔ انہوں نے سے بری طرح مارا اور اپنے چند آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ اسے کمرے سے لے جائیں۔ کانٹے نے انہیں کچھ ایسا تاثر بھی دیا تھا کہ وہ حویلی میں چھپے ہوئے بول کی جگہ آنکار کر سکتا ہے۔ دھکیلتے، مارتے پیتے ہوئے بارگاہی کانٹے کو کمرے سے لے گئے۔ ان کی تعداد اس لحاظ سے کہ ہو گئی تھی۔ چوبیس کی نفری تھی۔ کچھ باہر پیرا سر رہے تھے، کچھ مختلف کمروں کی تلاشی میں مصروف تھے۔ کانٹے کے چلے جانے کے بعد ہم نے آپسی اختلاف کی شوشہ طرازی کی۔ بظاہر ہر بھٹل بھائی اور بیرو بھائی میں ٹھن گئی۔ فتنے نے بھٹل کو ملانچہ مارا۔ بیرو بھائی نے ہیرے افشا کرنے کی آمادگی ظاہر کر دی تھی اور بھٹل بھائی انہیں گولہ کر رہے تھے۔ جیسے ہی سرغند بیرو بھائی کے مقابل آیا، انہوں نے ایک ایک پیٹرا بدل کے نہایت مشتاقی اور پھر تری سے بازیگر

اسے جکڑ لیا۔ یہ منظور کیجے کہ سرغند کے ساتھی بدحواسی میں بیرو بھائی کی طرف دوڑ پڑے۔ اور ہمیں اس لمحے کی رعایت مل گئی جس کے ہم سب بچھڑ گئے۔
 وہ رات قیامت کی رات تھی۔ بھٹل اور بیرو بھائی، شامو، بھو، ٹنگو، مارنی، زورا اور میں، ہم نے ان سے ہتھیار چھین لیے۔ اور دوسرے کمرے میں خود کانٹے ان کے چار آدمی بے بس کر دیا تھا مگر اس کوشش میں خود کانٹے بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ ان ڈاکوؤں، حملہ آوروں کو جان سے مار دینے کے بجائے ہم نے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی بند و قفس ناچارہ کر کے انہیں لوٹا دیں اور ان سے یہ بھی معلوم نہیں کیا کہ انہیں پتھروں کے کس دیوانے نے بھیجا تھا۔
 ”کیوں؟ اس میں کیا مصلحت تھی؟“ زریں تعجب سے بولی۔

”ہمیں ریاست سے کسی طور پر عافیت نکل جانا تھا، مزید کسی بکھیرے میں پڑے بغیر۔ ہماری ذرا سی نادانی سے پولیس کی دخل اندازی ہو جاتی۔ ابا جان کی حویلی مرکز نگاہ بن جاتی۔ اور جاتی ہو، ہم نے ان وحشیوں سے کیوں یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کس ذی حیثیت شخص کے فرستادہ ہیں؟“

”میں، میں سمجھ گئی۔“ وہ تیزی سے بولی، ”یہی پردہ پوشی بہتر تھی۔ وہ شخص زوج ہو کے یا منتشر ہو کے یا اشتعال میں آ کے، اپنی رسوائی سے بچنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا اور ہمارے راستے کی رکاوٹ بن سکتا تھا۔ یوں مزید پیچیدگی پیدا ہو سکتی تھی۔ یہی نا؟“

”بالکل، بالکل۔“ میں نے اضطرابی لہجے میں کہا، ”یہ بات تھی، اور پھر ہم نے حیدر آباد سے روانگی میں بہت غلط کی لیکن بیرو بھائی نے ایک بار پھر نواب ثروت یار سے مل لینا مناسب سمجھا۔“

زریں کچھ مستعد ہو گئی اور پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی،
 ”میں یہی پوچھنا چاہتی تھی۔“
 ”حیدر آباد جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بیرو بھائی نے مجھے بتایا بھی نہیں، بس چل پڑے۔ مجھے تو اس وقت معلوم ہوا جب ہم نواب ثروت یار کے محلے حمایت گھر میں داخل ہوئے۔ اتنی جلد ہمیں دوبارہ دیکھ کے نواب حیران ہوا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ابھی ہم حیدر آباد ہی میں تھے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا کہ اسے اتفاق کہنے، آپ لوگوں نے یہاں آنے میں کچھ دیر کر دی۔ اس دوران مولوی صاحب آئے تھے۔ وہ کچھ پریشان سے تھے اور حیدر آباد میں

مستقل قیام کے لیے کوئی چھوٹا مکان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ نواب کی درخواست پر کہ جب تک کسی معقول مکان کا بندوبست نہیں ہو جاتا وہ اس کے گھر قیام کریں، مولوی صاحب راضی ہو گئے۔ مولوی صاحب کی گفتگو سے نواب کو محسوس ہوا کہ وہ مالی طور پر خاصے فکر مند ہیں۔ اس نے گزشتہ ملاقات میں ہم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر مولوی صاحب حیدر آباد واپس آ گئے تو وہ انہیں ہماری آمد سے مطلع نہیں کرے گا اور ہمیں یہی خط خطہ دے گا۔ نواب کے بقول، وہ اپنے وعدے پر کار بند رہا اور یہ سوچ کے اس نے ہمیں خط لکھتے میں جلدی نہیں کی کہ اب تو مولوی صاحب کا قیام مستقل حیدر آباد ہی میں ہے، کسی وقت بھی وہ ہمیں مطلع کر سکتا ہے پھر ایک روز اس نے سوچا کہیوں نہ اشارہ نامولی صاحب سے ہمارا ذکر کر کے ان کا عندیہ جانے اور ہماری طرف سے ان کا تذکرہ در کرنے کی کوشش کرے۔ مولوی صاحب کی مالی حالت اس طرح بھی بہتر ہو سکتی ہے، اگر انہیں ان کی آبائی جائیداد ہماری تحویل میں ان کی کوئی پرانی امانت واپس مل جائے۔ کچھ ملاقات میں ہم نے مولوی صاحب کی تلاش کی یہی وجہ نواب سے بیان کی تھی۔ نواب کی زبانی میرا نام سن کے مولوی صاحب کا عجیب حال ہوا۔ وہ بے کل ہو گئے۔ پوچھنے لگے، کب آئے اور کیوں آئے تھے؟ نواب ثروت یار نے محل سے ہماری آمد کی روداد سنائی کہ کہاں سے ہمیں مولوی صاحب کا پتہ ملا، ہم ان کے لیے کتے مضطرب تھے اور ہم نواب کو یہی کپڑے دے گئے ہیں۔ نواب نے مولوی صاحب سے پوچھا، اجازت ہو تو ہمیں یہی مطلع کروا جائے کیا ہرج ہے، ایک بار ان سے مل بیٹھے اور کوئی خطا ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے۔ نواب نے ہماری بڑی سفارش کی۔ جواب میں مولوی صاحب نے کہا کہ ہمارا پتہ انہیں دے دیا جائے، ابھی دماغ حاضر نہیں ہے، کسی مناسب وقت ہم سے رابطہ کر لیا جائے گا۔ نواب پھر کیا کتا، چپ ہو گیا۔ رات کے کھانے پر نواب سے مولوی صاحب کی ملاقات ہوئی تو مولوی صاحب نے ہمارا پتہ طلب نہیں کیا۔ دوسرے دن نواب اپنے کسی ہندو دوست کی شادی میں حیدر آباد سے ملحق شہر سکندر آباد چلا گیا تھا کہ مولوی صاحب کسی ملازم یا کھر کے کسی فرد کو بتائے بغیر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ مولوی صاحب کے اس طرح روپوش ہو جانے سے نواب بہت غم زدہ تھا۔ کہنے لگا کہ وہ سمجھتے سے قاصر ہے، آخر اس کی کون سی بات مولوی صاحب کو گراں گزر گئی۔ اس نے بتایا کہ اس کی والدہ کو کورا اتنی پسند آتی تھی کہ وہ مولوی صاحب سے

نواب اور کورا کے رشتے کی خواہش کا اظہار کیے بغیر نہ سکیں۔ اس کی ماں کا خیال تھا، ممکن ہے، مولوی صاحب ایک نوجوان بیٹی کی ذمہ داری کی وجہ سے شکر ہوں۔ اس طرح ان کا بوجھ بٹکا ہو جائے گا اور ایک ماں کو اپنی پسند کی بہن مل جائے گی میں نے نواب کو نہیں بتایا کہ یہ بات نہیں تھی۔ مولوی صاحب کو نواب ثروت یار جیسے ذی وقار و تہذیب اور عالی نسب شخص سے کورا کا رشتہ منظور نہیں تھا تو وہ میں غور کر سکتے تھے، سوچنے کے لیے وقت طلب کر سکتے تھے شاید کوئی بھی فوراً پاں نہیں کر دیتا۔ مولوی صاحب تو میری وجہ سے کہ میں نواب ثروت یار کے قیام کے دوران میں نہ بچا جاؤں، فوراً وہاں سے چلے گئے، چلے گئے یا فرار ہو گئے۔ میری آواز گھٹ گئی۔

”مگر کیوں؟“ ”زیریں بے چینی سے بولی۔
”کیا کہا جا سکتا ہے، ظاہر ہے،“ وہ مجھے کوئی بہت براہی سمجھتے ہیں اس لیے کہ میں سزایافتہ ہوں، سات سال جیل میں گزارے ہیں میں نے۔ وہ مجھ سے خوف زدہ ہیں۔ اب وہ کورا کو میری امانت نہیں سمجھتے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ میں ان سے کورا کو چھین لوں گا۔ کیا بتاؤں، یہی کچھ ہو سکتا ہے۔“
”اور وہ،“ وہ کورا، نرجس بانو کو، وہ اسے کیسے سمجھاتے ہوں گے کیا یاد کر لیا ہوگا انہوں نے اسے؟“

”جائے کیا کہا ہوگا،“ یہی کہ وہ تو میری تلاش میں جگہ جگہ گھوم رہے ہیں۔ انہوں نے اسی آسمے میں اسے زندہ کیا ہوگا۔“
”مگر کب تک وہ اس نازک لڑکی کو دلالتے دیتے رہیں گے؟“

”جائے انہوں نے کیا سوچا ہے۔ ان کے دل میں کیا ہے، یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“ میں نے جھجھرائی آواز میں کہا۔

”دہرہ نے مجھے کورا کی بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ وہ بہت یاد کرتی ہے اسے، کہتی ہے، خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔“ ”زیریں سمجھتے ہوئے بولی۔
”ہاں۔“ میری آواز ڈوبنے لگی، مگر اب تو وہ مولوی صاحب کے قفسے میں ہے۔“

زیریں چپ ہو گئی۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ مولوی صاحب کے ذکر سے میرے رگ و پے میں پھر وہی سوزش ہونے لگی تھی۔ لمبے گزر گئے، پھر زیریں نے جیسے جیسے پوچھا، ”پھر حیدر آباد سے سیدھے ہمیں چلے گئے ہوئے؟“ ”ہاں آں۔“ میں نے چونک کے کہا، ”اسی دن رات

راتے میں زخمی کانتے کی حالت اور خراب ہو گئی۔ ادھر وہاں کہ کچھ لوگ ہمارے تعاقب میں ہیں۔ ہم ان سے بھاگنے رہے۔ دو ایک کو تو راستے میں بھگتا دیا، دو کو تک لے آئے وہاں پیرو بھائی کے ٹھکانے میں، سمجھو،“
”نہ کرنا گیا۔ بعد میں جب ان کی پٹائی کی گئی تو انہوں نے حیدر آباد کے ایک بڑے سرکاری افسر، نسبت شاہ کا نام انہیں کچھ اور ایسا پٹائی کی تو معلوم ہوا کہ نسبت شاہ ان کے دوست نواب حسرت جنگ کا محنت ہے۔“

”ارے!“ وہ بھٹی بھٹی آنکھوں سے بولی، ”یعنی اس بابا جان کی حویلی میں وہ درندے اس نے پیچھے تھے؟“
”یہ تو انہوں نے قبول نہیں کیا، ان کا کہنا تھا کہ انہیں تو ہمارے پتے، ہمارے کوائف جاننے کے لیے ہمارا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ خیر، ہم نے زیادہ چھان نہیں کی۔ اب ہمیں کرنا بھی کیا تھا۔ اس شخص کی نشان دہی ہو جاتی تو ہم حیدر آباد جا کے کون سا اس کے محل پر پلٹنا کرتے۔“

”فرخ، فریال وغیرہ سے کب ملتا ہوا؟“ ”زیریں نے بات سے پوچھا،“ اور کیا حال ہوا؟“
”کچھ نہ پوچھو،“ تبت کے سفر پر روانہ ہوتے ہوئے ابا کو واپس کا اعتماد نہیں تھا، انہوں نے وہاں جانے سے سارا انتظام کر دیا تھا۔ اپنے بچوں کے نام ایک سر منزلہ ناخبرہ کے انہوں نے ایک شریف النفس، دین دار شخص کی اکرم کے سر کر دیا تھا۔ اوپر کی روز نہیں کرا لے پر اٹھا لگی تھیں، اس گرا لے سے مولوی اکرم گھر کا خرچ چلاتے۔

مولوی اکرم کو ایک بڑی رقم الگ سے بھی دی تھی اور کہنا تھا کہ تین سال تک ان کی واپسی نہ ہو سکے تو مولوی اکرم کو مناسب جگہوں پر لڑکیوں کے رشتے کرنے کا اختیار دے دیا۔ زیریں کی رو سے اکبر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے۔ مولوی اکرم ہر معاملے کے مختار تھے البتہ مکان فروخت نہ یا اپنے نام منتقل کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ مولوی اکرم کو مونا کا روبرو کر کے اچھی بجلی گزر بسر کرتے تھے۔
”میں ان میں آنے کے بعد کل وقتی گمرانی کی وجہ سے انہیں مستقل کاروباری شغل ترک کرنا پڑا۔ انہوں نے شرافت کا اظہار کیا۔ دنیا میں اسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔“

”میں نے اپنے نام منتقل کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ مولوی اکرم کو مونا کا روبرو کر کے اچھی بجلی گزر بسر کرتے تھے۔“
”میں نے اپنے نام منتقل کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ مولوی اکرم کو مونا کا روبرو کر کے اچھی بجلی گزر بسر کرتے تھے۔“
”میں نے اپنے نام منتقل کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ مولوی اکرم کو مونا کا روبرو کر کے اچھی بجلی گزر بسر کرتے تھے۔“

کوئی خواب دیکھ رہی تھیں، میں بھی اسے خواب ہی سمجھ رہا تھا۔ اتنے دنوں بعد ان کا بھائی اس طرح سامنے آجائے گا اور اتنے دنوں بعد میں ان کی شکلیں دیکھ سکوں گا۔ یہ سارا کچھ کسی خواب کے مانند ہی تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مجھے تو اپنا یا ر اسی نہ تھا۔ ان کی خوشی تو دہری تھی۔ اباجان بھی بے سلامت واپس آ گئے تھے پھر انہیں جہاں گیر کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بھی ان سے دور نہیں ہے۔ وہ سب مجھے پھو چھو کے دیکھتی تھیں اولن کے بیڑ میں پر نہیں بک رہے تھے۔ اکبر میرے گلے میں جھول جھول گیا۔ وہ منظر عجیب تھا۔ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اتنے عرصے بعد ہم اکٹھے ہوئے تھے۔ مجھے ای اور فنی بیاد آ رہی تھیں مگر مگر کانتے نے سب کچھ منتقل کر دیا، اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا اور آخروہ پار گیا، وہ شخص جو دس بارہ آدمیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، خود بے پار گیا۔ آدمی کی سب سے بڑی شکست تو خود سے ہوتی ہے اور کانتے کی موت کا بیسواں دن تھا۔ جولین کے گھر سب جمع تھے۔ پیرو بھائی اور ماچھی رات کو گھر سے نکلے۔ انہیں کوئی بار دہی گئی۔ وہ بھی چلے گئے۔“

زیریں کو کانتے، پیرو اور ماچھی کی موت کا علم تھا۔ اس نے سر جھکا لیا اور دل گرفتہ آواز میں بولی، ”مگر ان دونوں نے کسی کا کیا کیا تھا؟“

”وہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ میں نے زہر خند سے کہا، ”یوں سمجھو کہ تبت کے سفر پر ہماری ساتھ جانے کی وجہ سے پیرو بھائی نے اپنا ٹھکانا اپنے مندر، معتبر لوگوں کے سپرد کر دیا تھا۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کے پروردہ لوگوں نے خوب گل کھلائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب شاید پیرو بھائی واپس نہ آئیں۔ پیرو بھائی اچانک ایک روز ہمیں واپس پہنچے تھے تو سبوں کو سانپ سونگھ گیا۔ پیرو بھائی نے جب سب کچھ الٹ پلٹ دیکھا تو ایک ایک کو خوب لٹاؤ، رگیدا۔ کچھ تو سنبھل گئے، کچھ نے دل میں کینہ رکھ لیا۔ ان میں ایک شخص تھا، جارجی نام کا، پیرو بھائی ہی کا بیٹا ہوا تھا۔ اس کی شادی بھی پیرو بھائی نے اپنی معنوی بیٹی ماری سے کرانی تھی۔“

میں نے بہت احتیاط کی لیکن جارجی کا نام آتے ہی بے اختیار میری زبان سے نکل گیا، ”اسی کتے نے اپنے ایک سانپ کی مدد سے پیرو بھائی کو ختم کیا تھا۔“

زیریں نے اپنی آنکھوں پر پلکوں کا پردہ کر لیا اور مجھے پشیمانی سے بھالایا۔ میں نے کہا، ”وہ بڑا کینہ تھا۔ سارے شہر میں پیرو بھائی کی موت کا چرچا تھا۔ پولیس ہم پر بھی شک کر رہی تھی۔ ہمیں بھی طلب کر لیا گیا تھا۔ ہم نے بہت دلیلیں

دیں تھی، ہمیں چھوڑا گیا، ہم نے ان سے کچھ وقت مانگا تھا۔ بہت صاف ستھرا قتل کیا تھا جابری نے، وہ کبھی نہ پکڑا جاتا۔ ایک روز اس کی بیوی ماری نے اسے انجام کو پہنچا دیا اور تھانے آکے اقبال جرم کر لیا۔ ماری نے سارے واقعات سے پردہ اٹھایا۔ یوں ہم بھی پولیس کے عتاب سے بچ گئے تھانے میں بیٹھل بھائی اور میں ماری سے ملے تھے، وہ اپنے اقدام پر ذرا بھی شرمندہ نہیں تھی۔ وہ تو اپنے بچوں کی طرف سے وحشت زدہ تھی۔ جب تک اس نے اپنے بچوں کو دیکھ بھال کے لیے بیٹھل بھائی سے وعدہ نہیں لے لیا، اس کی آدھ بکا جاری رہی۔ بعد میں اب جان سے کمرہ کے بیٹھل بھائی نے ماری کے بچوں کی نگرانی کا مستقل انتظام کرا دیا۔ ان کی خیر خبر رکھنے کا کام جو لین کے سپرد کیا۔

میں نے اپنی طرف سے اڑے پاڑے کے ذکر سے اجتناب کیا تھا۔ حالانکہ ذریں کو بہت کچھ معلوم تھا لیکن اپنی زبان سے مجھے اچھا نہیں لگتا تھا اسی لیے میں نے پاڑے کے بجائے بیرو بھائی کا ٹھکانا کہا تھا۔ وہ ایک معاملہ فہم لڑکی تھی، سمجھ گئی ہوگی۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ بیرو کی موت کے بعد اس کے پاڑے پر کیا واقعات رونما ہوئے، اس کا رشتہ میں کتنے لوگ شامل تھے۔ میں نے صرف یہ بتایا کہ بیرو کی بیوی اور بیٹی کو ہم اپنے گھر لے آئے۔

آپس میں چاقو بازی کی مشق کے دوران ماری کے زخمی ہو جانے اور دم واپس لین کے بعد اس کی حسرت کے واقعے سے ذریں بہت متلاطم ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس دوران حیدر آباد سے نواب ثروت یار کا خط بھی آگیا تھا کہ مولوی صاحب حیدر آباد واپس آچکے ہیں۔ ماری کی ناگفتہ بہ حالت میں ہم کیسے سزا کر سکتے تھے اور اس کے سامنے کے بعد تو کس آئے جانے کا کیا سوال، کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا تھا لیکن بیٹھل نے سفر کا ارادہ کر لیا۔ حیدر آباد میں نواب ثروت کے ہاں پہنچے، اس کی زبانی مولوی صاحب کی موجودگی کا مژدہ سننے اور اس کی معیت میں حیدر آباد شہر سے کچھ دور مولوی صاحب کے گھر کے لیے روانہ ہوئی، درمیان میں ایک سنان جگہ مونڑی خرائی کے بھانے رات گزارنے کے لیے نزدیک ترین پگہ پانہ، کسی نواب چن کے وسیع و عریض باغ میں واقع کوٹھی میں ہمیں بنکا کے لے جانے، رات گئے اس کے فرستادہ مسخ آدمیوں کا حملہ اور حیرت انگیز طور پر بیٹھل کا اصل معاملہ سو گھ لیتا۔ ان لوگوں پر یہ وقت تمام قابو یا فکلی، بیٹھل کا نواب ثروت کو جکڑ لیتا اور سرغنہ کا بیجان و اضطراب، عین لمحے بیٹھل کا سرغنہ کے نشانے سے خود چٹا

اور اپنے ستم گر نواب کو بھی بچانے کی کوشش اور بدھ سے سرغنہ کے نشانے پر اس کے آقا نواب ثروت کا اہانہ شدید زخمی حالت میں نواب کو اس کے ایک شامہ ڈاکٹر کے ہاں پہنچانا، آخری وقت میں ڈاکٹر کے سامنے نواب ثروت کا اعتراف کہ مولوی صاحب نے حیدر آباد آکے کورا اور اس کی وابستگی کے لیے میری دیوار کا ذکر کیا تھا۔ مجھے راستے سے ہٹانے اور کورا کو یہ یاد کرانے کے لیے کہ اب میرا انتظار محض ایک سہرا ہے، وہ میری آس ترک کر دے، نواب نے یہ ساری خوشگلی کی تھی۔

ذریں کی آنکھوں میں آنسو لرزاں تھے اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔
”نواب ثروت بھی نہیں رہا۔“ میں نے اسے بتایا۔
”ڈاکٹر کے بقول“ آخری وقت نواب ہم سے اپنے گھر کی معافی مانگنے کے لیے بے قرار تھا۔ اسے وقت ہی نہیں ملا۔ ہم کچھ دیر سے ڈاکٹر کے ہاں پہنچے، ڈاکٹر کو اس نے مولوی صاحب کے گھر کا پتہ بھی بتایا تھا۔ کسی تاخیر کے بغیر ہم وہاں سے سیدھے اس محلے پہنچے جہاں مولوی صاحب کی سکونت تھی مگر وہ وہاں سے جا چکے تھے۔
”وہ کیسے؟“ ذریں پر ہراسی گئی۔

”نواب ثروت کی دن تک ڈاکٹر کے ہاں زیر علاج تھا۔ اس کے ذرا نیور نے بہتر سمجھا کہ اس کی شدید حالت سے مولوی صاحب کو بھی مطلع کر دے تاکہ بعد میں اندر شکایت نہ ہو۔ مولوی صاحب نے اپنے محسن، اپنے ملا نواب ثروت کی عیادت کے لیے ڈاکٹر کے ہاں جانے کے بجائے اسی دن، شاید اسی وقت حیدر آباد چھوڑ دیا، کیونکہ ڈرا نیور نے نواب کے ہم سفر ہم دو اجنبیوں، بیٹھل بھائی اور میرا ڈاکٹر بھی ان سے کیا تھا۔

حیدر آباد سے واپس پر ریل میں سملی سے ملنے کا اجازت سملی سے سن ہی چکی ہوگی۔ حیدر آباد سے دلی جاتے ہوئے، مراد آباد کے مسافر خانے میں ٹھہر گئے۔ جہز ڈور اور سملی وہاں روک کے بیٹھل بھائی اور میں ہفتے ڈیڑھ ہفتے اطراف کے شہروں میں گھومتے رہے۔ مراد آباد میں ہمیں مولوی صاحب کے ایک دیرینہ رفیق حافظ عبداللہ کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ وہ دونوں کبھی ایک ساتھ مراد آباد کی مشہور دینی درس گاہ جامعہ قاسمیہ میں پڑھاتے تھے۔ حافظ عبداللہ نے بھی مدرسہ چھوڑ دیا تھا اور عرصہ ہوا اپنی زمینوں پر عمارت چلے گئے تھے۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔
نگہرا سادات میں مولوی صاحب کے دیرینہ رفیق حافظ

بہاؤ الدین سے ملاقات، ان سے بحث و تکرار، بیٹھل کا اپنی بر میری کلائی پر چاقو سے لکیر کھینچنا اور حافظ عبداللہ کا لعل جانا۔ ہماری روداد سن کے ان کا وعدہ کہ اب جب ہم مولوی صاحب ان کے پاس آئے، وہ ہمیں ضرور مطلع کریں گے اور میری بات مولوی صاحب کا غبار یا خوف دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ نگہرا سادات سے فیض آباد دلی کی اور لکھنؤ میں کلین خاں کے استاد شمشاد خاں کے مراد پر نہیں چار دن قیام، فیض آباد اسٹیشن پر جہز، ذرا اور دلی کو دواغ کر کے آگے کا سفر، مشرق یونی اور بہار کی بے شمار تینوں کی خاک چھانے کے بعد شہر آسن سول میں سید دوہلی کے ہاں پڑاؤ کی بابت میں نے تفصیل سے اسے بتایا۔ رکھن میں استاد شمشاد خاں کے اوپر پر رجن اور بنے ن کا مکرر اور بنے خاں کی شکست پر رجن سے میری مڈ بڑ بنے خاں کے غیاب اور چاندنی بابو کا قصہ۔ چاندنی بانو لے آؤا کے بیان سے میں نے پلو جی کی ”آسن سول کے رے میں نصیر بابا فردزاں اور یا سمن نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔“ میں نے پرمو کی سے کہا۔

وہ ہونٹ پیچھے ہوئے بولی ”فردزاں اور یا سمن کا وہاں سے کھٹا کسی تجربے سے کم نہیں۔“
”اتفاق ہے، مجھے تیار بخار آگیا تھا اور آسن سول سے گے سفر مشکل تھا۔ ہر چند میں چلتے جانے کے لیے کمر بستہ تھا۔ کلکتہ اتنا دور بھی نہیں رہ گیا تھا مگر سید محمود علی نے روک دیا۔ اس نے سمان نوازی کی حد کر دی۔ صبح وشام ڈاکٹر آتا تھا، کیا تاک تھا، کیا خاطر داری تھی۔ طرح طرح کے لوگ اس کے سمان خانے میں آکے ٹھہرتے ہیں، عالم فاضل، پنے اپنے فن کے ماہر، بڑے معزز اور مشہور لوگ۔ کوئی بھی نہیں جانتا ہوگا، ایسا متواضع میزان اتنا، اتنا بڑا۔“ میں نے دو کوٹھ دی، سید محمود علی کے لیے کوئی بدترین خطاب میری زبان پر آتے آتے رہ گیا، ”نصیر بابا کہتے ہیں، کتنے لوگ آتے آتے ہوئے رہے، کس سے بات کریں، کس کی منت کریں۔ آخر ہم وہاں پہنچ گئے، انہیں بہت دنوں سے جن دنوں کا انتظار تھا۔ تم نے دیکھا؟ وہ کیسی شیشے کی بنی ہوئی لڑکی ہیں۔ دھوپ سے جیسے ان کا بھی گزری نہ ہوا ہو۔ وہ کیسی شیشے کے سامنے میں زندگی بسر کر رہی تھیں۔“
”تم نے کمری سانس لی، بس یہی کچھ تھا۔ بہت سی باتیں تو میں نے تمہیں بتائیں بھی نہیں، بہت کچھ مجھے خود یاد نہیں رہا۔“ وہ سرگرمی سے بھی نہیں دیر تک سکوت چھایا رہا۔
”کیا سوچ رہی ہو؟“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ افسردگی سے بولی ”مجھ میں نہیں آتا، کیا کہا جائے۔“
”کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اسی لیے مجھے تامل تھا کہ میرے پاس تمہاری آسودگی کی کوئی بات نہیں ہے۔“
”لیکن یہ سب جانے بغیر مجھے ایک محرومی رہتی۔“
”میں نے پہلے ہی کہا تھا، جیتے ہوئے میں کچھ ایسا نہیں ہے جسے دہرا کر کوئی سکون حاصل ہو۔ یہ تو تم تھیں، کسی دوسرے کے سامنے تو شاید میری زبان ہی نہ نکلتی۔“
”سب کیا عجیب ہے۔“
”مجھے خود بھی یقین نہیں آتا۔“
”کبھی مجھے تم پر بہت ترس آتا ہے اور کبھی غصہ۔“
”یہی میرا حال ہے۔“
”اور عجیب بے بسی ہوتی ہے کہ میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتی۔“
”سچ پوچھو تو تم میرے بہت کام آتی ہو۔ میرے ساتھ نہ رہتے ہوئے بھی تم میرے ساتھ رہتی ہو۔ تمہارے خیال سے میری ہمت بڑھتی ہے۔ میں خود کو مضبوط محسوس کرتا ہوں۔ مجھے احساس رہتا ہے کہ کوئی میرے لیے بہت دعا میں کر رہا ہے۔ تم میرا لیون ہو، تم میرا جوج ہو۔“
”اتنا مت کہو۔“ اس کی آواز ڈونکے لگی۔ اس کے سراپا میں توجہ سامنہ اور ہوا ”میں تو صرف دعا میں ہی کر سکتی ہوں لیکن مجھے معلوم ہے، تمہیں اس سے ہوا کی ضرورت ہے۔ کاش میں بھی بابا کی طرح، بہرہ بھائی، زور بھائی کی طرح تمہارے ساتھ ہوتی۔ میں کیوں نہیں ہو سکتی؟“ اس کے لہجے میں بہت سے جذبے نمایاں تھے۔
”بیٹھل بھائی اور دوسرے کیا کم میرے لیے آزار پہنچتے ہیں کہ ایک تمہارا بھی اضافہ ہو۔ مجھے انہی سے بڑی ندامت ہوتی ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں، میری وجہ سے کتنے گھر، کتنے لوگ منتشر ہوئے۔“
”اور کتنے گھر آباد، کتنے لوگوں کی نجات بھی تمہارے سبب۔“ بولی۔ ابھی حال ہی میں دیکھو۔ یہ فردزاں اور یا سمن، تم وہاں نہ جاتے تو ان دونوں پر کیا کڑی۔“
”ہاں ان کا تو واقعی عجیب ہوا۔“
”وہ تو تمہاری بہت احسان مند ہیں۔ ہر وقت خدا کا شکر ادا کرتی ہیں۔ ہر وقت ان کی زبان پر تمہارے اور بابا کے نام کا ورد ہے۔“
”یہاں تو وہ خوش ہیں نا؟“ میں نے یوں ہی پوچھا۔

”بظاہر تو بے حد شاید باطن بھی۔“
 ”میں تم ہو تو وہ کیسے ناخوش ہو سکتی ہیں۔“
 ”ہاں۔“ وہ تھکے لہجے میں بولی ”میں تو کوئی آدمی نہیں ہوں۔“

”تم واقعی آدمی نہیں ہو۔“
 ”پھر کیا ہوں؟“
 ”تم، تم۔“ مجھے فوراً کوئی مناسب لفظ نہ سوجھ سکا ”تم نہ جانے کیا ہو۔“

”میں جانے کیسی مٹی کی بنی ہوں، یہ کتنا تو نہیں چاہتے؟“
 ”نہیں نہیں، مٹی کی نہیں، تم تو شمد کی ریشم کی بنی ہو، تم تو۔“

”بس، بس، خدا کے لیے بس کرو۔“ اس کا بدن ایک لمحے کے لیے ہلکا سا اٹھا، کہنے لگی ”مجھے تو اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا ہے۔“
 ”کیوں، کس بات سے؟“

”کیسے کسی لمحے شیشہ ہاتھ سے نہ گر جائے۔“ وہ اداس ہو گئی ”ہاتھ ہلکا بھی تو جاتے ہیں، ہلکا بھی تو جاتے ہیں۔“
 ”نہیں ہو گا ایسا۔“ میں نے عزم سے کہا۔
 ”کاش کہ ایسا ہی ہو۔“ وہ خمیدہ پلکوں سے بولی۔

اسی لمحے کہیں دور سے مرغ کی بانگ سنائی دی۔ میں نے چونک کے گھڑی دیکھی۔ تین بن چکے تھے ”یہ مرغ اب نا وقت بھی بانگ دینے لگے ہیں۔“
 ”یہ نئے زمانے کے مرغ ہیں۔“ وہ مسکرا کے بولی ”نئے زمانے میں ہر ایک کو جلدی ہے۔“

”پھر بھی رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہیں نیند تو نہیں آ رہی؟“
 ”تمہیں آ رہی ہے؟“
 ”مجھے تو جاگنے کی عادت ہے۔“

”مجھے بھی سونے سے کوئی ایسی رغبت نہیں، پھر اتنے عرصے بعد تو یہ موقع ملا ہے۔ نیند تو ادھار بھی کی جاسکتی ہے۔“

”اور کہتے ہیں، نیند کا ادھار زیادہ مدت کا نہیں ہوتا۔ نیند اپنا قرض معاف نہیں کرتی۔“
 ”کیا ایک اسے خیال آیا، اس نے ہمک کے پوچھا، ”توہ بنا کے لاؤں؟“

”تمہیں خواہش ہو تو لے آؤ۔“
 ”تمہیں نہیں ہے؟“

”تمہاری زحمت کا خیال آتا ہے۔ اب اتنی رات ہے۔ آج جلاؤ گی، پانی پالیاں۔“
 ”کچھ دیر نہیں لگے گی، بس چٹ پٹ۔“
 ”پھر میں بھی ساتھ چلتا ہوں، تمہاری کچھ مدد کر رہا ہوں۔“

”مجھے باورچی خانہ دیکھو، وہ صدیاں ہو گئیں۔“
 ”باورچی خانہ کوئی ایسی قابل دید جگہ نہیں ہے۔“
 اس نے مجھے روک دیا اور اٹھ کے تیزی سے باہر چلی گئی مگر کمرے سے چلے جانے کے بعد بھی وہ موجود رہی۔ اس کی خوشبو، اس کا خیال، میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

وہ ہر اعتبار سے کیسی مکمل لڑکی ہے، حسین و جمیل عورت اور وجہ و تحلیل مرد میں ذہانت نہ ہو تو کیسا ادھر رہا ہے ذہانت بجائے خود حسن ہے، ذہانت، سلیقہ، خوش گفتاری، خوش اطواری بھی حسن ہے۔

وہ جلد ہی واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا ٹھٹھا تھا۔ ”توہ دانی، شکر دانی، فغان اور چھوٹوں کے علاوہ طشت میں خشک میوہ بھی رکھا تھا، انناس کی قاشیں اور گلو ریاں بھی۔ اتنی جلد اس نے یہ اہتمام کر لیا تھا۔ کام کرنے کا جذبہ ہو تو سارا کام جادو کی طرح ہوتا ہے۔ جذبہ، جادو ہے۔ میں نے بڑھکھکا کے طشت میز پر رکھنے میں معاونت کی۔ اس نے فغانوں میں توہ بھرا۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ میں نے اسے کیوں بلایا ہے۔ توہ سے مجھے ہمہ جہتی کے علاوہ دار میں واقع ایرانی ہوٹل یاد آیا اور میں نے اس کی شکفتگی رکھ کے سلسلہ جنہانی کی ”تمہارا ہمہ جہتی جانے کو نہیں جی نہیں چاہتا۔“

اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔
 ”کیوں نہیں۔“ اس نے بے ساختہ کہا ”میں نے اب تک فرخ، فریال، فارہ، اور اکبر کو نہیں دیکھا ہے۔ ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔“

”اور وہاں صرف وہی نہیں، وہاں جولین، شہ بارہ اور گیتا ہے۔ وہ بھی اسی گھر کی فرد ہیں۔ میرے لیے تو فرخ، فریال کی طرح، اور وہاں، وہاں رما اور کیلاش بھی تو ہیں۔“

اس نے رما اور کیلاش کے بارے میں تجسس ظاہر کیا۔ میں نے اسے بتایا ”کائنات کی بیماری کے دوران اسپتال میں ڈاکٹر کیلاش سے تعارف ہوا تھا۔ تعارف، نقل میں بدل گیا اور مراسم ایسے بڑھے کہ گھر آنا جانا ہو گیا۔ دونوں عائلی بہن اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ دونوں میں بڑی دلکشی ہے۔ رما کے مل کے تو ہمیں احساس ہو گا، جیسے ایک شخص کی اب تک کسی بھی۔ وہ بالکل الگ لڑکی ہے، بڑی روشن خیال، اور میں تو کسوں کا، مفکر بھی، بڑی فکر انگیز باتیں کرتی ہے۔ تم میں اور

بازی گرو

اس میں بہت سی باتیں مشخک ہیں۔" میں رہا اور ڈاکٹر کی تلاش کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا۔ وہ بر شوق نگاہوں سے سنی رہی "تو پھر یہی چلتے ہیں" ہاں۔" میرے فیصلہ کن لہجے میں التجا بھی شامل تھی۔

"اچانک یہ خیال کیسے آیا؟" وہ حیرانی سے بولی۔
 "بس 'آہا' اصولاً تو بہت پہلے تمہیں وہاں ہونا چاہیے تھا یا ان لوگوں کو اس طرف آنا چاہیے تھا مگر سارے حالات تو تم سن ہی چکی ہو۔ فرصت ہی کہاں ملی لیکن اب 'اب تم تیار ہو جاؤ۔"

"مگر تم تو کہیں اور جا رہے ہو؟"
 "کہیں اور نہیں، پہلے یہی جانیں گے۔"
 "مگر کیا تو بالکل کی طرف ارادہ رکھتے ہیں۔"
 "ان سے میں بات کروں گا بلکہ تم بھی ان پر زور دیتا ہمارا یہ بات تو وہ ٹائیس گے نہیں۔"
 "اور تمہاری ٹال دیں گے؟"

"میری بات جانے دو، مجھ سے تو وہ کبھی کبھی بہت ضد کرتے ہیں۔ میری بات پر کان نہیں دھرتے۔ بہر حال، میرا خیال ہے انہیں اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ان سے کوئی نامناسب فرمائش تو نہیں کر رہے۔" ہمیشہ شہری فضیلتوں کے لیے میں طرح طرح کی دلیلیں وضع کرتا رہا۔ میں نے کہا "تمہیں وہاں جا کے ہی کچھ اندازہ ہو گا کہ وہ کیسا مختلف شر ہے پھر شاید لوٹنے کو جی نہ کرے۔"
 "میں نے شک نہ کیا ہے۔ وہ بھی تو برا شر ہے، بلکہ بہت برا۔"

"بے شک، وہ ہمیشہ سے بڑا شر ہے لیکن ہمیشہ کی بات دوسری ہے۔ وہاں اتنے کشادہ گھر تو نہیں لیکن وہ بھی گھر ہیں۔ وہاں لوگ کام کرتے ہیں اور اپنے آپ سے غرض رکھتے ہیں۔ وہاں آدمی تیز چلتا ہے اور گھڑی پر اس کی نظر رہتی ہے۔ سمجھو ہر شخص کوئی ترازو پاس رکھتا ہے۔ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے کسی حد تک چھپ چکی اور افزائش بھی نظر آتی ہے لیکن وہاں زندگی ایسی نہیں، تنگ اور اجازت نہیں ہے۔ یہاں تو گھڑی بھی شاید ست چلتی ہے۔ یہاں صرف سکون ہی سکون ہے۔ سکون کی اتنی افزائش بھی نہیں ہوتی چاہیے۔"

"اس نے قتل سے سنا۔ اس قتل میں تاک بھی تھا" میں وہاں جانے سے کب انکاری ہوں اور مجھے کسی شہرت اتنی غرض نہیں جتنی وہاں کے مکینوں سے ہے اور مکینوں میں بھی چندے۔ لیکن اپنے نہ ہوں تو کوئی ہستی اپنی نہیں لگتی۔"

"لیکن شہر سے بھی بڑا فرق پڑتا ہے۔ یہاں ان چھوٹے چھوٹے شہروں اور بستیوں میں آدمی کچھ دوسروں کا پابند نظر آتا ہے۔ لگتا ہے، یہاں ہر شخص، ہر شخص کا گھر اس سے مختلف تھا۔ یہاں بازار میں بڑے اہتمام ہی سے جاسکتی ہو، برت چھپا کے، اپنے آپ کو سمیٹ کے وہاں یہ سب کچھ نہیں ہے۔ یہاں ذرا سی بات ہو تو فساد ہو جاتی ہے، سارے شہر خبر ہو جاتی ہے، وہاں بڑی خبر نہیں ہوتی۔ تم ایک دہمی کھسی لڑکی ہو۔ تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم ان بے سہوا آواز سے نجات پاؤ؟ یہاں تو ہر عورت جیسے کسی زندان میں رہتی ہے۔ یہ چھوٹے شہر خصوصاً عورتوں کے لیے بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔"

"کیا بات ہے؟" وہ کسی قدر خوشی سے بولی "پہلے کبھی تم اس شد و مد سے اس شہر کے مخالف نہیں تھے۔"
 "مخالف نہیں، مسلسل سفر کی وجہ سے مجھے موازنے کا موقع اچھا ملا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے، بڑے شہر میں سکونت سے مراد ہے، آدمی نئی زندگی سے قریب ہے۔ نئی زندگی کے سفر میں شامل ہے، وہ ہچکچاہٹا ہوا نہیں ہے۔ اگر یہ چھوٹے شہر بھی ایسے متحرک اور سرگرم ہو جائیں تو کیا خوب ہو۔"
 "ٹھیک ہے۔" وہ خوش دلی سے بولی "ہمیشہ بھی دیکھیں گے۔"

"دیکھیں گے کیا معنی؟ بس چلنا ہے، دور کی بات نہیں سب سے کہہ دو۔"

"ایسے کیسے؟ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"
 "کیوں؟ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے، کون سی بڑی تیاری کرنی ہے۔ وہ ایک دوسرا گھر ہے، اسی گھر کے مانند وہاں ساری چیزیں موجود ہیں۔"

"جہاں گیز، نیس، سٹلی اور جو میاں کے سالانہ امتحانات میں دو مہینے رہ گئے ہیں۔"
 "یعنی جب تک تم کہیں آ جا نہیں سکتیں۔"
 "کیا مجھے اکیلے جانا ہے؟"
 "نہیں، ہمیشہ کبھی کسی کو جانا چاہیے۔"

میری مرمضانی ہوئی آواز سے اس کا بدن ہل ہوا۔ اس نے سمجھانے کے انداز میں متعدد غذر پیش کیے۔ کہنے لگی کہ زمینوں کی دیکھ بھال کا کام اب منیر علی کا بھانجا ارشد کر رہا ہے۔ معلوم نہیں، مصلوں کی کیا صورت حال ہے۔ ارشد کے ساتھ منیر علی کا بیٹا تو بر بھی بہت باڈی میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ دونوں پڑھے لکھے ہیں۔ انہوں نے کاشت کاری کے لئے

یہ آواز شروع کیے ہیں، کچھ اور زمینوں کا اضافہ بھی ہے۔ باغ بھی کثرت سے لگائے ہیں۔ زریں نے حویلی کے اٹنے میں مدفون تبت سے لائے ہوئے نوادر سے بھرے صندوقوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ نے جانے والے راستے پر نہایت رازداری سے دیوار چن گئی ہے۔ زریں کا یہ غدار ایسا معقول نہیں تھا۔ بٹیل نے صندوقوں کا کوئی بہت ہی معقول انتظام کیا ہو گا۔ نہ ان کے معاملات اتنی اہمیت رکھتے تھے۔ البتہ جہاں گیر اور ان وغیرہ کے تعلیمی سلسلے میں رخ اندازی کا معاملہ نظر از نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں جب ہو گیا۔

"ہوئے تو اب کے سفر مختصر رکھنا۔" وہ نرمی سے بولی "وہاں مہینے بعد تمہارا دھر آنا ہوا تو سب کو تیار پاؤ گے یا تم بہت سے کہیں قریب ہو تو سیدھے وہیں چلے جانا اور بس لکھ دینا۔ ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ امتحانات کے بعد اغت ہی فراغت ہوگی۔"

"دو ڈھائی مہینے کیا۔" میں نے بے دلی سے کہا "سفر میں بے یقین نہیں ہوتا، کہاں کتنا وقت لگ جائے۔ کہاں زنجیروں میں پڑ جائے۔ سفر اپنے اختیار کا نہیں ہوتا۔ تم نے ٹی کی کچھ تو سنا ہے۔"

"ضروری نہیں کہ ہر بار ایسا ہی ہو۔ ممکن ہے اس سفر کے بعد کسی اور سفر کی ضرورت ہی نہ پڑے۔"
 "کیا معلوم؟" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "کب تک یہ سلسلہ چلے گا، کہاں جا کے ختم ہو۔"

"تم بالکل نہیں بدلے، پھر وہی مایوسی کی باتیں، بالکل ہی ہو جو پہلے تھے۔"
 "تم کیا توقع کر رہی تھیں، میرے سینک نکل آئیں گے؟"

وہ کھلکھلا پڑی۔ کمرے میں جیسے گھنٹیاں بج اٹھیں، پھر تین تین انداز میں کہنے لگی "میں سمجھتی تھی، تمہارا ارادہ اور پتہ ہو چکا ہو گا۔ پہلے بھی تم نے ایسی تا امید کی باتیں کی تھیں مگر تم نے دیکھا۔ کئی جگہوں پر تم منزل پر پہنچ ہی گئے تھے۔ بس یوں تو ہوا، پہنچنے میں کچھ دیر سویر ہوئی، جیسا سیر حیدر آباد، مگر ایسا سادات۔"

"منزل پر پہنچنے کے ناکام واپس آ جانا، منزل پر پہنچ جانا نہیں ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔ اپنے لہجے کی بیزاری مجھے خود اچھی نہیں لگی۔

"لیکن راستے بند تو نہیں ہوئے۔"
 "جتنے راستے ہیں، اتنی بڑی زندگی نہیں ہوتی۔"

"پھر یہ بھی تو طویل نہیں ہوتا کہ ہم نے راستے آزمائے ہی نہیں۔ تمہارا عزم تو استوار رہا۔ نیت تو ثابت تھی، جستجو جاری رہی تھی۔" اس نے میرے فحان میں کچھ اور قہوہ ڈال دیا۔ میں نے منع نہیں کیا۔ قہوہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں نے دو گھونٹ میں ختم کر لیا۔

"تم بھی نہیں بدلیں، بالکل وہی ہو۔ مجھے یاد ہے، پچھلی مرتبہ بھی تم نے یہی کچھ کہا تھا، اور کوئی کہہ بھی کیا سکتا ہے۔ کسی کے پاس ان نشانیوں کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے۔ سب مجبور ہیں، میری طرح۔ لوگ دعاؤں کی قبولت، ستاروں کی کرشمہ سازی اور نوشتہ دیوار کی بات کرتے ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم، میرے لیے دعاؤں کی قبولت کا وقت کب آئے گا۔ ستارے کب مہمان ہوں گے اور دیوار کا لکھا کب بدلے گا۔" میرے سینے میں ہوک سی اٹھی اور میری آواز ڈولنے لگی "میرے لیے تو شاید سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ اب شاید کچھ بھی نہیں بدلے گا۔ یوں ہی میں بھاگتا رہوں گا، یہی کچھ بس یہی ہوتا۔"

"تم ایک باہمت اور بہادر نوجوان ہو۔ تم نے تو مثال قائم کی ہے۔ تم نے تو۔"

"مگر کیا حاصل؟ میں نے کیا تصور کیا ہے، کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ میں تو۔ میں تو۔" میری آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ "ارے رے، یہ کیا! نہیں نہیں، یہ نہیں۔" وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اندھنی ہوئی مسری کے پاس آ کے بے تابانہ اس نے میرا سر اپنی آغوش میں چھپالیا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن اس کے لمس میں ایسی جاذبیت اور وارفتگی تھی کہ میری آنکھیں اور جملے اور کھٹنے لگیں۔ مجھے کچھ یاد آ رہی نہ رہا۔ میں سک سک کے ہلکے ہلکے کے روتا رہا۔ اس نے میرا سر اپنی ہانوں میں بکڑ لیا تھا

پھر وہ اضطرابی انداز میں میرے بالوں میں انگلیاں بھیرنے لگی۔ میرے آنسوؤں سے اس کا کرتا بھگ گیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے سراپا میں جذب ہو جاؤں۔ میرا وجود اسی آنسوؤں میں تحلیل ہو جائے۔ اس کے ہاں بہت کداز تھا، بہت چھاؤں تھی۔

جانے کب یہ آنسو تھکے۔ سیلاب بھی کہیں جا کے ختم جاتا ہے۔ اس نے اپنے آنسوؤں سے میرے آنسو پونچھے، میرے ہنسیکے ہوئے گال خشک کیے، میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھی لہریز تھیں۔ میں نے اسے بھی رلا دیا۔ میری حالت کسی بچے کی سی ہوئی تھی۔ اس نے گلاس بھر کے مجھے پانی پلایا۔ میرے اوسان پتہ کتابیات پہلی کیشینر

کتابیات پبلکیشنز

”نہیں، نہیں“ وہ کلف آمیز غلت سے بولی ”میں تو ایسے ہی کسی نئی کتاب کی تلاش میں آنکلی تھی۔ سنا تھا کل ہی نئی کتابوں کا پارسل آیا ہے۔“

”ہاں“ نصیر بیابانہ بتایا تھا آپ کو مطالعے کا بہت شوق ہے۔“

”ہاں یوں ہی“ وہ شرابی گئی اور اس کے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے۔

”کون کون سے موضوعات آپ کو پسند ہیں؟“

”ہر اچھی تحریر، افسانہ و شاعری، ادبیات کئے، کچھ کچھ تاریخ بھی۔“ وہ کچھ سوچ سوچ کے الٹ الٹ کے بولی۔ اس کے انداز میں ہلاکی شائستگی اور نفاست تھی۔ ”اور آپ کو کون بتا رہا تھا، آپ کو بھی مطالعے کا خاصا شوق ہے“ اس نے ترنم ریز آواز میں پوچھا۔

”مجھے مطالعے کا وقت کہاں ملتا ہے۔ اسے شوق کی کی ہی کتنے ہیں لیکن مطالعہ تو کرنا چاہیے۔ مطالعے سے درپے چلتے ہیں۔“

”آپ کو کون سے موضوعات...؟“ اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”میرا کبھی کچھ یہی ہے“ میں نے ہچکچا کر کہا۔ ”بالکل آپ جیسا“ اصل میں کچھ فکر انگیز قسم کی تحریریں ہی اچھی لگتی ہیں۔ سننے خیال، نئے لفظ، نئی ترکیبوں سے مرصع، پہلے سے نئی، پہلے سے کچھ مختلف۔“

”اور ایسی تحریریں کم کم ہی ملتی ہیں“ وہ مستحی سے بولی۔ اس کی مدھم آواز میں بھی رس لکھا ہوا تھا۔

”کسی اچھی تحریر تک پہنچتے پہنچتے بڑی ناگوار تحریروں سے گزرتا پڑتا ہے اور مشکل یہ ہے، ایک معیاری تحریر کے مطالعے کے بعد کم تر درجے کی تحریروں میں جی نہیں لگتا اور یوں آدمی کا دل مطالعے سے اکتا بھی سکتا ہے“ میں نے خود کو لگام دی، کہیں میں تجاؤ تو نہیں کر رہا ہوں۔ اس کے لبوں پر دل آویز مسکراہٹ کھلی دیکھ کے مجھے تقویت حاصل ہوئی۔ میں نے پوچھا ”آپ تو فاری خوب جانتی ہوں گی؟“

”ہاں جانتی ہوں۔“

”آپ کی مادری زبان تو فاری ہے۔“

”جی ہاں“ اس نے دھکی آواز میں کہا ”لیکن مطالعے اور باقاعدہ زبان جاننے بغیر مادری زبان سے کیا ہوتا ہے۔“

”آپ کی بات سے مجھے یاد آیا، عرصہ ہوا ہمارے کالج میں ایک سن رسیدہ پروفیسر ہوتا تھا۔ عجب عجب قسم کی دلیلیں تراشتا کھیلے وضع کرتا تھا۔ وہ کتنا تھا، ذرا اس علم سے جو

اکتالی ہو۔ علم سے اس کی مراد زبان ہی تھی۔ کیونکہ اس وقت بھی بحث ہو رہی تھی کہ زید کی مادری زبان انگریزی ہے اور بکر نے ذوق و شوق سے انگریزی سیکھی ہے، دونوں میں بکر کون ہو؟ پروفیسر سیکھنے والے کو فوٹیت دیتا تھا لیکن کوئی کتاب ہی سیکھ لے، میرا خیال ہے مادری زبان کی برتری تو اپنی جگہ ہے۔“

”مادری زبان بھی اکتساب کے بغیر نامکمل ہے“ وہ باوقار انداز میں بولی۔

”یعنی کچھ یوں ہے، دونوں خوبیاں آمیز ہوں تو بات بنے“ میں نے لپکتی آواز میں کہا ”آپ کا تو علمی و ادبی خانوادے سے تعلق ہے۔ فاری میں یقیناً بہت کچھ پڑھا ہوگا۔ آپ نے؟“

”سیکھ رہی تھی لیکن بس۔“ اس کی آواز جیسے ٹوٹ گئی اور چہرے پر گھٹاسی چھانے لگی۔

”مجھے دھچکا لگا۔ افسوس بھی ہوا،“ غالت بھی ہوئی۔ واقعی اس کی عمر تو سیکھنے کی تھی کہ سید محمود علی نے اس کے والدین اس سے جدا کر دیے۔ میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا ”خیر“ آپ یہ سلسلہ اب بھی جاری رکھ سکتی ہیں۔ آپ چاہیں گی تو یہاں کسی فاری استاد کا ہندو دست ہو جائے گا۔“

وہ ایک آدھر کے رہ گئی۔

وہ ایک ماہ جمال لڑی تھی، حسن و جمال کا بھی کوئی دبدبہ ہوتا ہے۔ بار بار احتیاط کا خیال آتا تھا کہ کہیں میری کوئی بات اس نازک اندام کو ناگوار خاطر نہ ہو جائے۔ غالباً اسی لیے میری زبان کثرت کرنے لگتی تھی۔ کچھ یہ اتنا بے چارے کی رو بہ روئی، دو بہ دوئی کے سبب سے بھی ہوگا۔ یقیناً اسے احساس ہوگا کہ میں نے اس کے زخم پر دانستہ خار زنی نہیں کی ہے اور جو کسی مذہب شخص کا توہمہ ہوتا ہے، وہ اپنے دکھ اپنے ستم خود ہی تک محدود رکھتا ہے۔ ان کا اظہار کر کے وہ دوسرے کو بے آرام نہیں کرتا۔ ایک وقفہ سکوت کے بعد ”سرگوشیانہ انداز میں بولی“ آپ کو فاری بہت پسند ہے؟“

”ہے حد!“ میں نے کسی قدر جوش سے کہا ”فاری تو بہت شیریں، بڑی نرم و نازک زبان ہے۔“

”جس زبان میں ڈٹ، ٹھٹھ، ڈھڈھ وغیرہ جیسے کمرہ حرف نہ ہوں“ اس کی نفاست اور فصاحت اور لطافت کیا کہنے۔“

وہ بے ساختہ کھل کھلا بڑی اور ایسا لگا جیسے پھل جھڑنا چھوٹ بڑی ہوں، کسی نے ستار کے تار چھین دیے ہوں۔

”فاری میں“ کہتے ہیں، شاعری بے پناہ ہے بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ فاری زبان بنی ہی شاعری کے لیے ہے۔“

بازی گر

خانے ابتدا میں تھوڑی بہت فاری سیکھی تھی۔ اب تو سب بھ بھول بھال گیا ہوں۔ کاش یہ سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی نہ ملا تو وہ زبانیں ضرور سیکھوں گا، ایک فاری، دوسری انجی۔ میں آپ کو بتاؤں، میرے ایک بزرگ دوست اور اہلی تھے، راج کرشنا، پولیس کے بہت بڑے افسر تھے لیکن پس میں ہونے کے باوجود ایک عالم آدمی تھے۔ ان کے پاس لوگوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ انہیں بہت عمدہ انگریزی آتی تھی لیکن وہ فرانسیسی اور فاری زبانوں کی تعریف کرتے نہیں دیتے تھے۔“

آپ کی مادری زبان تو اردو ہے، اردو داں جلد فاری سیکھ گئے ہیں، اس کا لوجہ میریادہ بھی تھا، والمانہ بھی۔

”مگر کبھی فرصت ملے بھی تو۔“

”ابتداء میں تو میں بھی کچھ مدد کر سکتی ہوں“ وہ آہستگی سے بولی۔

”آپ!“ میرا جسم لرز گیا۔ ”آپ جیسا استاد ہو تو پھر کوئی یوں نہ پڑھے“ میری زبان سے نکل گیا اور میں نے اس بے لکھی پر خود کو سرزد نش کیا۔ سب سے بڑا نظم و ضبط زبان ہی کا ہوتا ہے اور یہی آدمی سے نہیں ہو پاتا۔

اس کے رخسار تھمتا اٹھے، جیسے شیطے سے بھڑک اٹھے ہوں مگر جلد ہی وہ سنبھل گئی گویا اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پھر وہ کہتی ہوئی، دلی ہوئی آواز میں بولی ”آپ جا رہے ہیں؟“

”ہاں، ہمیں اب جانا ہے“ میں نے انکار سے کہا۔

”خیر، کب واپس ہوگی؟“

”کچھ، کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن جلد ہی، جلد ہی آنے کی کوشش کروں گا“ وہ چپ رہی، میں نے کہا ”یہ بتائیے“

آپ کو یہاں کسی قسم کی پریشانی تو نہیں؟“

”کیسی پریشانی؟“ وہ ہراساں ہی ہو گئی۔

”ہر نئی جگہ ذرا سادقت تو لیتی ہے۔ ہمارے پاس یہی کچھ تھا۔ کوئی چیز آپ کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتی ہو تو درگزر کر دیتے تھے۔“ اسنے لوگوں میں کبھی کبھی انہیں جیس ہوئی جاتی ہے۔“

”یہاں کا تو ہم تصور ہی کر سکتے تھے“ اس کے لہجے سے منونیت نچک رہی تھی۔

”آپ سے میری بات ہی نہیں ہو پاتی اور میرے پاس کہنے کے لیے کوئی نئی بات بھی نہیں۔ یہ یقین تو بھیجی نے آپ کو کی ہوگی کہ یہاں آپ خود کو کچھ غیر نہ سمجھیں، کسی قسم کی اجنبیت نہ رہیں۔ گھر ایک دوسرے سے مماثلت کے باوجود ایک جیسے نہیں ہوتے اور زندگی میں گھبر دیتے رہتے

بازی گر 6

ہیں۔ اب یہ آپ کا کیا گھر ہے۔ اس پر آپ کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا یہاں کے کسی دوسرے کہیں گا۔“

”یہ گھر تو ہماری کسی نیکی کی جزا ہے“ وہ جھن جھناتی آواز میں بولی۔

”دیکھئے“ آپ کے نقصان کی تلافی تو کسی طور نہیں ہو سکتی۔ جانے والوں کا بدل نہیں ہوتا لیکن جانے والے کو جانا ہی ہوتا ہے۔ سب کی یہی آرزو ہے، یہاں آپ کو کوئی شگنی نہ ہو۔ پھر کچھ عرصے بعد ظفر میاں بھی آجائیں گے، وہ اب تک آجھی جاتے مگر بابا یہاں آکے کچھ ایسے مصروف ہو گئے کہ اس طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ ظفر میاں کے آجانے کے بعد آپ کو اور تقویت اور طمانیت ہوگی پھر انہیں اختیار ہے۔ وہ یہاں رہیں یا کہیں اور۔“

وہ سستی رہی۔ اس کے چہرے پر مضطربانہ شجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس نے عزم سے کہا ”ہم یہاں سے کہیں اور نہیں جائیں گے، ہمیں معلوم ہے، اس سے بہتر تلافی ممکن نہیں ہو سکتی۔ ظفر آجائیں تو اچھا ہے لیکن اگر انہوں نے یہاں سے کہیں اور جانے کی خواہش کی تو شاید ہم ان کا ساتھ نہ دے سکیں، ہم انکار کریں گے۔“

میرے ذہن میں بہت سی باتیں منڈلائیں۔ اس کے لہجے کا اثبات دیکھ کے مجھے بہت نہیں ہوئی، ”جو آپ مناسب سمجھیں“ میں نے متانت سے کہا ”یہ تو اور اچھی بات ہے۔ ہمارا ایک دوسرا گھر بھی ہے۔ سفر سے واپسی پر سب کو وہاں لے جانے کا ارادہ ہے۔ آپ نے یہی میں اباجان کے گھر کے بارے میں شاید کچھ سنا ہو؟“

”مجھے معلوم ہے“ وہ مسکرا کے بولی۔

”پھر تو مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میری کوشش ہوگی، اب کے جلد واپسی ہو جائے یوں ہم غلط لکھتے رہیں گے لیکن چونکہ ہم آج اس جگہ، کل اس جگہ، ہمارا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہوتا اس لیے ہمیں آپ کا خط نہیں مل سکتا اور اس کی نوبت بھی نہ آئے شاید۔ یہاں زری اور خانم آچکی ہیں۔ ان کی موجودگی میں آپ کو کسی قسم کی تنہائی نہیں ہوئی چاہیے۔“

”وہ تو وہ تو۔“ فردزاں سیمائی آواز میں بولی ”ان کے لیے کیا کہا جائے خدا نے انہیں اعلیٰ صفات سے نوازا ہے۔ وہ تو سرتاپا محبت ہیں۔ ان کا لطف و کرم تو بے پایاں ہے بے شمار ہے۔“

”خدا کرے“ ایسا ہی رہے۔“

فردزاں کی تانہہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اپنے بیان

207

کتابیات پبلی کیشنز

206

کتابیات پبلی کیشنز

میں کتنی معصوم اور پر جوش ہے۔ چند ٹائٹل بعد وہ ناز بردارانہ لہجے میں بولی ”آپ سے ایک گزارش ہے۔“
”ہاں ہاں، کہئے۔ کیا بات ہے؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”آپ مجھے آپ کہہ کے کیوں مخاطب کرتے ہیں؟“
”بس یوں ہی، جانے کیوں۔“ میں نے ہلکی ہلکی آواز میں کہا ”مگر آپ بھی تو اس جرم کی مرتکب ہو رہی ہیں۔“
”آپ کی بات دگر ہے۔“

”میری بات کیا ہے؟“ میں نے لطف لیا۔
”مجھ سے نہیں کہا جائے گا“ وہ شرمیلی لہجے میں بولی ”یاسمن کو تو آپ اس ادب و احترام سے مخاطب نہیں کرتے۔“

”لیکن آپ۔۔۔ ٹھیک ہے“ مجھے اس کی دل بھگی عزیز تھی۔ میں نے وعدہ کیا ”چلے میں کو شش کروں گا۔“
”اور۔۔۔ اور آپ سے کچھ اور بھی کہنا تھا۔“
”کیا؟“ میں نے گہرا کے کہا ”دیکھئے ممنونیت کی کوئی بات۔۔۔“

”آپ نے تو۔۔۔“
وہ شاید یہی کچھ کہنا چاہتی تھی یا کوئی اور بات، میزبھیوں پر دھکتی چاپوں سے وہ رک گئی۔
کوئی تیزی سے میزبھیوں طے کر رہا تھا۔ وہ نیساں تھی۔

”ارے بابر بھائی!“ وہ اکھڑی ہوئی سانسوں سے بولی ”آپ یہاں ہیں سارے میں ڈھونڈ لیا۔“
”خیریت تو ہے؟ ذرا تسلی سے بھئی۔“
”ممانتا ہے ہیں“ نیساں پٹ پٹانی آواز میں بولی ”بابا نے آپ کو بلایا ہے، دو آدمی پیغام لے کے آئے ہیں۔“

”بابا نے بلایا ہے“ میں کرسی سے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔
”کیا کہتے ہیں؟“
”مجھے نہیں معلوم، آپ جا کے پوچھیے۔“

میں نے فرزوان کی طرف دیکھا اور محذرت چاہی۔ وہ بھی سرا سیمہ ہو گئی تھی۔ جلدی جلدی میزبھیوں اتر کے میں ڈبوڑھی میں پہنچا۔ ماما کے پاس اڑے کے دو آدمی بیٹھے تھے۔ انہیں میں جانتا تھا نام یاد نہیں آ رہے تھے۔ کسی دھوکے کا امکان نہیں تھا۔ وہ اڑے کے مستند آدمی تھے۔ پھر بھی میں نے تصدیق چاہی ”استاد کہاں ہیں اس وقت؟“

”اڑے پر ہیں بھائی!“ دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔
”انہیں وہیں بیٹھا کے میں اندر آنا، چپل کے بدلے جوتیاں پہنیں، واسٹ پٹنی اور احتیاطاً چاقو جب میں رکھ لیا۔“

راستے بھر میں مستند رہا لیکن ان دونوں کا سرخ اڑے کی جانب تھا۔

اڑے کی چوکی پر بٹھل بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد بزم لگی ہوئی تھی اور حقہ سلگ رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کے سب اٹھ گئے اور انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ بٹھل کے چہرے پر چمکے ہوئے اطمینان کے باعث میں نے سکون کی سانس لے۔ سارے راستے طرح طرح کے دوسرے مجھے تنگ کرتے رہے تھے۔ بٹھل نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلا لیا۔ میں نے اپنی اس اچانک طلبی کا مقصد جاننے میں چل گیا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ چوکی پر کھانا بچ رہا گیا۔ وہ ساواہ سا کھانا تھا۔ کھانے کے بعد حقے کے چند لمبے کش لے کے بٹھل اٹھ گیا۔ استاد سلامی اور اڑے کے دو آدمی بھی ہمارے ہم راہ تھے۔ تاکے میں بیٹھ کے ہم بازار آگئے اور بٹھل کپڑے کی دکانوں پر خریداری کرتا رہا۔ مجھ سے بھی کپڑے کی اقسام اور رنگ کے بارے میں وہ پوچھا جاتا تھا۔ مجھے کپڑوں کی قسموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن وہ نظر کو بھاتا، میں نشان دہی کر دیتا۔ اس نے مروانہ کپڑے کی خوب خریدے۔ ”خویر، ارشد، نجومیاں اور جاکٹیر کے لمبے قیمتی قیمتی کپڑے۔ میں سمجھ گیا یہ، روا لگی کی تیار ہے ہم خالی ہاتھ واپس آئے تھے۔ اب جاتے وقت ہمیں ایسے نہیں جانا چاہیے تھا۔“

بازار میں شام ہو گئی۔ کپڑوں کے کئی پلندے بن چکے تھے۔ انہیں ساتھ آنے والے آدمیوں کے سپرد کر کے ہم آگے چلے آئے استاد سلامی ہمارے ساتھ رہا۔ پھر فیض آباد کے بڑے اسپتال آکے ہم نے دم لیا۔ برکھا کے باپ لکشی داس کی جان اس کے وصال کے میں کہیں ایک گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے دماغ کی رگ پھٹ چکی ہے۔ انہیں حیرت تھی کہ اتنے دنوں سے وہ کیسے زندگی جمیل رہا ہے۔ آدمی کو موت بھی پریشان کرتی ہے۔ لکشی داس کو بالکل ہوش نہیں تھا، زندہ لاش کے مانند تھا۔ اسپتال سے نکلے نکلے اندھرا چھانے لگا اور مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ چلے چلے وہ پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔ تھانے دار موجود نہیں تھا لیکن اس کا ماتحت اس کی جگہ سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ ایک سنجیدہ شخص تھا۔ اس نے ہمیں کرسیوں پر بٹھایا اور خوش خلقی سے ہماری آمد کا مقدمہ دعا پوچھا۔ استاد سلامی نے مجھے اور حیران کیا۔ اس نے دہائی دی کہ اس کے اڑے کے دو آدمی ہریا اور پھوجا مارے گئے۔ اتنے دن گزرجھے۔ پولیس نے اب تک قاتلوں کی گرفتاری میں کوئی پیش رفت

نہ کی۔ پولیس کی اس بے توجہی اور سرد مہری سے اس کے لئے کی آدمی نہایت شاکہ اور بے چین ہیں، مایوس ہیں۔ اس کے سامنے اڑے کے ایک استاد کی طرف سے اس کے شک اور خدشوں کا اظہار میرے لیے نیا بھی تھا۔ یہی استاد سلامی پولیس افسر کو قائل کرتا رہا، بٹھل کی ہم توانی کر رہا تھا کہ شرمیں طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہیں بازاروں اور محلوں پر دہشت چھائی ہوئی ہے۔ آگے اور بھی سنگین واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ پولیس کی ناکامی سے وہ بٹھل کے حوصلے اور بڑھکتے ہیں۔ وہ باہل اڑے پر بھی نے کی جرات کر سکتے ہیں۔ استاد سلامی نے کہا کہ اس نے بڑے آدمیوں کو اب تنگ تھا رہے رکھا ہے، اب وہ انہیں سے بے مت کم باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے لیکن کب تک اس کے قابو میں رہیں گے، کب تک پولیس کی طرف سے ناجوئی کارروائی کا انتظار کرتے رہیں گے۔ ان کی عجیب نیت ہے۔ اپنے ساتھیوں کے خون پر وہ ہستے غم زدہ ہیں، نئے ہی مشتعل چھپی ہیں، مایوس بھی اور کسی حد تک خوف بھی۔

پولیس افسر تندی سے استاد سلامی کی عرض داشت پر روی کا اظہار کرتا رہا۔ استاد سلامی اور بٹھل نے تجویز کی کہ کسی ممکنہ فتنے کے پیش نظر چند دنوں کے لیے اڑے اڑے کے اس پاس پولیس تعینات کر دی جائے تو بہتر ہے گا۔ دفعہ شر کے لیے یہ مشورہ معقول تھا۔ پولیس افسر ناس کی تائید کی اور ہمیں عزت سے رخصت کیا۔ پولیس اسٹیشن سے نکل کر ہم تینوں سڑکوں پر شلے۔ پھر ایک چائے خانے میں آکے، ہم نے چائے پی اور دل میں خاصا وقت گزارا۔ اڑے واپس پہنچتے پہنچتے رات لگی۔

پولیس افسر نے وعدہ نبھانے میں بڑی مستعدی دکھائی۔ اس کی عمارت کے باہر تین بندوق بردار سپاہی موجود تھے۔ ایک کو ہم نے گلیوں میں گشت کرتے دیکھا تھا۔ استاد سلامی نے ان سے بہت تباہ سے سلام دعا کی۔ وہ اس کی ان پچان کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ نہ ہوتے تو پولیس لول سے جان پہچان میں کون سی مشکل ہوتی ہے۔ استاد سلامی نے انہیں رات کے کھانے کی پیش کش بھی کی اور کہا، کی چیز کی ضرورت ہو تو وہ کوئی تکلف نہ کریں۔ اڑے کے لواڑے ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ کھانا بھی تیار ہی تھا۔ اسے پہنچنے کی دیر بھی کہ دسترخوان بچھا دیا گیا۔ کھانے کے بعد استاد سلامی، بٹھل اور اڑے کے چند

آدمی باہر نکل آئے۔ مجھے بھی انہوں نے ساتھ رکھا تھا۔ ہریا اور چھوکی موت کا انھوں دن تھا۔ اڑے پر انہی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہر شخص مغفوم تھا۔ انہیں اب بازار کی طرف بڑھتے دیکھ کے میرا سر کھوٹنے لگا۔ بازار میں دن کا سماں تھا۔ دروہام نے جیسے ٹھنکھوہ بانڈھ رکھے ہوں۔ سارا علاقہ سازو آواز سے گونج رہا تھا۔ ایک بالا خانے پر ہمارے قدم رکھتے ہی نفہ سرائی بند ہو گئی۔ استاد سلامی کا وہاں بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی حاکم جلوہ افروز ہو گیا ہو۔ ہمیں ایک جانب قائلین پر بٹھا دیا گیا۔ ہم سے پہلے وہاں اور بھی تماش بین موجود تھے۔ ہماری جگہ خالی رکھی گئی تھی۔ سب ہماری آمد کے خنجر تھے۔ بٹھل کے لیے چچوان کا اہتمام تھا۔ کچتی مفتی ہوئی کم سن لڑکیاں پھلوں کے طشت، گلدستے اور گھوڑیاں لے آئیں۔ انہوں نے موتیا کے ہار ہمارے گلوں میں ڈالے۔ قہوہ بھی آگیا۔ یہ ایک بڑا بالا خانہ تھا، خوب سجا ہوا، زرنگار پردے، منقش درود پوار، نفری بھی کم نہیں معلوم ہوتی تھی۔ دروازہ قدرے فریب اندام ناکھ نے ہم سے باقاعدہ اجازت مانگی اور دل کش نقش و نگار کی ایک فوجوان سالوئی سلونی لڑکی نے از سر نو بیان اٹھائی۔ اس کی آواز بھلی تھی، اوائل کی بھی بری نہیں تھی۔ کلام بھی معاملہ بندی، چمیز خالی کا خوب یاد تھا۔ کھلتی ہوئی گندی رنکت کی دو فوجی لڑکیاں رقص کنائیں تھیں۔ واجبی سا رقص آتا تھا۔ لباس ہی ایسا چمکا دکھتا، سلی سٹاروں منکا پہنا ہوا تھا کہ رقص کی تیزی و طراری دوچند ہو گئی تھی۔ لکھنؤ میں چاندنی بانو کی نفہ سرائی اور رقص کاری دیکھنے کے بعد اب سب کچھ سچ معلوم ہوتا تھا۔ میرا تو دماغ ہی الجھا ہوا تھا، محسوس کیا کرتا۔ میں تو بٹھل اور استاد سلامی کی وجہ سے خود کو جکڑے ہوئے وہاں بیٹھا تھا اور کوئی پہلی بھی تو مسلسل اسے بوجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

انہیں وقت کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ ایک اور مغفید آگئی پھر ایک اور پھر چھوڑے بدن کی ایک خوش چہرہ پختہ عمر کی عورت نے سرائی اپنے شروع کردیے اور ساں بانڈھ دیا۔ وہ بہت سرلی تھی، آواز میں گونج تھی اور اعتماد بھی بلا تھا۔ دوسرے تماشائی رنڈہ رنڈہ کم ہوتے گئے آخر میں ہی باقی رہ گئے۔ ناکھ نے بٹھل کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ استاد سلامی نے ابتدا میں بٹھل کا تعارف کر دیا تھا۔ بٹھل کی سامنے وہ خود بھی مودب، ہاتھ باندھے، تقریباً دو زانو بیٹھا رہا اور بٹھل کے عطیات آگے کرتا رہا۔ کوئی تین بجے کے قریب یہ محفل تمام ہوئی اور گھر جانے

کے بعد بجائے بھٹل اڈے واپس آیا۔ پولیس گلیوں میں بھی موجود تھی، اڈے کی عمارت کے باہر بھی۔ استاد سلامی نے ہر ایک کی خیریت دریافت کی۔ اڈے کی وسیع چوکی خالی پڑی تھی۔ احرار دھر کی باتوں میں چارنج گئے، پھر سب وہیں چوکی پر پرے اور دو ایک گھنٹے بعد ہی اٹھ گئے۔ میں تو جانتا ہی رہا تھا۔ منج ناشتے کا ہتھام ہوتے ہوئے نونج گئے اور کوئی ساڑھے دس بجے بھٹل نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں توکل دوسرے ایک معمول تھا، منہ اٹھائے اس کے پیچھے چل دیا۔ عمارت کے باہر ناگنا تیار کھڑا تھا۔ ہم جلد ہی حویلی واپس آ گئے۔

○☆☆○

گوکہ بھٹل نے گزشتہ رات گھر نہ آنے کی بابت کہلوا دیا تھا، لیکن حویلی میں سب کے سب ہوتے چرے بتا رہے تھے کہ انہوں نے رات آرام سے نہیں گزارا ہے۔ بھٹل نے ان کی دل داری دل نوازی کے لیے احکام جاری کرنے شروع کر دیے۔ اسے دیکھی غذا میں مرغوب خالص، میٹھی نکلیاں، بننے کی دال کا کلوہ، سرسوں کی بھجیا، چٹکوں والی ماش کی دال کی کچھڑی وغیرہ، دوسرے کھانے پر اس کے فراموشی کھانے سے بچے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد بیٹھک میں اس نے زریں کو حکم دیا کہ سفر کا سامان تیار رکھا جائے۔ آئندہ دو تین دن میں کسی وقت بھی ہماری روانگی ہو سکتی ہے۔ پھر اس نے فروزاں اور یاسمن کو پاس بلا کے کہا کہ اس نے ایک آزمودہ کار وکیل سے بات کر لی ہے۔ ہفتے بھر میں وکیل بکھتے چلا جائے گا اور استاد جامو کو ساتھ لے کے آسن سول میں ان کی زمین اور جائیداد کے معاملات نمٹائے گا۔ وہ ظفر کو بھی ہر مرحلے اور ہر معاملت میں ساتھ رکھیں گے اور ظفر کو پھر بیس لے آئیں گے۔ فروزاں اور یاسمن سر جھکا کر سنتی رہیں۔ بھٹل کے ٹوکنے پر فروزاں نے کچھ جرات کی اور دے لے لے میں اپنے اندیشے کا اظہار کیا کہ آسن سول کا رخ کرنے میں پھر کوئی قضیہ نہ کھڑا ہو جائے، کیوں نہ زمین اور جائیداد پر خاک ڈال دی جائے۔ انہیں اب اس کی ضرورت نہیں، یہاں انہیں سبھی کچھ مل گیا ہے۔ فروزاں نے ظفر کو کوئی ذکر نہیں کیا۔ اتنے لوگوں کے سامنے اس کی زبان پر ظفر کا نام تا شاید مناسب بھی نہیں تھا۔

”نہیں ری، اب سارا ٹھیک ہوگا“ بھٹل نے کڑوی آواز میں کہا ”ستے میں چھوٹ گیا ری وہ۔“ اس کی زبان پر سید محمود علی کے لیے کوئی برا لفظ آتے آتے رہ گیا۔ وہ سر جھٹک کر بولا ”ہمت بوجھا ہے اپنے پر۔“ تاہم ملا تو اس کو

دیکھیں گے۔“

فروزاں اتنا ہی کہہ سکتی تھی، چپ ہو گئی۔ کھانے کے بعد خاصی دیر محفل بھی رہی اور بھی رہتی لیکن یقیناً زریں نے انہیں اشارہ کیا ہوگا کہ ایک ایک کر کے سب جا۔ لگے ان باتوں کے احساس میں زریں ماہر تھی اسے انداز ہوگا کہ گزشتہ رات ہم کتنی دیر سوئے ہوں گے۔ میں ہم اٹھ گیا تھا لیکن اپنے کمرے کی جانب ابھی میں نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ رک جانا پڑا۔ کسی نے استاد سلامی آمد کی اطلاع دی تھی۔ زریں، خانم، نیساں اور جہانگیر ام وہاں موجود تھے۔ یہ سن کے انہوں نے جلدی جلدی خیز صاف کیا اور لمحوں میں وہاں سے چلے گئے۔ اڈے کے آگے آ جانے پر پھر کوئی بیٹھک میں نہیں بیٹھ سکتا تھا، تھکائی۔ طلب نہ کیا جائے۔

استاد سلامی بولایا ہوا بیٹھک میں داخل ہوا۔ اس ساتھ اڈے کے تین اور آدمی بھی تھے۔ سلامی کا چہرہ تھا تھا، آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں، اسے سلام کا بھی خیال نہ رہا۔ بوکھلائی ہوئی آواز میں اس نے بتایا کہ اسے ابھی اطلاع ملی ہے، گزشتہ رات ٹھاکر ہر دیو اور اس کے ٹھاکر کل دیو کا خون ہو گیا ہے، ان کی خاندانی حویلی اور کچے کھلیاں راکھ ہو گئے ہیں۔ ٹھاکر ہر دیو کی پتی اور کتے۔ سارے افراد ختم ہو چکے ہیں، ان میں سے کوئی نہیں بچا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر کا پروردہ استاد گورا اور اس کے ساتھی مارے گئے۔

بھٹل نے ہنگامی بھری اور خاموش رہا۔ سب کی مضطرب نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اس کے جہود پر استاد سلامی اور بدحواس ہوا ”شائم۔ استاد؟“

”سن لیا رہے!“ بھٹل نے منہ بٹا کر کہا ”اس نے ہر بلا کے استاد سلامی اور اس کے ساتھ آنے والے اڈے۔ آدمیوں کے لیے چائے ناشتے وغیرہ کا بندوبست کرنے کا حکم دیا۔“

”یہ کیا؟ کیسے ہو گیا استاد؟“ سلامی جھپٹی آواز میں بولا ”کیا پولیس رہے!“ بھٹل نے تنک کے کہا ”خبر تو ہے؟“

”ایک دم کی استاد! مجھ کو اپنے خاص حوالدار نے ہے دیکھ لیتا، ٹھوڑی دیر میں سارے شرمیں بگل بج رہا۔“ ”تو جا کے اب کمر کا پوری رات کا جاگا ہوا ہے۔“

بازیگر

کہ مری سوا ہوگا۔“ ”مگر ہر استاد! سلامی بیڑاری سے بولا ”تمہارے جانے کے بعد کمر سیدھی کرنے کو چوکی پر پھیلا تھا پر سالی اور اپاٹ ہوئی۔“ ”اب ٹھیک سے آئے گی رہے۔“ بھٹل نے حقے کا منہ لیتے ہوئے کہا۔

”کیا بولتے ہو استاد!“ سلامی کھپسا گیا ”اپنا حوالدار بولتا تھا، ٹھاکر کوئی چھوٹا موٹا آدمی نہیں تھا۔ بڑا خاندانی رہیں تھا، باقی، گھوڑے اور پیچھے بہت زور تھا اس کا۔ پولیس میں بھی آگ لگی ہوئی ہے۔ کھنڈتک بات جا بیچی ہے۔ سر کوئی بھی ہاتھ نہیں آیا۔ کیا صفائی سے کام دکھایا ہے۔ پولیس سارے میں چھاپے مار رہی ہے۔“

بھٹل سر ہلاتا رہا۔ سلامی کے ساتھ آنے والے اڈے کے پرانے آدمی تھے، ماکن، دولھے خاں اور ڈوڈا، تینوں اپنے دامنوں پر چھایا ہوا اندھا دھڑلے کرنے کے لیے ذرا سی روشنی ڈرا سے گھماز کے طالب تھے۔ بھٹل اس سخاوت پر قادر تھا مگر سر دست اس کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بھٹل کی بے نیازی، بے حسی کے حراف تھی۔ یہ انہیں اور مضطرب اور موحش کر رہی تھی۔ پھر وہ خودی اٹھنے، ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے۔ میں گنگ بیٹھا ان کے وہم و گمان، قیاس آرائیاں، شوش طرناں سنتا رہا۔ پھر میں نے وہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ میری رگوں میں خون بہنے لگا تھا لیکن میری حالت ان سے مختلف تھی۔ معلوم و نامعلوم کا ستم مختلف ہوتا ہے۔ جانے کا غدا نہ جانے سے سوا ہوتا ہے مجھے اعتقاد دیکھ کے بھٹل نے دھمکتی آواز میں پوچھا۔ ”تو کدھری چلا رہے؟“

”کمرے میں“ میں نے بیٹھک میں کہا۔ ”تو بھی جا کے اب لمبی بچھنے۔“ میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ بہت سی باتیں سینے میں اٹھیں لیکن یہ گفتگو کا موقع نہیں تھا۔ میں نے خود کو تمام لیا اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر راہز ہو گیا۔ مجھے استاد سلامی کی سادگی پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس کی صرف دو ہی آنکھیں تھیں، صرف سامنے کی طرف دیکھنا آتا تھا۔ اسے جانے کون کی خصوصیت پر جامو نے اسے اڈے کا گھرانہ یاد کیا تھا۔ وہ کل دوسرے بھٹل کے ساتھ تھا اور بھٹل سے سوال کر رہا تھا۔ ایسے سوال جن کے جواب نہیں دیے جاتے۔ کون سی مقدمہ کشائی اسے مطلوب تھی۔ اس کے معنی تھے، کل سے استاد سلامی محض، بھٹل کا آواز کا رہا تھا۔ ایک معادلت

بازیگر

آہار، اطاعت گزار شخص کی طرح، بھٹل کے احکام کی تعمیل اس نے مقدمہ جانی تھی۔ کسی اور طرف جانے کو بچنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اسے بھٹل سے برائے نام آگئی تھی۔ اسے صرف استاد بھٹل کے بل، چاقو بازی میں کمرشہ سازی اور اڈا گیری کے معاملات میں حسن تدبیر ہی کا علم تھا۔

سلسلہ اسی دن سے شروع ہوتا ہے، استاد گورا اور ہریا کے معاملے میں میری دخل اندازی سے۔ کلکتے سے جامو کی اچانک فیض آباد آمد اور ایک رات کے قیام کے بعد شہر سے غیاب پر میرا اٹھا ٹھکا تھا۔ بھٹل کا اڈے پر مستقل پڑاؤ اور اڈے کے آدمیوں کی باگیں کھینچے رکھنا، مجھے ہر معاملے میں الگ رکھنا اور مسلسل حویلی میں مجوس رکھنا۔ میں نے بھی عواقب پر اچھی طرح غور کیا تھا اور میں نے بھی کچھ بھی نتائج اخذ کیے تھے جن کی توثیق ان کی طرف سے کی گئی ہے۔ حویلی کے خیال نے مجھے بھی وحشت زدہ کیے رکھا تھا۔ جامو، ہریا اور بھٹو کی موت سے پہلے فیض آباد آیا تھا۔ گویا اس سے پہلے ہی امکانات ذہن نشین کر لیے گئے تھے اور دیوار پر نوشتہ کندہ کر دیا گیا تھا، نوشتہ آدمی بھی تحریر کرتے ہیں۔ جامو اور جہو دو نوں بھائی اپنے دیرینہ رفیق ہریا اور بھٹو کی موت پر اتنے بڑے سانچے پر نہیں آئے۔ سوں بھی ایسے ہی گزر گیا۔ جامو اور جہو دوسرے اہم کام میں جو مصروف ہوں گے۔ ہریا اور بھٹو کی جدائی کے صدمے نے انہیں ہمیشہ ہوگا۔ پھر ادھر ان کے علاقے میں ایک نوجوان لڑکی رکھا، اس کے بد نصیب باپ کشمی داس، اس کے بے گناہ ملازمین کے خون کے بعد تو انہیں اپنے اقدام کی تجدید و تائید کا ایک اور جواز مل گیا تھا۔ ان کے عزم میں پھر اور ہنگامی آئی چاہیے۔ انہوں نے کوئی جلدی نہیں کی۔ جامو اور جہو کو کلکتے ہی میں ہونا چاہیے۔ بالکل اپنے مخدوی و مکاری استاد بھٹل کے نقش قدم پر۔ وہ کل سے پھرے مختلف جگہوں پر اپنے نشانات ثبت کر رہا تھا اور کل اس نے مجھے بھی حویلی کی قید سے آزاد کر دیا تھا کیونکہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میری چہرہ نمائی کے لیے یہ رہائی بڑی ضروری تھی۔

بھٹل اور جامو کے پاس حاشیہ برادریوں کی کمی نہیں۔ ادھر بھی، ادھر کلکتے اور حیدر آباد۔ جانے کتنی جگہوں سے ان کے اشارے پر سراپاؤں، سر فرشتوں کی فوج اکٹھی ہو سکتی ہے۔ ان کے پاس پیسے کی بھی کمی نہیں اور جہاں حویلی کی حرمت اور حفاظت پیش نظر ہو، وہاں تو وہ۔ میں نے جیسی تو ارادہ کیا تھا کہ کیوں نہ چیکے سے ایک دن خود ٹھاکر کی ریاست، اس کے کل دھمکوں کی طرف نکل جاؤں۔ یہ کیسی

کتابیات پبلکیشنز

211

بازیگر

210

کتابیات پبلکیشنز

نادانی ہوتی! یہ کام کیا ایک آدمی کے بس کا تھا۔
سب کچھ آئینے میں صاف نظر آتا تھا مگر نظر آنے سے
مراوغا طرجمانی نہیں ہے میرا جسم باہر بار دھڑکنے لگتا تھا مجھ
سے تادیر بستر نہ رہا گیا اور نہ ہی کسی سے ملنے کسی کو دیکھنے
کو دل چاہا۔ استاد سلامی ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے
بھٹل کے سایہ عاطفت کی اس قدر شدید ضرورت ہوئی کہ وہ
اور اس کے ساتھیوں کا زور دوشور ٹھہم چکا تھا۔ کسی نتیجے پر نہ
پہنچنے کا پہلا مرحلہ جراتی دوسرا مایوسی کا ہوتا ہے۔

میں وہاں سے گزرتا ہوا باہر آگیا اور ڈیوڑھی میں
موندھے پر مہم کے پاس بیٹھ گیا۔ مہم کے سینے میں داستانیں
دفن تھیں۔ اڑے سے بھی اس کا بہت عرصہ تعلق رہا تھا۔
وہ اہل ثروت کا ڈنڈا ہوا تھا، زہرا لکھتا رہا۔ اس کے بوڑھے
جسم میں بڑی نفرت بھری ہوئی تھی۔ کچھ دیر میں اس کا بیٹھنا
بھی آگیا۔ مہم نے اسے شرم کی سن گن لینے کے لیے بازار کی
طرف بھیجا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، ہر جگہ ایک ہی چرچا ہے بہت
سی دکانیں بند ہو گئی ہیں۔ شرم میں جا بجا پولیس گھوم رہی ہے۔
شرم سے باہر جانے والے ہر راستے پر پولیس کا پہرا ہے۔ ہر
آنے جانے والے شخص، سوار کی تلاشی لی جا رہی ہے۔
ٹھاکر کی بستی سے آنے والے لوگ بتاتے ہیں کہ ٹھاکر کی قدیم
حویلی کا ڈھانچا ہی باقی رہ گیا ہے۔ ابھی تک دھواں اٹھ رہا
ہے اور باغات میں تو اب تک آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ حویلی کی
فصیل کے اندر آبادی میں ملازم، عورتوں اور ان کے بچوں
کے سوا کوئی نہیں بچا۔ حملہ آور، چاقو، خنجر، پتھر اور
خنجر سے لیس تھے اور ان کی تعداد خاصی تھی۔ انہوں
نے اپنے کام بانٹ رکھے تھے۔ پولیس نے ساری بستی گھیرے
میں لے لی ہے۔ خاستر حویلی میں تو کسی کو جانے کی اجازت
نہیں۔ مہم کے بیٹھے نے جگہ جگہ لوگوں سے اصل واقعے کی
ٹوہ لینے کی کوشش کی مگر ہر جگہ تضاد بیانی ملی۔ کوئی کہتا تھا، حملہ
آوروں نے بہت لوٹ مار کی اور عورتوں سے زیادتی کی، کسی
کا کہنا تھا وہ اندھ کی طرح نمودار ہوئے اور جلد سے جلد اپنا
کام نمٹا کے آٹا فانا غائب ہو گئے۔ ان کے پاس عورتوں سے
زیادتی اور لوٹ مار کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا جب استاد سلامی اور اس کے ساتھی
بھٹل سے رخصت ہوئے۔ میرے قدم کبیں بھی نہیں ٹک
رہے تھے۔ رات کے کھانے پر معمول کے مطابق دسترخوان
پر اہتمام تھا۔ مہم بھی کھانے میں شامل تھا۔ میں تو اسے
دیکھا کیا اور خانہ پری کے لیے وہاں بیٹھا رہا۔ کھانے کے بعد
پرسوں رات کی طرح وہ سارے بیٹھک میں آگئے اور بھٹل

نے نیساں سے فرمائش کی کہ وہ اسے کچھ سنا لے۔ نیساں کی
آواز بہت اچھی تھی۔ اب نیساں بڑی ہو گئی تھی وہ شرمائے
گئی مگر بھٹل کا حکم کس طرح رد کیا جاسکتا تھا۔ اس نے ایک
پوری گیت سنایا پھر زریں کی فرمائش پر ایک غزل اس نے
شروع کی۔ اس کی آواز بہت شرمیں تھی۔ سب محو ہو گئے،
شاید سوائے میرے۔ میرا دماغ ہی بھٹکا ہوا تھا۔ ابھی نیساں
نے غزل ختم نہیں کی تھی کہ دروازے پر مہم کو مڑلا کر
کے میں اور منتشر ہو گیا۔ مہم اندر آنے کے لیے منتظر
معلوم ہوا تھا۔ میں تخت کے کنارے ہی بیٹھا تھا۔ غزل ختم
ہونے ہی پر مجھے اٹھنا چاہیے تھا لیکن میں آہستہ سے اٹھ گیا
اور دب پاؤں باہر چلا آیا۔ کسی نے محسوس کیا یا نہیں، میں
نے پلٹ گئے نہیں دیکھا۔ میرا اندازہ صبح تھا۔ مہم بھٹل کو
یہ اطلاع دینے اندر آتا چاہتا تھا کہ پولیس حویلی کے آس پاس
بھی آچکی ہے۔ یہ بڑے مکانات اور حویلیوں کا علاقہ تھا۔
جہاں شرم کے منجانب علاقوں کی طرح پولیس کی ایسی ضرورت
نہیں تھی۔

”کب پولیس آئی؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے۔“ مہم بتا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے“ مجھے اس کے سامنے استقامت کا اظہار
ہی کرنا چاہیے تھا۔ اس کی کمر چھتا کے میں بیٹھک میں
واپس آگیا۔ قہقہے ہی نیساں نے غزل ختم کی، میں بھٹل کے
پاس جا پہنچا۔ میں نے سرگوشی میں اسے بتایا تو اس نے فوج
سے سنا اور سر کی جنبش پر اکتفا کیا۔ کبھی کو میرے اس طعن
باہر جانے اور بھٹل سے کانٹا پھوسی کرنے پر ٹھک جانا چاہیے
تھا۔ بھٹل نے اس کے تدارک کے لیے نیساں سے پھر پوچھ
سنائے کی خواہش کی۔ اوور نے بھی شد و مد سے بھٹل کی ہم
نوائی کی۔ نیساں نے اب کے میری غزل، چاہتا ہوا ہوا
شروع کی۔ اس دوران میں اس کی آواز اور کھل گئی تھی۔
سب کی تحویت نیساں کے لیے داد کے مانند تھی۔ چھٹی مرتبہ
بھی بھٹل نے اس سے چند غزلیں سنی تھیں۔ اب تو وہ
کھٹار آگیا تھا۔ غزل ختم ہونے پر بھٹل نے نیساں کو اپنے
پہلو میں دبوچ لیا، اس کی پشانی چومی۔ زریں، فروزاں اور
زہرہ بھی نیساں سے لپٹ گئیں۔ اسے بہت پیار کیا۔ پھر
نیساں کی باری تھی۔ وہ چل کے بولی ”بابا! کچھ دن کے لیے
اور ٹھہر جائیے۔“

بھٹل نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا، پھر بھاری

آواز میں بولا ”ہاں رسی دیکھیں گے ابھی۔“

اس رات جلد ہی سب اٹھ گئے۔ ان سب کے ہٹ

بانے کے بعد میں بھٹل سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے
برقع نہیں دیا۔ اپنے کمرے میں جا کے دروازہ بند کر لیا۔ میں
نے بھی یہی کیا۔ کل رات بھی میں ایک چل کے لیے نہیں
ہٹا تھا۔ کل رات میں بھٹل کا پابند تھا، تنہا خود اپنا۔ خود پر
خفا رکھنا آدمی کے لیے سب سے بڑی آزمائش ہے۔ میں
نے اپنی دل جوئی کی ہر ممکن کوشش کی کہ میں اچھی طرح دیکھ
دیں سکتا ہوں۔ مجھے دلیلیں دینا آتا ہے اور سیاہ سفید بھی
ذہن نظر آتا ہے اور میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ ادھر بھٹل بھی
ہے اور کیا مختلف ہے؟ پہلے بھی ایسا ہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ اور
وہی کو میرا اضطراب نہیں روک سکتا۔ کون سی دلیل میرے
پینے میں کانٹا بیٹھتی ہوئی ہے؟ کئی بار میں نے زریں کی طرف
بانے کا ارادہ کیا کہ اس کے پاس بہت سایہ ہے لیکن یہ بھلاوا
مجھے قائل نہ کر سکا۔ آدمی کتنی بار اپنی زندگی ختم کرنے کے
رہے ہوتا ہے اور زندگی ہے کہ اڑی رہتی ہے۔ اس رات
مجھے موت نہیں آئی۔

○●○

صبح ابھی پوری طرح جیدار نہیں ہوئی تھی کہ کمرے کے
اہر شور پر میں نے باہر جا کے دیکھا۔ حویلی کی مہر خاوند
نکونر بی، بھٹل کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ میں
نے پاس جا کے پوچھا تو اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں بتایا۔
پولیس نے حویلی گھیرے میں لے لی ہے۔ مہم کہتا ہے ”بابا کو
نادو پولیس بابا کو اور آپ کو پوچھ رہی ہے۔“
بھٹل بھی اتنی دیر میں باہر آگیا ”ٹھیک ہے رسی، فیمل
کیوں پچاتی ہے۔“ بھٹل نے اسے جھڑک دیا۔ ”ان کو بولو“
آئے ہیں باہر۔“

بھٹل نے مجھے تیار ہوجانے کا اشارہ کیا۔ جانے کیوں
مجھے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ اس جس سے تو کوئی قیامت
کی بھلی۔ جلدی جلدی کپڑے بدل کے میں باہر آیا تو بھٹل بھی
تیار ہو چکا تھا۔

ڈیوڑھی کے باہر چوتھے پر دس بارہ پولیس والے
ہونڈھوں پر موجود تھے، ہمیں باہر نکلتا دیکھ کے پختہ عمر کا افسر
کھڑا ہو گیا۔ ”تمہی استاد بھٹل اور استاد باہر ہو؟“ اس نے
خوت سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“ بھٹل نے ناگوار سی سے کہا۔

”تم کو ہمارے ساتھ چلنا ہے“ افسر نے اکڑی ہوئی آواز
میں حکم دیا۔

”پر جی لائے ہو؟“ بھٹل نے تنہی سے پوچھا۔

پولیس افسر نے سر ہٹا کر بھٹل کو دیکھا اور دھڑکتے لہجے

میں بولا ”کیسی پرچی؟“

”آدمی تو پرانے جان پڑتے ہو، تمہوڑا حساب بھی آتا
ہوگا“ بھٹل کی آواز بھی اکڑی ہوئی تھی۔ ”نیو تاسا تھ ہو تو
درشن کراؤ مہاراج!“

”نیو تانا“ پولیس افسر چونک پڑا، پھر سہلا کے بولا ”اچ
چھا، اچ چھا، نیو تانا!“ اس نے خوت سے کہا ”ہم تم کو دکھائی
نہیں دے رہے؟“

”تے سے اور تک، پورے کے پورے دکھائی دے
رہے ہو۔“ بھٹل نے ہنسنے لہجے میں کہا ”ادھر ہی فیض آباد میں
گوری سرکار کا تختہ ہو گیا کیا؟ یہ پرچی بٹے کا پکڑا سی نے چلایا
ہے، ہم کیا الٹی باتیں بولتے ہیں صاحب بھار!“

”ہم، ہم تم کو گرفتار کرنے نہیں آئے“ پختہ عمر پولیس
افسر نے بغلت دھل انداز کی ”کو تو مال صاحب کو تم سے
ملنا ہے۔“

”تو آیا ہونا صاحب!“

”تم سے پہلے کیا بولا تھا“ ماتحت افسر نے دوبارہ مداخلت

کی اور مفاہانہ انداز میں بولا ”اب جلدی کرو۔“

”ایسا کیسے، کھڑے آئے ہو پہلی بار، تمہوڑا چل جان کر کے
چلو، ابھی ناشتا بھی کدھری ملا ہوگا۔ لگتا ہے، رات ساری
کانٹوں پر بیٹائی ہے۔ پوٹے لوٹے ہوئے ہیں۔“

بھٹل کے تیور کی تبدیلی پر موقع تھی۔ ان سے زیادہ
جست کرنا لا حاصل تھا، نامناسب بھی۔ ہمیں بہر حال ان کے
ساتھ جانا اور اس پہلے مرحلے پر کوئی ناروا تاثر قائم نہیں کرنا
چاہیے تھا۔ بس اتنا ہی، جس کے وہ متحمل ہو سکیں اور
ہمارے بارے میں ان کی کوئی تہمتی رائے متزلزل ہو سکے۔
ظاہر ہے، یہ رائے متنی ہی ہو سکتی تھی۔ وارنٹ کا مطالعہ بھی
بے جا نہیں تھا۔ وہ اڑے پر نہیں، فیض آباد کے ایک اقبال
مند، عزت دار محلے کی ایک بڑی حویلی میں آئے تھے لیکن
وارنٹ پر اصرار کتابتی اصولی اور قانونی ہو، زیادہ دیر حویلی
کے چوتھے پر انہیں روکے نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ صبح

کنارے پر کھڑی تھی، سورج اٹھ رہا تھا۔ سورج کو طلوع
ہونے میں ایک رات کی منزل طے کرنی پڑتی ہے اور جب
طلوع ہوتا ہے تو اسے بڑی بے گلی ہوتی ہے۔ عبارت گاہوں
میں جانے اور چل قدمی کرنے والے حریز سورج سے سویرے
حویلی کے چوتھے کی تماشائی بنی کو اپنے معمولات پر ترجیح دیں
گئے۔ پہلے ہی حویلی کی داستانیں کیا کم زباں زخماں وعام
تھیں۔ ادھر اس آٹا میں حویلی کے کمین بھی جاگ سکتے تھے۔
پولیس کی آمد کا سن کے تو اندر کمرام بچ جاتا۔ چلے چلے بھٹل

کتابیات پبلی کیشنز

نے احتیاط کی تھی۔ شکون بی اور مہاکو زبان بندی کی سختی سے ناکید کر دی تھی۔
 ”تم ٹھیک کہتے ہو“ ماتحت افسر نے کسی قدر بیزار سی کہا ”میں رات بھر آرام میں ملا ہے اور ابھی جا نے کب نصیب ہو۔“

”پر ہم لوگوں نے دانا دکھا نہیں کیا ہے“ منہ اٹھائے سیدھے بستر سے اٹھے ہیں۔ ایسے کیا نماز منہ و زبان میں سلائی کو جاکیں، ایسا کرو صاحب! ہم کو عزت دینا آپ کو بھاری پڑنا ہے تو آپ اپنے ٹھکانے چلو، پیچھے ہم آتے ہیں مگر ہری جانا ہے؟“

”کو تو تالی چلنا ہے“ اطمینان رکھو۔ ناشتا بھی وہیں مل جائے گا۔ وہاں ہمارا انتظار ہو گا۔“

”پہلے کیا ہے صاحب؟“ بھٹل نے تجسس آئیں سادگی سے پوچھا۔ ”یہ تو آپ بولے نہیں؟“

”وہ تم کو وہاں جاکے تاج چل جائے گا۔“
 ”ٹھیک ہے صاحب!“ بھٹل نے بے ظاہر تذبذب سے کہا ”بڑے صاحب نے ملایا ہے تو ضرور کوئی بڑی بات ہوگی، براحتی بیٹھا بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی ایک چلا آتا، سر کے بل بیٹھ جاتے۔ ادھر ہی ہم گھر پہنچتے ہیں۔ یہ اڑا نہیں ہے۔ ادھر ہی اور بھی لوگ رہتے ہیں، کیا پولیس گئے ان کو۔ اور وہ لوگ آس پاس والوں کو۔“

”وقت برباد مت کرو“ پختہ عمار افسر نے کبیدی سے کہا ”زیادہ بات بالکل نہیں سمجھو!“

بھٹل نے سر اٹھا کر تندر نظروں سے اسے دیکھا۔ ”ایسا نہیں صاحب! ذرا رمان سے، ہم جانے سے منع بھی بول سکتے ہیں۔“

”پھر تم اپنے لیے اچھا نہیں کرو گے“ اس بار ماتحت افسر کا لہجہ بھی تڑپا تھا۔

”پھر آپ کیا کر لو گے صاحب؟ تو پدم کرادو گے؟“

”ہم تمہیں ایسے بھی لے جاسکتے ہیں۔“

”ناسحاب! ایسا نہیں“ بھٹل نے پاٹ آواز میں کہا ”تھوڑا اپنا بیچا دھیان کو“ آگے سارا اوندھیا جائے گا۔“

”یہ کیا کیا ہو رہا ہے“ پختہ عمار فرہم بننا کے بولا ”یہ یہ آدمی کس طرح بول رہا ہے“ اس نے بھٹل کو گالی دی۔

”ناپ تول کے منہ کھولو“ اچھا رہتا ہے۔ اونچے سر“ اپنے کو راس نہیں آتے۔ آپ بادشاہ لوگ ہو، اپنا بیچا راج دربار سے پرانا تال میل ہے۔ پرچی ساتھ لاتے تو اتنا نہیں

بولتے، رسی ہاتھ میں تھما دیتے۔ کو تو آل صاحب شکر کے لاث صاحب ہیں، پر ہم ان کے پالتو نہیں ہیں۔ جانے ان کو بولو، اپنے سے کام ہے تو ادھر ہی آنے کا کٹھ کریں، دوسرے کو وال دیا اپنے ساتھ لکھا میں۔“

مونڈھوں پر بیٹھے ہوئے سارے سپاہی ایک دم کھڑے ہو گئے اور انہوں نے بندوق سیدھی کر لیں۔ پختہ عمار افسر کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ وہ غصہ چاند چند قدم آگے گیا۔ کچھ بعد نہ تھا کہ وہ بھٹل کے گردیاں پر ہاتھ ڈالے یا کوئی اور حرکت کرنے مگر معاً اس کا ماتحت درمیان میں آ گیا اور وحشت زدہ لہجے میں بولا ”بات مت بڑھاؤ استاد!“

”بات تو آپ بڑھا رہے ہیں۔“ بھٹل نے مجھے کوئی اشارہ نہیں کیا تھا لیکن اس کی تیوری سے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی آواز پر قابو رکھنے کی کوشش کی ”آپ نے کیا سمجھا ہے، آپ یوں سر اٹھائے ناوقت کسی کے گھر آئے اس کی توہن کیجئے۔ نہ فرد جرم سنائیے نہ وارنٹ دکھائیے۔ کسی معاملے میں ہماری ضرورت ہے تو بہتر ہے اپنا لہجہ بدل کے بات کیجئے، ہم آپ کی رعیت نہیں ہیں۔“

سب کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ ماتحت افسر نے بیچانی انداز میں اپنے افسر کو دیکھا۔ ان کی جانب سے کمر رد عمل سے پہلے میں نے سر جھٹک کے کہا ”چلیے، کہاں جا رہے؟“ یہ کہتے ہی میں چوتھے کی میز چھوٹی کی طرف بڑھ گیا۔ بھٹل نے بھی پھر کوئی رد نہیں کیا۔

نیچے پانچ تانگے قطار میں کھڑے تھے، پختہ عمار افسر کا جھپٹکا سب سے آگے والے تانگے کی پچھلی نشست پر، چابٹھا۔ ماتحت افسر کے تانگے میں ہم دونوں سوار ہو گئے۔ اگلی نشست پر اس کے ساتھ ایک بندوق بردار سپاہی بھی آ گیا۔ دوسرے سپاہیوں نے بھی جلدی جلدی بالی آنگوں میں جگہیں سنھال لیں۔ چلتے وقت انہوں نے یہ اہتمام رکھا کہ ہمارا تانگا درمیان میں رہے۔ گھوڑا گانڈوں کی چٹاں چڑا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے گلی کو پچھڑھٹکے لگے تھے جیسے گوا لشکر گزر رہا ہو۔

اندھیرا سٹ رہا تھا۔ صبح بیدار ہونے والوں کی تعداد ایسی زیادہ نہیں تھی مگر ایک ساتھ اتنے تانگے اور پولیس والے دیکھ کے وہ دھکتے اور رک جاتے۔ گشت کرنے والے سپاہی ٹولیوں میں جگہ جگہ تعینات تھے۔ ہمارے کاروان آدھ کی اطلاع انہیں دور سے ہو جاتی ہوگی۔ ابھی کچھ دیر پہلے حویلی کی طرف جانے والے آنگوں کی واپسی کی توقع بھی

ہو رہی تھی۔

ان کی چستی و مستندی کا سبب ہوگی۔ ایسے شور سے آخری ساعت کی نیندیں منتشر ہو جاتی چاہیے تھیں۔ کئی جگہ لوگ سٹ پائے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے۔ بہت سوں نے درجوں، موٹکوں اور پتھوں سے ہمارے مختصر قافلے کا چرانی پریشانی سے نگارہ کیا۔ سڑکوں پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ٹھوڑے بھی خاصی جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ راستے میں ماتحت افسر نے کوئی کلام کیا نہ ہم نے سلسلہ بنائی کی۔ میری طرح بھٹل بھی آنے والے وقت سے ہیرو آزمائی کے لیے خود کو جمع کر رہا ہو گا۔ آنے والا وقت بڑی آزمائش کا بھی ہو سکتا ہے، بات بہت دور بھی جاسکتی ہے۔ پولیس کے طور طریقے ہمارے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہاں کوئی ایک شخص نہیں ہو گا۔ جہاں بہت سے لوگ ہوتے ہیں، وہاں اختلاف ضرور ہوتا ہے۔ آدمی کہتے ہی ایک جیسے، ایک دوسرے کے قریب ہوں، وہ ایک دوسرے سے بہت الگ، بہت دور بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ آدمی ایک جیسے ہو کر تے تو زندگی کسی آسان اور سل ہوئی۔ کئی مرتبہ ہمیں ایک سے زیادہ پولیس افسروں کے سامنے پیش ہونے کے تجربے سے گزرنا پڑا ہے۔ ہر ایک شوشہ طرازیوں اور نکتہ پرداز یوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔ دلیلیں تاویلیں کیسی ہی مضبوط ہوں، بہت سے اختلاف آدمی کی اپنی انا کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ انا بھی ایک کجی ہے اور کہتے ہیں، آدمی کی سب سے بڑی کمزوری اس کی انا ہے۔ زندگی بھر وہ جاوے جا اختلاف پر آمادہ رہتا ہے اور یوں اپنی انا کی افزائش پر دوش کرنا رہتا ہے۔ پولیس افسروں کا یہ باہمی اختلاف بھی ہمارے لیے مفید بھی ثابت ہوا ہے۔ ایک دوسرے کو قائل کرتے ہوئے وہ زچ ہونے لگتے ہیں اور انہیں خود اپنی جبری وکتہ آفرینی و گروگوں کو بتی ہے۔ کسی نتیجے پر نہ پہنچ پانے کی بیزار ی میں وہ کسی آسان راستے اور دفع الوتقی قسم کے فیصلے پر شوق ہو جاتے ہیں۔ اب جو کچھ بھی ہو، ہمیں بہر حال بدترین صورت حال کے لیے خود کو تیار رکھنا چاہیے۔ واپسی کا تعین بھٹل بھی نہیں کر سکتا ہو گا۔ پولیس شک کی بنیاد پر ہمیں دیر تک روک سکتی ہے۔ اصل جرم کا سراغ نہ ملنے کی صورت میں اپنے حکام کے سامنے جواب دی اور خود اپنی دل دی باتن آسانی کے لیے پولیس مشکوک آدمی ہی کو سہرا بناتی ہے۔ دیے بھی اصل جرم تک ان کی رسائی تقریباً ناممکن ہے لیکن انہیں ایسی آسانی سے دستبردار بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے ماتحت اور سب سے آگے کے تانگے میں فردکش اس کے

افسر کی بدحواسی ظاہر کر رہی تھی کہ کچھ دیر میں اختصار سے دوچار کیے کیسے افسروں سے ہمارا واسطہ پڑ سکتا ہے۔ ان پیشینگوں کے ہم کہتے ہی تجربہ کار ہوں، وائے کی نوعیت تو ہر جگہ مختلف ہوتی ہے۔ سامنا پڑنے والے لوگ بھی ہر بار بدلتے رہتے ہیں۔

میں چیچن منٹ کے سفر کے بعد قدیم و جدید طرز کی ایک عمارت کے سامنے تانگے ٹھہرے، اندھیرا ماند پڑ چکا تھا اور اجالا ابھی ایسا روشن نہیں ہوا تھا۔ اول صبح بیٹیوں پر چھا جانے والی پرندوں کی چکارا مچ چکی تھی۔ صبح سے بہتر روز دشب کا کوئی پسر نہیں ہوا۔ کسی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ صبح قدرت کا سب سے شاہکار منظر ہے۔ صبح نہ ہوتی تو یہ دنیا بڑی ادھوری ہوتی مگر وہی بات ہے، ساری خوش منظری اور خوش موسمی آدمی کی اپنی کیفیت سے مشروط ہے۔ آدمی میں اندھیرا چھایا ہو تو کیا سانی صبح اور کیا فیصلہ شام۔

عمارت میں ہر طرف سپاہی موجود تھے۔ تانگے سے اتر کے بھٹل نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے بچے کے دباؤ سے شاید میں نے وہی افذ کیا جس کی وہ تلقین کرنا چاہتا تھا۔ ماتحت افسر کی بیرونی میں ایک مختصر راہ داری سے گزرتے ہوئے ہم اونچی چھت والے ایک وسیع کمرے میں داخل ہو گئے اور دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بیچچوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔ کمرے کی حالت خاصی اہتر تھی۔ دیواریں سیلن زدہ، رنگ روغن میلا میلا، روشنی بہت دھم، ہمارے سامنے کی دیوار پر کلدی کے فریم میں محصور ایک بڑا نقشہ آویزاں تھا۔ نقشے کے نیچے لمبی بیٹھ کی بھاری کرسی اور اس سے آگے بہت بڑی میز تھی، میز کے ارد گرد چھ کرسیاں، میز پر پوش البتہ صاف ستھرا تھا۔ فرش بھی دیواروں کی نسبت کچھ بہتر تھا۔

ماتحت افسر بہت بے کل نظر آتا تھا ”ابھی انتظار کرو۔“ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا ”اندر مینگ ہو رہی ہے۔“

بھٹل کی خاموشی سے وہ جزیب ہوا، کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن لمبے بھر ٹھہر کے واپس چلا گیا۔ کمرے کے کئی دروازوں اور کھڑکیوں میں سے صرف ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس پر دو مسلح سپاہی بیٹھے انہیں رگرو کر دیے گئے تھے۔ وہ چندفٹ کی لمبائی میں ایک دوسرے کے مخالف فوجیانہ انداز میں گشت کرنے لگے۔ ایک ادھر آتا تو دوسرا ادھر جاتا اور دروازے کے وسط میں دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہو جاتے۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ لیکن باہر راہ داری میں خاصی سرگرمی تھی۔ بھٹل نے بیڑی سلگائی اور کمرے کش بھرنے لگا۔ جانے

کتابیات پبلی کیشنز

کیوں میرا خیال تھا میری خواہش تھی وہ آنے والے لمحوں کے بارے میں کچھ زبان کھولے یا مجھے کوئی ہدایت دے۔ وہ اپنے آپ میں یکم بیٹھا رہا۔ کسی رائے اور مشورے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس کی موجودگی میں میری حیثیت ایک معمول کی سی تھی۔ مجھے خاموش رہنا تھا اور میں جانتا بھی کس قدر تھا۔ میرا علم میرے قیاس پر مبنی تھا۔ جو میں سمجھ رہا تھا ضروری نہیں اسی ترتیب سے وہ کچھ پیش آیا ہو، وہ اس سے مختلف بھی ہو سکتا ہے لیکن جو کچھ بھی ہوا ہے، بہت ناقابل یقین، بڑا لرزہ خیز ہے۔ پولیس کو تحقیق و تفتیش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنی چاہیے۔ یہ اس کی آن اور ساتھ کا معاملہ ہے۔ فرائض سے زیادہ پولیس کو اپنی سادہ اور آن کا خیال ہوتا ہے۔ انہوں نے ہمیں خاصی دیر بعد طلب کیا ہے۔ پورا ایک دن اور ایک رات گزر جانے کے بعد۔ پہلے انہوں نے شرکی تاجبندی کی، سارے شہر اور گرد و نواح میں پولیس کا جال بچھا دیا پھر انہوں نے حویلی کے علاقے میں پھرا لگا دیا۔ گویا ہر سمت اور ہر پہلو ٹھونکنے کے بعد ان کی نظرس حویلی پر جا کے نکلی ہیں اور واپس آتے کے محرم تک رسائی میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں، آگے اور سرے بھی ان کے ہاتھ آسکتے ہیں۔

میں نے پچھلتے نگاہ سے ٹھٹھل کو دیکھا اور مجھے اس کے چہرے سے کچھ جاننے میں ناکامی ہوئی۔ وہ تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا، کبھی کبھی مجھے اس کی اس بے چرکی سے بڑی الجھن اور چڑھتی تھی۔ وہ چہرہ جس پر کوئی نقش، کوئی تاثر مرقوم نہ ہو، کورے کانڈ کی طرح وہ تو اور متوحش کرتا ہے۔ یقیناً ٹھٹھل کو اس تکنیکی کا اچھی طرح احساس ہو گا کہ یہ کوئی اور شہر نہیں، فیض آباد ہے، یہاں زریں کی حویلی ہے اور یہاں زریں ہے۔ آدمی کی استقامت کا ایک پیمانہ ہوتا ہے اور بھکسوں کی بات دیگر بھی، یہاں حویلی میں زریں کے علاوہ ہمارے اور بھی خوش نما پرسان حال ہیں۔ ان کے لیے ہمارے اور ستون کی علامت ہیں، روشنی کے بھی۔ ہمارے اچانک غیاب کی خبر کب تک ان سے چھپی رہے گی۔ حویلی کے گرد پولیس کے گھیرے کی اطلاع گزشتہ رات انہیں نہ ہو سکی ہوگی تو آج ہو جائے گی۔

منیر علی کے بھانجے ارشد اور بیٹے خوبر کو فیض آباد میں آباد ہوئے اب وقت گزر گیا ہے۔ وہ حویلی میں محسوس نہیں رہتے، زمینوں کی دیکھ بھال کرنے جاتے ہیں، شرکے لوگوں سے بھی اب ان کی اچھی رسم و راہ ہوئی چاہیے۔ کچھ دیر پہلے حویلی میں منیر علی پولیس کی آمد اور ہمیں ساتھ لے جانے

کا واقعہ دن چڑھتے تک ہر شخص کے دہریاں ہو گا اور ہماری قید و بند کے پس منظر، سنگینی و سفاکی کی ساری جزئیات، کچھ حقیقتیں، کچھ فسانوں کے ساتھ۔ ارشد اور خوبر بہت لائق اور ہوش مند جوان ہیں۔ ان سے یہی توقع ہے کہ شرمیں گونجے بہت ناک تذکروں سے حویلی کے یکینوں کو دور کرنے کی احتیاط کریں لیکن خود ان کا کیا عالم ہو گا، انہیں ایسے سانحوں اور حادثوں کا تجربہ ہی کس قدر ہے۔ اور حویلی کا واسطہ بیرونی ملازموں اور دیگر چھوٹے موٹے کام کرنے والوں سے بھی رہتا ہے۔ بدنامی کے پر لگ جاتے ہیں۔ اوروں کا اتنا نہیں، مجھے تو فروزاں اور یا سمن کا خیال آتا ہے۔ کس قیامت سے گزرے کہ وہ اس پناہ گاہ میں پہنچے ہیں۔ انہیں تو ابھی نری و گداز کی ضرورت ہے۔ وہ تو کھلا جائیں گی۔ وہ تو بے بھی شیشے کے مانند ہیں۔

اور پولیس سے کیا بعد ہے۔ ہم پر زور ڈالنے کے لیے وہ کسی وقت حویلی میں نہ داخل ہو جائے۔ مطلب برادری کے لیے پولیس کسی بھی نادار اور انتہائی حربے پر اتر آتی ہے خواہ بعد میں لوگ وہاں دیتے پھرس اور پولیس کو پشیمانی اٹھانی پڑے لیکن اس پشیمانی سے عتاب زدگان کے زیاں کی تلافی نہیں ہوتی۔ شرکے سمندر میں پہلے ہی حویلی کسی جزیرے کا درجہ رکھتی ہے۔ ان ہرزہ سراہوں کے باعث وہ اور بدب تو بے بلکہ بدب ملامت ہو کے رہ جائے گی۔ پھر حویلی کے بے چارگان کے پاس یہی ایک چارہ ہو گا کہ وہ بمبئی ایا جان اور منیر علی کو، کھٹے جامو اور جمو کو تاروے کے بلائیں۔ میں اس رات زریں کو یہی کچھ تو بار کرانا چاہتا تھا۔ یہ چھوٹے شہروں کے لوگ بڑے فسانہ طراز ہوتے ہیں، قصے کہانیاں ہیں ان کا جی بہت لگتا ہے۔ ان کے پاس ہی وقت ہی وقت ہوتا ہے۔ کیا ٹھیک تھا کہ ہم پہلی فرصت میں بمبئی کی طرف نکل جاتے۔ بمبئی جاکے بھی جہاں گیر، نیساں اور بوجیاں اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ بڑے فائدے کے لیے تھوڑا نقصان برداشت کر لیا جاتا ہے۔ کچھ میں زریں کو قاتل نہ کر سکا، کچھ خود میری کوتاہی، نادانی، اس دن ہیرا اور گورا استاد کے معاملے میں دخل اندازی کرنے کی چوک جو مجھ سے ہوئی تھی، بات اتنی دور جانے کا مجھے کوئی اندازہ ہی نہ تھا پھر جب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وقت ہی نہیں ملا۔ بہت اتنی جلد بمبئی روانہ کی گئی۔ فیصلہ پر کس طرح عمل کر سکتے تھے۔ دوسروں کے کیا، آدمی تو اپنے قابو میں نہیں ہوتا، خود کو اپنا مطیع نہیں کر سکتا۔ اپنے دل و دماغ تابع نہیں رکھ سکتا۔ اسی کے اپنے دست و بازو محروم ہو جاتے ہیں۔

اچانک جسم کا کوئی حصہ اذیت سے دو چار کر دیتا ہے۔ ایک دل بکنے، دماغ بھٹکنے لگتا ہے۔ آدمی کی سب سے بڑی بات اتنی اس کی اپنی قابو پائی ہوئی ہے۔ میں نے ٹھٹھل کی باتوں و سکوت اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن جسم میں نہ کریں، یعنی نہیں۔ طرح طرح کی دہم و گمان سر میں بہن رہے تھے۔ یہ اندیشے اور دوسرے خود رو کانٹوں سے مارے ہوئے ہیں۔ کانٹوں بھرے پودے پتھروں میں بھی پالتے ہیں۔ آدمی کتنا ہی مضبوط ہو، دہم و گمان کے خار اس سے اسے مفر نہیں۔ میں اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ مجھے لگتا تھا اس تشویش و تردد سے کچھ حاصل نہیں۔ ہم یہ بہرہ رو کوئی ماں میں موجود ہیں۔ تھوڑی دیر میں پیش ہونے والی اب فیصلہ کرنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ کس قتل اور رے ہماری روداد، ہماری بات سنتے ہیں۔ ہم تو اپنے بہتر ہیں گے ہی لیکن اگر انہوں نے کچھ اور ٹھان رکھی ہو تو؟ ہم جان و دیم زندگی میں کھٹے بھرے زیادہ ہو گیا۔ درمیان ایک مجبور قسم کا سپاہی تاروں کے اسٹینڈ میں اٹکے بے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں بھری چائے لے کے آیا۔ قتل کے انکار پر اس کا گہرا ہوا چہرہ اور بڑبڑاتا ہوا ہن چلا گیا۔ روشنی بڑھ گئی تھی لیکن روشنی اور جس میں لی نسبت باہم نہیں ہے۔ ان کی طرف سے ہماری طلبی میں تاخیر ناقابل کسم تھی۔ ٹھٹھل نے اس دوران کئی بیڑیاں بک ڈالیں۔

کمرے میں پرانے زمانے کی دیوار گیر گھڑی جانے کب بند پڑی تھی۔ گھڑی کا شیشہ گرد و غبار سے دھندلا گیا تھا۔ لیڈرہ کھٹے بعد ماتحت افسر کا تھمتا چہرہ دروازے پر مائل رہا۔ وہ تیز قدموں سے اندر آیا، چلو، اٹھ جاؤ، اس نے معنوی تحسنا لے لی تھی۔

بیڑی زمین پر پھینک کے ٹھٹھل کھڑا ہو گیا اور کسماتا اٹھ سے مخاطب ہوا، چل رے، ابھی اندر کازرت بھاؤ بھی میں۔

”دیکھو استاد!“ ماتحت افسر تیشیمی انداز میں بولا ”ذرا بیان رکھنا، یہ عام لوگ نہیں، بیڑی اونچے افسر ہیں۔ کل رات سورج ڈوبنے لگتا تو اسے اوجھ پینے ہیں اور رات بھر کتے رہے ہیں۔ ان میں ایک افسر ورا صاحب سینئر سے پوچھ رہے ہیں کہ آئے ہوئے ہیں۔ اتنے پرانے نہیں پرانے ہیں کیسے کیے ہیں۔ بڑا نام ہے ان کا۔ ولایت میں اسے پانچ سال گوروں کے ساتھ کام کیا ہے۔“

کیا بات ہے۔ گوروں کی چھایا بھی گوری ہوتی ہے، ان کا چھو بھی سوئے کا ہو جاتا ہے۔

”تمہارے بھلے کو بولتے ہیں“ ماتحت افسر ناگواری سے بولا ”آگے تم جانو۔“

”بولو تو منہ بند رکھیں؟“

”نہیں نہیں، یہ ہم نے کب بولا ہے، پرتھوڑا دھیان رکھنا، ہاں!“

”یہ تو ان پہ بھی ہے صاحب! ایک ہاتھ سے کدھری بچتی ہے۔“

ماتحت افسر کے چہرے پر رنگ آیا، وہ جب رہا اور جلالت سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم بھی کمرے سے باہر آگئے۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے وہ بائیں جانب مڑ گیا اور پہلے دروازے پر ٹھکر کے اس نے وہاں تعینات سنگین بردار سنتری کو ہمیں اندر لے جانے کا اشارہ کیا۔ سنتری نے اسے سلام کیا اور کسی توقف کے بغیر دروازہ کھول دیا۔

وہ ایک کشادہ، روشن اور صاف ستھرا کمرہ تھا۔ کھڑکیوں پر سفید اور گہرے دھاری دار پردے بھول رہے تھے۔ سامنے عتابی رنگ کے کپڑے سے ڈھکی ہوئی وسیع میز و دفتری سامان سجا ہوا تھا۔ کرسیاں بھی نئی تھیں۔ میز کے اس پار تین کرسیوں پر تین اور میز کے دائیں بائیں کرسیوں پر دو افسر موجود تھے۔ ان کی عمریں چالیس اور پچاس کے درمیان تھیں۔ وسط میں جو شخص حکمت کے کرسی نشین تھا غالباً وہی ورا ہو گا۔ ان میں سب سے کم عمر وہی لگتا تھا، ناک نقش ترشا ہوا، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی پنک دار آنکھیں، سیاہ بال، سلیقے سے مانگ نکلی ہوئی، رنگت داہری، قد متناسب، جسم فربہ کی طرف مائل۔ بیٹے اور شانوں پر پولیس کے امتیازی نشانات آویزاں۔ وہ تازہ لڑک و دردی میں لمبوں تھا، دردی میں نہ ہوتا تو کوئی بھی اسے پولیس والا نہیں کہ سکتا تھا۔ اس کے دونوں جانب بیٹھے ہوئے افسر پختہ مندی رنگت کے حامل، ہماری جسامت کے اور نسبتاً معمر تھے۔ میز کی شرقی و غلی جانب دو افسروں میں ایک سرسبز رنگ کا، بالوں کی طرح لمبا، چہرہ اور چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ پولیس میں اتنی عمر کا ایسا سوکھا ہوا آدمی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ دوسرا خود سرافروزی تھا جو صبح حویلی آیا تھا اور وارنٹ کے مطالبے پر برگشتہ ہو گیا تھا۔ پانچوں افسروں کے آگے کانڈ اور قلم رکھے تھے۔ وہ سب ہمارے خنجر تھے۔ ان کے چروں سے بے چینی ہو رہا تھی۔ ہمارے داخل ہوتے ہی ان کے جسم تن گئے۔ ہم میز

سے گز بھر کے فاصلے پر جا کے ٹھہر گئے۔ ایک قدم دور کر سیاں خالی تھیں۔ انہوں نے ہم سے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔ بیٹھل نے ہاتھ اٹھا کے انہیں سلام کیا۔ میں نے بھی بادل ناخواستہ اس کی نقل کی۔ درمیان میں بیٹھنے ہوئے افسر نے سر کی خفیف سی جھنجھٹ پر اکتفا کیا۔ ان سب کی نظروں نے جیسے ہمیں حصار میں لے رکھا تھا۔ اسی اذیت ناک خاموشی میں کئی لمبے گزر گئے پھر وسط میں بیٹھنے ہوئے افسر نے شانے اچکائے اور سامنے رکھے ہوئے گلاس سے گھونٹ بھریانی پل کے کھن کھناتی آواز میں بولا "استاد بیٹھل! استاد بابر! اس کے مخاطب میں طنز اور استہزا کی آمیزش تھی۔

بیٹھل بے حس و حرکت کھڑا رہا۔
"نیتوے بنا تم کو یہاں آنا پسند نہیں تھا، کیوں استاد؟"
اسی افسر نے زہر خند سے کہا۔
"بنا تو آپ نے والی ہے" بیٹھل نے دھیمی آواز میں جواب دیا "پر اب تو ادھر ہی ہیں۔"

"یہ تو اچھا کیا استاد، سیدھے سہماؤ آگئے۔"
"اب اچھا ہو کہ برا، دیکھیں گے صاحب!"
"بڑی تعریف سنی ہے تمہاری استاد بیٹھل! لکھنے شہر کے استاد، فیض آباد کے استاد" ابھی پتا چلا کہ لکھنؤ کی کدلی استاد بابر کے نام پر چلتی ہے۔ وہاں بابر استاد اپنی مرضی کا مینٹر بٹھا کے آئے ہیں۔ ادھر بیٹھل استاد نے، سے بیٹھا جامو استاد کو فیض آباد سے لے جا کے کھٹکے کے راج سنگھاسن پر بٹھلایا ہے۔ دوسرے شہروں کا ابھی ہم کو پتا نہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ہے لوگ کہتے ہیں، بابر استاد کو کچھ لکھنا پڑھنا بھی آتا ہے، دونوں کی پرانی جوڑی ہے اور دونوں کے ہاتھ میں جادو ہے چاقو، چھرا، خنجر، لاٹھی، ڈنڈا، ٹلم، بندوق، تمپنا ہاتھ میں آنے کی دیر ہوتی ہے، آواز کا نشانہ لے لیتے ہیں۔ کوئی گھبرند نہیں، پیادوں کی پوری سینا حاضر اشاروں پر تاجے سے پڑنے پر سر بھی کٹا دے۔ پولیس سے آنکھ پوچی سن بھاتا چھیل ہے۔ جیل، پھری، تھانا گھر کی طرح ہے۔ بڑی سونلی کھال ہے۔ ان سے دشمنی پاپ ہے۔ پلٹ جائیں تو کسی کو شام نہیں کرتے۔ دور دور تک نام ہے استاد بیٹھل کا، پولیس افسر نے سر جھکا کے سامنے رکھے کاندھوں پر نظر ڈالی اور رک رک کے بولا "استاد بیٹھل! استاد بابر! استاد جامو، حرم، شمشاد خاں اور۔ اور لمبی لٹ ہے" اس نے بیٹھل کو مخاطب کر کے چلے پن سے پوچھا "کیوں استاد! یہاں ہی ہے نا!"
"کیا پولیس صاحب! آپ کرسی پر بیٹھنے ہو" بیٹھل نے جیسے اپنے آپ سے کہا "یہاں ہی ہو گا۔"

"نانا، کچھ کم، زیادہ یا غلط ہو تو بولو؟"

"ابھی کم ہے صاحب!"
"ہاں" پولیس افسر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ دوسری سیدھا نہ رہ سکا، اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سنی نے انداز میں بولا "تم ہی ہو گا، ہم کتنا جان سکتے ہیں، پھر تم ہی پوچھا استاد!"

"اے منہ سے کیا پولیس" بیٹھل نے اٹھنے سے کہا "چھائیں لگتا صاحب! اور آپ شاید سن بھی نہ پاؤ۔"
"رات بھر تمہارا ہی چرچا ہوتا رہا ہے شرمیں تمہارے ٹھکانے کے تنگی سا بھی رات سے ہمارے مہار ہیں۔ کیا کیا ہوئے ہیں وہ تمہارے بارے میں، تمہارا رہ بھرتے ہیں۔ بولتے ہیں، یہاں شرمیں تمہاری محل جیسی اور؟ حویلی ہے حویلی کی اصل مالک جو ان لکنا، اور اس کا ڈنڈا ہے، حویلی کے مالک تم ہو یا استاد بابر۔ تم کو وہ پایا ہوتی ہے بابر استاد کو بھی کچھ مانتی ہو لیتی ہوگی۔ معلوم ہوا ہے اڑے بس خاص خاص آدمیوں کا وہاں آنا جانا رہتا ہے اور سننے پر حویلی میں اور بھی لوگ رہتے ہیں جن کا رشتہ نا فیض آباد سے نہیں ہے شرمیں تمہارے نہ ہونے پر حویلی کی ادب بھال اڑے کے آوی کرتے ہیں اور کسی میں بہت نہیں؟ حویلی کی طرف سراٹھاکے دیکھو یا نظر خیر صحت کرے" پولیس افسر نے جیتی ہوئی آواز میں پوچھا "ایسے کون کون لوگ حویلی میں رہتے ہیں استاد؟"

بیٹھل کو جواب دینا چاہیے تھا کہ وہ کون ہوتا ہے؟ آہ باتیں کرنے اور اتنا کچھ پوچھنے والا۔ میری توقع کے خلاف بیٹھل نے۔ بے لہجے میں کہا "اپنے ہی لوگ ہیں صاحب!"
"اپنے کیا؟ تمہارے رشتے دار یا۔۔۔"

"اب تو سارے اپنے ہیں۔"
"پتہ کیا تھے؟"
"پتہ نہیں تھے" بیٹھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "سنا ہے بابر استاد کی سنی بن کر جنازہ بھی حویلی سے تھا۔ وہ شہر کے گھر پر پانچ تھی۔"
"تمہارے ذکر پر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا وہ حد سے تجاوز کر رہا تھا۔ جی میں آیا، میز چھانگ کے اس کے سر پر چاچنچوں، زبان کاٹ لوں یا گلا دوں۔۔۔" بیٹھل نے زور سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

وہ کہتے پولیس افسر ہرزہ سرائی کرنے لگا "ایک رات کو گھر پر بن کر بھائی سے سامنا ہو گیا۔ بھائی کو کدھ کے بہ کھڑکی سے کود پڑی اور بے چاری نے جان دے دی۔ کیا نا"

بتایا ان لوگ نے بالی کا؟" اس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے افسر سے پلو بدل کے پوچھا "نیم، نیم جان!" افسر نے غصے سے لٹکے کے کہا۔

"بڑی دکھ بھری چتا ہے رات ہی سنی کیا بات تھی؟"
"رمان میں بیٹھا ہوا افسر مسلسل ٹھٹھول کر رہا تھا۔
"کام کی بات کرو صاحب!" بیٹھل کی آواز تپتی ہوئی نی ادراس نے میرا ہاتھ زور سے تیز کر رکھا تھا۔
"ٹھک ہے، کام کی بات کرتے ہیں، اسی واسطے تم کو مان لایا بھی ہے۔ دیکھو استاد!" اس کی آواز تند ہو گئی "چھا ہوگا، ایک بات دھیان سے سن لو۔ ہم کو دونوں طریقے تھے ہیں دیکھی، ولا تپتی بھی۔ تم کو کون سا پسند ہے؟"
"ادھر ہی تمہارے سامنے ہیں، اپنے گھر میں نہیں"

"ٹھل نے رتھی سے کہا" اس نے کیا پوچھتے ہو۔"
"آل رات!" وہ ڈھٹائی سے بولا "صاف صاف بات رتے ہیں۔ تم نے ساتھ دیا تو کام آسان ہو جائے گا۔ بعد مایہ لوگ جائیں" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان کو دیکھی طریقے آتے ہیں، ولا تپتی یہ یہ لواس نہیں کرتے۔ تم نے اتنی بات کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑی کہ تم جان لو، ہم تمہارے بارے میں کتنا کام کر چکے ہیں۔ جان کاری رکھتے ہیں۔"
"ایسے اپنا بھی بھلا ہوا ہے۔"

"تمہارا کیا؟" پولیس افسر بے کل ہو گیا "تمہارا بھی لا؟ ہاں!"

"سنے کو بھی تھوڑی آپ لوگ کی جان کاری کا۔"
"صل نے ٹھکے لہجے میں کہا۔
"ا، رٹیل لی، انڈر گنڈ، انڈر فٹنگ!" اس نے جوش سر کا طنز اظہار کیا پھر تجسس سے بولا "تم نے، تم نے کیا؟"

"آپ کا دھیان ہے صاحب! مت پوچھو۔"
"نانا تیار بولو!"
"جو تھوڑا صاحب! آپ ولایت سے پلے ہو، مری جی چھوٹ لوں گی۔"

پولیس افسر نے پہلے تو چلیں پیٹ چائیں اور کرسی پر مل پڑا۔ وہ ایک تیز قدم افسر تھا۔ بیٹھل کا مقصود اخذ کرنے ماسے لہجہ صرف ہوا اور اس نے قہقہہ لگایا۔ قہقے میں سناٹا کئی کم تھی لیکن اس کے ساتھیوں نے، ہم تو بالی کی اور بلدیہی شہید بھی ہو گئے، ہم سے مخاطب افسر نے تپتی ہوئی

آواز میں کہا "تمہاری غلط فہمی ابھی دور ہو جائے گی استاد!"
"دیکھتے ہیں صاحب! کس کی دور ہوتی ہے" بیٹھل زیر لہجی سے بولا۔

پولیس افسر کے دائیں جانب بیٹھے ہوئے افسر نے مٹا اپنا سر قریب کر کے دخل اندازی اور سرگوشی میں غائبانہ طور پر دیکھنے کی جسارت کی۔ اس کا انداز مودبانہ تھا، نڈیانہ بھی۔ جواب میں پولیس افسر ستان سے سر ہلا تا رہا، کچھ دیر وہ کم مسم سا رہا۔ اس کی پھنکارتی نظرس ہم پر بھری ہوئی تھیں "ہاں استاد، استاد بیٹھل!" وہ جکڑی ہوئی آواز میں بولا "آگے کی بات کریں، تم اچھی طرح جانتے ہو گے کہ تم کو یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟"

"اپنے کو پیچھے کا دکھائی نہیں دیتا" بیٹھل نے تنک کے کہا۔
"ٹھک ہے" پولیس افسر کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی "ہم دکھاتے ہیں، برسوں رات پڑوس کی ٹھاکر ہستی میں سے ۲ آدمیوں کو یا تو مار دیا گیا ہے یا زندہ جلا دیا گیا ہے۔ پورے ۲۷ آدمی۔" وہ زور سے بولا۔
بیٹھل خاموش کھڑا رہا۔

"صرنے والوں میں ٹھاکر بل دیو، ٹھاکر ہریو، جیسے نامی لوگ شامل ہیں۔ وہ اس طرف کے بہت بڑے زمین دار تھے، پڑکھوں سے ریش، بڑی آن بان والے۔ یہ عام لوگوں کی ہتیا نہیں ہے۔"
"بڑے لوگ کی ہتیا بھی بڑی ہوتی ہے" بیٹھل نے بہ ظاہر تلاف سے کہا۔

"یہاں ایسا، ایسا اندھرو دور دور تک نہیں ہوا، سرکار نے اب ہم کو ادھر بھیجا ہے اور بھیجا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجا ہو گا۔ ان کو معلوم ہے، ہم نے ناکام ہونا نہیں سیکھا اور ہم پولیس، چاروں طرف دیکھنے کے بعد ہی، ہم کسی پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔"

"چار کھونٹ دیکھ کے ہی پوچھنا ٹھک رہتا ہے" بیٹھل نے کسماتے ہوئے کہا "ایک بات پوچھیں صاحب! آپ کا کوئی رشتہ نا لگتا ہے ٹھاکروں سے؟"
"کیا کیا کیا کیا لگتا چاہتے ہو تم؟"

"تھوڑا ٹھاکروں کا بھی آگیا پچھا، اننا سیدھا دیکھا آپ نے؟"
"کیا مطلب؟" پولیس افسر بھڑک اٹھا "وہ بہت جانے پچھانے لوگ تھے۔ بہت اونچا گانا ہے ان کا۔ ان کے دادا رکھو یہ ٹھاکر کو انگریزوں نے سر کاٹنا نسل دیا تھا۔ اس علاقے

میں کون ہے جو ان کو نہیں جانتا۔“
بھٹل نے سر ہلا کے تائید کی ”ہاں صاحب! چرچے سے
میں شکا کروں گے۔“
صرف چرچے سے ہیں؟ پولیس افسر نے گویا بھٹل کی
نقل اتاری۔ ”اور کچھ نہیں؟“
”اور کیا صاحب؟“ بھٹل نے اکھڑی ہوئی آواز میں
پوچھا۔

”دیکھا نہیں کبھی؟“
”ہاں صاحب! درشن سے رہ گئے۔“
”درشن ضروری بھی نہیں جانتا کافی ہے۔“
بھٹل نے خاموشی مناسب سمجھی۔

”استاد بھٹل!“ پولیس افسر کی زبان کسی اندرونی
خاندان سے بھلائی گئی، کہنے لگا ”ٹھاکر بیل دیو، ٹھاکر ہرزو اور ان
کے گھرانے کے اتنے لوگوں کی موت پر سرکار ہاتھ پر ہاتھ
دھرے نہیں رہ سکتی۔ سینئر تک بات جا چکی ہے۔ ٹھاکروں کی
حویلی میں ڈھانچوں کے سوا کچھ نہیں بچا۔ اس خون خرابے
کی سزا بھی آخری درجے کی ہوگی۔ مجرموں سے پچاسی کا
پچھنڈا اور نہیں ہے۔ وہ بچ نہیں سکتے۔“
”تمہیں پتا چاہیے؟“ صاحب بہادر! آپ نے گھٹنا کے
کارن پر دھیان دیا؟ کوئی کارن تو ہوگا۔“
”کارن ایک ہی ہو سکتا ہے، ٹھاکروں سے دشمنی کا، کسی
بدلے کا۔“

”لگتا ہے، پرائیمر ہوگا۔ پہلے آپ اس کی کھوج کرو۔“
”تمہارے بھائی کی ضرورت نہیں، ہم یہاں جگہ نہیں
مار رہے، پولیس افسر کا پارا چڑھ گیا، میری بیوی ہو سکتا ہے۔“
”ہاں صاحب! نیا پرائیمر، میری بیوی ہے پر اس کا بھی کوئی
سزا ہوگا۔ ٹھاکروں نے کسی کو بڑی چوٹ دی ہوگی جو گھٹنا بھی
اتنی بڑی ہوئی۔ لوگ بولتے ہیں، ٹھاکر ٹھاکر نہیں رہے تھے،
بس تاج ہی نہیں انکا تھا اور“ اور یہ چھوٹا ٹھاکر، وہ راج کمار تو
آدمی کا جنا نہیں لگتا تھا۔ بہت کٹ کٹا، مر کھتا تھا، منہ مارا،
ڈکراتا پھرتا تھا سارے میں۔ ادھری لوگوں سے پوچھو، بولتے
ہیں صاحب! ایک دم کھلا ہوا تھا۔“

”اور کیا جانتے ہو تم ٹھاکروں کے بارے میں؟“
”اور کیا صاحب!“ بھٹل کا منہ بن گیا۔
کئی بار میرے جی میں آئی کہ دخل دوں مگر کسی بے زبان،
مخبوط الحواس، کسی بے جواز آدمی کے ہاں میں بھٹل کے پہلو
میں بت کی طرح ایسا تھوہ تھا۔ کسی یقین ہی میں زبان ساتھ
دیتی ہے اور بیان میں تاخیر کے لیے کوئی یقین لازم ہے اور

یقین کے لیے علم کی شہادت، علم کی سند چاہیے۔ میرا
مضموضوں، اندازوں اور قرائن و آثار تک محدود تھا۔
دل کہتا تھا کہ ٹھاکر کی حویلی کا سرگ کرنے والے آتش بد
مہم جو بھٹل ہی کے فرستادہ تھے اور وہ وہی ہوں گے۔ پھر
کون ہو سکتے ہیں لیکن ایک تنگ و تاریک گوشہ ان کے
ہونے، کسی اور کے ہونے کا بھی اندازہ امکان موجود تھا
بہر حال اتنا تو واضح ہو گیا تھا کہ ہمیں کو تو اپنی طلب کرنے
پادجو اب تک وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں اور
لوگ جھوٹ، حجت و سکرار کا سب کوئی رائے قائم کرنا
بھٹل کو میں نے ایسا عطا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ پھر
پھونک کے انہیں جواب دے رہا تھا شاید اس لیے کہ
ایسی اتنی بڑی واردات یا سامنے کے سلسلے میں ہم بھی
نہیں ہوئے تھے۔ واقعے کی نوعیت پہلے سے مختلف
ولایت کا تربیت یافتہ پولیس افسر دراصل عام افسر
نہیں تھا۔

اس کی ساتھی بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ ان کے چو
سے کدورت اور خشونت جھلکتی تھی جسے ان کا پس نہ چل
ہو کہ وہ اس تو ٹھاکر کے بجائے جلد از جلد کوئی حکم نازل کریں
بعد میں یہ حکم واپس بھی لیا جاسکتا ہے۔ پشیمانی پولیس
معمول ہے۔ ان کا چلایا ہوا تیر کبھی نشانے پر بھی لگ
ہے۔ ان کے درمیان بیٹھے ہوئے پولیس افسر کو
کارروائی اور خاندان پر ہی سے غرض نہیں تھی۔ وہ سراسر
کی جستجو میں تھا۔ ولایت والوں کو یوں بھی وقت بہت
ہوتا ہے۔ وقت کی قدر و قیمت کا فرنگیوں کو کوئی غیر
احساس ہی ہوگا کہ ایک دنیا ان کی اسیر تھی۔ دس لوگوں
پاس وقت بہت دافر ہوتا ہے اور کہتے ہیں، جو چیز دافر
ہے، اس کی قدر و قیمت بھی کم ہوتی ہے۔ دس لوگ
معاملات میں بھی جوش و خروش سے شامل ہوتے ہیں۔
ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پولیس افسر دراصل ایک طلب
تھا، ایک حقیقی پولیس افسر جو کسی معاملے کی تک پہنچنے
لے اپنی ذات سے بے پروا ہو جاتا ہے، خود سے کوئی سزا
نہیں رکھتا اور ایسا شخص زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ولایت
بارے میں کسی نے مجھے بتایا تھا۔ شاید کرشنا جی نے۔
پولیس کے لوگ تحقیق و تفتیش کی دوران میں مشین
جاتے ہیں۔ مجرم یا ملزم سے انہیں ذاتی قسم کا عذاب نہیں
ان کا مقصد اپنے مقصد کا حصول ہوتا ہے۔ وہ مجرم کے تیر
جرم کے دشمن ہوتے ہیں اور دلیل و منطق کی ترانہ
ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کرشنا جی کہتے تھے کہ کبھی مجرم کے جرم

”اب کتنے دن بعد آتا ہوا؟“
”ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا۔“
”بچ کج کہاں کہاں رہے؟“
”اے ہی گھوما پھیری رہی، بھٹل نے بے اعتنائی سے
”ہاں کیا پولیس؟“

”کیوں گھوما پھیری کیوں؟ کوئی خاص بات؟“
”اپنے کو کتنے نہیں کاٹا ہے۔“
”کتنے آدمی کو کاٹے ہیں؟“ درما کے ہاں میں طرے بیٹھے
نے افسر نے ایک کے کہا۔ درما نے آنکھیں میچ لیں، اس
لے چرے پر ناگواری کے آثار صاف نمودار ہوئے۔
”جواب آتا ہے اپنے کو؟“ بھٹل درشتی سے بولا ”پر
بہدک جاؤ گے صاحب!“
”ہاں بتاؤ گے نہیں؟“ درما نے بہ جگت کہا ”کیا بات
ہی؟“

"آپ کا واسطہ نہیں اس سے" بھٹل آسکی سے بولا
 "اپنے کو کسی کی کھوج ہے۔"
 "کس کی؟" ورنہ ہلکے کے پوچھا "کون ہے وہ؟"
 "کوئی کھویا ہے اپنا۔"
 "کھو گیا ہے؟" ورنہ تذبذب سے بولا "کون؟ اڑے گا"

"آوی؟"
 "گھر کا آوی۔"
 "اوہ! پولیس افسروں نے لمبی سانس کھینچی۔
 "وہ الگ چکر ہے" بھٹل نے کھردری آواز میں کہا
 "آپ اپنی پھر کی گھڑاؤ ہم کو ادھر کیوں بلایا ہے؟ لگتا ہے"
 آپ ہم پر شک کرتے ہو۔"
 "جائے کیوں تبھی مضطرب ہو گئے۔ ورنہ کی آنکھوں کی
 چمک اور گہری ہو گئی۔ ترخ کے بولا "تم پہ کیوں نہیں کیا
 جاسکتا؟"
 "مگر صاحب! بھٹل کے لیے میں تھی نمایاں تھی۔
 "ہم اڑے کے آوی ہیں۔"
 "اور اڑے پہ بھی نمبر ایک۔"
 "تو بری کا ہے کی؟"
 "ابھی نہیں استاد! ابھی تم سے کچھ اور جانتا ہے۔"
 "آپ آگے جا کے ہی زبان کھولیں گے۔"
 "آگے کدھر؟"
 "ابھی ادھر ہی سارا ختم نہیں ہو جاتا۔"
 "تم ایک چالاک آدمی ہو استاد!"
 "ہملا نمبر ہی بولا تھا آپ نے؟"

"ہاں" اور اس میں اب شک بھی نہیں۔ پہلے سنا تھا
 اب دیکھ رہے ہیں لیکن استاد! ہمارا نمبر بھی کم نہیں ہے۔
 جہاں کی تم بات کر رہے ہو وہاں بھی ہمارا دیکھا اور جانا ہوا
 سامنے رکھا جاتا ہے۔"
 "ادھر ہی ہم ہوں گے اور اکیلے نہیں۔ ساتھ میں چونچ
 لڑائے کو اور بھی کالے پہلے پیچھی۔ ادھر ہی ہم جو بھیرویں
 الپ رہے ہیں اور آپ کے لیے نہیں پڑ رہی، ادھر ہی ایسا
 نہیں ہو گا۔ ادھر کا نئے کا بڑا دھیان ہوتا ہے، اتنے پانی کا
 حساب۔"

"ابھی کہنا چاہتے ہو تم؟" ورنہ کی زبان بگڑنے لگی "اور
 کہہ بھی کیا سکتے ہو۔ اچھی طرح جان لو استاد! تمام شہادتیں
 تمہارے خلاف جاتی ہیں۔ تمہارے ٹھکانے کا آدمی بیچ بازار
 میں ٹھاکر کے کھلائے پائے استاد گور کے پاؤں میں ہوتا ہے
 کہ کہیں سے استاد بابر سینہ پھلا کے آ جاتا ہے۔ اپنے اڑے

کے آدمی کی بری دشاؤد کچھ کے اس کا خون جوش مار رہا ہے
 استاد گور پر ٹھاکر کی چلی چڑھی ہوئی تھی۔ اس دو ٹھکانوں
 کے اندر سے کو پتا نہیں ٹھاکر کے سامنے کون مانا ہوا استاد
 چاقو کا بل کا دھنی۔ ان جانے میں استاد گور سے بھول ہوئی
 اور زمین کا منہ دینا پڑا "ایسا ہی نا؟"
 "ایک دم ایسا ہی" بھٹل نے ستائی انداز میں کہا "لگتا
 ہے، ولایت میں کوئی میم نہیں پالی صاحب نے مگھڑال سے
 بندھے رہے ہو زور پچھلے سے بات کرو۔"
 "پچھلے سے کیا؟" ورنہ گڑبڑا گیا۔

بھٹل نے گھری اور جی ہوئی آواز میں اسے بتایا کہ
 فیض آباد شہر کے ایک آسودہ حال سادہ شہار کا دودھاری گھر
 کشمی داس کی جوان سال، نازک اندام، تعلیم یافتہ اور نرم
 تعلیم پتی رکھا ایو دھیان میں تھرتھرتا کر کوئی ہوئی تھی کہ ٹھاکر
 بستی کے مالک و مختار ٹھاکر بل دیو کے منہ زور بے لگام اور
 نفس پرست بیٹے ہر دیو کی نظروں میں آگئی۔ رکھا کا صبر
 و جمال دیکھ کے ٹھاکر اور اسان کھو بیٹھا۔ اس نے وہیں تیرہ
 امتحان پر رکھا سے زیادتی کرنی چاہی اور ناکام رہا۔ پھر اس
 نے فیض آباد میں کشمی داس کو رکھا کے لیے پیغام بھیجا۔
 ٹھاکروں کے مال و زر، عیش و عشرت، آس پاس کے لوگ
 جو روستے سے کشمی داس خوب آشنا تھا۔ آس پاس کے لوگ
 اپنی نوجوان لڑکیاں پردوں میں چھپائے رکھتے تھے۔ کشمی
 داس اس حقیقت سے واقف تھا کہ انکار کی سزا کیسی جبر
 ناک ہو سکتی ہے لیکن سب کچھ جانتے ہوئے وہ اپنی ز
 و نازک بیتی کو ٹھاکر کے جنم میں نہیں دھکیل سکتا تھا۔ وہ
 بمانے کرتا رہا۔ ٹھاکر نے دھمکیاں دینی شروع کر دیں اور
 ایک روز اپنے شوہر پست کارندوں کے ذریعے رکھا کو اغوا
 کرا لیا۔ شہر کے اڑے کے آدمیوں کو بروقت خبر ہوئی
 انہوں نے ٹھاکر کے نمک خواروں کو راستے میں جالیا اور
 مار بھگا گیا۔ رکھا بہ سلامت گھر واپس آگئی۔ اڑے کے
 آدمیوں کی یہ جرات ٹھاکر کے لیے سبکی اور توہین کے مترادف
 تھی۔ انہیں قابو میں رکھنے کے لیے ٹھاکر نے اپنے ہرود
 پارہ ہنسی کے ہتھ پھٹ "چاقو باز" اڈا گور استاد گور کو فیض
 بیچ دیا۔ گور نے فیض آباد میں داخل ہو کے بیچ بازار
 ایک دن کشمی داس کے محل میں تعینات استاد ہر کا را۔
 روک لیا۔ چاقو نکل آئے۔ بھٹل نے کما کے اتفاق سے اس
 دوران میں بابر (یعنی میں) کسی کام سے وہاں سے گزر رہا تھا
 مجمع دیکھ کے گھبرا گیا۔ اس کی دخل اندازی کی وجہ سے گور
 چاقو پر گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ ٹھاکر ہر دیو کو چل ڈالتا

ہوئی تھی جب کشمی داس نے اپنی بیٹی کے لیے اس کے
 لئے ہر ہائی نہیں بھری تھی۔ دوسری ندامت گور کی ہزیمت
 ہوئی۔ اور ہر رکھا اپنے اغوا کے حادثے سے ایسی دل
 اٹ ہوئی کہ ہنسا ہونا، ٹھکانا پینا بھول گئی۔ وہ سکتے کی سی
 نت سے دوچار تھی۔ اس طرف ٹھاکر کے سینے میں پچاس
 تھی تھی۔ اور جلد ہی چند دنوں کے اندر اندر ٹھاکر ہر دیو
 ایک رات اپنے زرخیز مسلح آدمی دوبارہ شہر بھیج دیے۔
 ایک رات میں ناک لگائے بیٹھے تھے انہوں نے چھب کر
 مذہب سے ناک گشت کرنے والے ہر اور اس کے حقیقی بھائی
 پٹلائے کا گشت کرنے والے ہر اور اس کے حقیقی بھائی
 در و دار کیا اور انہیں ختم کر دیا اور کشمی داس کے گھر
 رکی۔ اس کے گھور کے دربان اور ملازم کو راستے سے
 کے وہ رکھا کو ساتھ لے گئے۔ کشمی داس کو بھی انہوں
 زنی کیا۔ وہ اب پاگل ہو گیا ہے اور اسپتال میں ہے۔
 کے دو جوان آدمیوں کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنے شرکی
 لڑکی کی عزت و آبرو محفوظ کرنے پر عین سر ہو گئے تھے۔
 بھٹل ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ پولیس افسروں نے
 راٹھاکے اسے روک دیا "آگے ہم بتاتے ہیں استاد!" اس
 ہر ہمتی رہا تھا، وہ اضطرابی انداز میں بولا "بالکل دیسا ہی"
 تم ہونا چاہتے ہو۔ پھر یہ ہوا کہ کشمی داس بیچ گیا لیکن بے
 'مروے سے بدتر' ٹھاکر کے لوگ رکھا کو لے گئے اور
 رہے دن رکھا کی ادھر ہی ہوئی ہر نہ لاش شہر کے کنارے
 ڈیول میں پڑی ملی۔ کشمی داس پہلے ہی سدھ بدھ کھو بیٹھا
 اس دکھ سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ہر، 'پھو'
 ہی داس کے دونوں نوکر اور بیٹی رکھا، سب کی اڑتیاں
 لے چھپے انہیں۔ شہر کے بہت سے لوگ کریا کر میں شریک
 سنے اتنا ہی نا؟ پلو مان لیا کہ یہ ہتیا میں ٹھاکر کے آدمیوں
 کیس لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ بولو استاد!"

"جو آپ کی مرضی ہو، بول دیں۔ اپنے لیے اب کیا رہ
 ہے۔" بھٹل نے برکتگشتی سے کہا "ہاں" اس کے بند
 دی والوں نے چوڑیاں ڈال کے شریں ٹھکانا لگا یا پھر کھیل
 "اور ان کی جگہ کسی اور نے لے لی۔ ٹھاکر بستی کا صفایا
 دیا، ایک دو نہیں، پورے ستائیس آدمی بھون دیے۔ ان
 ہمارے کھیت کھلیان، سارا کچھ" ورنہ کی آواز حلق میں
 لٹکی اور اس نے تقریباً بلبلانے کو پچھا "وہ وہ کون تھے؟"
 "اب سرتال آپ ملاؤ صاحب!" بھٹل نے بے نیازی
 نہ کیا۔
 "وہی کر رہے ہیں" پولیس افسر ورنہ ترخ کے بولا "اور

ایسا گھبر معاملہ نہیں، وہیاد دو تو ادر ادر آئے سامنے کا
 صاف دکھائی پڑتا ہے۔ زیادہ دن نہیں بیٹے تھے، ہر اور پھو
 کو ششان گھٹا پہنچائے، ٹھاکر ہر دیو کو پورے کے پے پور
 نوکر چاکر، دھن دولت سمیت ختم کر دیا گیا اور جانا کہ حساب
 چکنا ہو گیا ہے اور یہ سارا اس سے ہوا جب گلے کا بادشاہ
 بھٹل اور اس کا وزیر بابر، فیض آباد میں تھے۔"

اب کیا کلام رہا تھا۔ پولیس افسر کے لیے میں ایسی کوئی
 رمزیت اور معنی خیزی نہیں تھی، بھٹل کو کسی خوش فہمی میں
 نہیں رہنا چاہیے تھا۔ اس نے خاموشی اختیار کی، شاید اس
 لیے کہ غیر معقول جواب سے خاموشی بہتر ہوتی ہے۔

"تم اسے اتفاق بولو گے؟" ہیں نا؟ تم کو کیا ہی ہونا
 چاہیے لیکن ایسے اتفاق بڑے کم ہوتے ہیں استاد! اڑے کے
 دو جوان مارے گئے۔ آج دو کم ہوئے تھے، کل چار بھی ہو سکتے
 تھے کیا اڑے کے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں؟ اڈا
 ہوتا کس لیے ہے؟ اس کے آدمی اتنے سستے نہیں ہوتے
 کیوں استاد!"

"اڑے کے آدمی کا کیا مول۔ وہ حرام کا، ملی کا بکرا ہوتا
 ہے۔" بھٹل نے بے زاری سے کہا "کوئی نئی بات کرو
 صاحب! آپ نے فیصلہ کر دیا ہے، اب آگے حکم کرو۔"
 "نہیں استاد، معلوم ہے تم کس فہم میں ایسا بول رہے
 ہو۔ کام بکا ہوا ہے، سولہ آئے پکا۔ ہم نے تمہارے پٹھو استاد
 سلامی اور اڑے کی اور آدمیوں سے پوری جان کاری لے لی
 ہے، پرسوں شام سے کل صبح سویرے تک تمہارے اٹھے
 بیٹھے کی۔ پرسوں شام تم سلامی کے ساتھ پولیس کی بدمانگنے
 تھانے گئے تھے پھر کسی ہوٹل میں چائے پی، بازار گھومے
 اور اسپتال جا کے کشمی داس کی پوچھ گچھ کی۔ اڑے سے
 رات کو گانا سننے کو ٹھے پیچنے اور درہنگ مستی کرتے رہے پھر
 اڑے لوٹ کے باقی رات وہیں گزار دی۔ دوسرے دن سورج
 نکلے بلکہ دن چڑھنے کے بعد گھر کا رستہ لیا۔ اس میں کچھ غلط تو
 نہیں ہے؟" ورنہ نے تیرہ آواز میں پوچھا۔
 "آئے پانی سے بڑا برا!" بھٹل نے مصنوعی حیرانی سے

کہا۔
 "معلوم ہوا" فیض آباد آئے کے بعد استاد بابر گھر میں یا
 حویلی میں بند رہا۔ وہ صرف اس دن باہر نکلا تھا اور یہ دوسرا
 دن تھا جب بازار میں ہر اور استاد گور میں چاقو پھل رہے
 تھے اور ہر کے پاؤں اکٹھے تھے تھے۔ پھر اتنے دن بعد پرسوں
 پہلی بار استاد بابر اڑے پر آیا وہ بھی تمہارے بلائے پر، تم نے
 اڑے کے آدمی بھیج کے اسے بلایا تھا۔ ہر اور پھو کے کیا

کرم میں بھی وہ شریک نہیں ہوا تھا۔ وہ استاد باہر جو ہر کام نچلا دیتے دیکھ کے تڑپ گیا تھا، ہر ایک موت پر کھمبے میں آرام کرتا رہا۔ لکشی داس کی یاد بھی برسوں تم دو دنوں کو بہت آتی جب کہ وہ کئی دن سے اسپتال میں مر رہا تھا۔ ہرا اور پھو کے مرن کو ابھی سے نہیں جانتا تھا کہ گانا سننے اور ناچ دیکھنے کا تمہارا من ہو گیا۔ رات گئے تک آشپاہی کے کونے پر بچکی کے کھنگرو کھٹکتے رہے۔ ادھر شرمیں بیٹھ آدی گواہ ہیں کہ تم دونوں بیٹھ تھے، سچ شرمیں۔ سب کے سامنے اور اڑے کا کوئی بھی آدی باہر نہیں تھا۔ تھانے جاکے تم نے رات کو اڑے کے آس پاس پولیس کا پیرا بھی لگوا لیا تھا۔ اتنے دن بعد تمہیں اڑے کی رکھوالی کی بھی چٹا ہو گئی۔ سارے کام اسی شام اور اسی رات۔ بڑے تجربے کے بعد ایسا ناپائیدار ممکن ہوتا ہے۔ تجربہ بڑی چیز ہے۔" رومانے آخری لفظ انگریزی میں ادا کیے اور ہنسنے پھلائے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ بھٹل کی خاموشی پر اس نے تقریباً جھرتے ہوئے ٹوکا "بولو استاد! برسوں رات اور کل صبح تک ہی اتنی چلت پھرت کیوں۔؟"

"بھول ہو گئی صاحب! بھٹل نے پشیمانی کے انداز میں کہا "پر اتنا صاف ہو گیا، ادھر ہی ٹھاکر بستی میں جانے اور تاک دھندلا دھن کرنے والے ہم نہیں تھے۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب کہاں ہو کہ ٹھاکر بستی میں چپچھاڑ کرنے والے دشت، وہ بھیڑیے تمہارے بھیجے ہوئے نہیں تھے۔"

"آپ جو مطلب نکالو صاحب! بھٹل نے سر جھکا کے کہا۔

"وہ لوگ کون تھے؟" رومانے لڑی ہوئی آواز میں بولا "تم کو اب یہی بتانا ہے، وہ کون تھے؟ ہمیں وہ آدی چاہیں۔"

"بھٹو، ہی تھے وہ۔ بھٹل نے دبے لہجے میں کہا۔

وہ پانچوں اپنی نشستوں پر زبردور ہو گئے۔ پولیس افسر کے جسم میں ہلک سی اٹھی "ہاں ہاں" اس نے بے تابی سے کہا "تم یا تمہارے آدی، تنگی سامھی۔ بات ایک ہی ہے۔"

بھٹل نے ہاتھ جوڑ دیے "ایک بات تو دوسری کوئی نہیں رہی مہاراج! "

"اب صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ تم جلد سے جلد ان آدمیوں کے نام بول دو۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے، ہم بولتے ہیں، وہ بھی تھے۔ ہم یا ہمارے تنگی سامھی اور آپ نے ابھی ڈنڈا اٹھا دیا ہے۔ بات ایک ہی ہے تو آپ کا کیا جاتا ہے۔ ان کے بدلے ہمیں کھینچ

دو۔ پھندے کے لیے گردن چاہیے آپ کو، ہماری کران کی۔ اپنا کام بکا کرو اور گھر جا کے کمر سیدھی کو قتل کھا گئی ہوگی۔"

"جانتے ہیں، ایسا کیوں بولتے ہو؟" رومانے آواز زور فزون ہو گیا "اس پر تم چھوٹ جاؤ گے لیکن وہ ہونڈی بات ہے۔ ابھی تم یہاں ہو، کیا سمجھتے ہو، ہم تمہیں اتنی آسانی سے آگے جانے دیں گے؟ ایک دن، دو دن، ہفتے بھر، کئی ہفتے تک ہم تمہیں روک سکتے ہیں۔"

"پر ایک دن تو بدراکھو گے" بھٹل نے چرماتی آوازیں کہا۔

"وہ دن ابھی دور ہے۔"

بھٹل کسمکے رہ گیا۔

چند لمحوں میں وہ تینوں سرگوشیاں کرتے رہے۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میز کے دونوں طرف بیٹھے ہوئے مقامی افسر بھی شامل ہونے کے لیے مضطرب تھے۔ مٹا رومانے پھر کئی ہوئی آواز کمرے میں گونئی "کون تھے وہ؟"

"آپ سمجھتے ہو، ہم بتا دیں گے؟"

"نہیں تو اپنے لیے برا کر دو گے۔"

"اور بتائیں گے تو کیا ہمارا کچھ بھلا ہو گا؟"

"اس میں تمہارے لیے ضرور کوئی نری ہو جائے گی؟"

بھی سفارش کریں گے۔

"اور چپ رہنے پر کیا رہے گا؟"

"یہ دھیان من سے نکال دو پھر تمہارا انگ انگ بو۔"

گما، ہم کو معلوم ہے، کسے۔"

بھٹل نے جھجھکتے ہوئے کہا "اس سے آپ کو کیا ملے؟"

کچھ بھی نہیں صاحب! کچھ نہیں۔"

"ویکیس گے، تم ہی لوگوں میں ہماری بھی گزری ہے۔"

"اپنے ساتھ نہیں گزری صاحب! وہ اور لوگ ہوا گے۔"

"تم تم کون ہو؟" رومانے کو طیش آیا "واو کیر؟ چنے خارا ٹرم باز؟"

"ہم کیا، کچھ بھی نہیں صاحب! دھوکا ہو رہا ہے آپ کو۔"

دور ہو جائے گا۔"

"ایسے ایسے ہی دور ہو جائے گا؟" رومانے چلا کے بولا۔

"بنتی بنتی کر سکتے ہیں صاحب! "

"ہا، بنتی، بنتی۔" رومانے کو گھبراہٹ اور اپنے ساتھیوں کا مخاطب ہو کر بولا "سنئے ہیں آپ، استاد بھٹل کیا بولتے ہیں؟"

کر رہے ہیں۔ انہیں ٹھاکر دیا جائے واہ استاد! " رومانے کے چہرے پر رعوت تیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو استاد! " رومانے کوئی نہیں بولا۔

بھٹل اپنے جتن کر رہا تھا۔ اپنی اور میری برات کی نئے آخری لمحے تک کرنی تھی۔ میرا اتنا کچھ نہیں مجھے تو اپنی لامعلی کی ایک آسودگی حاصل تھی۔ اسے لی ہی مٹنا چاہیے۔ اندھے اور بہرے کو دیکھنے اور سننے ان حاصل رہتی ہے، گونگے کو بولنے سے۔ آدی کو نہیں ہے، نہ دیکھنے پر نہ سننے پر نہ بولنے پر۔ مجھے کوئی نہیں کرنی تھی۔ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتے تو میرا ایک باب ہوتا، اپنی معذوری کا اظہار۔ غالباً میری ثانوی ت سے وہ بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے خیال میں مجھ ہم کلائی وقت کے خیال کے مترادف ہوگی۔ بھٹل ہی کو ناچوئی کرنی تھی کمر مال دونوں کا مقدر تھا۔ بھٹل کی کمر کا مجھے خوب اندازہ تھا۔ اس شخص کے لیے اپنی ت کسی اعصاب شکن اور صبر آزما ہوگی جو فی الواقع کسی گرفت اقدام کا مرتکب ہوا ہو۔ صاف دامن کی توانائی نہ اور ہوتی ہے بہر حال ایسا انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے لو کو عواقب و مضمرات کا بدر تمام احساس ہو گا۔ حویلی پولیس کی آمد، کو توالی میں طلی، اس طرح کمرے میں بے ہوئے مجرموں کی طرح باز پرس اور دلیل، تاویلیں دربد میں پیش آنے والے ممکنہ بہت نادر بڑے اذیت رطوں سے نبرد آزما کی کے خاکے بھی اس کے ذہن میں آئے ہونے چاہئیں۔ ٹھاکر کوئی ایک آدی نہیں تھا۔ کوئی بھی نامزد شخص ایک آدی نہیں ہوتا، کبھی وہ دھوکے مسادی اے کبھی چار کے، کبھی سوکے اور کبھی ہزار کے۔ اپنی اپنی بات پر موقوف ہے۔ ٹھاکر کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں پولیس افسروں کے تجربے پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ یہ مادی تھا جو میں نے اسے طور پر قیاس کیا تھا۔ رومانے اس کی تصدیق یا انکار کرتی تھی۔ اس کی زبانی یہ ترتیب مکمل سن کے مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا ہم زاد رہا ہو۔ ابھی بھٹل ٹھاکر بستی میں جانے والے جاں بازوں سے اپنی لکھی کی کوئی مقتول بدل تو جیسہ پیش نہیں کر سکا تھا۔ اس اقرار بھی مجسم تھا، انکار بھی۔ کبھی تردید، کبھی تائید، کبھی لکھی نری، مدافعت اور سرکشانہ۔

انہوں نے ہمیں طلب کرنے سے پہلے ہمارے بارے میں سی معلومات جمع کر لی تھیں۔ اڑے کے آدمیوں نے

اڑا رہا نیاز مند ہمارے ہنر کاری و مشاق، چستی و چابک دستی کے فنون میں خاصی مبالغہ آرائی کی ہوگی۔ سب کچھ تازہ تازہ تھا۔ یہ نقش دھندلانے یا زائل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت تو درکار ہوتا۔ بھٹل نے ابتدائی میں اندازہ کر لیا ہو گا کہ ہمیں سامنے ملانے سے پہلے وہ کوئی رائے قائم کر کے بیٹھے ہیں۔ سیدھا انکار انہیں آسانی سے منظور خاطر نہ ہو گا۔ وہ سارے بڑے اہتمام میں نظر آتے تھے۔ کچھ دیر کے لیے سہی، انہیں ان کی جزر و بدیدہ ریزی، خود کچھ اخذ کرنے کی سرخوشی سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ بھٹل کی جانب سے صاف انکار انہیں مایوس کر سکتا تھا۔ مایوسی کبھی اشتعال کا رخ اختیار کر سکتی ہے۔ یہ میرا گمان تھا، بھٹل کی طول کلائی بھی بے سبب نہیں معلوم ہوتی تھی۔ چنگ بازی کے دوران میں ڈھیل دینے جیسا کوئی حربہ۔ وہ انہیں مترو و متذبذب کرنے کی جستجو میں تھا لیکن رومانے کوئی روایتی طرز کا پولیس افسر نہیں تھا۔ اس کا طریق کار جید اگانہ تھا۔ ہمارے لیے بہت نیا۔ امتیازی کارکردگی کی کوئی وجہ ہی ہوگی جو اس نے کم عمری کے باوجود پولیس میں یہ مرتبہ حاصل کیا تھا۔ اب خلاصہ اتنا تھا، رومانے کچھ تھانے ہوئے تھا، ہم اس کی تحویل میں تھے اور اسے ہر لحاظ سے ہم پر فوقیت حاصل تھی۔ اپنی دھمکی کے مطابق وہ ہمیں عرصے تک حوالات میں روک سکتا تھا اور یہ عرصہ کسی طور ہمارے لیے سودمند نہیں تھا۔ اگر واقعی ٹھاکر بستی میں ٹھاکر بل دیو، اس کے خاندان اور کھیت کلیان نیت و نابود کرنے والے بھٹل ہی کے بھیجے ہوئے آدی تھے تو اپنا کام پورا کر کے راتوں رات وہ بہت دور جا چکے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے، گروہ کے بجائے وہ الگ الگ سمتوں میں کھڑے ہوں۔ انہوں نے ہر ممکن احتیاط کی ہوگی مگر کتنے ہیں، جرم اپنے سامنے چھوڑ جاتا ہے۔ ان کی ذرا سی لغزش بھی ہمیں بڑے عذاب سے دوچار کر سکتی تھی۔ وہ لگاتار اور ہمیں کے آدی ہوں گے۔ ان شہروں کے سوا کہاں کے ہو سکتے ہیں اور ضرور انہیں جامو اور جمونے اکٹھا کیا ہو گا، بھٹل تو مستقل فیض آباد میں تھا۔

دیر تک ایک جگہ خود کو باندھے ہوئے کھڑے کھڑے ٹانگیں اگڑنے لگی تھیں۔ "دیکھو صاحب! بھٹل نے نیم اچھائی، نیم چھائی کچھ میں کہا "اپنی نانو تو کچھ پولیس؟"

"اب کیا رہ گیا ہے اب تک تمہاری ہی سنی ہے" رومانے آتش بار آوازیں بولا۔

"اچھا ہو گا کسی اور طرف بھی دھیان دو۔"

"کسی اور طرف؟ کس طرف؟" رومانے کے تیروں میں

ذرا بھی منافست نہیں تھی، بگڑے بولا "بس استاد! تم کو اب صرف یہ بتانا ہے، وہ کون لوگ تھے؟"

نسل نے ایک بار پھر صراحت سے مدعا بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بندھی ہوئی آوازیں کہا کہ ہمت ہوگا، وہ ہم و روانہ انداز میں ہمارے معاملے پر نظر ثانی کریں۔ کیا یہ معلوم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ کس بنیاد پر اتنے بڑے واقعات میں ہمیں ملوث کیا جا رہا ہے۔ لکشی داس کی نوجوان اور معصوم بیٹی پر کھاکے انگو، خون اور ساتھ میں دو ملازموں کی ہلاکت اور لکشی داس کی بے چارگی، اس کی شکستہ حالت پر اڑے کے آدمی دل گرفتہ تھے۔ شہر میں ان کے ہوتے ہوئے یہ سانحہ کیسے ممکن ہو گیا۔ یہ ان کے لیے بڑی سبکی اور شرم کی بات تھی۔ لیکن ظاہر ہے، اس سے بڑا صدمہ انہیں اپنے دو بے گناہ ساتھیوں کی موت کا ہونا چاہیے۔ وہ تو بے حال تھے اور ان کی کیفیت، بیخوشی کی سی تھی۔ ہیرا اور پھوکے کپڑا کرسم سے پہلے وہ بارہ بجے جا کے استاد گورا کے سر پر چنچنے کے لیے پر ہول رسے تھے۔ ان سے معلوم کیا جائے یا شاید خود انہوں نے پولیس کو بتایا ہو کہ ان کی لگائیں کس نے کھینچے رکھیں، کس نے انہیں مصروف خط کی تلقین کی، کون راہ کی دیوار بن گیا، کس نے انہیں تسلی دی کہ وہ خاطر جمع رکھیں گورا کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ اسے یہ سو ادا لانا بہت مزگا پڑے گا۔ غلبت مناسب نہیں، کوئی بھی انٹالسیدھا قدم پر سکتا ہے۔ ٹھاکر کیل دیو اور ٹھاکر ہریو سے اڑے کے آدمیوں کا براہ راست کوئی معاملہ نہیں تھا۔ انہیں تو گورا مطلوب تھا، وہ اور اس کے ساتھی۔ گورا ہزار ٹھاکروں کا پروردہ ہو لیکن انہیں گورا سے سروکار تھا۔ اصولاً گورائی ان کا ہدف ہونا چاہیے۔ ٹھاکر تو دور کی بات تھے۔ گورا کی ہزیمت ٹھاکروں کے لیے درس عبرت ہوئی۔ اڑے کے آدمی بس اشارے کے منتظر تھے۔ وہ انگاروں پر وقت گزار رہے تھے لیکن ہوش و حواس سے عاری نہیں ہوئے تھے۔ ٹھاکروں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے انہیں بدترین نتائج کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ ٹھاکروں کے جاہ و جلال اور اثر و رسوخ سے وہ خوب واقف تھے۔ وہ اتنی ہی دور تک جاسکتے تھے جتنی ان کی استطاعت ہے۔ اڑے کے آدمیوں کو چاقو اور زور کے علاوہ پولیس اور قانون کی بھی شہدہ ہوتی ہے۔ کسی کو بھی زنداں بند نہیں۔ کوئی بھی سولی پر چڑھنا نہیں چاہتا۔ یہاں سب ایک دوسرے کے گواہ ہیں اور شر کے لوگ بھی۔ اڑے کے آدمیوں میں کوئی بھی اس عرصے میں شہر سے باہر نہیں گیا۔ نہ یہاں باہر سے کوئی آیا۔ شاید پولیس نے بھی شبہ کر لیا ہے کہ

فیض آباد کے اڑے کا کوئی آدمی ٹھاکر بستی کی عمارت گرمی میں شامل نہیں تھا۔ پھر وہ کون تھے؟ وہ کون ہو سکتے ہیں؟ وہ اڑے کے آدمی نہیں تھے تو ان کے فرستادہ ہو سکتے ہیں یعنی اڑے کے آدمیوں نے ادھر ادھر اپنے دوستوں سے فرد کی ہوا یا مل و زور صرف کر کے کرائے کے آدمی جمع کیے ہوں اور انہیں ٹھاکر بستی جانے والے راستے کی طرف بنگایا ہو۔ وہاں تپتی بجانی والوں کی نفرت بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ ٹھاکروں کی حویلی کی دیواریں اونچی ہوں گی، پیرے و باہر بھی کم نہیں ہوں گے۔ ٹھاکروں کے اتنے بڑے گھر اور لاؤ لکسر پر چند توہمیں سے غلبہ نہیں پایا جاسکتا۔ وہ لوگ بہت منظم ہوں گے اور مسلح بھی خوب پیشہ ور بھی۔ اس منصوبے پر انہوں نے پوری طرح غور و فکر کیا ہوگا۔ غور و فکر کے لیے وقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ آندھی کی طرح ٹھاکر بستی میں وارد ہوئے تھے معقول وجہ ہونی چاہیے کہ یہ سرفروش مہم جو فیض آباد کے اڑے کے آدمیوں کی تحریک پر ٹھاکر بستی میں آئے تھے اور اس طرح فیض آباد کے اڑے کے آدمیوں نے مرنے والے اپنے عزیز ساتھیوں سے رفاقت کا حق ادا کر لیا۔ ان کی روحوں کو سکون پہنچانے کے اسباب پیدا کیے اور اپنے بیٹوں کا بوجھ ہلکا کیا۔ کسی مضبوط جواز، معتبر شہادت اور بین ثبوت کے بغیر ان پر ایسا کاری الزام عائد کرنا سہمے، نا انصافی اور بہت دھری ہے۔ "ایسا کیسے صاحب!" بھیل نے گھبرائے میں کہا "یہ اتنا برا کارن نہیں ہے کہ اڑے کے دو آدمی مارے گئے تھے چاقو رکھنے اور زور کرنے والوں کے بچا لیا اور نیچے روز ہو تا ہے۔ ہر پاگل نہیں ہیں صاحب!" بھیل نے اچھے اپنے آپ پر شبہ ہوا۔ میں یقیناً کسی بدگماں کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ بھیل کے بیان میں بڑا اثر تھا۔ پانچول افسر انشاک سے سنتے رہے۔ ورا کے واپس جاب نیچے ہوئے معمر افسر نے دخل اندازی کرنی چاہی تو ورا نے اسے روک دیا۔ بھیل کے چپ ہو جانے پر چند لمحے سناٹا چھایا۔ پھر ورا کی بھڑی ہوئی آواز گونجی "کارن پوچھتے ہو گورو! کارن ہے۔ سب سے بڑا کارن تم خود ہو۔ شہر میں تم ہو، یہاں تمہارا اور تمہارے سیدھے باڈو والے استاد بار کا ہونا سب سے بڑا کارن ہے۔ تم اڑے کے آدمیوں میں خود کو کیوں شامل کر رہے ہو۔ ان سے خود کو الگ کر کے بات کرو۔ تم ٹھیک بولتے ہو۔ ان لوگ نے بھی یہی بولا ہے۔ تم نے انہیں روکا تھا پر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم نے خود کو بھی روکے رکھا ہو۔ تم نے انہیں ہوا ہی نہیں لگنے دی۔ تمہیں

ملم تھا کہ ٹھاکر بستی سے کچھ دنوں بعد ایسی سچپنا آئے۔ وہ اپنی ٹپ منڈے ہو جائیں گے۔ ہم نے چاروں طرف مایان دیا، پوری چھان بین کی ہے۔ پرکھوں سے اس پاس ٹھاکروں کا کھنڈہ چل رہا ہے۔ کوئی بڑی دشمنی نہیں سمجھی ان کی ہے۔ دشمنی کے لیے برابر کا ہونا چاہیے۔ ہم نے ادھر لٹ پٹ پولیس کو بھی ارجمند تار دیے۔ ٹکٹے کی ساری پولیس سٹاؤنڈل کو جانتی اور مانتی ہے۔ بولتے ہیں "استاد بھیل کے کانے کا کوئی منتر نہیں۔ ایک وقت سارے ٹکٹہ شہر میں ہی کاراج تھا۔ اب بہت دنوں سے استاد ٹکٹے میں نہیں ہے درجامو استاد اس کی گدی پر بیٹھا ہوا ہے، ویسے اڈا استاد بھیل کے نام ہی ہے چلتا ہے جامو بھی بڑا ٹھکانا استاد ہے۔ سٹاؤنڈل نے کوئی ایسا دیا تو اپنی جگہ نہیں بٹھایا ہوگا۔ ٹکٹے سے آنے والی رپورٹ میں بڑی بڑی باتیں، بڑی بڑی لہجائیں لکھی ہیں تمہارے لیے۔"

"وہ تو سارا ٹھیک ہے" بھیل نے ناراضگی سے کہا "پر کدھری بند کہ ٹھاکر بستی پہ ہمارے آدمی چڑھ دوڑے تھے۔"

"وہی تم کو بتاتا ہے" ورا نے جلی کئی آواز میں کہا۔ پولیس ایسے کسی پر الزام نہیں دھرتی۔ ہمارے پاس کارن ہیں۔ یہ بھی تم ٹھیک بولتے ہو، دوستا تھیں کو کھوڑنا اڑے کے آدمیوں کے لیے اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ دیر سویرت سہی، رو گورائی سے منشت۔ ٹھاکروں تک وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ٹھاکروں تک وہی سوچ سکتا ہے جس کی آنکھ دور تک دیکھتی ہے۔ یعنی وہ آدمی تم جیسا ہوا تھا۔ اڑے کے آدمیوں کو ہم نے دیکھ لیا ہے۔ ان میں زیادہ تر گدھے ہیں۔ بس ان کو اتنے کا دکھائی دیتا ہے۔ جامو اور جھرو کو تم نے بلایا۔ اب ماں ان دونوں جیسا کوئی استاد نہیں رہا۔ پھر بھی اڈا چل رہا ہے اور یوں چل رہا ہے کہ اڈا جھرو اور جامو کا ہے اور ان کے پر استاد بھیل بیٹھا ہے، کوئی سینہ پھلا کے دندا تا ہوا آئے کیسے آئے؟"

ورا کو معاً کچھ خیال آیا۔ اس نے رک رک کے ایک ٹکٹہ سامنے رکھے ہوئے کا کھنڈہ پر ڈالی۔ دو ایک وقت لگنے کے بعد وہ اسی کھنڈہ سے لہجے میں بولا "اب کے یہاں تم بہت نول بعد آئے تم کہیں بھی رہو، کہیں بھی جاؤ، کتنی ہی دور، کن تو تمہارا یہاں انکار رہتا ہے۔ تم کو بار بار یہاں آتا ہے، اب تک تمہارا راج محل کھڑا ہے اور محل میں بیٹی رہتی ہے، لڑکیا کو کوئی بھی ہے۔ محل کی چوکیداری اڑے کے آدمی کرتے ہیں۔ جامو اور جھرو کے ناتے شہر کا اڈا تمہارا اڈا اور

مونجھ کی کمان کھینچی ہو۔ سینہ پھلائے، ہنر لرا تا وہ محل کے عین مقابل آکے ٹھہر گیا۔ ورا کے اشارے پر دو سپاہی مجھے بھیل سے کچھ دور لے گئے۔ گواہ وہ ابھی صرف بھیل کو تختہ مشق بنانا چاہتے تھے۔ بڑی مونجھ والا سپاہی ل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھوڑا رہا "تو ہی رستم ہے؟" بھیل نے کاٹ دار آواز میں پوچھا۔

سپاہی کا جسم بل کھا گیا، آنکھیں کچھ اور چوڑی ہو گئیں۔ اس کے بجائے معمر افسر نے اشتعال کی حالت میں کہا "ہاں، یہی رستم ہے، یہ سپاہی کم جلا زیادہ ہے۔ اس کو تمہارے چپے موٹی کھال کے سوروں کے لیے یہاں رکھا ہے۔"

"اپنے کو نفی لگتا ہے۔" بھیل نے جھٹ بھاتھ بڑھا کے سپاہی کے ہاتھیں گال پر پھیلی ہوئی مونجھ کی نوک موڑ ڈالی "مونجھ تو اس کی کرا رہی ہے۔ تیل پلاتا ہے رے اس کو؟"

سارے افسر ہڑک اٹھے۔ سپاہی رستم بری طرح سٹٹا گیا۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کے اس نے ہنر گھمایا پھر کچھ خیال آنے پر اپنے سامھی سپاہی کو بھیل کے ہاتھ باندھنے کی ہدایت کی۔

"آدمی بھی کرا رہا ہے۔" ایک مقامی افسر نے زبان کھولی "مونجھ ہی کو نہیں، سارے بدن کو تیل پلاتا ہے۔"

"اپنے کو تو ہیرا دکھتا ہے۔ کسی اور کو بلاؤ صاحب! اس نے بس چربی چڑھائی ہے۔" بھیل نے یقیناً کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔

رسی باندھنے کے لیے دو سپاہی بھیل کا ہاتھ پکڑ کے پشت کی طرف کرنے کو آگے بڑھے ہی تھے کہ بھیل نے اچانک دونوں ہاتھ پھیلا دیے ان کی گردن پر تھم جھٹ ضرب لگائی۔ یہ افتاد دونوں کے سان و گمان میں نہ ہوئی۔ دونوں بے توازن ہوئے اور پاگوں کے مانند چپٹے ہوئے۔ بھیل کی طرف جھپٹے۔

لحمے بھر میں کرا منتشر ہو گیا پانچوں افسروں نے کرسیاں چھوڑ دیں۔ معمر افسر نے مچھا نکال کے تان لیا۔ دو سپاہی میرے لیے بست لگانے کا تاثر دیا تو انہوں نے اپنی گرفت سخت کر دی۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ مجھ سے اٹھے رہیں اور انہیں بھیل کے پاس جانے کا موقع نہ ملے۔ نوجوان افسر کھنا بھی بھیل کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ رستم ہوش و حواس سے ریچان سا ہو گیا تھا۔ اس نے بھیل کے ہاتھ بندھ جانے کا انتظار کرنے کے بجائے ہنر بلند کیا اور گھما کے سن کو مارنا چاہا مگر بھیل نے ہنر کا چڑا جابک دیتی سے اچک لیا اور اپنے

ہاتھ میں تیزی سے لیٹ لیا۔ رستم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، سارا جسم ہلچل رہا تھا۔ اوجھرے نوجوان افسر اور دو سپاہیوں نے بھل کو دبوچ لیا لیکن بھل نے پھر کوئی مزاحمت نہیں کی، "ان بھانڈوں کو دور کرو صاحب!" اس نے گونجتی آواز میں کہا۔

"تم ایک اور جرم کر رہے ہو۔" درما دھاڑنے لگا "قابل دست اندازی پولیس۔"

"خون سے بڑا نہیں ہے، ان کو روکو صاحب! ہم مانتے ہیں، یہی ٹھاکر بستی میں گئے تھے۔"

"ہونہ۔" درما کے چہرے پر سکون کے آثار ہو رہے تھے۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کے لیے اس نے کچھ وقت لیا "مگر تم نہیں، تمہارے ساتھی۔" اس کی آواز کی جھلانت ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔

"جامو اور جمرو استاد۔" بھل نے سر جھکا کر کہا۔ مجھے جھکا سا لگا، یہ جواب میں نے اپنی سماعت کا شور مچا کر بھل نے جامو اور جمرو کی نام لیے تھے۔

"جامو اور جمرو استاد! درما پھر کیا؟ پھر تم۔ تم پھر پیکر چلا رہے ہو۔ یہ، یہ تارو کیجئے ہو، یہ۔" درما نے بے قراری سے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات ڈھول کے ایک کاغذ اٹھایا اور بھل کو دکھانے لگا۔ لال رنگ کا مٹی کاغذ تھوڑی دیر پہلے نوجوان افسر کھانے درما کے حوالے کیا تھا "تار میں لکھا ہے، جامو اور جمرو دونوں کھلتے میں موجود ہیں، موجود رہے ہیں اور اڑے کے دوسرے آدمی بھی۔ کھلتے پولیس کی طرف سے ہماری پوچھ گچھ کے جواب میں یہ تار آیا ہے۔" درما کی زبان فرط غضب سے بھٹکتی تھی۔

"پھر کس کا پولیس صاحب! آپ تو ادھر کھائے بیٹھے ہو۔" بھل کا لہجہ درما کی ضد تھا، بڑی حد تک معتدل "تپ کو بولا ہے، ہم اڑے کے لوگ ہیں، اپنا کام دوسرا ہے۔ آپ کو تھوڑا ٹھنڈا ہونے کا کام ملے، اس واسطے ہم نے جامو اور جمرو استاد کا نام لیا ہے۔"

میرے سینے سے کوئی بوجھ ہٹ گیا۔ بھل نے درما سے پوچھا کہ اس نے جواب نہیں دیا؟ جب کہ درما نے ابھی تسلیم کیا ہے کہ ہیرا اور پھو، کشمی داس کے دو ملازم، ہرکھا کے اغوا اور اس کے ساتھ درندگی کے واقعات میں ٹھاکر ہر دیو اور استاد گورامی ملوث تھے۔ بھل نے ایک بار پھر اپنا مدعا دہرایا "ہم کو بولو صاحب! شہر کی پولیس پھر اس طرف کیوں نہیں گئی؟"

"ان کی طرف جانے کے لیے پولیس کے پاس کوئی

ثبوت نہیں تھا۔" درما نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا "ہم سمجھتے ہیں، وہ ٹھاکر ہی ہو سکتا ہے، ٹھاکر اور اس کے کارندے لیکن کسی نے انہیں دیکھا نہیں، کسی نے تھانے میں آکر کوئی شکایت نہیں کی، کسی نے رپٹ درج نہیں کرائی۔"

"پر آپ جانتے ہو، سارے جانتے ہیں، اوجھری سارا فرم ہوتا ہے، وہ کوئی اور نہیں تھے۔ اپنی بھی کسی تھانے میں آکر پرچی نہیں کھائی، اپنے کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا اور پولیس کو معلوم ہے، اس رات ہم اوجھری شہر میں تھے۔ اپنا کیا ثبوت ہے صاحب؟"

بھل نے درما کو جواب دی کہ زحمت نہیں دی۔ شاید اسے یقین تھا کہ درما کے پاس کوئی معتقل جواب نہیں ہے۔ کبھی ایسے جواب طلب نہیں کرنے چاہئیں کہ مسئول ذبح ہو کے اپنے کسی نادرا، غیر مدلل جواب ہی پر اڑ جائے۔ بھل کے رنگ بدلتے لیجے میں اب حیرت انگیز مدافعت اور مفاہمت نظر آتی تھی۔ دو سپاہی اور نوجوان افسر اسے بکڑے ہوئے تھے۔ رستم کچھ فاصلے پر ہنر لے اپنی سبکی کی تلافی کے لیے بے تاب تھا۔ بھل کی عدم مزاحمت اور افسران کی جانب سے کوئی ترغیب نہ ملنے پر سپاہیوں کا جوش اور جذبہ کسی قدر ماند پڑ چکا تھا لیکن بس وہ کسی ہدایت کے منتظر تھے۔ بھل نے درما سے کہا کہ اس نے طرح طرح اپنی بے گناہی باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہی کر سکتا ہے۔ اس اعادہ ٹھکرا کر کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کیا ہے۔ اسے مجرم قرار دینے کی بنا پولیس کے اعلیٰ افسر نے اپنے طور پر افادہ کیے ہوئے چند حقائق پر رکھی ہے، "ان کا خلاصہ یہ ہے اڑے سے بھل کی پرانی وابستگی، اڑے کے نامی گرامی استاد کی حیثیت سے شہرت، اڑے کے دو نوجوان ساتھیوں کے خون پر غم و غصہ، اڑے کے زیر نگرانی شہر کے ایک محلے کے مکین کشمی داس کے گھر کی تباہی پر ندامت اور ذلت کا احساس، شہر میں بھل کے شیش محل اور اس کے شیش نفس کمینوں کی عزت و حرمت پر آج آنے کے اندیشوں کا غلبہ، استاد جامو کی گتے سے بنگائی انداز میں آمد اور داغی۔ پولیس کی دانت میں ٹھاکر بستی پر یلغار کے قابل یقین جرم کے لیے یہ حقیقت آمیز نشانیاں کافی ہیں مگر یہ ثبوت اور شادوں سے عاری ہیں۔ بین ثبوت کے بغیر، جیسا کہ اس نے پہلے بھی کہا ہے، یہ شخص ایک مفروضہ ہے۔ اس کی کوئی عقلی حیثیت ہے نہ قانونی۔ پولیس کی یہ امید کہ اپنی عام روش، آخری روئے کی ایذاؤں سے وہ بھل اور بابر کو اعتراف پر مجبور کر دیں گی، ایک خام خیالی، خوش خیالی ہے، جرم کے مرتکب نہ ہونے کی

رہ میں وہ کس طرح اپنی گردنوں کی نذر پر آمادہ ہو جائیں۔ آخر پولیس کو کبھی انہیں عدالت میں پیش کرنا ہے۔ اگر ہاں پولیس کے جرم سے سرگرم بھی ہو جائی عدالت مخرف ہو سکتے ہیں۔

درما توجہ سے سنتا رہا، بھل نے اسے دخل اندازی کا بھی نہیں دیا۔ بھل نے کہا کہ کچھ دیر جاتی ہے، زیادہ سانس کا دیکھ عدالت کی ابتدائی کارروائی عمل کر کے اپنی میں پولیس کی زبردستی اور زیادتی پر باز پرس کے لیے ہی چاہتا ہو گا۔ وہ ایک مستند وکیل ہے اور ایسے پیچیدہ و معاملات کا ماہر۔ اپنے موکلین کی برات کے لیے وہ ہانک، جس حد تک ممکن ہو، حکام بالا کی، یہاں تک کہ بے حاکموں کی خدمت میں حاضر ہو کے دادو فریاد سے نہیں چو کے گا اور حویلی کے مکین بھی اپنے در پیچے زے منتقل کر کے نہیں بیٹھ جائیں گے۔ وہ اخلا تعلیم سے مت ہیں اور اپنے اور دوسروں کے حقوق کا پورا شعور ہے، وہ جس حد تک بھی آسودہ ہیں۔ اس سے کہیں واپس ملتی و حسن بھل اور بابر کی غایت کے لیے داؤ پر لے کر درج نہیں کریں گے۔ درما نے انہیں یہاں طلب کی دھمکی دی ہے حالانکہ پولیس اچھی طرح اس سے واقف ہے کہ اڑے کے لوگ ٹھاکر بستی کی خون لائیں۔ بھل اور بابر، جامو اور جمرو کے کسی بھی تعلق سے بے خبر ہیں۔ پولیس نے گزشتہ رات انہیں کن کن کٹوں سے دو چار نہ کیا ہو گا، پولیس بہتر جانتی ہے، اسے اقدار مایوسی ہوئی ہے۔ حویلی کے مکین تو بہت دور کے ہیں۔ انہیں تو اور رکھا گیا ہو گا۔ درما نے حویلی کی خانہ خواتین کو کو تو تالی بلا کے رسوا کرنے کی شوشہ طرازی بھی بے شک اس جگہ قدم رکھنے کا حاشہ ان کے لیے نادر ہو گا لیکن ظاہر ہے۔ بھل اور بابر کی سلامتی ان کے لیے بہتر ہو گا۔ اس چار دیواری کا رخ کرنے ہی پر ہو جائی ہے پھر کیا رہ ہے پھر ان کے لیے کیا رکاوٹ رہ جائے گی۔ یہ نقش کشی ہے پولیس کی سمجھ میں نہیں آئے گی جتنے گھرے نقش، ہی اور ان کی وارفتگی اور اتاری ہوا بھل نے پیشکش کی درما کو یقین نہ آئے تو انہیں طلب کر کے دیکھ لے۔

عزیزوں کو مورد عتاب ٹھہرایا گیا ہے۔ درما کی نگاہیں بھل پر مرکوز تھیں۔ دوسرے افسروں کے چہروں پر خون جل رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو کن انکھیں سے دیکھتے اور ان کی آنکھیں چڑھ جاتیں۔ درما کا یہ شوق سماعت انہیں گراں گزرا رہا ہو گا مگر وہ تو چپے ان کی موجودگی بھل چکا تھا۔

بھل نے اپنا بیان جاری رکھا، کتنے لگا کہ ٹھاکر بستی میں دو آدمیوں کے خون کی واردات کتنی ہی ہولناک اور سنگین ہو لیکن ایک دوسرا پہلو بھی توجہ طلب ہے۔ ایک بار یوں ہی، ازراہ آنکھی ارد گرد کے دسمات، قصبوں اور شہر کے لوگوں کے پاس جا کے پوچھا جائے کہ وہ اب کیسا محسوس کرتے ہیں؟ اب کچھ موسم بدلا ہوا لگتا ہے کہ نہیں؟ بعض خرابیاں اور تباہیاں باعث مسرت بھی ہوتی ہیں۔ کون جانے، کتنے ہیرا اور کچھ جیسے جوان، ٹھاکروں نے اپنے اقبال کی ہیبت چڑھائے ہوں۔ جانے کتنی پرکھا میں ان کی ہوس کا شکار ہوئی ہوں، پولیس کو خوب احساس ہو گا کہ ٹھاکروں کی زندگی میں کتنے موقعوں پر وہ خود بے بسی و بے چارگی سے دو چار ہوئی ہے۔ میرا کون ہے شاید کوئی بھی نہیں جس کے دل میں ٹھاکروں کے اس انجام پر ہوک انہی ہو، ان کے ختم ہوجانے پر کسی نے دہائی نہیں دی، مکین یا تم پر نہیں ہوا، پولیس پھر دہرے لیے زمین پر آکے دیکھتے تو اسے اپنے مطلوب مجرم ایسے شقی القلب معلوم نہیں ہوں گے۔ انہوں نے ٹھاکروں کے مانند نادروں کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے۔ انہوں نے ٹھاکروں کو نشانہ بنایا ہے، کسی اور کو نہیں، کشمی داس، ہرکھا اور ان کے بے زبان ملازموں کو نہیں۔ جانے کتنے لوگ ٹھاکروں کے لیے سینوں میں آگ جلائے، زہر چھپائے ہوئے تھے۔ ان گنت ماہو سال، روز و شب کے دیکھوں کے بعد کم سے کم ایک سپر تو ان کا بھی ہونا چاہیے تھا۔ بھل نے کہا، اس کا پس چلا تو وہ بھی ٹھاکروں کے لیے کچھ ایسی ہی سزائیں تجویز کرنا لیکن، لیکن بھل نے خود کو روکا اور ذہنی ہوئی آواز میں بولا کہ اس طرح نوائی اور حقیقت بیانی کے اظہار سے مجرموں کی وکالت اس کا مقصد نہیں ہے۔ پولیس اپنا کام جاری رکھے۔ ایسے واقعات کے اعادے کی پیش بندی کے لیے اسے حرکت میں رہنا چاہیے۔ یہ تو شوق و جنت، تردد و تشویش اس کے منصب کا لازمہ ہے کہ آخر وہ کون تھے۔ وہ کون تھے، کینہ پرور، شورش پست یا زخم خوردگان، ستم زدگان، آئے سامنے کچھ دکھائی بھائی نہ دینے پر پولیس کی بھٹکتی نظرس اڑے پر منڈلانے لگیں۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بھل اور بابر بھی

اڑے کے آدمی تمہارے آدمی ہیں۔ اس اڑے کا تم کو لگاتے کے اڑے سے زیادہ دھیان ہونا چاہیے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اڑے کے دو آدمی مارے جائیں اور استاد بھٹل گردن ڈالے بھنارے۔ تم بارہ بھنگی جا کے استاد گورا کو ڈھیر کر سکتے تھے۔ تمہارے آگے وہ کتنی دیر کا تھا پر ٹھنڈا کر کے کھانا اچھا رہتا ہے۔ تم کو پتا تھا وہ خاکوں کا پالا ہوا ہے۔ یہ پالتو لالکوں کے ہاتھ پیر ہوتے ہیں۔ پر جا کے بناراجا نہیں ہوتا۔ جیسے تمہاری آن کی بات تھی ویسی خاکوں کی بھی ہوگی اور خاکوں سے ہر کام کو معلوم تھا، تمہاری بڑے گا۔ یہ تمہارے بس کا نہیں تھا۔ خاکہ گزرتا تو چن چن کے اڑے کے آدمی سلا دیتے۔ تم نے اپنے آدمیوں کو روک لیا تھا اور تم بھی گورا استاد سے بدلے کا دھیان من سے نکال دیتے تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید یہی کرتا۔ گورا کو ایک بار ڈھیل دینے سے وہ اور بھٹل سکتا تھا۔ آج اس نے اپنے اڑے آنے والے دو آدمی مار دیے، نکشی داس کا گھرا جاڑا، کل اس کا ساٹھ پنا اور بڑھ بھٹکا تھا۔ اس کے پیچھے خاکہ تھے اور خاکہ ہر دیو اسے جوانی اور بیٹے کا شہد کچھ زیادہ ہی تھا۔ ایک بار منہ کو خون لگ جائے تو آگے کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ کل تمہارے راج کل پر بھی اس کی نظر پڑ سکتی تھی۔ وہاں راج کماریاں اور لوگ بولتے ہیں، بے پروا والی پریاں رہتی ہیں۔ اپنے کئے استاد گورا کے ختم ہو جانے پر خاکہ ہر دیو پکلا بیٹھے والا نہیں تھا۔ اس کا دماغ بہت پھرا ہوا تھا۔ تم نے اسی سے آگے کا سوچ لیا تھا جب بازار میں ہریا اور گورا کا جھٹا ہوا تھا اور استاد بابر نے بیچ میں گورے کو اور گورے کو ایک طرح سے جیون دان کر دیا تھا۔ اسی سے تم کو چار کرنا تھا کہ آنے والے دن کیسے بدلے ہوئے پر کشا کے، کتنے کھور بلکہ کتنے ہو سکتے ہیں۔ استاد سلائی نے تم کو بول دیا تھا کہ گورا کس راستے سے آیا تھا؟ اس کی ڈوری کس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے دوسرے دن سے تم نے سورے سے شام تک اڑے پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ تم کو کئی طرف دیکھنا تھا۔ اڑے کی طرف اڑے کے ہویار کی ساکھ پانی رکھنا بند باندھنا، اڑے کے لوگوں کی رکھشا کرنا، اپنے دوست ہر دیو اور جامو کو منہ دکھانا اور اپنے راج محل کو بچانا، اڑے پر بیٹھنے ہی تم نے سوچ بچار کے لیے سلا کام یہ کیا کہ تاروے کے استاد جامو کو لگاتے سے بلا لیا۔ جامو ہریا اور پھو کی موت سے پہلے آیا تھا۔ وہ ان کی موت اور نیچے پر نہیں آیا، کیوں؟ یہ تم ہی بتر جانتے ہو گے کہ اسے کون سا کام پڑا تھا جو شرمیں صرف ایک رات بتائی اور چلا گیا اور سنا ہے، کسی کو بتاے بنا۔

دروانے گلاس اٹھا کے گھونٹ بھربانی بنا اور دھال سے باجھیں خشک کر کے کتنے لگا "چھوڑو" آگے چلتے ہیں۔ ادھر آدھ صاحب بھادر ٹھاکر ہر دیو کے پاس۔ گانچھ تو اسی دن پڑا تھی۔ جب گورا پیچھے کپڑوں، سوچے منہ اور اٹھتے بیٹوں اس کے سامنے پچھا تھا۔ اپنے پھو کی یہ درگت دیکھ کر چھوٹے ٹھاکر کا خون ٹھول جانا چاہیے اور یہ جان کے تو سرگھوا ہو گا کہ گورا اور ہریا کے بیچ میں آنے والا اجنبی گور شیر کا بچہ تھا مگر ہر ہریا اور کیا کرتا ہے۔ گورا کا ایسے اکوڑ سانوس سے لوٹنا صاف ٹھاکر کا ایمان تھا۔ ٹھاکروں کی ناک لمبی ہوتی ہے۔ پھر اس سوچتا رہا کہ اب فیض آباد کے اڑے کوئی اور نہیں، استاد بھٹل بیٹھے لگا ہے، جس کا دور دورہ کوئی جو نہیں۔ ٹھاکر کی چھاتی میں اور کل مل جی چلی چاہیے اس سے پہلے کہ استاد بھٹل اڑے پر پہنچے جائے، اس کا پچھ کیل دینا ہی ٹھیک ہے۔ ٹھاکر کے من سے ہر کھا بھی چلی ہو تھی۔ ایک بار وہ اس کے ہاتھ میں آتے آتے کل گئی اور نکلوانے والے ہریا اور اڑے کے آدمی تھے۔ گورا اڑے بھی اپنے مالک کی آنکھوں اور دل میں کھولی ہوئی جگہ۔ اس کے لیے بڑا دیا کل ہو گا۔ اسے بھی جلدی تھی۔ استاد بھٹل اڑے پر اپنے آپ کو تھکیاں دے رہا تھا اور اٹھتے۔ شگون لے رہا تھا کہ گورا ایک رات فیض آباد آیا۔ اب وہ بڑی تیزی سے آیا تھا۔ اس نے اپنا کام کرکھایا۔ ٹھاکر برکھا بیٹھ کر دی اور ہریا اور پھو کو گرا کے اپنی طرف۔ بارہا ہوا یہ بیت لیا لیکن ٹھاکر اور گورا استاد دونوں کو بھٹل کی جان کاری پوری نہیں تھی۔ جاننے نہ جانے سارا چیٹکا رہے، اور بڑھتی کتنی جاننے کا۔ کچھ نہیں معلوم کہ دوسری طرف کیا فیصلہ ہو سکتا ہے اور کیا فیصلہ ہو چکا۔ دوسری طرف استاد بھٹل سے اڑے کے آدمی رات ہی کو بولے تھے۔ استاد کی چار آنکھیں، آٹھ ہاتھ پاؤں پر ہاتھ پیر ناپ تول کے اٹھتے ہیں۔ استاد کے دماغ میں، شطرنج کچھی رہتی ہے۔ لگتا ہے، ہریا اور پھو کے جانے۔ پہلے ہی استاد بھٹل نے سارا تھانہ لیا تھا۔ ان کے جا۔ کے بعد فیصلہ پر ٹھیک لگایا۔ ادھر ادھر کی جانچ پڑتال پر ہر اپنے بھائی دیا کہ ایک ہی جگہ میں سارا ٹھکانا بھٹکا دیا۔ نہ رہے ہاں نہ بیچے ہاں۔ کون کورا استاد، کون ٹھاکر، دیو، ہر دیو، حویلی، سونا، چاندی، نوکر چاکر زمین جاگیر، گاجر کی طرح سارا ہی جڑ سے اکھاڑ دو۔ وہ کیا بولتے ہیں، سو کی، ایک لوبار کی۔

باجت سی نمودار ہوئی، استاد گورا ذرا خود کو تھام کے رکھتا اور ٹھاکر ہر دیو کا خون بھی اتنی گری نہ کھاتا تو بھی کیا ہوتا! ہاں، ہریا اور پھو ضرور رنج جاتے۔ ہر کھا بھی زندہ رہتی۔ اس کے دو تو بھی جان سے نہ جاتے، نکشی داس بھی پاگل نہ ہوا، پادھر کا ٹھاکر کی طرف کا شاید کچھ نہ بدلتا۔ ان کا فیصلہ تو کھٹکا جا چکا تھا۔ ہریا اور پھو کے کرنا کرم اور نیچے اور ٹھاکر کی کڑ گھٹا کے بیچ میں سے کم ہے۔ اتنے لوگ اکٹھے کرنے میں کچھ سے تو لگنا ہی چاہیے۔ یہ تو جان پڑتا ہے، اسی سے ملے ہو چکا تھا جب ہریا اور گورا کے کھڑا میں استاد بابر نے آگے اپنا سلیٹ دیا تھا۔ اس کے دوسرے تیرے دن جامو لگاتے سے آیا تھا۔ جامو کا چانک فیض آباد آتا اور زنت واپس ہو جاتا بھی کسی کارن بنا نہیں ہو گا۔ جامو استاد کو ٹھاکروں کی چھب، ڈھب، چلت پھرت، ان کی راج بٹ کا پورا معلوم تھا، سارا کیا چھتا۔

میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ دروانے پھر مجھے متزلزل کر دیا تھا۔ وہ جیسے مجھے اور بھٹل کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ اس کی تجزیے میں ان سے اور ان دیکھے کی کوئی بے اعتباری نہیں تھی۔ وہ ایسا پر اعتماد تھا جسے ہر مرحلے میں شریک رہا ہو اور گزشتہ کی گھمراہی کرتا رہا ہو۔ اس الزام تراشی یا فرد جرم کا بقیہ حصہ بھی وہی تھا جو نزدیک دور کے مشاہدے سے میں نے وضع کیا تھا یا میری جستجو کا حاصل تھا۔ دریا جیسے میرا آموختہ دہرا تھا پر تھکواہ ہمیں یہ سب کچھ جتانے پر کیوں مصر تھا، ان دشمنوں کی اسے کیا ضرورت تھی؟ اس حد تک تفصیل سے۔ اپنی منطق وہ خود تک بھی محدود رکھ سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ طبیعتاً کوئی اذیت پسند شخص تھا، اس قدر جزئیات بتاتی ہے وہ ہمیں کوئی آزار پہنچانے کے درپے تھا یا وہ کوئی سفلہ آدمی تھا، خود ہونا، خود پسند، بعض ذہین آدمیوں کو داوطلبی کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس تجزیہ و تحلیل سے اپنے ساتھیوں پر اپنی ذہانت و فطانت، نکتہ رسی و خیال آفرینی کا کوئی اثر ڈالنا مقصود تھا یا پھر اپنے اخذ کیے ہوئے نتیجے پر اسے کوئی شبہ تھا۔ شغل کا درمل شاید اس کی توقع کے مطابق نہ ہو اس لیے وہ اسے کھڑو اور بھٹو پڑا تھا۔ دریا کے لب و لہجے کا اعتماد ہر چند کسی شک یا ابہام کی نفی کرتا تھا۔ یہ اعتماد شخصی بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ اسے قیاس اور شلوک کا اظہار بھی بڑے تین سے کرتے ہیں قبض لوگوں کا انداز ہی حکمی ہوتا ہے اور دریا تو پولیس کے بڑے عہدے پر فرما رہا تھا۔ اس کی آواز کی توانائی کچھ اسے منصب کے سبب سے بھی ہوگی۔ عہدہ و منصب، مال و زر، شہرت و مقبولیت کی

توت ہی کچھ اور ہوتی ہے یا ہو سکتا ہے، اپنی تفریح و توجہ سے وہ بھٹل کو متنبہ کرنا چاہتا ہو کہ جس شخص کی نگاہ اتنی تیز اور رسا ہو، دیر تک اس سے کچھ چھپانا لا حاصل ہے۔ دریا کو سرے ڈھونڈنے کا فن آتا تھا۔ وہ کھوجیوں کے مانند تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا، میری طرح بھٹل کو بھی جگڑے ہوئے ہو گا۔ پولیس انسورور ہوا میں تیر نہیں چلا رہا تھا۔ میں نے سرگھٹا کے ایک نظر بھٹل کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر شہید کی چھاتی ہوئی تھی اور بس، اس کا کچھ ملے نہیں تھا۔ باطن تو تھما ہوا ہے، ظاہر بھی عیاں نہیں تھا۔ مجھے تو بڑی دشت ہو رہی تھی۔ دماغ پھٹا جا رہا تھا، جسم جیسے کوئی دھک رہا ہو۔

دروانے بیٹھے بیٹھے بھر بھر ہی ملی، چمت کی طرف دیکھا اور ایک لمحاتی توقف کے بعد اضطرابی لہجے میں بولا، "ہاں استاد!" وہ کچھ اور کتا چاہتا تھا لیکن جانے کیوں رک گیا۔

بھٹل خاموش رہا۔

"کچھ انہیں میں ہو تو بولو!" دریا کی ڈنک مارتی آواز گونجی۔

"پورا سو ہے صاحب! آپ گیانی دھیانی ہو۔"

"کارن پر زور تھا، تمہارا، اور کو تو جانے دو، ہم نے بولا تھا، سب سے بڑا کارن تم ہو، ادھر تمہاری حویلی بڑا کارن ہے۔ حویلی میں تمہاری جان انگلی ہے۔ پتا نہیں لیا ہے وہاں، کچھ ہر دے (دل) کا سنبندہ ہو گا۔ تم آج فیض آباد میں ہو، کل تم کو یہاں سے چلے جانا ہے۔ اڑے کے آدمیوں کے کس بل کا تم کو کچھ بھی طرح معلوم ہے۔ سے بڑے پتہ وہ کتنی دیر بھر سکتے ہیں۔ ایک طرف تو چاچو، پھر والا، اچھی، بلہم دوسری طرف بندوق، منچا، پوری ایک سینا، سرکار دربار میں جان پہچان بلکہ خود سرکار دربار۔ تم نے اپنی جگہ ٹھیک سوچا۔ ٹھاکر ہر دیو اور استاد گورا کو کھلا چھوڑ دیا جانا تو نکشی داس کے گھر کی طرح اور گھروں سے بھی لڑکیاں بالیاں اٹھیں۔ وہ حویلی کی طرف بھی جاسکتے تھے۔ سمجھ میں یہ آتا ہے، پہلے تو ادھر ہی جانے کو پھڑ پھڑاتے۔ استاد بابر نے سامنے آگے ان کو اپنی حویلی کا رستہ دکھا دیا تھا، پر استاد! ان کو کوئی اور روک بھی ہو سکتا تھا۔ اتنا آگے، اتنا زیادہ ہی کیوں؟"

"لگتا ہے، گانچھ کسی گئی ہے، بھٹل نے رکھائی سے کما کچھ اور ہو تو بولو صاحب!"

"اب تمہاری باری ہے، سب تم کو بولنا ہے۔"

"اسے پاس کچھ نہیں۔"

"اتنا کچھ سن کے اب تم کو اپنے ساتھیوں کا بول دینا

چاہیے "ورما سنی اُن سنی کرتا ہوا بولا۔
"ہم سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"پھر کس سے، مرے والوں کی آتماؤں سے پوچھیں؟"
"آپ کے لیے کیا دور ہے، پیل بھر میں دودھ پانی الگ کر دیتے ہو، اپنی اتنی ٹوہ کی ہے، اُن کے لیے بھی تھوڑا زور لگاؤ۔"

"وہ تو ہم پہنچ ہی جائیں گے ان تک بھی۔ آج نہیں تو کل "ورما کی آواز کبیر آئیز بھی۔
"دیکھو صاحب! اُسے کو زیادہ گھوما پھیری نہیں آتی۔"
ٹھیل نے سہاٹ لیے میں کہا "جو پیلے بول دیا ہے، پورا ٹول کے بولا ہے۔ اُس کی آخری جانو۔ اپنا کوئی ساھی نہیں تھا اور ہو گا تو آپ سمجھتے ہو، ہم بول دیں گے؟"

"تم کو بولنا ہے، تم کو بولنا پڑے گا استاد!" ورمانے مکہ انداز میں کہا پھر اسے کچھ خیال آیا اور اس کی غرائی آواز ماند پڑی، کہنے لگا "اجھا ٹھیک ہے، ہم یہاں سے اٹھ جاتے ہیں، تم کو ہماری زبان نہیں آتی۔ اب ہمارے افسر تم کو دیکھیں گے پھر یہ جائیں اور تم جانو۔ ہم نے تم کو بتا دیا ہے، یہ دلی لوگ ہیں۔"

"ہم بھی پردہ نہیں، یہ کیا کر لیں گے صاحب!"
ٹھیل کی بے باکی گفتگائی پر ٹھول کی جالی چاہیے تھی۔
یہی ہوا، وہ سارے تعلقاتی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"ابھی بتا چل جائے گا" ورما ٹھٹھی ہوئی آواز میں بولا۔
"یہ آدمی کی شکل بگاڑ دیتے ہیں" اس کو اٹھا کر دیتے ہیں۔"

"آدھے چہرے ہیں نا!"
"پھر کچھ اچھے بن پڑتا ہے۔"
"دیکھتے ہیں صاحب! اُن کو بھی۔"
"ہاں، تمہارا تجربہ بھی کم نہیں ہو گا۔"
"اپنے کو تو بہار بنا لیتا ہے۔"

"اس بار بہت نیا ہو گا اور شاید آخری بھی، یہ تمہیں اس قابل نہیں چھوڑیں گے کہ تم دوبارہ کوئی سن مانی یا ہٹ دھری کر سکو۔"
ٹھیل سر ہانے لگا اور کسی قدر سنبھلی ہوئی آواز میں بولا "ایک بات پوچھیں صاحب! آپ ہی پر کیوں جم گئے ہو؟"

ورمانے شانے اچکائے اور کسمسا کے بولا "کارن بنا نہیں تے، اور کارن تم کو ایک ایک کر کے گنا دیے ہیں۔"
"اگر اس کے الٹ ہو تب صاحب!"

کوئی جواب دینے کے بجائے ورما شعلہ بار نظروں سے ٹھیل کو گھور اکیلا۔

"تب ہم کو آپ کے اور ان کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟" ٹھیل نے ٹیکلی آواز میں پوچھا۔
"تم؟ تم کیا کر سکتے ہو؟" ورما چٹپٹا کے بولا۔
"ہم تو بس پوچھتے ہیں مائی باپ! پھر اپنے کو کیا کرنا چاہیے؟ ہم جنگل میں نہیں بستے۔"

"جنگلی جنگل ہی میں نہیں بستے۔"
"اپنی بات کا جواب دو صاحب!"
"پھر تم اپنا رستہ لینا، ہم اپنا" ورما جھٹکا کے بولا۔
"اور اپنے ساتھ مستی کرنے کا بھگتان کون دے گا؟"
"اس کے لیے تم پکھری جا کے زنجیر کھینچنا، پکھریاں ہر طرف کھلی پڑی ہیں۔"

بند دروازے پر دستک سے بھی چونک پڑے۔ دوسرے ہی لمحے وہ نوجوان پولیس افسر دروازے پر نمودار ہوا جس نے ہمیں اس کمرے تک پہنچایا تھا۔ ورما کی اجازت سے وہ لپکتا ہوا اندر آیا اور اس نے مستعدی سے ایک کانڈ ورما کے سامنے رکھ دیا۔ نوجوان افسر فوراً واپس ہو گیا۔ ورمانے فور سے کانڈ دیکھا، اس کے تھتھے پھول گئے، ہنوس سکڑ گئیں۔ بے دلی سے اس نے دائیں طرف بیٹھے ہوئے افسر کی طرف کانڈ بڑھا دیا۔ ان چاروں نے باری باری اسے دیکھا اور ان کے چہروں پر غلٹیں پھٹ گئیں۔ چند ثانیے ورما اپنے آپ میں گم رہا پھر بھاری آواز میں بولا "تم کو بول دیں استاد! ہم کو حویلی کا رستہ بھی معلوم ہے۔ چھان بین کے لیے ہم کو کوئی کھر بند نہیں۔"

"جاؤ صاحب! ادھری بھی جاؤ۔ آپ وردی والے ہو، منہ اٹھائے کسی بھی گھر میں گھس سکتے ہو۔ اپنے کو آپ کے لیے ہاتھ کا پتا ہے۔ ہر جگہ سات کی معافی بولتے ہیں، آپ کے لیے کوئی گنتی نہیں، آپ ساری حویلی اٹھا کے ادھری لے آؤ۔"

"تم نہیں مانتے تو ایسا ہی ہو گا، بولتے ہیں، وہ موم کی بنی ہیں، موم کی یارٹیم کی، جو بولو۔ بہت سنبھال کے رکھا ہے تم نے ان مورتوں کو۔ ادھر تمہارے سامنے آئیں گی تو سارا موم، سارا ریشم۔" ورمانے خود کو رد کا اور پھلتے ہوئے بولا "جس حویلی کے لیے تم اتنی دور کا سوچ سکتے ہو استاد! وہاں کے لوگوں کے حوالے میں آنے پہ دیکھتے ہیں، تم تہمتی دینے ٹھہرتے ہو۔"

"اپنی مانو صاحب! تھوڑا آرام کر کے متھ پہ زور ڈالتا"

رت بگائی سے الٹا ہو جاتا ہے کبھی۔ "ٹھیل نے ٹیکلی لہجے میں کہا۔

بڑی عمرت مراد چل اور برداشت نہیں ہے۔ دائیں طرف کے معرا فسر نے بہم انداز میں ورما سے درخواست کی "دیر نہ کیجئے سرائان کو ان کی اصل جگہ بھیج دیجئے، ہم دیکھتے ہیں ان کو، یہ لاقوں کے بھوت ہیں، ایسے حرام ڈیلوں سے نمٹنا ہم کو آتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ ورما کوئی رائے ظاہر کرتا، ٹھیل نے اونچی آواز میں کہا "ان کی بات مان لو صاحب! کسی کو کھجلی زیادہ ہوتی ہے، یہ بھی پولیس کے افسر ہیں۔ ادھری منہ دکھائی کو نہیں بیٹھے۔ ان کو بھی کچھ حلال کرنے دو۔"
"زبان سنبھال کے استاد!" ورما گڑ کے بولا "اپنی حد سے مت بڑھو۔"

"حد ساری آپ کے لیے ہے۔ آپ بھی تھوڑا اندر رہو، آپ کی چاکری نہیں کرتے۔"

ٹھیل کا لہجہ واضح طور پر مختلف تھا۔ مجھ سے زیادہ اس پر پولیس کو حیرت ہوئی چاہیے تھی۔ براہِ سنسنی ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ تبدیلی بے وجہ نہیں ہو گی لیکن وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یہی ہو سکتا تھا کہ ٹھیل کو ان سے کسی رعایت کی توقع نہ رہی ہو۔ ورما نے بے چینی سے اپنے آدھے غضب افسر کو دیکھا۔ اسے کچھ پس و پیش تھا لیکن معرا افسر کو اب مزید اپنے عالی مرتبت افسر کی خاطر منظور نہ تھی، اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی گنتی پر زور زور سے ہاتھ مارا۔ سترتی جیسے ہی اندر داخل ہوا، معرا افسر نے کھانا نامی کسی شخص کو جلد از جلد حاضر ہونے کا حکم دیا۔

کھانا راباری میں دروازے کے قریب ہی منڈلا رہا ہو گا، فوراً اندر آیا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے کوئی اہم کانڈ لے کے آیا تھا "دونوں کو ڈارک روم لے جاؤ۔" معرا افسر نے ترحی آواز میں کہا "اور اپنے رستم کو بولو، وہ بھی تیار ہو جائے۔"

"وہ تیار ہے جناب!" نوجوان افسر نے مودبانہ جواب دیا۔

"میاں کیوں نہیں؟" ورما کچھ الجھتے ہوئے بولا۔
"ڈارک روم میں پورا انتظام ہے سرائان، معرا افسر کی پورچی آواز جوش میں بگائی "ابھی، کیجیے گا، ہوش ٹھکانے آجائیں گے ان پختے خانوں کے۔"

"کیا کیا نام لیا تھا اس کا؟" ورمانے تذبذب سے کہا

"ہاں، وہ رستم، سراب، اس کو میاں کیوں نہیں بلایا جاسکتا؟" ورما کو اپنی جگہ سے اٹھنے میں جانے کیوں تامل تھا۔

"میاں بھی بلا سکتے ہیں سر لیکن۔"
ورمانے ہاتھ اٹھا کے افسرانہ تحکمت سے کہا "اسے یہیں آنے کا کہو۔"

معرا افسر نے بادل بنا خواست کھنا کو اشارہ کیا۔ کھانے ذویانہ انداز میں سر جھکایا اور کسی تاخیر کے بغیر دروازے کی طرف لوٹ گیا۔

"ہم ایسا نہیں چاہتے تھے استاد!" کھنا کے جانے کے بعد کمرے پر چھائی ہوئی خاموشی ورما کی آواز سے ٹوٹی۔ وہ بڑ بڑاتے ہوئے بولا "وہ کمرہ ہم نے دیکھا نہیں لیکن بڑی باتیں سنی ہیں۔ وہاں آدمی کا دم کھٹے لگتا ہے۔"

"ادھری آپ کو ان سانس لینے دے رہے ہو۔"
ٹھیل نے بیزار سی سے کہا۔

"ہم نے تم کو پورا موقع دیا۔"
"کہا ہے کا صاحب! اس کا کہ جو آپ بولو، اس کو مان لیں؟ وہ رست تو سیدھا سولہ کی طرف جاتا ہے۔"

"دمیرج رکھو، تم کو بولا ہے، ہمارا کام آسان کرنے پر تم کو جھوٹ مل جائے گی۔ ہمارا کام آسان کرنے کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"چھوٹ تو اپنے کو پوری ملے گی، آپ کے بچے تے نکلتے ہی مل جائے گی اور آپ کا بچہ بھی کتنی دیر کا ہے۔ زیادہ تاہم کو نہیں روک سکتے اپنے کو آپ۔"
"تم ایسا ہی سوچو، ہم جانتے ہیں، تم کو کب تک روک سکتے ہیں۔"

نوجوان افسر ٹھیک کستا تھا۔ یکایک تازہ وردیوں میں ملبوس پانچ تو مند سپاہی جوتے بجاتے اندر داخل ہوئے۔ ہم سے قریب آ کے انہوں نے اپنے افسروں کو تمام تر سرکاری ادب سے سلام کیا۔ نوجوان افسر کھنا بھی ان کے ساتھ تھا۔ ابھی وہ اس رسم سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک چوہا سپاہی ہاتھ میں کیوس کا لمبا بیگ لے اندر آیا۔ وہ آخری درستے کا سپاہی ہو گا کہ ایک گوشے میں بیگ رکھ کے چپکے سے واپس چلا گیا "ان کو دیکھتے ہو؟" معرا افسر نے کانٹا نیچے میں کہا "یہ جو دو سورا تمہارے پاس کھڑے ہیں۔ ذرا دیکھو، راون کے ان کتوں میں کس نے ہاں کا کتا دودھ پیا ہے۔"

"بھاری بھر کم خٹے، اوسط قد، تانبے جیسی چمکتی رنگت، گول چہرے کے ایک ادھیڑ سپاہی نے بیگ سے ہنر دکھایا۔ اس کی بڑی مونچھیں چہرے پر چھائی ہوئی تھیں، بالوں پر جیسے

گیا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں شیشل پر بھٹکتی گئیں پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف نگاہ کیے بغیر ہاتھ اٹھا کے ہمیں گھیرے ہوئے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ ایک کے تذبذب و تامل کے بعد سپاہیوں نے بچوں میں بکڑے ہوئے ہمارے بازو آزاد کر دیے، ”تم جا سکتے ہو۔“ ورنہ بوجھل آواز میں کہا ”لیکن۔۔۔“

شیشل نے اسے روک دیا ”کچھ اور نہیں صاحب!“ اس نے تنبیہیں انداز میں کہا ”ہم پہلے آپ کو سارا بول چکے ہیں۔“

ورنہ آنکھیں پچھلیں اور ایک گہری سانس بھر کے کرسی کی پشت سے کمر نکاوی۔

سایہ ہم سے دور ہو گئے۔
مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرا جسم ہی مضطرب ہو گیا تھا جیسے میں خواب کی حالت میں ہوں اور میں نے جو دیکھا، سنا ہے، وہ کوئی فریب نظر، فریب خیال ہے۔ سیاہی ہٹ جانے کے بعد بھی میں اپنی جگہ ٹنگ کھڑا رہا۔ شیشل نے بھی دروازے کی جانب لوٹنے میں جھکت نہیں کی۔ وہ اپنی جگہ موجود رہا، پھر آہستہ آہستہ میں نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا۔ میری رگوں میں خون سن سنا رہا تھا ”چل رے۔“ اس نے بدبواتے ہوئے کہا۔ میرا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں تھا تو میں ہڑبڑا گیا اور پھر قدموں سے اس کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتا رہا۔

باہر جاتے جاتے شیشل ٹھہر گیا ”ایک بات صاحب!“ اس نے مودبانہ لہجے میں کہا ”اپنی جتنی ہے، آج نہیں توکل، جب بھی آپ کو ناٹم ملے، وہ جو آپ بولتے ہو، اسے راج محل میں آؤ۔ آپ نے ادھر رہنے والوں کو جانے کیا کیا بولا ہے۔ وہ ایسے کسی کے ساتھ نہیں آتے پر آپ کی دوسری بات ہے۔ ایک بار ان کو اپنی آنکھ سے دیکھ لینا۔ گھر تو آپ کا بھی کوئی ہوگا۔“

یہ کہتے ہی شیشل دروازے سے نکل آیا۔

○☆☆○

دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کوتوالی سے چند قدم کے فاصلے پر کئی تانگے خالی کھڑے تھے۔ کچھ کے بغیر شیشل پہلے تانگے پر سوار ہو گیا۔ دن اس قدر چڑھنے کے باوجود سورج پر ایسی چل چل نہیں تھی۔ جگہ جگہ پولیس موجود تھی۔ ہم نے آدھ میل کے قریب راستہ طے کیا ہوگا کہ شیشل نے ایک کپے کے اور صاف ستھرے ہوٹل کے پاس تانگا رکوا دیا۔ اس کے اتر

جانے پر مجھے بھی اترنا پڑا۔ وہ ہوٹل کے باہر کھلی جگہ میں رکھی بیچ پر بیٹھ گیا۔ اس طرف سایہ تھا اور سکون بھی۔ ہم منہ اندھیرے کمرے سے نکلے تھے۔ شیشل کو صبح چائے پینے کی عادت تھی۔ اسے طلب ہو رہی ہوگی، مجھے تو بھوک اور پیاس کا احساس ہی نہ رہا تھا۔ میں گھر بیچ کے اپنے کمرے میں بند ہو جانا چاہتا تھا۔ گھر دور تھا اور اتنی دور تھی نہیں تھا کہ سیدھے گھر کا رخ کر لیتے تو وقت صرف ہو جاتا۔ میں نے نہیں سنا کہ شیشل نے چائے والے سے کیا کہا ہے۔ گلاس بھربائی ایک ہی سانس میں پی کے اس نے بیڑی سلگائی اور گھر سے گھرے کش لینے لگا۔ آستھن ہوئی چاہیے تھی۔ میرا جسم تو کوئی بوجھ بنا ہوا تھا۔ ایک جگہ کھڑے رہنے کے سوا ہم نے کوئی مشقت نہیں کی تھی لیکن آستھن کا تعلق تو کڑے ہوئے وقت کے رویے سے ہے۔ کبھی ایک لمحہ ہی ہماڑ ہو جاتا ہے، آدمی کو ویران کر دیتا ہے۔ زندگی تو ویسے بھی لمحوں میں مٹی ہوئی ہے، تندو گرم، بے جان، بے بس، نرم و لطیف لمحوں پر مشتمل، دھپ پٹے، گرم کمرے کے ہمارے سامنے ملائی سے ڈھکی ہوئی چائے اور گرم گرم چوریاں رکھ دیں۔ میرا جی لوٹ رہا تھا۔ شیشل کے خیال سے چوری کا ایک ٹکڑا منہ میں لیا تھا کہ گلاس میں جھنڈے لگا ملائی کی ترہ ہٹانے میں نے چائے کے چند گھونٹ کسی طرح انڈیل لیے ”کیا ہے رے؟“ شیشل نے ناگوار سی سے مجھے ٹوکا۔

”کچھ نہیں۔“ میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا ”بس چائے ٹھیک ہے“ اب گھر چلو۔“

”چلتے ہیں رے۔“ وہ منہ ہٹا کے بولا ”تھوڑا دم لے۔“ اس نے بھی دو ایک پگوریوں پر قناعت کی اور چائے کی چمکیوں سے خود کو سیراب کیا۔ کاش آدمی کو جانوروں کی طرح جسم کی آبیاری کے لیے خورد و نوش کی حاجت نہ ہو کرتی یا پھر وہ جانوروں سے مختلف نہ ہوتا۔ ہم نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ دور سے شور بلند ہوا۔ استاد سلامی کے ساتھ اڑے کے کئی آدمی لپکے، بھاگتے ہماری جانب اتر رہے تھے۔ انہوں نے دور سے ہمیں دیکھ لیا تھا اور دیوانے سے ہو گئے تھے۔ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی پریشان ہو گئے۔ ہمارے پاس بیچ کے اڑے کے آدمیوں کا شور اور بڑھ گیا۔ وہ سارے شیشل اور مجھ سے گلے ملنے کے لیے ہمک رہے تھے۔ تقریباً سب کی حالت ایک جیسی تھی، بال بکھرے ہوئے، کپڑے شلتے، آنکھیں بھاری بھاری، چروں پر دھول جی ہوئی۔ شیشل اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ اس نے انہیں شور مچانے سے منع کیا اور سکون سے بیٹھ جانے کی ہدایت کی۔

”اور تم، تمہارے ساتھ کیا اپنی استاد!“ سلامی نے جھجکتے ہوئے پوچھا ”ان کتوں نے تم کو تو کچھ، کچھ۔“ اس کی آواز حلق میں بیٹھ گئی۔

نازی گر 5

نے ادھر ادھر سے بیچیں کھینچ کے ہمارے قریب کر لیں۔ کچھ اندر سے کرسیاں اٹھا لے، کرسیاں ”اسٹول“ بڑھنے، جس کے جو ہاتھ لگا۔ سارے ہوٹل میں افراتفری ہو گئی۔

”اسنے کو ابھی پتہ چلا، وہ حرام کے بنے تم کو بھی سو رہے سو رہے کو توالی لے آئے تھے۔“ استاد سلامی حواس باختگی سے بولا۔

”میلے زرا سانس باندھ لے۔“ شیشل نے اس کے ٹانگے پر جھپکی دی۔

”کیا استاد کیا بولوں، سالوں نے رات خویلی سے نکلتے ی، بچپن میاں کی اٹھانک گئے تھے کہ دھریا، رات بھر حرامی بلوں نے بل بھر کر کمرنگانے نہیں دی۔“ استاد سلامی کراہتے ہوئے بولا۔ شیشل کی ہمدردی سے وہ اور بکھر گیا اور ہڈیاں انداز میں کٹنے لگا کہ اڑے کے تقریباً سبھی آدمیوں نے رات بڑی آزمائش میں گزاری ہے، پولیس نے ایک ایک کو الگ کر کے میں لے جا کے جیسے کسی پرانی دشمنی کا حساب پکٹا کیا ہے۔ گھولنے، پھلانگنے، ٹھوکر سن، ڈنڈے، ہنزار اور پیچیاں۔ کسی کو الٹا ڈکایا، کسی کو ہرنہ کر کے ہنزار چڑیوں سے نیل ڈال دیے۔ سب سے زیادہ بدسلوکی استاد سلامی سے کی گئی۔ کچھ اڑے کے ٹکراں کی وجہ سے، کچھ اپنی تلخ کلامی کی وجہ سے وہ خطاب کی زور پر رہا۔ اس کے بقول اس سے برداشت نہیں ہوا۔ پولیس کی زیادتی پر وہ منہ پر آئیں مغالطات نہ روک سکا۔ جیسے میں افسروں کا بار اور چڑھ گیا۔ سلامی کا منہ سو جا ہوا تھا اور کانوں پر کھڑکے نمایاں تھے۔ وہ کہہ رہا تھا، جتنا وہ انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا، وہ اور اکھڑ جاتے تھے۔ اڑے کے کسی آدمی نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ پولیس نے کھانے کو بوجھانہ چائے پانی کو۔ صبح چھوٹے سے گلاس میں چند گھونٹ گروی چائے دی گئی تھی۔ شیشل سنتا رہا۔ سلامی کے ساتھ سبھی اپنی شب بیتی سنانے کے لیے بے قرار تھے۔ ایک ساتھ کئی بول اٹھتے تھے۔ شیشل نے جھمک کر انہیں خاموش کیا۔

”اور تم، تمہارے ساتھ کیا اپنی استاد!“ سلامی نے جھجکتے ہوئے پوچھا ”ان کتوں نے تم کو تو کچھ، کچھ۔“ اس کی آواز حلق میں بیٹھ گئی۔

شیشل نے جواب میں آنکھیں پچھلیں۔

”ہاں۔“ سلامی کا منہ کھل گیا۔ شیشل کی خاموشی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا ”تم“ تم سے بھی استاد! اسیں! نہیں۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا ”تم سے دیکھ لوں گا، اپنا“

نازی گر 6

وقت اپنا بھی آئے گا۔ وہ حرامی مجھڑا آج تو اس تو تے کی آنکھیں ہی پھری ہوئی تھیں۔ سالہ کاغذی شیر، افسروں کے آگے تھیں مارغاں بنا ہوا تھا۔ ”سلامی یقیناً کبھی مونجھ والے رستم نامی اس سپاہی کے بارے میں پتا رہا تھا جو افسروں کی طلبی پر شیشل اور مجھے ہنزارنے آیا تھا۔ سلامی نے بتایا کہ گزشتہ کل، شام ہوتے ہی پولیس کی بہت بڑی نفری نے اڈا گھیرے میں لے لیا تھا۔ استاد سلامی اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ شیشل سے ملنے خویلی گیا ہوا تھا۔ سلامی اڑے پر نہ کسی کو ہٹا کے نہیں آیا تھا کہ وہ خویلی کی طرف جا رہا ہے ورنہ پولیس اس کے تعاقب میں خویلی آدھ گئی۔ جو لوگ چھاپے گئے وقت اڑے پر موجود نہیں تھے، انہیں کلی کچوں اور ان کے گھروں سے پکڑا گیا۔ ٹولیوں میں انہیں کو توالی کے مختلف کمروں میں بند کر دیا گیا۔ ساری رات ان سے باز پرس ہوتی رہی۔ ہر ایک نے ایک ہی بات دہرائی کہ ٹھاکر بستی میں ہونے والے واقعے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن پولیس پر وحشت طاری تھی۔ کسی کے پاس دوسرے سے زیادہ کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں جو پولیس کی مشکل آسان کرے۔ وہ کہہ رہے تھے، شیشل اور میرے بارے میں پولیس افسروں نے کرید کرید کے طرح طرح کے سوال کیے۔ سب کا ایک ہی جواب تھا۔

شیشل نے ہاتھ بلند کر کے حیران و پریشان ہوٹل والے کو طلب کیا۔ رام پوری مٹلی ٹوپی، چکن کے سفید کرتے اور پاجامے میں لمبوس چھریے، جسم کا ہوٹل والا اڑے کے آدمیوں سے خوب واقف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سسے ہوئے انداز میں قریب آ کے شیشل کو سلام کیا اور کھینے چھوئے۔ شیشل اسے سب کے لیے ناشتے کی تیاری کا حکم دیا چاہتا تھا کہ ہوٹل والے نے سر جھکا کے اور سینے پر ہاتھ رکھ کے شائستگی سے کہا کہ وہ پہلے ہی اپنے کارندوں کو ہدایت دے چکا ہے۔ ناشتا تیار ہو رہا ہے۔ اس نے کہا، ”معلوم ہے“ اور اسے ”کیا سارا شہر جانتا ہے کہ اڑے کا ہر آدمی کل رات، پولیس گھیر کے لے گئی تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سب صحیح سلامت واپس آ گئے۔ پوچھنے لگا، ناشتہ کو جانے دیجئے، کوئی اور خدمت ہو تو اسے بتائی جائے۔ کوئی اور خدمت کیا ہوتی جو اسے بتائی جاتی۔ شیشل کے اشارے پر سب نے وہیں میزوں پر رکھے جگوں سے منہ پر چھپکے مارے اور آستینوں، ڈامنوں سے چہرہ خشک کیا۔

”تم نے چھو کو دیکھا استاد؟“ اپنی دھناتی کی سور کے جنوں نے کہ نکسیر چل پڑی۔ ”سلامی کو وہ رہہ کے کڑی ہوئی

کتابیات پبلی کیشنز

237

236

کتابیات پبلی کیشنز

رات ستارہی تھی، کسے لگا "سلاخون رکنا ہی نہیں تھا۔ اوہ اپنے بچپن کو ٹھوکر مار مار کے دیوار میں ٹھہرا دیا۔ آگے طاق کی اینٹ نکلی ہوئی تھی، جا کے تھکا کر آیا، وہ تو کو، آنکھ رہ گئی۔ کپڑے دیکھتے ہو استاد اس کے "سلا" نے بے تابانہ اوہ اوہ دیکھ کے بچپن کو آواز دی۔ بچپن دور بیٹھا تھا۔ اڑے کے آدمیوں نے اسے اٹھا کے آگے کی جانب دھکیل دیا۔ بچپن کی پینٹاں پر میلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جا بجا خون کے دھبوں نے کپڑے رنگ دیے تھے۔ ہینسل نے بچپن کو پاس بٹھالیا۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی استاد۔" سلا کی شکایتی لہجہ غصے سے لبرز تھا، کسی کی بھی گردن پکڑ کے اندر کود آئی دیکھو نہ آئی کی ذات، چھوٹا دیکھو نہ بڑا، دے دھواں دھواں۔ کو تو آئی نہیں، قصائی خانہ ہے۔ سالے کوئی بات ہی پوری نہیں سنتے تھے۔ سب نے چڑھائی ہو جیسے ایسا جنگلی پنا، خراپا ہم نے بھی نہیں دیکھا۔ یہ کیا ہے استاد؟" ہینسل سر جھکائے بیٹھا رہا۔

اتنی دیر میں ہوٹل کا مالک اور اس کے آدمی میزوں پر ناشتا لگانے لگے اور یوں وہ سارے بھوکے پیاسے رکابیوں اور پیالیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ہینسل نے ان کے لیے خوشبودار پان منگوئے اور تمباکو نوشی کرنے والوں کو سگریٹ، بیڑی سے آسودہ کیا۔ ہوٹل والا ناشتے کے پیسے لینے پر آمادہ نہیں تھا۔ ہینسل نے اس کی جیب میں روپے ٹھونس دیے۔ وہ روپے واپس ہینسل کی جیب میں ڈال دینا چاہتا تھا کہ ہینسل کی ناراضگی بھانپ لی اور اس کا جسم چرما کر رہ گیا۔

ہوٹل سے کچھ دور تک سیر پیدل چلتے رہے۔ بازار میں ہم تماشا بن گئے تھے۔ راہ گیر ٹھہر ٹھہر کے ہمارا گزرتا قافلہ دیکھتے اور کاٹا بھوسی کرتے نکلتے۔ بعض راہ گیروں نے بڑھ کے اپنے شاہراہ اڑے کے آدمیوں کو مبارکباد بھی دی۔ آتے سائے ڈالیں بائیں ہر طرف لوگ جمع ہونے لگے۔ کھڑکیوں اور چھتوں پر غورتوں اور بچوں کے چہرے نظر آتے گئے تھے اور اطراف میں دیواروں اور گنبذوں کا تھا۔ ہینسل اور میں سامنے پڑنے والے پہلے آگے میں بیٹھ گئے۔ وہ سارے ہمارے پیچھے تانا چاہتے تھے لیکن ہینسل نے استاد سلا کی کو اڑے جا کے چلے درست کرنے کی تلقین کی اور کہا کہ پولیس دوبارہ آئے تو اڑے کا کوئی آدمی اپنے ہتھکڑ کا اظہار نہ کرے اور نہ شرمیں گزشتہ رات کو تو آئی کی روداد کا چرچا کرے۔ بہتر ہے، وہ سب اڑے پر جتے رہیں اور آرام کریں اور شرمیں غیر ضروری گشت سردست ملتوی کر دیں۔ کسی مشورے کے لیے

سلا کی کسی وقت بھی ہینسل کے پاس حویلی آسکتا ہے ورنہ آج شام ایک کل صبح، جیسا مناسب ہوا، ہینسل خود اڑے آئے گا۔ کچھ دور وہ ہمارے ساتھ آگے کے پیچھے چلے نظر آئے ہر ایک موڑ پر اوچھل ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ کی مسافت کے بعد حویلی آگئی۔ تمام راستے اور خصوصاً حویلی کے ارد گرد پولیس تعینات تھی۔ ماما اور اس کا بھتیجا گلو چوتھے پر پیرا دے رہے تھے۔ ماما کے کندھے پر دو ٹائی بندوق لگی ہوئی تھی۔ ہمارا آگیا دیکھتے ہی دونوں میں تلاطم سا اٹھا۔ ان کے چہروں پر کوندنی ٹائیائی دیدنی تھی۔ ماما ہینسل کا ہت لٹا کر آتا تھا، تیزی سے چوتھے کی سیڑھیاں اتر کے وہ ہینسل سے لپٹ گیا۔

دھوپ اپنی انتہا پر تھی لیکن تیش برائے نام تھی۔ ارشد، خور اور جانیگیر تعیناً ڈیوڑھی ہی میں موجود تھے کہ ہماری آواز سن کر کے تقریباً بھاگتے ہوئے باہر نمودار ہوئے اور جیسے ہم کوئی عجوبہ ہوں، پچھی پچھی آنکھوں سے ہماری شکلیں دیکھنے لگے۔ نکلے بھر سکتے جیسے ایک عالم کے بعد انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ ان کے دیدوں میں روشنیوں کی جھلک لائی گئی۔

صاف نظر آ رہا تھا، ان کے سینوں میں ہمت سے سوال دھڑک رہے ہیں لیکن کسی استفسار میں پاس ادب ٹھوٹا ہے۔ باہمی مفاہمت کے لیے ہی ایک طور کار کر رہے اور وہی بات۔ وہ سوال ہی کیوں کیے جائیں جن میں مسئول کی گراں باری کا شاید ہو۔ سوالوں کا تو یہ ہے، آدمی بھی خود کو بھی ٹھیک سے جواب نہیں دے پاتا تو دوسرے کو کیا مطمئن کر سکتا ہے۔ سوال آسان، جواب مشکل ہوتے ہیں۔ ہمت سے سوال صرف سوال ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ ہمت سے سوال خوابوں کے مانند ہوتے ہیں اور شرمندہ جواب نہیں ہوا پتے۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مضطرب ارشد، خور اور جانیگیر کو اپنی جلیوس لیے ہوئے ہم اندر چلے آئے۔ زریں، خانم، نیساں اور زہرہ خاص دروازے کے پلو میں واقع بینک میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ نیساں ان کی موجودگی کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ حویلی سے باہر کی دنیا سے قریب رہیں۔ ہماری آہٹوں پر ان کے کان لگے رہیں۔ مطلب کی آمد رات کو متوقع ہو، طلب گار صبح سے انتظار کی اذیت سے کیوں دو چار ہوتے ہیں؟ اور ہماری واپسی کا کوئی وقت ہی طے نہیں تھا وہ یہ فاصلوں کا گمان بھی خوب ہے۔ فاصلوں کی کمی دیشی سے کسی کی طلب یا کسی کی یاد کی شدت

کہاں متاثر ہوتی ہے؟ کوئی دیوار کے پار ہوا سمندروں کی دوری پر؟ دوری تو ایک ہی ہے۔ دسترس کی دوری سب سے بڑی دوری ہے۔ ارشد، خور اور جانیگیر کی ڈیوڑھی میں اور خانم، زریں، نیساں اور زہرہ کی بینک میں نشست میں ایک ہی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی تھی۔ صبح حویلی میں پولیس کی آمد اور ہمیں ساتھ لے جانے کے معاملے کو ممانہ لگتا ہی چاہیے کے بیان کیا ہو، یہ تو سننے والے پر موقوف ہے، اسے لفظوں کی غائبیں درست کرنے اور گرہیں نکالنے کی کٹنی مہارت ہے۔ ان سب کی ہوش مندی میں کیا کلام تھا۔ حویلی میں آنے جانے والے ملازمین سے انہیں کل شام ہی معلوم ہوا تھا۔ چاہیے کہ حویلی کو چاروں طرف سے پولیس نے گھیرے میں لے لیا ہے اور شرمیں جگہ جگہ اس کے دستے ڈرا جاتے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ بھی ذہن نشین کر دی گئی ہوگی کہ شر سے کچھ دور ٹھہر بستی میں کیسا خون ریز واقعہ ہو چکا ہے۔ ارشد اور خور حویلی میں قید نہیں رہتے تھے۔ باہر جانے نکلتے لوگوں سے ان کے مراسم رسی نوعیت سے تجاوز کر گئے ہوں گے۔ آدمی کتنا ہی خلوت نشین، محتاط اور مرد پرزار ہو، نئی جگہوں پر دوسرا دن اس کے لیے ایسا اجنبی نہیں رہتا۔ ارشد اور خور کو تو فیض آباد میں بے ہوشے وقت گزر چکا تھا۔ بینک میں موجود زریں، خانم، نیساں اور زہرہ کے لالہ رنگ رخساروں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ ہینسل نے جاتے ہی دستر خوان آرائی کی فرمائش کی۔ دو بج چکے تھے۔ کھانا کھانے کا جواز بھی تھا۔ ہینسل کو توجہ و توجہ کی عادت نہیں تھی لیکن ان کے کسی سوال سے پہلے اس نے از خود واضح کیا کہ پولیس کسی غلط فہمی میں انہیں کو تو آئی لے گئی تھی۔ پولیس کو جب یقین آ گیا کہ ہم لوگ تو کئی دن سے فیض آباد سے باہر نہیں نکلے، معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ نیساں اور زہرہ کو اس کے ساتھ لب کشائی کی توفیق نہیں تھی۔ زریں اور خانم نے خاموشی شعار کی۔ نیاز مندی کا بھی شیوہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، جوں کا توں تسلیم کر لیا جائے اور اپنے منہ کو محسن کو جواب دہی کا آزار نہ دیا جائے۔ ان کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں لیکن آنسو انہوں نے آنکھوں ہی میں جذب کر لیے اور وہاں سے منتشر ہو گئیں۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا، ایک پیر نہیں پیچھے صبح حویلی سے جانے اور دوپہر واپس آنے میں کئی دن، کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ میں نے کمر بند کر لیا۔ میں چند دیر اپنے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ مجھے بھی تو ہمت سے جواب مطلوب تھے۔ وہ تو ہینسل کی زبان سے ایک کلمہ خیر سن کے

چلی گئی تھیں لیکن میں نیاز مندی کے اس درجے پر فائز نہیں تھا جہاں تسلیم و رضا کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ ان کے لیے ایک پیر بعد ہماری واپسی ہی مژدہ جاں فزا تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا، یہ ایک پیر ہم نے کیسا کن کن کے، کیسا کانٹوں پر بتایا ہے۔

مجھے کسی طور قرار نہیں تھا۔ میں نے بستر پر جسم پھیلا کے، آنکھیں موند کے گہری گہری سانس بھرنے کی مشق کی۔ کہتے ہیں، جسم و جاں پر چھائی دھند سے نجات کے لیے آسودہ کاروں کا یہ ہر۔ خاصا تجرب ہے گردنوں خانہ ہی زہر پھیلا ہوا ہو۔ ہینسل اور میں اپنے بے دیدہ چہرے اور بے شکستہ لباس کے ساتھ واپس آگئے تھے۔ پولیس ہمیں کو تو آئی میں روک کتی تھی۔ بہر حال اب ہم بے ہمدرد جانے لگے تھے، اپنے دروہام، اپنے لوگوں کے درمیان۔ ہماری خلوت گاہیں ہمارے ارادے سے قریب تھیں۔ ہمیں اپنا اختیار واپس مل چکا تھا لیکن یہ تو ہینسل ہی جانتا تھا کہ اس اختیار کی نوعیت کس قدر عارضی یا دائمی ہے۔ اس نے پولیس کو قائل کر دیا تھا کہ ٹھاکر بستی میں ٹھاکروں اور ان کے خوار یوں کو نیست و نابود کرنے والے اس کے اشاروں کے تابع نہیں تھے، دوسرے لفظوں میں وہ کوئی اور مہم جو، غیرت مند، سمیت پند، ٹھاکروں کے زخم زدہ، ستم دیدہ یا ٹھاکروں کے ہم نسل و ہم رتبہ رقیب تھے۔ ہینسل نے یہ ظاہر پولیس افسروں کو باور کرا دیا تھا کہ ٹھاکر بستی میں پیش آنے والے واقعے کی رات ہمارے بالا خانے کا رخ کرتے اور دیر تک رقص و سرود کی محفل میں قیام کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس سے پہلے شام کو بازار میں خریداری اور چائے خانے میں چائے نوشی، اسپتال میں جاں بلب لکشی داس کی عبادت، ہیرا اور پیمو کی موت پر دہائی دینے اور مجرموں کے تعاقب میں پولیس کی بے حس کا نام کرنے اور بطور حفظ اہتمام اڑے پر پولیس کی نگہ داری کے مطالبے کے لیے تھانے میں حاضری کے مشاغل بھی غیر شعوری اور غیر ارادی تھے۔ یہ تو میں جانتا ہوں اور پولیس افسروں نے بھی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ فیض آباد آمد گئے اتنے دن گزر جانے کے بعد ہینسل کو کیا کچھ حویلی سے اڑے طلب کرنے کا خیال کیوں آیا۔ اسی دن کیوں، ایک دن پہلے اور ایک دن بعد کیوں نہیں؟ مجھے اسپتال اور تھانے میں ساتھ لے جانے، رات کو مجرمے کی محفل میں شریک رکھنے، باقی رات اڑے پر گزارنے اور صبح سویرے چھ آنے کے بعد حویلی واپس ہونے میں کیا مصلحت تھی یا یہ بھی محض اتفاق تھا؟ صرف اسی شام اور خاص اسی

میں موجود ہے۔ اس کی خوشبو میرے سینے میں بسی ہوئی ہے۔ میرے کانوں میں اس کی آہیں سرسرا رہی ہیں۔ وہ تو ہر بل میرے ساتھ رہتی ہے اور ساتھ رہے گی۔ میری تو یہی ستار ہے۔ مجھے اس کی سلامتی کے عوض اسی کو قیمت دینا چاہیے۔ میری عمر بھی اسے لگ جائے۔

مجھے کچھ نہیں معلوم، یہ جاننے کے بعد کہ وہ ثواب ثروت یا حافظ عبدالحق جیسے آئودہ خانوادوں سے وابستہ ہو چکی ہے، میرا کیا حال ہوگا۔ میرا جو بھی حال ہو، یہ کیا کم ہے کہ وہ سلامت ہے، وہ امان میں ہے۔ گواہی کسی جگہ اس کا حال بھی کیا مختلف ہوگا۔ جانے کتنے لوگ اپنے محسنوں، عزیزوں کے لیے اپنی ذات کی نفی کر دیتے ہیں۔ مولوی صاحب کی خوشنودی کے لیے وہ بھی ایک دن شاید خود کو نذر کر دے لیکن پھر وہ کہاں رہے گی۔ وہ اپنے لیے کتنی زندہ ہوگی۔ آدمی اپنا تو اپنے اراوے سے ہوتا ہے۔ اس کا نام اس کا چہرہ وہی رہتا ہے، رفتار گنتا رہی وہی مگر بس ایک گمان، ایک قیاس، جانے کتنے لوگ، چلتے پھرتے، زندگی میں شامل، کوئی نہیں جانتا کہ وہ کتنے زندہ ہیں، کتنے نہیں۔ ان کی زندگی کتنی اپنی ہے، کتنی پرانی۔ مولوی صاحب گورا کے لیے بڑے محترم و محبوب ہوں گے۔ وہ نہ ہوتے تو وہ کہاں ہوتی۔ دریائے جلی کے کنارے دو خون کرنے کے جرم میں جب پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا تھا، مولوی صاحب اسے بچالے گئے ورنہ وہ اسی رات جلی میں ڈوب جاتی۔ یہ مولوی صاحب ہی تھے جنہوں نے خود کو اس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کی نظروں میں مولوی صاحب کا کیا مقام، کیا درجہ ہوگا۔ تمام مراتب ان پر تمام ہیں۔ ان کا وجود اس کے لیے سائے اور ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسلمیر میں جب مولوی صاحب میز پر لی کے پاس رہتے تھے، زہرہ گورا اسے خاص بانوس ہونگی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ مولوی صاحب گورا کو شیرازیوں کی طرح رکھتے تھے اور شیرازی جب دیکھو گم م، مضطرب مضطرب ہی رہتی تھی۔ بہت کم کسی سے بات کرتی۔ کسی دن اس کی حالت زیادہ اضطرابی ہوتی تو مولوی صاحب کی پریشانی دیدنی ہوتی تھی۔ زہرہ کبھی بھی ان دونوں کے درمیان ایک عجب تعلق تھا۔ زہرہ نے انہیں بہت کم بکلام ہوتے دیکھا تھا اور دونوں ایک دوسرے کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ مولوی صاحب فخر رہتے تھے کہ وہ کوئی خواہش کرے لیکن وہ ایک بے نیاز لڑکی تھی۔ نہ آرائش و زیبائش سے اسے کوئی سروکار تھا نہ کہیں آنے جانے اور کھانے پینے سے کوئی ایسی رغبت۔ مولوی صاحب سے کبھی وہ فرمائش کرتی تو کتابوں کی۔ اس

سے ظاہر ہوتا ہے، مولوی صاحب نے اسے تعلیم سے اچھی طرح آراستہ کیا ہے۔ وہ ایک عالم کے ساتھ تھی۔ بہت سیکھا ہوگا اس نے مولوی صاحب سے۔ مجھ سے بچھڑتے وقت اس کی عمر ہی کیا تھی، سیکھنے کی عمر تھی۔ تنہائی میں کتابوں سے بڑا رشتہ کوئی نہیں ہوتا۔ کچھ کتابوں نے بھی اس کا حوصلہ استوار کیا ہوگا۔ مطالعہ وقت کا بہترین مصرف ہے۔ علم سے زندگی زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ برداشت اور تحمل کی قوت بھی علم فزون کر دیتا ہے۔ بہر حال کچھ حاصل کرنا، کچھ نہ حاصل کرنے سے بہتر ہے۔ اسی کی طرح مولوی صاحب میرے بھی کیا کم مربی و محسن ہیں۔ وہ کوئی دولت مند جاگیردار آدمی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی ناتوانی اور وریدری کے باوجود کیا اسے اپنی امان میں رکھا ہے۔ زمانے کی دھوپ اور تیرہواؤں سے بچا کہ اس کی خاطر زندگی ہی بدل دی۔ جاگت قبیلے کے جنوں لوگوں سے آسنا سامنا ہوجانے کا بھی دھڑکا نہیں ہر وقت لگا رہتا ہوگا۔ گیا میں گورا کے آتلیق پر نسل کے وقت گورا بھی زور پر آجاتی۔ وہ تو اس کی زندگی بھی اسے بچ نکلے کا موقع مل گیا۔

جاگت قبیلے کے وحشت زدہ لوگ اس کی جستجو میں ابھی تک سارے ہندوستان میں بھگ رہے ہوں گے۔ گورا کی بازیابی کی صورت ہی میں انہیں اپنے قبیلے کی حرکت و ستادیزات کا سراغ مل سکتا ہے۔ ان کی ملیت قبیلے کے لیے سعادت ہے۔ ان کے بغیر قبیلہ بدبخت ہے اور سردار ناتواں۔ اس کی حکمرانی عبوری ہے۔ ایسی آسانی سے وہ ان سے دست کش نہیں ہوجا میں گے۔ وہ تو اپنی نسلوں کو یہ فرض منتقل کرتے رہیں گے۔ کون انہیں اس واقعے سے آگاہ کرے کہ ان کے یہ مقدس محسن انہیں اب بھی واپس نہیں مل سکیں گے۔ وہ... تو گورا جس رات اپنی جان بچا کے ہمارے گھر آئی تھی، ابا جان کی تحویل میں آگئے تھے۔ میں نے ان کی وردن گروانی نہیں کی تھی، میں سمجھتا بھی کیا۔ ان کی زبان قدیم اور مختلف ہوگی۔ یقیناً وہ میری فہم اور استطاعت سے بالاتر ہوں گے۔ ان میں بدھ نظریے، فلسفے، اقوال و ارشادات دیا تو احکام مندرج ہونے چاہئیں اور ان پر کندہ پیچیدہ خطوط اور اشاری عباراتوں سے ایک مدونہ لکھنے پر بھائی کی نشان دہی بھی ہوتی ہوگی۔ ابا جان ایسے ہی ہوش و حواس سے بگائے نہیں ہو گئے۔ ابتدا ہی سے وہ ایک نکتہ ہیں اور جس رس شخص ہیں۔ جن کا کائنات کی وجہ سے تبت کے ایک معتبر عالم کا قتل ہو گیا تھا، ان کی نوعیت اور اہمیت کے بارے میں ابا جان کا تجسس ہوجانا لازم تھا۔ پہلے انہوں نے کائنات کی

زبان سے آشنائی حاصل کی ہوگی۔ برسوں کی شب و روز ریاضت کے بعد کہیں انہیں لعل و جواہر کے ذخیرے کی موجودگی، محل وقوع سے متعلق اسرار و رموز تک رسائی ہوئی ہوگی۔ جاگت قبیلے کے لوگوں کو مدونہ خزانے سے اتنی غرض نہیں ہوتی چاہیے جتنی انہیں کائنات کی یادگاری، تاریخی اور روحانی حیثیت سے ہوگی۔ عقیدت بجائے خود ایک دولت ہے۔ عقیدت کا چینیائی سے ایسا تعلق نہیں ہوتا۔ یہ بنے کا معاملہ ہے۔ کاش گورا کا آتلیق تبت سے بھاگتے وقت یہ کائنات ساتھ نہ لانا پھر نہ وہ زندگی سے جاتا، نہ گورا کو اپنے قبیلے کے لوگوں کے مسلسل تناقب کی فکر ہوتی، نہ ابا جان اپنا اپنی شہر چھوڑنے کا فیصلہ کرتے اور شاید اسی بھی اس طرح زندگی نہ پار بیٹھتیں۔ غمی بھی گھر میں محفوظ ہوتی، کالا غنائے تک نہ جاتی۔ ان کا کائنات نے ابا جان پر جیسے جادو کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے سارے خاندان کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ خاندان میں نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ ایک بے اندازہ دولت کی صورت میں اذیت ناک حادثہ اور صاحب کی تلافی ہو گئی تھی اور یہ ابا جان ہی بہتر جانتے ہوں گے کہ اس تلافی سے ان کا دل کس قدر مطمئن ہے۔

کہیں کسی جگہ یقیناً جاگت قبیلے کے لوگوں سے مولوی صاحب کا تصادم نہیں ہوا ورنہ مولوی صاحب کو نجات اصل کرنی مشکل ہوجاتی۔ مولوی صاحب نے گورا کا نام بدل کے نرس یا نور کھڑا اور پردہ کر دیا تھا۔ ان کے پاس رہ کے انہی کے شعائر سیکھ سکتی تھی۔ مولوی صاحب کے ساتھ ایک برقع پوش لڑکی کو دیکھ کے کسی کو بھی شک نہیں ہوتا ہوگا کہ مولوی صاحب اپنی جگہ تو بہت محتاط رہے ہوں گے۔ نوک پھوک کے اس کے ساتھ سفر کرتے رہے ہوں گے۔ تا تو کیا ہے، مجھ سے زیادہ اس پر مولوی صاحب کا استحقاق ہے۔ بس وہ ایک بات کیوں نہیں جانتے۔ انہیں ایک بار تو شوق کرنی چاہیے تھی کہ جیل جانے کے بعد مجھ پر کیا لڑی۔ یہ کیا بات میں نے اور بھیل نے حافظ عبدالحق سے لیا تھی، مرزا ہوجانے کا مطلب میرا مرجانا یا منتقل ہوجانا نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے طور پر یہ کیسے سمجھ لیا کہ ب میں کسی کام کا نہیں رہا ہوں، جیل جانے کے بعد میرا چہرہ بادل سیاہ ہوجانے لگا۔ وہاں آدمی صرف چوری چکاری سیکھتا ہے۔ حافظ عبدالحق نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا مگر ان کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب بھی گھبرا اداں واپس آئے تو حافظ صاحب ضرور ان سے میری الت کریں گے۔ وہ ایک سلجھ ہوئے، اصول پسند، شریف

الطبع شخص نظر آتے تھے۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب پر ان کا بہت اثر ہے۔

میرا سر غموں پر تھا۔ کمرے میں مجھے بہت جس محسوس ہونے لگا۔ بس یہی ایک تفتیق اور تاکید داغ میں بھی جاتی تھی کہ ہمیں کسی طرح جلد سے جلد اپنے سفر روانہ ہوجانا چاہیے۔ جی یہی کرتا تھا کہ سب کی نظروں سے بچ کر یہاں سے بھاگ نکلوں اور دوسرے کمرے سارا وجود و زنجیروں میں جکڑا ہوا لگتا تھا، رواں رواں جیسے بندھا ہوا ہو۔ میں اگر طے کرلوں تو یہاں سے کسی بھی وقت جاسکتا ہوں۔ کون مجھے روک سکتا ہے لیکن خود میری ایک پوار تو درمیان میں حائل ہے۔ ورنہ اگلے ہوتے ہوں، پولیس کو بھی تو آپ پرواز چاہیے۔ میں ایسے کس طرح کہیں جاسکتا ہوں۔ مجھے تو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ بھیل نے پولیس افسروں سے صاف کہا تھا کہ وہ پولیس کی خاطر جی کے لیے مجبور ابھی کچھ عرصے فیض آباد میں رہے گا۔ میرے چلے جانے سے بھیل پر نظرس مرکوز ہوجائیں گی اور میرے یوں چلے جانے سے پولیس جانے کیا کیا مفہوم اخذ کرے۔ بھیل تو پھر بہت ناتواں ہوجائے گا۔ مجھے تو اس وقت تک یہیں ٹھہرے رہنا ہے جب تک جو پولیس کی نگاہوں کے حصار سے آزاد نہ ہوجائے۔ اصل بات تو اب بھی وہی ہے۔ پولیس نے ہمیں چھوڑ دیا ہے لیکن جیسا کہ بھیل نے خود پولیس افسروں سے کہا تھا، اس سے یہ کہاں مراد ہے کہ پولیس نے ہم سے ہاتھ اٹھایا ہے۔ آدمی کے متعلقین بھی اس کے وجود کا حصہ ہوتے ہیں۔ آدمی کیا ہے، اپنے منظر و پس منظر کا شیرازہ۔ بھیل کے علاوہ یہاں زیریں ہے، نیساں، خانم، جیا گیکر، میز علی کا خاندان، فروزاں یا سکین اور نصیر بابا ہیں۔ میرے اس طرح روپوش ہوجانے سے وہ دل گرفتہ تو اور آزرہ ہوجائیں گے۔ سب کو بتا کے جانے کی بات ہی دوسری ہوتی ہے۔

میں اپنے کمرے سے نکل آیا۔ چلے ہوئے کے اعادہ و تکرار سے ذہن بہت پریشان ہوتا ہے لیکن اس بازیگشت سے کچھ سکون بھی ملتا ہے کہ آدمی کا رشتہ اپنے آپ سے قائم ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھولا نہیں ہے۔ ابھی دن خوب روشن تھا۔ سب سے پہلے نیساں مجھے دکھائی دی۔ وہ میری طرف ہی آ رہی تھی، مجھے کھانے پر بلانے کے لیے اچھا ہوا جو میں خود باہر آیا۔ بیٹھک سے متھل بڑے کمرے میں یہاں سے وہاں تک دسرخوان سجا ہوا تھا۔ آج ناشے میں اتنی فراوانی اور گونا گونی نہیں تھی۔ انہیں وقت ہی نکٹا ملا تھا۔ یہ سن کے کہ

ہمیں صبح صبح پولیس لے گئی ہے۔ ان کا عالم بھی عجیب رہا ہوگا۔ انہیں شاید اتنی جلد صرف ایک ہر پورہ ہماری واپسی کی توقع بھی نہ ہو۔ جانے کیوں اب مجھ پر ایسا بار نہیں تھا۔ غالباً اس لیے کہ مجھے اپنا کچھ ہوا بیٹھنے لگا تھا ہوا سلجھانے اور کسی گوشے میں محفوظ کرنے کا وقت مل گیا تھا۔ کسی نتیجے پر پہنچنے اور اپنی بے دست و پائی کے احساس سے بھی آدمی کو قرار آ جاتا ہے۔ سامنے جو دنیا پڑی ہوئی تھی۔ اسے پھلانگنا میری استطاعت سے باہر تھا۔ ناتوانی قناعت پر آمادہ کرتی ہے۔ ٹھیل بھی وہاں موجود تھا اور تقریباً سبھی۔ ارشد اور تویر مجھے اپنے پاس بٹھانے کے لیے ادھر ادھر سٹھ گئے۔ میرے انتظار میں وہ ہاتھ روکے بیٹھے تھے۔ زریں خانم، نیساں اور ابراہیم لپکتے لپکتے گرم گرم کھانوں کے ڈوٹے لگائی رہیں بھر اطمینان سے بیٹھ گئیں۔ یہ سارے لوگ ایک دستر خوان پر جمع ہو جاتے تو اچھا خاصا کسی دعوت کا منظر ہو جاتا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کے دیکھا، سب کے چروں پر بادل سے چھائے ہوئے تھے اور لگتا تھا وہ گویا کھانے کی رسم ادا کی کے لیے وہاں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ کھانے کے لیے خلوے معدہ سے زیادہ خلوے دماغ ضروری ہے۔ ٹھیل نے کچھ کھانوں کی تعریف، کچھ نئے کھانوں کی فرمائش کی تو کدوں سے تھکدو رو کر کے اور یہ جانے کی کوشش کی کہ باقی سب خیریت ہے۔ مجھے فروزاں اور یاسمن کا خیال آتا تھا۔ یہاں آتے ہی حویلی کے ارد گرد پولیس کی موجودگی حویلی کے دروازے پر پولیس کے آنے اور ہمیں ساتھ لے جانے کی سرگوشیوں کی ٹھیک سے ان کے دل بھی بہت دھڑکے ہوں گے۔ ان کے چروں پر گہری سنجیدگی طاری تھی، البتہ وحشت نہیں۔ آس پاس غم گساروں کی کثرت ہو تو وحشت یوں بھی کم ہو جاتی ہے۔ کھانے کے بعد وہ بینک میں آکے بیٹھ گئے اور ٹھیل اپنی خاص جگہ پر گاؤں کیلئے کے سارے نیم دروازہ کو حقہ کشی کرنے لگا اور اس نے جاکیر سے بچی منگوائی۔ ارشد اور تویر بھی شامل ہو گئے۔ ان کے مصروف ہو جانے پر مجھے باہر جانے کا موقع مل گیا۔ ڈیوڑھی میں ماسے معلوم ہوا کہ صبح دس بجے کے قریب شرکا بڑا وکیل رام پر ساد بھارگو زریں سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کاغذات پر زریں سے دستخط کرائے اور یہ جگت روانہ ہو گیا۔ زریں اور وکیل کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ماما کو علم نہیں تھا۔ یقیناً وہ منانات کے کاغذات ہی ہو سکتے ہیں۔ وکیل کو عدالتی کارروائی میں دیر لگی ہو وہ ہماری موجودگی میں کو تو لانی نہ آسکا۔ میرے پوچھنے پر ممانے بتایا کہ حویلی سے کوئی ہر کارہ وکیل کو صورت حال سے آگاہ

کرنے یا بلانے کے لیے نہیں گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا، ٹھیل نے یہ اختلاط گزشتہ رات ہی کر لیے ہوں گے۔ اس نے کل رات یا ممکن ہے، کچھ اور پہلے وکیل بھارگو کو آج صبح سویرے سے بلکہ ہر وقت حویلی پر نگاہ رکھنے، پولیس کی دخل اندازی کی صورت میں مستعد رہنے کے لیے کسی ذریعے سے کوئی رابطہ کیا ہی ہوگا۔ وکیل اور خود تو انہیں آسکتا تھا۔ ٹھیل نے حویلی کے محاصرے کی خبر سن کے اور شاید اس سے بھی پہلے سارے امکانات قیاس کر لیے تھے۔ ہو سکتا ہے اس نے زریں کو بھی پیش آنے والے سانحوں کے لیے حوصلہ قائم رکھنے کی فمائش کی ہو۔ صبح وکیل کی آمد پر زریں نے خاموشی سے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ اس آبادی میں اس کی حاملہ منی کے علاوہ ٹھیل کی تعلقین کو تاکید کا بھی دخل ہوگا۔ ممانے مجھے نہیں بتایا کہ وکیل کی آمد پر زریں نے کسی تشویش یا حیرت کا اظہار کیا ہو۔ ادھر کو تو لانی میں ٹھیل نے پولیس افراد کے سامنے یوں ہی ہوا میں تیر نہیں چلایا تھا کہ اس کا وکیل ہم دونوں کے قانونی تحفظ کے لیے بس آیا ہی چاہتا ہوگا۔ وکیل وقت پر نہ پہنچ سکا۔ اس اثنا میں ٹھیل نے اپنی وکالت کا فریضہ خود انجام دے لیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں نکلتے تھے کہ وکیل کی اب ضرورت نہیں رہی۔ کسی وقت بھی ہمیں اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

شام کو میں یوں ہی وقت گزاری کے لیے ٹھلتا ہوا بالائی منزل پر واقع لاہری کی میں چلا گیا تھا۔ مجھے تازہ رسالوں کی ورق گردانی میں وقت لگ گیا۔ وہاں سے واپسی پر معلوم ہوا کہ وکیل بھارگو ٹھیل سے ملنے آیا تھا۔ مجھے ان کے درمیان موجود نہ رہنے کا ملال تھا۔ اس دن اڑے سے کوئی شخص حویلی نہیں آیا۔ ٹھیل بھی حویلی میں بند رہا۔ رات کو کھانے کے بعد ماسے گرد و پیش کی سگ سن لینے کے لیے ایک بار بھر میں نے ڈیوڑھی کا رخ کیا۔ ماما کا بیٹھا بھی وہاں موجود تھا۔ اس کا کتنا تھا کہ سارے شر میں طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ پولیس نے جانے کتنے لوگ گرفتار کر لیے ہیں۔ کسی بھی مشکوک راہ گیر سے پولیس پوچھ کچھ شروع کر دیتی ہے جو ذرا سی مزاحمت یا حجت کرتا ہے، پولیس والے اسے ساتھ لے جاتے ہیں۔ شر سے باہر جانے والے راستوں پر پولیس کی نفری میں اور اضافہ کر دیا گیا ہے۔ سنا ہے بارہ بجے سے پولیس کے دستے بلوائے گئے ہیں۔ شام کو دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ دن بھر شر میں ہو کا سا عالم رہا ہے۔ اڑے پر بھی پولیس کی بھاری جمعیت ہے لیکن اڑے کے آدمیوں نے خود کو عمارت تک محدود رکھا ہے۔ ٹھیل نے دوپہر رخصت

ہوئے وقت انہیں یہی مشورہ دیا تھا۔

کھانے کے بعد ٹھیلک میں سبھی موجود تھے۔ میری طرح ہر ایک کو توقع ہوئی کہ ٹھیل رات گئے تک ان کے ساتھ بیٹھا رہے گا۔ وہ جلد ہی اٹھ گیا۔ اس کے چلے جانے کے یکے بعد دیگرے سبھی کمرے سے ہوئے اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ میں بھی پھر وہاں سے اٹھ گیا۔ جی میں آیا تھا کہ زریں خانم، نیساں، جاکیر وغیرہ سے کمرے میں آنے کو کہوں گا مگر اس خیال سے رک گیا کہ وہ ایسے سوالات شروع کر دیں جن کا جواب دینا میرے لیے آسان نہ ہو۔ بہت سے جواب مجھے خود نہیں معلوم تھے۔ نیساں اور یاسمن جگ اور گلاس کا ٹٹٹ رکھنے آئیں تو میں نے انہیں بھی نہیں روکا۔ نیساں نے سر کی باتش کے لیے بھی مجھ سے پوچھا تھا۔ باتش کا وعدہ ہوگا، ان کی چمکی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ دونوں کچھ وقت میرے ساتھ گزارنے کی خواہش مند ہیں۔ میرے انکار پر وہ چپ چاپ چلی گئیں۔ لاہری سے لائی ہوئی کتابوں اور رسالوں میں بھی جی نہیں لگا تو میں نے آنکھیں موندیں اور کسی وقت جیسے ریاں کل گئیں، نیند بھی ایک طرح کی آزادی سے، بے اختیار آزادی اور اختیار کے احساس کے غیر آزادی کیسی۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد ٹھیل حویلی سے نکل گیا۔ ٹھ سے اس نے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا اور جانے کیوں میں سے اکیلا جانے نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھ سے نہیں کہا تو میں بھی چپ رہا اور اس کی طرف استغماہی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ ممانے اس نے ٹانگا منگوایا تھا۔ اڑے کے ملاوہ وہ کہاں جا سکتا تھا۔ دوپہر کھانے کے وقت وہ واپس آیا۔ مجھ سے ہواشت نہیں ہوا تو میں نے زیر لبی سے پوچھ لیا، ”وہاں سے؟“

”ہاں سے۔“ اس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ”ایئر رہے ہیں حرام کے بچے۔“

”سنا ہے ہر طرف پولیس ہے۔“ میں نے اپنا مضطرب خود تک محدود رکھنے کی کوشش کی، ”پولیس بہت دلائی ہوئی ہے۔“

اس کی آنکھیں چڑھ گئیں گہری سانس لی، کچھ کتنا چاہا وہ ہڑ بڑا کے رہ گیا۔ وہ کوئی بات ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے کیا سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے بہت غصہ آتا تھا بلکہ اپنے آپ سے چرس ہوئے لگتی تھی۔

رات، کھانا کھانے کے بعد ٹھیلک میں جانے کے بجائے میں ڈیوڑھی میں چلا آیا۔ ماما کا بیٹھا مجھ سے اب خاصا مانوس

ہو چکا تھا۔ ان لوگوں میں اس کا شمار ہوتا تھا جو سوتے میں بھی چپ نہیں رہتے۔ مجھے کیردے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دواں ہو گیا۔ کہنے لگا، ”صبح بازار سے حویلی کی طرف آ رہا تھا کہ چوراہے پر اسے ٹھیل کا ٹانگا نظر آ گیا۔ ٹھیل نے اسے بھی ساتھ بٹھالیا۔ راستے سنان تھے، ہر جگہ راہ گیر کم تھے، پولیس بجلی ہوئی تھی۔ دو بجوں پر پولیس مزاحم ہوئی اور فضول قسم کے سوالات شروع کر دیے۔ ٹھیل نے انہیں اپنی منزل یعنی اڑے، جامو استاد کی چوکی کا بتایا اور اپنی سکونت کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا۔ حویلی کے ذکر پر سوال کرنے والوں کی ہموں تن گئیں لیکن اس اطمینان کے بعد کہ کل صبح کو تو لانی میں ٹھیل ہی کو بلایا گیا تھا، انہوں نے مزید کوئی تعرض نہ کیا۔ اڑے سے قریب پولیس کا دستہ زیادہ محتاط تھا۔ انہوں نے ٹھیل کو ٹانگے سے اتار لیا، تلاشی لی۔ ٹھیل کی جیب سے چاقو برآمد ہونے پر ان کا پارا چڑھ گیا۔ ٹھیل نے ہر سوال کا جواب زہری سے دیا اور صاف بتا دیا کہ وہ اڑے کا آدمی ہے۔ چاقو تو اس کے لیے جسم کے کسی حصے کی مانند ہے۔ وہ فیض آباد پولیس کے آدمی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کسی بات سے ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ چاقو کی موجودگی اور اڑے سے تعلق کے اعتراف نے انہیں اور متوحش کیا۔ ٹھیل نے جانے کے لیے وہ ٹھیل اور ممانے کے بیچے کو تقریباً کھٹے دیتے، دھکیلے ہوئے اڑے کی کچی سے باہر لے آئے، پچھ اس طرح کہ دو پولیس والے دامن بائیں، دو پیچھے، ایک آگے، پورا گھیر اڑال کے گھیرے کے ساتھ ان کا اصرار رہا تھا۔

ماما کا بیٹھا کہ رہا تھا، ٹھیل کا ساتھ ہونے کے باوجود اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس سے تو ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بازار والی سڑک پر بہت سے راہ گیر یہ منظر دیکھنے کے لیے اپنی اپنی جگہوں پر ٹھہر گئے تھے۔ کسی کو قریب آنے کی بہت نہیں ہوئی۔ سڑک کے کنارے فلائنگ بھر کے فاصلے پر گشت کرتی ہوئی فیض آباد پولیس کی دخل اندازی پر کہیں یہ تماشا ختم ہوا۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ انہوں نے جانا، شاید ٹھیل کسی نئے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ ٹھیل کو ساتھ لانے والے پولیس والوں سے استفسار پر ان کے چروں کی تندی دور ہوئی۔ مقامی اور غیر مقامی سپاہیوں میں ٹھوڑی سی ہنگام ہوئی۔ ٹھیل اس دوران خاموش کھڑا رہا۔ فیض آباد پولیس کے حوالدار نے غالباً اپنے غیر مقامی ساتھیوں کی خوشنودی کے لیے تھکانہ لےجے میں ٹھیل سے باز پرس کرنی چاہی۔ ٹھیل نے کہا کہ ان

سوالوں کے جواب وہ پہلے دے چکا ہے۔ خوالدار اپنے ساتھیوں سے پوچھ لے۔ خوالدار نے شرکی مخدوش حالت میں چاقو ساتھ لے کے چلنے پر سرزدش کی اور گئے لگا کہ ہنر ہے، وہ ان دنوں خود کو گھر تک محدود رکھے۔ اس نے ہنسل کو متنبہ کیا کہ شہر میں دفعہ ۳۴ نافذ کر دی گئی ہے، سائوں پر بھی شک کیا جا رہا ہے، افسران کا حکم ہے، کسی سے کوئی رعایت نہ کی جائے جو بھی ذرا سا مشکوک نظر آئے، پکڑ کر تھانے لے آئیں۔ ہنسل نے رکھائی سے کہا ”سو پچاس کیا“ پورا شہر تھانے میں بند کر دو۔“ خوالدار زچ سا ہو گیا اور ہنسا کے بولا کہ وہ تو ہنسل کی بھلائی کی بات کر رہا ہے۔ ہنسل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تو جہنم میں جائے۔ خوالدار بلکا جھٹکا غیر مقامی پولیس افسر کو الگ لے گیا اور سرگوشیوں میں جانے کیا کچھ باور کرا تا رہا۔ افسر کے اشارے پر سپاہی، ہنسل اور ماما کے پیچھے سے محاصرے سے دستبردار ہو گئے۔ ہنسل نے وہاں سے حرکت نہیں کی اور اپنے چاقو کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ افسر کو چاقو کی واپسی میں کچھ عار تھی لیکن چند لمحوں کے پس و پیش کے بعد اس نے منہ بگاڑتے اور گالیاں جلتے ہوئے چاقو ہنسل کی طرف اچھال دیا۔

یوں ہنسل اڑے تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ ماما کے پیچھے کے مطابق ”اڑے پر لوگوں کا اڑھام تھا“ ہنسل کو دیکھ کے سبھی ہانگل ہو گئے۔ ساری عمارت نعروں سے گونج اٹھی۔ ہر شخص ہنسل کی پذیرائی کے لیے مضطرب تھا۔ استاد سلامی نے فوراً حقہ تازہ کرایا۔ ماما کھینچا چوکی سے دور بیٹھا تھا اس لیے وہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکا۔ دو ڈھائی گھنٹے اڑے پر قیام کے بعد ہنسل وہاں سے اٹھ گیا، اس کی واپسی کے انتظار میں ٹانگا اڑے کے باہر کھڑا تھا۔ واپسی کے راستے میں بھی ایک جگہ انہیں روکا گیا اور چند سوالات کے بعد آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ دوپہر کے وقت سڑکوں پر سناٹا اور بڑھ گیا تھا۔ کل رات بازار کے علاقے میں بالا خانے بھی بند رہے۔

اس رات بھی ہنسل نے بینک میں زیادہ دیر نشست نہیں جمائی۔ حالانکہ کھانے کے بعد تقریباً سبھی بینک میں آچکے تھے اور کسی رگ جگے کے آزد مند معلوم ہوتے تھے۔ ڈیوڑھی سے اٹھ کے میں بینک میں داخل ہوا تھا کہ ہنسل نے سب کو آرام کرنے کی ہدایت کی۔ نصیر بابا نے اس کا حقہ اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔ بینک میں میری موجودگی کی وجہ سے کچھ دیر وہ سارے پیچھے رہے اور کلبلا تے رہے۔ میرا سر خالی خالی تھا۔ دماغ پر جہنم بھی خالی پن کا سبب ہوتا

ہے۔ ان سببوں کی حالت بھی کچھ مختلف نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہنسل نے بھی محسوس کیا ہو گا کہ حویلی کے کمین اس کی جانب سے خوش امید کی کسی نوید کے طلاکار ہیں۔ ظاہر ہے کہ گرد و پیش کے گرد و غبار نے ان کے اعصاب بھی غلٹ کیے ہوں گے۔ ہنسل کو زیادہ نہیں تو کچھ دیر ان کی نشاط خاطر کے لیے وہاں بیٹھے رہنا چاہیے تھا لیکن لگتا تھا۔ ہنسل بھی آنے والے دنوں کے سازگار موسم کی پیش گوئی سے قاصر تھا اور کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا، آگے جس کی تردید میرا جکی کا امکان ہو۔ ہنسل کی جگہ ان کی دل داری و دل جوئی، کام میں بھی کر سکتا تھا لیکن میری باتوں سے ان کی ایسی تشویش نہیں ہوئی اور پہلے تو خود مجھے اس تشویش کی ضرورت تھی۔

ہنسل کی پان خوری شوق تھی۔ ہر پندہ پانوں کی اقسام کے بارے میں اس کی معلومات پان کے عادی کسی شخص سے کم نہیں تھیں، حویلی میں اس کے قیام کے دوران پان دان خاص اہتمام ہوتا تھا۔ صبح و شام، ناشتے اور کھانے کے بعد چاندی کے ورق میں لبوس لگوریاں اس کے سامنے رکھ دی جاتیں۔ الاچی دانے، لکھنؤ کے خاص زردے، زعفران اور طرح طرح کے مسالوں سے بھری چھوٹی چھوٹی منتقش بنارس ڈبیوں سے خاص دان آراستہ کیا جاتا تھا۔ ہنسل کے بوخار پر پان رچتا بھی خوب تھا۔ اس رات معمول کے خلاف سامنے رکھے خاص دان رکھ آنے کی تاکید کی۔ نیساں کے واپس آنے پر زوریں کا اضطراب کچھ کم ہوا۔ یہ کام وہ خود کر سکتی تھی مگر اس کے ہنسل کے پاس جانے کی بات اور ہوتی۔ اسے سامنے دیکھ کے ہنسل کو توجہ اس کی طرف مرکوز کرنی پڑتی اور یہ توجہ مزید گراں باری کا سبب ہو سکتی تھی۔ زوریں نے یقیناً ہنسل کے چہرے پر کسی قسم کا کندہ بھانپ لیا تھا۔ حسن اور نازکی لازم و ملزوم ہیں۔ وہ بہت شیشہ نفس لڑک تھی۔ نازکی سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی آب گینے کے مانند ہے۔ اسے دوسروں کے آب گینے کا احساس بھی اتنا ہی ہونا چاہیے۔ جمانگیر اور نیساں بساط بچانے کے لیے چل رہے تھے۔ خانم کا تور دیکھ کے دونوں بچھ سے گئے اور سر جھکائے بینک سے نکل گئے۔ کچھ دیر میں سبھی ایک دوسرے کے پیچھے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ میں بھی پھر بہت قریبی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اپنا سا بھی آدمی کو بہت مرغوب ہوتا ہے لیکن اپنا آپا ہی زہر لگے بھی اپنے آپ سے دور ہونے کو جی کرنا ہے اپنا چہرہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

میں کو توالی میں حاضری دے تیسرا دن تھا۔ ہنسل بیشتر اپنے کمرے میں بند رہا۔ سرشام استاد سلامی کی آمد کی اطلاع روہ بینک میں آیا۔ میں ڈیوڑھی میں تھا اس لیے سب سے نیچے میرا اس کا سامنا ہوا پھر میرے ساتھ ہی وہ بینک میں آغل ہوا۔ یوں مجھے اس کے اور ہنسل کے درمیان موجود رہنے کا ایک جواز مل گیا۔ استاد سلامی کے پاس سنانے کے لیے یہی ایک خبر تھی کہ دوپہر کے وقت پولیس کا ایک مسلح دستہ اڑے پر وارد ہوا اور اسے کو توالی چلنے کا حکم دیا۔ کو توالی ہی جلدی اسے ایک مقامی، دو غیر مقامی افسروں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ یہ کمر اس کمرے سے مختلف تھا جہاں تین دن ملے اڑے کے آدمی لے جانے گئے تھے اور ان کی زبانیں لٹولانے کے لیے طرح طرح کی ایذائیں دی گئی تھیں۔ استاد سلامی سے اس پر نووی سوال کیے گئے جن کے جواب وہ اس روز تفصیل سے دے چکا تھا۔ یہ سوال زیادہ تر ہنسل اور برے متعلق تھے۔ اس مرتبہ پولیس افسروں کی ترش رفتاری میں پہلے بھی تیزی نہیں تھی۔ استاد سلامی کے یہ ل اس نے ایک بار پھر صراحت کی کہ استاد ہنسل اڑے کا دی ہے اور محض اڑے کے آدمی قتل و خون کے اتنے بڑے ر معظّم واقعات میں ملوث نہیں ہوتے۔ وہ ڈاکو اور نقب زن ہیں ہوتے۔ میرے بارے میں اس نے پولیس افسروں کو ”اڑے اور چاقو سے میرا تعلق بالواسطہ ہے۔ میں اڑے کا ہی قطعاً نہیں ہوں۔ ہنسل سے ربط خاص کی وجہ سے کچھ با سمجھا جاتا ہے۔ بے شک استاد ہنسل کی معیت کی وجہ سے مجھے چاقو، ٹلم، الاچی اور زور آزمائی وغیرہ میں بڑی اہارت حاصل ہے لیکن اذاکیری اور چاقو بازی میرا مقصود ہی ہے۔ ضرورت ہی پر میں قدم بڑھاتا ہوں“ کسی سے ادنیٰ ہو رہی ہو یا درمیان میں پڑے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔ ہریا نے معاملے میں بھی جی ہی ہوا تھا۔ ہریا، جامو استاد کے اڑے کا ہی تھا۔ یہ کس طرح ممکن تھا، جامو استاد کے شریفیض آباد یا اس کے اڑے کے ایک آدمی پر باہر کا آدمی حاوی آ رہا اور استاد باہر کھڑا دیکھتا رہے۔

پولیس نے کھانچا کے کے سوال کرنے اور استاد سلامی الجھانے کی کوشش کی۔ استاد سلامی نے ہوش و حواس قائم رکھے۔ اصل صورت حال کی تصدیق کے لیے انہوں نے ہر دیو اور مل دیو کی ہستی میں خون خرابہ ہونے والی رات مل کی مصروفیات کی ترتیب دہرائی اور اپنی طرف سے ہم و اضافہ کر دیا۔ استاد سلامی نے شدت سے تردید و تھجج کر اس نے ایسا بھی نہیں کہا۔ استاد ہنسل اس روز شام

کو جائے خانے میں چائے نوشی کے بعد سنار کی کسی دکان پر نہیں گیا اور نہ ہی اسی رات اس نے شاہ زادی کے بالا خانے کا رخ کیا۔ افسران نے اس سے بحث نہیں کی اور اسے اڑے واپس جانے کی اجازت دے دی۔

”یہ اپنی مالی ہیرائی کا ہر ذوب گئی؟“ یکایک ہنسل نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گیا۔ استاد سلامی کو آئے دیر ہو گئی تھی۔ اس کی خاطر تواضع کے لیے کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ حویلی میں کسی مہمان کی آمد کی اطلاع زوریں، خانم اور زہرہ کوئی الفور ہو جاتی تھی اور محمودی نامی اور جیز عمر لازمہ حرکت میں آ جاتی تھی۔ اور کچھ ہی دیر میں سارا انتظام جیسے خود بہ خود ہو جاتا تھا۔ محمودی بیگم اس کا اصل نام تھا۔ حویلی کے کمین اسے مودا بوا کہتے تھے۔ وہ بیشتر بیزرو بونا اور سبز چادر اوڑھ رہتی تھی۔ اس نسبت سے ہنسل نے اس کا لقب ہریالی رکھ دیا تھا۔ مہمانوں کے لیے وہی باورچی خانے سے خورد و نوش کا سامان بینک میں لاتا تھی۔ میں باورچی خانے جانے کے لیے نکلا ہی تھا کہ وہی ہوا۔ محمودی بیگم طفت اٹھائے بینک کی طرف آئی دکھائی دی۔ میں بینک میں واپس جانا چاہتا تھا، مجھے گمان ہوا، کمین میں ہنسل اور استاد سلامی کی گفتگو میں خلل تو نہیں ہو رہا ہوں۔ مجھے اٹھانے کے لیے ہنسل نے یہ بلاغت اختیار کی ہو۔ شاید مجھے وہاں بیٹھے ہی نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے پھر بینک میں واپس جانا مناسب نہیں سمجھا اور لا بیری کی طرف نکل گیا۔

سورج ڈوب رہا تھا، نرم نرم ہوا چل رہی تھی۔ حویلی کے اندر دلی حصے میں خاصی چمک چمک تھی۔ جمانگیر مل گیا اور اس نے بتایا کہ پیچھے باغ میں ارشد اور توبر بید منتقل ہو گئے۔ میں لیکن باغ میں جانے کے بجائے میں نے لا بیری کی سیڑھیاں ملے کیں اور دروازے میں داخل ہوتے ہوئے میرے قدم ٹھک گئے۔ وہاں فرداں موجود تھی۔ شاخ پر جیسے گلاب مازہ تازہ کھلا ہو۔ سفید چکن کے کرتے، دوپٹے اور آڑے پاجامے میں لبوس۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے، جیسے سیاہ بادلوں کی اوٹ سے چاند دکھتا ہو۔ بصارت کی بھی ایک استطاعت ہوتی ہے۔ روشنی بصارت سے ہوا تو! میری آنکھیں ایک لمحے کے لیے بینائی کو نہیں لگتا تھا، چہرے سے چنگاریاں لپک رہی ہوں یا کہ نہیں پھوٹ رہی ہوں۔ ذرا ہوا کا رخ بدلے ذرا دھوپ نرم ہو اور ذرا سی پھوار پڑے تو پھر مردہ پودوں اور پھولوں پر زندگی لٹکانے لگتی ہے۔ آدمی بھی کچھ ایسی کی طرح کے ہوتے ہیں۔ بس ذرا سا سیاہ ذرا سا

گدا اور ذرا سا گرد و پیش کا اعتبار ہوتا چاہیے۔ وہ کسی کتاب کے مطالعے میں گم نہ ہو۔ مجھے سامنے دیکھ کے سٹائی گئی اور اضطرابی انداز میں دوپٹے سے سر ڈھانپا، لباس درست کیا اور کسی قدر سرا سمہ آوازیں آواں کیا۔ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی "آئیے، آئیے۔"

میں نے سر جھکائے کرسی پہنچ لی "آپ، آپ ٹھیک تو ہیں" اپنی آواز کا بچکانہ خود مجھے ٹھیک رہا تھا۔ ناشے کھانے اور بیچل میں روز دو تین بار تو چہرہ نمائی ہو جاتی تھی لیکن اس طرح آنے سامنے بات کیے ہوئے دن ہو گئے تھے۔ "کوئی کوئی پریشانی تو نہیں آپ کو؟" میں نے بے ترتیبی سے کہا۔

اس نے اپنی غرائیں آنکھیں پتلیں تراشیدہ لبوں پر مسکراہٹ بکھری اور وہ جھپکے ہوئے بولی "میاں تو کسی اور دنیا کے لوگ رہتے ہیں۔"

"جی، جی گھر۔" جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی زبان قابو کی اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے کی کوشش کی "گزرندہ دنوں، بھٹل بھائی اور میں کچھ بے ہنگم سے معاملات میں گھرے رہے۔ بس اتفاقات کہیے۔ ایسے اتفاقات ہمارے ساتھ آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے بار بار خیال آتا رہا، آپ اور ایسا سن کیا کہیں گی، ہم آپ کو کوئی وقت ہی نہ دے سکے۔ جس صورت حال میں آپ میاں آئی ہیں اس کی ستم ناک کارہائے احساس رہتا ہے۔ خدا کرے، میاں آپ کو کوئی الجھن، کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس سنے ماحول میں آپ کا بھی لگ جائے۔ ہر جگہ کی اپنی مشکلیں اور آسائیاں ہوتی ہیں۔ کوئی شخص مکمل نہیں ہوتا اور جگہ کا بھی کچھ بھی ہے۔ کبھی کوئی ایسی دیکھی بات ہو جائے تو نظر انداز کر دیجئے اور کسی چیز کی ضرورت ہو، کہیں آنا جانا اور کبھی کچھ ناگوار خاطر ہو جائے تو براہ راست مجھے بتادیجئے، مجھے یا بھٹل بھائی کو یا زیریں کو۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس کی آواز کرجی کرجی سی ہو رہی تھی "آپ شاید بھول گئے۔ یہی کچھ آپ نے پہلے بھی کہا تھا۔ یہ تو ہماری خوش بختی ہے کہ اس طرف آپ کا آنا ہو گیا۔ خدا نے آخر ہماری بھی سن لی اور نہ جانے کیا۔ کیا اس کی آواز جھرجھرائی۔"

"نہیں، ایسے نہیں" میں نے منتظر لہجے میں کہا "اب وہ سب کچھ اب بھول جائے، کوئی حیاں ہی مت دیجئے اس طرف۔ مجھے کوئی برا، بھیا، ک خواب تھا۔ واقعی یہ کیا اتفاق ہے۔ کوئی جیسے سوچنے کے ہمیں وہاں لے گیا تھا۔ سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ کہاں آسن سول، اس وحشی سید محمود

علی سے ملاقات، اس کا مہمان خانہ، میری بیماری اور وہاں قیام کی معذوری، نصیر بابا سے رسم و راہ اور ہم پر ان کا اعتماد۔ کیسا آنا پانا ہے۔ یہ ہم تو بستی بستی گھومتے رہتے ہیں۔ آج یہاں، کل وہاں۔ آسن سول کی طرف نہ جاتے، ہو سکتا ہے کسی اور شہر کا رخ کر لیتے۔"

وہ مضطربانہ طلائی چوڑیاں گھماتی رہی۔ اس کے شفق زار رخساروں پر بادل سے اٹھ آئے چندے خاموشی رہی پھر وہ آہستہ سے بولی "اب آپ کب جا رہے ہیں؟"

"جلد ہی مگر، مگر چ پوچھئے تو ابھی کچھ طے نہیں ہے۔ کچھ نہیں معلوم، کتنا وقت اور لگ جائے۔ میں یہی تو کہہ رہا تھا، یہاں آتے ہی ایک نامکالی سے دو چار ہو گئے اور یوں مجھے ابھی بیرون میں زنجیر پڑی ہے۔"

وہ اپنی ریشمین پگلیں پٹ پٹا کے بولی "ایسی کیا بات ہے، کچھ بتائیے گا؟"

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے پلو بدل کے کہا "ہمارے لیے تو یہ معمول ہے۔ یہ گھنا میں تو صبح و شام ہم پر منڈلاتی رہتی ہیں اور کوشش یہی رہتی ہے کہ حویلی پر کوئی آج نہ آئے۔ ایسا ہی ہو گا لیکن میں آپ سے کہتا ہوں، آپ ایک تعلیم یافتہ اور ہوش مند لڑکی ہیں۔ تجربوں کے لیے درازی عمر ضروری نہیں ہے۔ کم عمری کے باوجود زندگی نے آپ پر بہت کچھ آئینہ کر دیا ہے۔ ایک فیصد امکان نامکالی کا پوشہ ذہن میں رکھنا چاہیے، بس حوصلہ نہیں کھوتا چاہیے۔ ہمارا کچھ نہیں ہے۔ کچھ دن سکون سے گزرتے ہیں کہ پھر کوئی افتادہ۔ جانے کب سے آزمائشوں، اندھیروں، اجالوں کی آنکھ پھولی جاری ہے۔ آنے والا کل ہمارے لیے بہت بے یقین ہو تا ہے۔ کچھ راستے ساتھ نہیں دیتے، کچھ ہماری اپنی تھی ہے۔ بس ہم ایسے ہی لوگ ہیں، اٹے سیدھے اور یہ بھی تو ایک جج ہے، ہم ایسے نہ ہوتے تو آپ ابھی تک اس انداز ترین شخص، سید محمود علی کہے۔"

میرا دماغ کوئی مناسب لفظ نہ ڈھونڈ سکا اور میری زبان اینٹھ کے رہ گئی۔ اپنے آپ کو مجتمع کرنے کے لیے میں نے کچھ توقف کیا اور قدرے تھمی ہوئی آوازیں کہا "اس خیال سے ہول آتا ہے، اگر ہم بوقت نہ پہنچ پاتے، وقت تو دیرے ہی بہت نکل چکا تھا۔ کاش، ہم کچھ پہلے ہی ادھر چلے جاتے تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہو چکا تھا۔ پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ آپ، یا سمن اور اس ناتواں بوڑھے نصیر بابا کے ہم نچہ کام آئے۔ اب آپ کو میاں دیکھ کے، کیا بتاؤں، مجھے اور بھٹل بھائی کو کیسی طمانیت ہوتی ہے۔"

"ہم سے، ہم تینوں سے زیادہ نہیں" اس نے بے ساختہ ہاتھ اس کی کھٹکی آواز افعال و اتمان، حسرت و شیدائیت کا پڑھ جی "ہمارے لیے تو یہ دوسری زندگی ہے۔"

"اور میاں سب کی خواہش بلکہ آرزو ہے کہ اس نئی رگی میں خدا کرے آپ کے تمام دکھوں کا زائل ہو جائے۔ آپ اپنے اختیار کی زندگی گزاریں جہاں تک ہمارا ملہ ہے، میں نے کمنا، ہمارا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آنے لے کل کے لیے تو، ہمارے لیے کیا اور کیسے ہوں لیکن ہم ں ہوں یا کہیں اور، کہیں بہت دور، کیسے ہی حالات اور دشت سے نبرد آزما۔ یہاں ابھی ہمارے بجائے ہیں۔ ان کا آپ کا گزرا ہوا کچھ جدا نہیں ہے اور دور و مشترک بھی لی چیز ہے۔"

میری زبان پر جو آیا کہتا رہا۔ کل اسے ہمارا سارا سفید ہ معلوم ہو ہی جاتا تھا۔ شاید میں کسی پیش بندی کی شعوری بر شعوری کوشش کر رہا تھا۔ آنے والے کل کا کسی تاریکی اس کی نامدگی یا کل کسی نامور انکشاف کا اثر اور شدت کرنے کے لیے۔ یوں اسے اب تک ہمارے بارے میں راہبست اندازہ ہو جانا ہی چاہیے تھا۔ میں نے اپنے آپ روکا۔ اتنا ہی بہت تھا۔ اس سے پہلے کہ اس شیشہ نفس، اگل اندام کے نماں خانے میں ان جانے اندیشہ و ابھام بنے لگیں، میں نے صراحت کی "میں یہ سارا کچھ اس باور کر رہا ہوں کہ آپ کی استقامت اور آپ کا حوصلہ ی توانائی کا سبب ہو گا۔ اپنے گھر سے وابستہ افراد یا یوں ہے، اپنے متعلقین اور پُرسنان حال کے عزم و ارادہ کی باتیں ہو تو پیش آنے والے سخت مرحلوں، منزلوں کی تی ارزاں ہو جاتی ہے۔"

میں نے نظر اٹھائے دیکھا، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ مرتضیٰ تھے اور انہیں دیکھ کے گلاب بے غھڑی کا گمان ہوتا تھا، میں نے کہا "ذرا کچھ وقت، یہ ش کا وقت مل جائے تو ہمیں چلیں گے۔ مجھے یاد ہے، میں آپ سے ہمیں کا ذکر کیا تھا کہ وہاں بھی ہمارا ایک گھر ہے، براکھر، فرخ، فریال، فارہ، اکبر، گیتا، جولین، شہ پارہ، پچھا اباجان اور زہرہ کے بابا، نصیر علی صاحب وہاں موجود ہیں ہاں ایک اور لڑکی بھی۔ اس کا نام رہا ہے۔ اس کے راتو گھے ہیں۔ بڑی بڑھی کھسی، بہت عجیب لڑکی ہے وہ۔ ت خیال آفریں باتیں کرتی ہے اور بھی بہت کچھ ہے وہاں۔"

"گھروں اور بگدوں سے کیا ہوتا ہے؟" وہ خوابیدہ لہجے

میں بولی "سب کچھ کیمنوں سے ہے۔"

"ہاں، آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن بگدوں کی بھی اپنی حیثیت ہوتی ہے۔ ہمیں ایک برا شہر ہے۔ جگہ جگہ کے لوگ وہاں آباد ہیں۔ ان کے روز و شب کے معاملات گاؤں دیہات اور چھوٹے شہروں سے الگ ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور دور بھی بہت۔ یہ دوری و نزدیکی غالباً ہر بڑے شہر کی خصوصیت ہے۔ بڑے شہروں کی گنجائی اس بھی کرتی، جی بھی خوب بھلائی ہے۔ بڑے شہر میں رنگارنگی بہت ہوتی ہے۔ صاحب استطاعت شہروں نے گنجان آبادیوں سے دور بڑے بڑے محل جیسے گھر بنا لیے ہیں اور ان گھروں میں ان کی اپنی ایک دنیا ہے۔"

"مگر آپ تو کہیں اور جا رہے ہیں" اس کے لیے کا ٹیکھا پن شائستگی سے عاری نہیں تھا۔

"ہاں دیکھئے، اب کے کس طرف جانا ہو لیکن ہم کہیں بھی جائیں، میں نے زیریں سے بات کی ہے، کچھ وقت جانا ہے، یہ عارضی و حصد جلد چھٹ جائے گی۔ جہاں گیر اور نیساں کے امتحانات کے بعد زیریں کا ارادہ ہے۔ بہر حال کسی ذریعے سے ہمیں معلوم ہو جائے گا اور ہم سیدھے ہمیں پہنچ جائیں گے۔ کوشش کریں گے کہ اس مرتبہ سخراتاطا ٹول نہ ہو۔"

"میاں بہت سکون ہے" اس نے سرسرائی آواز میں کہا "میاں کیا کچھ نہیں ہے۔"

"بہنیں جانے سے مراد ہجرت نہیں ہے میرے کہنے کا مطلب ہے، وہاں بھی ایسا ہی ایک گھر ہے، جی گے تو وہاں رہیں، نہیں تو واپس آجائے۔"

"گھر۔" وہ کسی قدر ہچکچاتے ہوئے بولی "دیکھا جائے تو ہماری طرز کے گھروں کی عورتوں کو بستیوں اور شہروں کے طول و عرض کی کمی بیشی اور رنگارنگی سے کیا غرض ہو سکتی ہے چار دیواریاں تو ہر جگہ چھوٹی بڑی ایک جیسی ہوتی ہیں۔"

"واقعی!" میں کرسی پر سیدھا نہ بیٹھا رہا۔ "آپ نے کیا جی بات کہی ہے" میں نے اٹھتی آوازیں کہا "بے شک، ہمارے خاص طرز کے خاندانوں کی عورتیں تو زندگی بھر چار دیواریوں میں رہتی ہیں، ایک کے بعد دوسری، تیسری چار دیواری۔ مگر ساری دنیا میں ایسا نہیں ہے۔ ادھر گوروں کے ملکوں میں عورتیں مردوں کی طرح زندگی کے معمولات میں شامل رہتی ہیں اور مرد نہیں بن جاتیں۔ اور آپ کو، آپ کو کیا اچھا لگتا مناسب لگتا ہے؟"

"مناسب نامناسب کیا" وہ کھوٹی کھوٹی آواز میں بولی

”سب کچھ موجود وقت سے پوستہ ہے۔ وقت حاکم ہے، یہ بدل جاتا ہے تو سارے طور اطوار، کچھ بدل جاتا ہے۔ پچاس سال پہلے کچھ اور تھا جو اب نہیں ہے۔ پچاس سال بعد یہ نہیں ہوگا جو اب ہے۔ کس وقت کیا صحیح کیا غلط تھا اور ہے اور آنے والے وقت میں کیا صحیح کیا غلط ہوگا۔ وقت یہ سوچنے اور فیصلہ کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ دریا و سمندر کے مانند، وقت کنارے پر لٹا رہتا ہے اور اس سے وابستہ تمام ذی حیات اس کے ساتھ سینٹے اور پھلتے رہتے ہیں۔ جو دھاروں سے بچھڑ جاتے ہیں، وقت ان سے سروکار نہیں رکھتا۔ وہ نابود ہو جاتے ہیں۔ آدمی وقت کے زندان میں رہتا ہے۔“

”دیکھئے، مطالعے اور علم کا یہ فیضان ہے۔ آدمی خیال کرنا اور فکر کرنا ہے۔ میری آواز تمہانے ٹکلی تھی، آپ کے مطالعے کے غیر معمولی شوق سے میں واقف ہوں لیکن یہ ہے آپ کیسی فکر انگیز اور دل نشیں باتیں کرتی ہیں۔ کبھی لکھنے کی طرف بھی توجہ کی؟“

اس کے رخساروں کی سرخی بکھر بکھر گئی ”میں کہاں۔۔۔“ اس کے سراپا میں جیسے کوئی تلاطم سا اٹھا ”پہلا مرحلہ توحرف شناسی ہے۔ اچھی تو یہ بھی۔“

”اسے انکار کہا جائے جو علم کا خاصہ ہے“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”لکھنے کی صلاحیت تو خدا داد ہوتی ہے۔“ ”علم کے بغیر ہر صلاحیت محدود بلکہ بے سود ہے۔“ ”آپ کا بہر حال ایک تہذیبی اور علمی پس منظر ہے۔“ ”علم درشتی میں کہاں ملتا ہے۔ اس کا خون سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر طلب گار کو خود جستجو کرنی پڑتی ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ دولت کی طرح علم کا ورثہ منتقل نہیں ہوتا۔ ہر عالم کی اولاد جاہل پیدا ہوتی ہے اور جاہل ہی رہتی ہے تاوقتیکہ علم و فن کے رموز جاننے اور کتب و کتب کی بے جینی نہ ہو۔ میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا ”جانبے کیوں میرا دل کستا ہے، آپ لکھنے کی طرف توجہ کریں تو کسی سے کم نہ ہوگا۔ لکھنے کے لیے شوق علم شرط ہے تو آپ اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا، علم روحی یا ذہنی آسودگی کا سبب بنتا ہے تو اظہار کے لیے بھی بے قرار رہتا ہے۔ علم سے خیال کی کریمیں بیھوتی ہیں۔ کچھ نئے خیال، نئے تصورات اور نئے راستے افشا ہو جاتے ہیں۔ علم سے اندھیرے پھٹتے ہیں، یہ امکانات سوا کر دیتا ہے پھر جی چاہتا ہے کہ انہیں دوسروں تک، یہ روشنی دوسروں تک منتقل کی جائے۔ علم کسی خام خیال کی بحیم کرتا اسے جلادیتا

ہے اور صرف یقین ہی نہیں، علم ٹھک بھی پیدا کرتا ہے۔ مذہب علم کی طرف راغب کرتا ہے اور کسی نے کہا تھا، کچھ ایک فضیلت ہے۔ شک سے ارتقا کی سفر تیز ہو جاتا ہے، چاہے جانے اور کیا کیا۔“

مجھے متجاوز ہو جائے نہ کا خیال آیا اور میری آواز خود بخود ماند بننے لگی۔ میں نے معذرت کی ”مجھے تو اتنا نہیں معلوم میں پڑھتا ہوں کہ ہوں یا توجہ نہیں لگتا یا وقت نہیں ملتا۔“ اس کی جھلک آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں اور چشم و اشتیاق سے لب ریز تھیں۔ میرا وجود کسمانے لگا ”یہ اجازت دیں تو کموں“ وہ ہنستے لہجے میں بولی ”لکھنا تو اصل یہ آپ کو چاہیے۔ زری بھی کل کہہ رہی تھیں، جو کچھ آپ گزری ہے، آپ لکھیں تو۔“

”واہ!“ میں کرسی پر اچھل سا گیا ”یہ میں سچ میں کہا گیا۔ میں ایسی کسی خوش فہمی کا تحمل کیسے ہو سکتا ہوں مجھے اپنی بساط اور توفیق کا اچھی طرح اندازہ ہے“ میں نے۔ تابی سے پوچھا ”یہ زری نے آپ کو کیا کہتا تھا؟“ ”کچھ نہیں“ وہ کسی قدر ٹھنک گئی ”لیکن جب آپ کا آتا ہے، ان کی زبان پر آپ کے لیے دعائیں اور آرزوئیں ہوتی ہیں۔“

میں نے سکون کی سانس لی۔ ”کل رات ہی کہہ رہی تھیں۔ زندگی نے آپ۔ بہت اجنبیت اور مغایرت برتی ہے۔ کم عمری ہی سے آپ کوئی احساس لطافت اسے منتشر کر گیا۔ وہ رک گئی اور ٹھنکی سے کہنے لگی ”زری کہہ رہی تھیں، آپ کے بچر۔ بے پناہ ہیں۔“

”کیا تجربے؟“ میرے ہونٹ پھیل گئے ”تجربے۔۔۔“ شک محتاط کہہ رہی ہیں لیکن ہر بار ایک نئی حیرت۔ ایک اچھا منظر، ایک نیا تماشا، عبرت کا کوئی اور درس۔ تجربوں کا مجموعی اختتام نہیں ہوتا۔ کسی کو کم، کسی کو زیادہ، تجربے اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ نت نئے تجربے، ایک دوسرے ضد۔ زندگی بہت پیچیدہ اور گونا گوں ہے اور اسی نسبت۔ تجربے بھی۔“ میرے لہجے میں ہندی اٹھتی ”جانبے دیجئے! ذکر کرو۔“

اس کے مخروطی لب کچھ کہنے کے لیے دھڑک رہے تھے لیکن کوئی احتیاط مانع نہ تھی۔ اس نے موضوع بدل دیا مناسب سمجھا اور آہستگی سے بولی ”زری سے کہا ہے کہ وہ کھوتے۔ کچھ کتابیں منگوائیں تو پورا اچھا ہو۔ ہماری نادر کتابیں تو بڑے بڑے گھنٹے۔ زری کے لیے کئی جگہ سے کتابیں آتی ہیں۔ مطالعہ

داخل میں وہی کرتی ہیں، خوب جم کے انہیں انگریزی بھی بت آتی ہے۔ حیرت ہے، اتنے بڑے گھر کی دیکھ بھال، ہر کسی کا خیال رکھنے کے بعد وہ مطالعے کے لیے وقت نکال لیتی ہیں۔“ اس کی کیا کہنے، خدا نے اسے کسی اور مٹی سے بنایا ہے۔“

”یقیناً، ان کے ہاں تو کوئی سمندر ہے۔ وہ تو۔۔۔ ان کے اوصاف کے بیان و شمار کے لیے نہ لفظ وضع ہوئے ہیں نہ رد۔ یوں تو یہاں سبھی ایک دوسرے کا رقبہ ہیں لیکن زری۔۔۔ ری تو ایک مثال ہیں۔ وہ تو پریوں کی کسی کہانی کا کردار ہیں۔ لاپرواہ اور رسالوں میں بھی ایسے کردار نہیں ملتے، لہجے کی شدت سچ کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ کہنے لگی ”کبھی کبھی تو نا سے ڈر لگتا ہے۔“

”کیوں؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ”ان کے تپاک، دریا دلی، نظم و ضبط، برداشت، خوش فہمی، خوش و فحاشی، ذہانت اور مطالعے کے سامنے اپنا آپا نہ کرنا لگتا ہے۔“

”ہاں! وہ ایسی ہی ہے بہت عجیب ہے وہ۔“ ”بھئی، کبھی ایسا نہیں کہتی ہے۔ اسے بہت احساس ہے،“ ”تی ہے، کسی کا اتنا خیال رکھنا بھی تو ایک بار ہے۔ سب ہم پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ میں نے زری اور خانم آپنی، کہا تھا، آپ اتنا ہمیں نہ پوچھا کیجئے، شرمندگی ہوتی ہے۔“ ”لوئی مہمان تو نہیں، اس گھر کے فرد ہیں۔“

”یہ ابتدا کی بات ہے اور آپ یہ اندیشہ دل سے نکال لیں کہ آپ پر سب ان کے لیے کسی بوجھ کا باعث ہو سکتی ہے۔ کچھ دنوں میں آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ یہ سب ان کی سرشت میں داخل ہے۔ یہاں سارے ایک رے کی خوشنودی کے بہانے ڈھونڈتے ہیں، انہیں دیکھ آتا ہے۔ جن کا دکھ سے واسطہ پڑا ہو، ایسی کو تو یہ ہنر آتا ہے۔ یوں جاننے، یہاں سب اپنے آپ کو ترک کر دینے اور دوسرے کو رعایت دینے کا کوئی تجربہ کر رہے ہیں اور جیسے اس ترک و ایثار کے ثمرات، اس سے حاصل ہونے والی المی کے اسرار و رموز ان پر کھل رہے ہیں، ان کی نامت بڑھ رہی ہے۔ سبکی گود دیکھئے، شاید اس پر گزری کسی نے آپ کو نشانی ہو۔ وہ ہمیں حیدر آباد سے واپسی سفر میں ریل کے ڈبے میں بیٹھی تھی، اتفاق سے ہم بھی اسی میں سوار ہوئے۔ یہ اتفاق نہ ہوتا تو جانے کیا ہوتا۔“ ”وہ کہاں، کس حال میں ہوتی۔ عجیب و غریب واقعات

پیش آئے تھے اس کے ساتھ۔ بڑی لمبی درودا ہے۔ ہم اتے یہاں لے آئے۔ اس حویلی میں وہ ایسی شامل ہوئی جیسے انہی درودام کا حصہ ہو، بیس پیدا ہوئی ہو، اسے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔“

”ہاں، اپنی سبکی آیا، وہ تو بہت دل کش ہیں“ وہ چپکتی آواز میں بولی ”ایسا تو ان کا دم بھرتی ہے۔ آپ سچ کہتے ہیں۔ یہ تو کوئی تصوری، طلسمی دنیا ہے۔ کبھی تو یقین نہیں آتا۔ کسی فریب کا گمان ہوتا ہے مگر یہ کیسی خیال آفریں، مثال آفریں حقیقت ہے۔“

”آپ کتابوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ آسن سول میں رہ جانے والی آپ کی نادر کتابوں کا ذخیرہ ضائع نہیں جائے گا۔ ذرا کچھ وقت گزر جائے، بھٹل بھالی کا ارادہ ایک بار پھر وہاں جانے کا معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے اور معاملات بھی وہاں جانے کا نشانے ہیں۔“

”اب وہ قصہ ختم کیجئے“ اس کی آواز پر اواسی طاری ہو گئی ”ہم یہاں بہت خوش ہیں۔ اب ہمیں کچھ اور نہیں چاہیے، وہاں جانے کے اور مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ بابا بھی چند دن پہلے ہی کہہ رہے تھے۔ ان کے سامنے لب کشائی کا یارا نہیں تھا۔ کامل لپ جائے گا اب وہاں جانے کے مکانات اور زمینوں کی رقم! اور اور کیا؟ اور چیزیں تو واپس نہیں مل جائیں گی۔ اور ہم اس دولت کا کیا کریں گے۔ یہ دولت جو ہمیں یہاں ملی ہے، کسی سے کم ہے کیا۔ وہاں کے خیال سے ہمیں ہول آتا ہے۔“

”انگریز ایک بار وہاں جانے کے اس سید محمود علی کو دیکھنے کو دل بہت مضطرب ہوتا ہے۔ اسے بہت کم سزا ملی، اس کا قلق ہے۔ میں اپنی آواز کی پیش پر قابو نہ پاسکا۔ سید محمود علی کے نام پر سینہ جھٹکے لگا تھا“ اس وقت کی بات کچھ اور تھی۔ ہمیں آپ دونوں اور نصیر آباد کی فکر تھی کہ آپ کسی طور جلد سے جلد وہاں سے دور ہو جائیں اور بہ سلامت منزل پر پہنچ جائیں لیکن سید محمود علی کا حساب ہائی ہے۔ اسے اس ورمیان وقت مل گیا ہے۔ جلد ہونے پھیل بھائی نے اسے آگاہ کیا تھا کہ ہم جلد ہی واپس آئیں گے۔ اسے بھی کسی وقت ہماری اچانک آمد کا دھڑکا لگا ہوگا۔ یا تو اسے آسن سول سے ہجرت کر جانی چاہیے یا اس نے اس عرصے میں اپنے ارد گرد حصار اور مضبوط کر لیا ہوگا۔ وہ جہاں بھی ہوگا، ہم بہر حال اسے ڈھونڈ لیں گے۔“

”اب خاک بھی ڈالے ان پر، رفت گزشت“ وہ سرا سہ لہجے میں بولی۔ اس میں اتنا بھی شامل تھی ”اتنا ہی

ہمت ہے کہ ہمیں وہاں سے رہائی مل گئی۔ آپ کو آگے سفر و پیش ہے بہتر ہوگا، پہلے آپ اپنے کام کو اولیت دیجئے بعد کو کسی مناسب وقت اس طرف جانے کا قصد کیجئے۔

”ہاں“ ابھی اتنی جلد مکمل بھی نہیں ہوئی تھی آپ سے سچ کہوں، جی جانتا ہے کہ پہلی فرصت میں وہاں پہنچوں۔ بسل بھائی! جی جانتا ہے سوچتے ہوں گے۔ انہوں نے یہاں اپنے دیکل سے آپ کے معاملے پر ضروریات کی ہوگی، مجھے اس بابت ویسے کچھ علم نہیں ہے، صرف اندازے سے کہہ رہا ہوں۔ ظفر میاں کو بھی یہاں آنے دیجئے۔ انہیں بھی ساتھ رکھیں گے۔ مجھے تو یہ نہیں معلوم کہ ظفر میاں سے بسل بھائی یا نصیر بابا کی کیا بات ہوئی ہے۔ میں ان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ میرے خیال میں انہیں اب تک یہاں آ جانا چاہیے۔ شاید بسل بھائی نے ان دونوں یہاں کی دیگرگوں صورت حال دیکھ کے انہیں بلانے میں تامل کیا ہو۔ آپ اطمینان رکھیں، وہ آجائیں گے۔ میں نے سرائی کے ظفر کے ذکر سے اس کے رخساروں پر آنے جاتے رنگ دیکھنے چاہے لیکن اس کے چہرے پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ہم ہم بھیجی رہی۔ ”ظفر میاں نے بڑی اذیتیں جھیلی ہیں“ میں نے کہا ”انہیں دیکھئے، ان سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ کاش وہ ہماری موجودگی میں یہاں آجائیں۔ بڑی تعریفیں سنی ہیں ان کی۔ نصیر بابا تیار ہے تھے کہ علم کا شوق ہی انہیں آپ کے والد محترم کے دروازے پر لے گیا تھا۔“

وہ سر جھکائے دوڑنے کی تیل کر دیتی رہی۔
”ان کے آنے کے بعد یہ خلیش بھی دور ہو جائے گی کہ وہ آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔“

”ہم یہاں ہر طرح مطمئن ہیں“ اس نے بے جلت کہا۔
”لیکن ابھی ایک حصہ تو باقی ہے۔ ظفر میاں کے آجانے پر گویا ایک خانوادہ مکمل ہو جائے گا۔“
”لیکن ہمیں کیوں اور نہیں جانا؟“ وہ کسی حد تک ناز بردارانہ انداز میں بولی۔

”پائل، پائل، کون آپ سے کہتا ہے یہ تو آپ پر منحصر ہے۔ آپ کا اختیار ہے۔ ظفر میاں چاہیں تو وہ بھی یہیں رہیں، ہم سب کے ساتھ۔“
”وہ نہیں چاہیں گے تو۔ تو بھی“ اس نے زیریں سے کہا۔

”جی جی، جی ہاں“ میں نے مضطربانہ تائید کی۔
”ہم کہیں اور نہیں جائیں گے“ وہ چل کے بولی۔
خوش اندام، خوش کلام اور خوش اطوار لوگوں کی صحبت

بھی کسی سیرگاہ کی طرح ہوتی ہے۔ اس کے دو بے رودقت احساس ہی نہیں رہا۔ اندھا جتنا گمراہ ہوتا جاتا ہے، وہ بھی اتنی گمراہ ہو جاتی ہے۔ کئی اطراف جلتی روشنیوں۔ لائبریری جگ مگرا رہی تھی۔ ان روشنیوں میں اس کے کانوں میں جھونکنے آویروں کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھجھکے جھجھکے رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ شائستگی کی بھی اپنی ایک ٹھنڈکت ہو رہی تھی۔ اس کی آواز میں ترنم تھا اور ٹھنڈے اور ٹھنڈے تار تھا۔ جیسی وہ خود سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، سانچے میں وہ ہوئی اس کی گفتگو بھی تھی۔ اس طرح باتیں کرتی تھی پچھلے کوئی شہ زادی باپ قول کے خرام کرتی ہو۔ کسی بھی فار لب دلچہ اور تراکیب کی آمیزش اس کی گفتگو کا تیار اور نشتیں، اثر آفریں کر دیتی تھیں۔ حسن اور ذہانت دو آتشے مانند ہے اور کوئی جو ہر علم سے آراستہ ہو تو مستزاد ہے۔ ہر دم یہ احساس رہا کہ میں ایک مختلف، ایک منفور لڑکی۔ ہم کلام ہوں۔ میں وہاں بیٹھا تھا، میں نا رہتا کہ زینے پر کسی تیز چاؤں سے وہ بھی چونک پڑی، میں بھی منتشر ہوا۔ وہ دنیا بھی۔ جلدی جلدی سیرجھیاں چڑھنے سے اس کی سانس پھول رہی تھیں۔ ”رے آپ یہاں ہیں؟“ وہ ہانپتے ہوئے، ”سارے میں دیکھ لیا۔“

”کیوں خیریت تو ہے؟“
”بابا، آپ کو یاد کر رہے ہیں۔“
”کیا بات ہے؟“ میں نے تردد سے پوچھا۔
”کوئی مہمان ان کے پاس آئے ہیں۔“
”کون مہمان؟“

”مجھے نہیں معلوم،“ وہ سادگی سے بولی۔
”استاد سلامتی؟“ وہ وہیں یا کوئی اور؟ لیکن یہاں کو معلوم ہو سکتا تھا، مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے فردزاں طرف دیکھا۔ وہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے رابطی سے معذرت کی اور سیرجھیاں ملے کر کے نیچے آگیا۔
”جینک میں کوئی اور نہیں،“ استاد سلامتی تھا۔ میرے سے جیسے کوئی بوجہ اتر گیا، ”کہہ رہی تھی گویا تھارے؟“ جینک نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

”کیوں؟“ میں نے تھارے لائبریری کی طرف ”میرا بوجہ غم ارادی طور پر پٹا تھا۔“
”ادھر ہی سلامتی کب سے تیرے لیے بڑک رہا ہے؟“
بار بار کہتی مارتا تھا، یہ اپنا لاڈلا راجا۔“
”جینک کی بات استاد سلامتی نے مکمل نہیں ہونے دی، جینک نے آواز میں بولا، ”ہاں لاڈلے استاد! اپنے کو بے گلی تھی

تم ایک دم۔ ایک دم سے۔“ سلامتی نے بے تابانہ اٹھ کر کھینچ لگایا اور دوپٹے لگا۔

رات کا کھانا ہم تینوں نے جینک میں کھایا۔ کھانے کے بعد سلامتی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ بٹھل اور اس کے روئے سے مجھے اپنی بدگلی پر زحمت ہوئی رہی۔ میرا داغ ایسے ہی الے سیدھے جانے بنا رہتا ہے۔ استاد سلامتی کی خاطر واری کے لیے باہر جانے کی کسی کو متوجہ کرنے کی ہدایت پر میرا داغ کیوں بھٹکتا بھٹکتا لگا تھا۔ گھر کے اندر میں ہی جا سکتا تھا یا بٹھل۔ میں نے کیوں سمجھا کہ میری موجودگی بٹھل اور استاد سلامتی کے مابین حارج ہو رہی ہے۔ بٹھل تو یوں بھی مجھے ٹھاسکتا تھا۔ اس عذر کے مختلف کی اسے ضرورت نہیں تھی۔ اسے بھی کچھ میری بدگلی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے مراحت نہیں کی اور اچھا ہی کیا۔ مجھے اور شرمندگی ہوئی۔ بری بد وضعی کی اسے عادت ہو جانی چاہیے۔ میں نے بھی اموشی مناسب سمجھی۔ زحمت کا سب سے موثر اظہار اموشی ہے۔ کھانے کے بعد میں جینک سے جلدی اٹھ گیا رکرے میں آ کے بستر پر اپنے آپ کو نوچتا رہا۔



ہمیں کو تو تالی میں حاضری دیے ساتواں دن تھا۔ رات کا مانا کھانے تقریباً بھی جینک میں بیٹھے تھے۔ حقے کے سکتے نے خیریت کی خوشبو ہر طرف مکی ہوئی تھی کہ مہمان تیار ہوا اندر آیا۔ مہمان کو سب کے سامنے زبان کھولنا دشوار رہا تھا۔ بٹھل خود ہی اٹھ گیا۔ میں نے بھی اس کی پیروی کی۔ جینک سے باہر آنے پر مہمانے بو کھائی آواز میں بتایا کہ تیرے پر پولیس موجود ہے۔

”بٹھل نے آنکھیں میچ لیں اور مہمان کی کمر تھکتے ہوئے بولے، ”آتے ہیں۔ ادھر ہی بیٹھے کو موڑنا دھڑکی لگا دو۔“
میرا وجود ایک لمحے کے لیے سلاطین ہوا تھا لیکن میں نے کو سنبھال لیا۔ پولیس کی آمد تو کسی وقت بھی ممکن تھی۔ زالی سے آنے کے بعد کسی بھی لمحے، مجھے تو جیسے ان کا مار تھا۔

جینک میں داپس آ کے بٹھل نے بان کا بیڑا کھایا، حقے چند کش لیے، بیڑی کا بیڈل جب میں رٹھا اور دھڑکی آواز زریں کو مخاطب کیا ”اپنے کو جانا ہے ابھی،“ لوٹنے میں ابھی لگ سکتی ہے۔ رات بھی لگ جائے، ہم لوگ آرام۔“
”جینک میں سکوت چھا گیا۔
”بٹھل نے پیچھے مڑنے نہیں دیکھا۔ ہم دونوں ڈیوڑھی

بار کر کے چوتھے پر آئے تو کسی سپاہی ادھر ادھر منڈلاتے دکھائی دیے۔ مہمان اور اس کا بیٹھیا اندر سے کرسیاں لالاکے رکھ رہے تھے۔ چوتھے کے نیچے گلی میں اتنی روشنی نہیں تھی لیکن آٹھوں کی عثمانی روشنیوں میں پولیس کا دست وہاں بھی مستند کھڑا نظر آ رہا تھا۔ چوتھے پر موجود سپاہیوں کے درمیان پولیس افسر ہی تھا جو کڑھتہ مرتبہ ہمیں خوشی سے کو تو تالی لے گیا تھا اور اس نے پانچ افسروں پر مشتمل جماعت کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے ہمیں احتیاط کی تلقین کی تھی۔ ہمیں سامنے دیکھ کے اس کا جسم اکڑ گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بٹھل اور مجھ پر جم گئی تھیں جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو یا پچانے کی کوشش کر رہا ہو ”کیا ہے سہارا ج! کوئی پنا دیکھ لیا پھر راستہ بھول گئے؟“ بٹھل نے انھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

پولیس افسر نے ہونٹ بھیجنے لیے اس کے کندھے تک گئے ”ٹھیک ہے استاد!“ اس نے منہ بنا کے کہا ”تم کو دیکھنا تھا۔“

”مورنی بڑا کے بھوادیں ادھر ہی۔“ بٹھل تنک کے بولا۔

پولیس افسر کی توری پر پل بڑھ گئے اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خشکیں نظروں سے بٹھل کی صورت دیکھ لیا۔ ”اتنا کشت کیوں کیا مانی باپ! بوری سینا کے ساتھ آئے ہو۔“ بٹھل کا لہجہ بدلا ہوا تھا، ”کتنے لگا، آپ کی بات کو کچھ نہ دیتے۔ سر کے بل آ جاتے ورش کو۔“

”زیادہ بات نہیں استاد!“ پولیس افسر نے چڑچڑے پن سے کہا ”ٹھیک ہے، اب جا کے آرام کرو۔“

”ایسا کیا صاحب!“ بٹھل نے حیرانی کا اظہار کیا ”کچھ اٹا ہو گیا کیا؟“

”بس بس، ٹھیک ہے، تم کو بولانا، اندر جاؤ اور لمبی کھینچو۔ ہم کو دیکھنا تھا، تم یہیں رہو کہ نہیں۔“

”صاحب، ہمارے گوبول کے چلے تھے، پندرہ بیس روز تک ادھر ہی رہیں گے، کہہ رہی تھیں گی تو پر نام کر کے، گلے پچھلے سارے معاف کر کے۔“

”دیکھو استاد!“ پولیس افسر مصنوعی حاکم سے بولا ”تمہاری بھلائی کے واسطے بولتے ہیں۔ ابھی احتیاط کرو، بہت خراب حالت ہے۔ اڑے کے آؤ میں کو بھی قہام کے رکھو۔ پوری حکومت یہاں سے وہاں تک چلی ہوئی ہے۔ گورے ریڈیٹ نے لکھنؤ پولیس کی گردن دلوچ رکھی ہے۔ اب تک مجرم گرفتار کیوں نہیں ہوئے؟ پولیس کیا کر رہی ہے؟

آواز پر اس کی ہمت استوار ہوئی۔ ”ارے یا سمن، تو آؤ“
ادھر تو میرے پاس ”میں نے اشتیاق سے کہا ”دیکھو اس
نیسان کی بجی، تمہاری ہم زاد نے میرا حال کر دیا ہے۔“
بستر کے نزدیک آگے وہ متذبذب سی، کھٹی سکڑی کھڑی
رہی۔ میں نے اسے پاس آنے کو کہا۔ وہ قریب آئی تو میں نے
اس کا ہاتھ پکڑ کے بستر پر اپنے سامنے بٹھایا، وہ بہت معصوم
اور دلکش لگ رہی تھی۔ نیسان اور اس کی عمر میں انیس ہیں
ہی کا فرق ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے کا سایہ بن چکی تھیں۔
”دیکھا، نیند نہیں آ رہی نا“ نیسان لگتی آواز میں بولی
”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا، راتھ چلو، بابر بھائی تمہیں دیکھ کے
خوش ہوں گے۔“

”کیوں؟“ میں نے بنادنی حیرانی سے وضاحت چاہی۔
”یا سمن یہاں آنا نہیں چاہتی تھی کیا؟“
”نہیں بابر بھائی! یہ تو آپ کا دم بھرتی ہے، آنے کے
لیے بے کل بھی تھی اور بھجک بھی رہی تھی۔ کتنی تھی اس
وقت انہیں زحمت ہوئی۔“

”کیسی زحمت!“ میں نے شکایتی لہجے میں کہا اور یا سمن کا
ہاتھ اٹھا کے اسے بوسہ دیا ”جیسے نیسان“ دیکھے تم۔ تم جب
چاہو، بے روک نوک آسکتی ہو اور ایسے آؤ گی توچ، مجھے بڑی
خوشی ہوگی“ اس کا ہاتھ میں نے سینے سے لگا لے رکھا۔ اس
لہجے اس کی لیے میرا دل بہت اٹھا اور میری سمجھ میں نہیں
آیا، میں اس سے اپنی شینگلی کا اظہار کس طرح کروں۔
نیسان نے ماتش کی زنجیر سے مجھے باندھ رکھا تھا۔ مجھے احساس
تھا کہ یا سمن کا رہا سا افتاح اس کی بچی کچی انجینیت دور
کرنے کے لیے مجھے بہت شفقت، بہت محبت اور بہت گداز
کا تاثر دیتے رہتا چاہیے۔ وہ دن کی بار آنا سامنا ہوتا تھا
اور ہر بار میری کوشش رہتی تھی کہ بیٹے ہوئے دن وہ جتنی
جلد ہو سکے، بھول جائے۔ آج اگر بہتر نہ ہو تو گزرا ہوا کل
سمانے لگتا ہے، چاہے کتنا ہی کرب ناک رہا ہو۔ آج اگر بہتر
ہو تو گزرے ہوئے کل کی طرف کوئی پلٹ کے نہیں دیکھتا۔
آج کی شام کی گزرے ہوئے کل کی ہولناکی سے سوا ہو جاتی
ہے، جب بھی وہ میرے سامنے آتی تھی، میری نظروں میں وہ
منظر گھوم جاتا تھا جب آسن سول میں سید محمود علی کے مسمان
خانے میں میں چلی بار نصیر بابا کے ساتھ جھپٹی چھاتی کسی وحشت
زدہ ہرنی کی طرح ہم دو انجینیوں کے پاس آئی تھی۔ اس کا
سرا لہرز رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرے پر
بے یقینی، ناامیدی کی دیرانی چھائی ہوئی تھی۔ نصیر بابا کی زبانی
اس کی روداد سن کے ہی میرا سینہ بہت جلا تھا۔ اس رات

اسے سامنے دیکھ کے تو میں گنگ ہو گیا تھا۔ اس کا وہ چہرہ
گلاب ابھی کھلا نہیں کہ مر چکا تھا، اس کا وہ خزاں زدہ چہرہ
آنکھوں میں نقش تھا۔ یہاں آگے اسے دونوں میں اس کا
رنگ روپ ہی بدل گیا تھا۔ اس کے عارض چمک رہے تھے،
پہلے سے بڑی معلوم ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ بہت دلی شکر
ہوتے ہیں لیکن سب کے لیے دل ایسا نہیں کھینچتا۔ کچھ لوگوں
میں جانے کیا خوبی ہوتی ہے کہ بے اختیار ان سے رابطہ خاطر کو
جی چلتا ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ نیسان کی طرح چمک کرے،
نیسان کی طرح وہ میرے بازو میں بھول جائے اور مجھ سے
شکاہتیں کرے، ناز کرے، یا سمن سے باتیں کرنے کی ایک ہی
صورت تھی۔ میں نے نیسان سے منت کی کہ اب وہ اپنا یہ
شغل سرفروازی ترک کرے۔ آخر وہ ماں گئی۔ اس نے میرے
روغن زدہ بال بگردن اور پیشانی کو تکیہ سے رگڑ رگڑ کے خشک
شوئی کی بالوں میں کھنکھی کی۔ غسل خانے جا کے صابن سے
ہاتھ دھوئے اور واپس آگے میرے پہلو میں دیک کے بیٹھ گئی
اور رات گزرتی رہی۔ جتنی دلچسپ باتیں، لطیف، فنی، فزیاں،
امی، گھر اور اسکول کے زمانے کے قصے ذہن میں محفوظ تھے،
میں انہیں سناتا رہا۔ میرے پاس خوش گوار یادوں کا ذخیرہ تھا
ہی کتنا۔ جتنی شوخی اور گفتگنی مجھے آتی تھی، میں نے ان پر
تمام کی۔ وہ مسکراتی، مکمل کھلاتی رہیں۔ وقت چپکے سے
گزر گیا۔ کچھ یاد نہیں رہا کہ رات کو توانی سے پولیس شرمیں
ہماری موجودگی کی تصدیق کے لیے حویلی آئی تھی اور کل کا
کچھ اعتبار نہیں ہے، کب وہ پھر آن دھمکیں۔ ہم اپنے گھر
میں ہیں، پرکے پرندے کی طرح۔ اسے خبر ہے کہ قید سے
آزاد کروا جاتا ہے۔ ہم اپنے گھر میں ہیں اور گھر کو چاروں
طرف سے پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ کوئی عاقبت اٹھ سکی یا کسی
کی عائد کردہ پابندی، گھر اور زنداں میں بھر گیا فرق ہے۔ یہ
کیسی رہائی، کیسی امیری ہے۔

کوئی تین بجے کے قریب نیسان کو ہوش آیا۔ اس کے
نوکٹے پر یا سمن بھی بیدار ہوئی بستر سے اٹھ کر وہ منع
کر رہی تھی لیکن ان کا اکیلے جانا مناسب نہیں لگتا تھا۔
انہیں طویل راہ داری سے گزرنی تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ
باہر نکلا۔ اسے کمرے میں جاتے جاتے وہ پلٹ کے بے ہوش
مجھ سے چٹ ہمیں۔ جانے کیوں میری آنکھیں ملنے لگیں۔
میں نے ان کے سروں پر ہاتھ رکھا، پیشانیوں پر چھیں اور ان
کے شانے تھپ تھپا ناٹوٹ آیا۔ وہ چلی گئی تھیں لیکن وہ
تک وہ میرے ساتھ رہیں۔ پھر کسی وقت آنکھ لگی تھی اور نیند
ٹوٹی تو کمرے میں ہر سو وحشی پھیلی ہوئی تھی۔ دیواری گھڑی

پہلیں جک مار رہی ہے۔ پولیس افسر نے پولیس کو غلط گالی
مار لی، جتنی آواز میں بولا ”پولیس کے پاس جادوئی ڈنڈا
نہیں تھا اور مجرم حاضر۔ سالے اوپر بیٹھے حکم پر حکم
دار ہیں۔ تم کو کیا پولیس۔ آٹھ دن ہو رہے ہیں۔ ٹھیک
کے کرکانے کو نہیں ملی سمجھو، ۲۴ گھنٹے کی بیکار جھنجھٹی پردہ سی
ہے ان لوگوں نے جادو کر سمجھ کے دروا صاحب کو بھیجا تھا۔
بائی ہی ہمت کا رہ جائے گا۔ دوسرا چیلے بھی نتھی کیے
غیر وہ بھی اب ڈھے ڈھے سے نظر آتے ہیں۔ کتنے پڑے“
پوڑیے۔ کتنے ابھی حالات میں سڑ رہے ہیں۔ سارے
میں پولیس کتوں کی طرح مجرم سو گھنٹی پھر رہی ہے۔“
پہلیں افسر نے تہ تیغ سے کرسیاں رکھ دی تھیں۔ بھٹل نے
آئے ہوئے تو ذرا جل جان کر کے جاؤ۔“

”نہیں استاد! اب چلتے ہیں، جا کے رپورٹ کرنی ہے،“
پہلیں افسر کا منہ ابھی تک چڑھا ہوا تھا۔ ”تم کو پولیس دیں، تم
مانے نہیں آتے تو ہمارے پاس حویلی کی تلاش کی حکم تھا۔“
”پتہ نہ معلوم ہے، آپ تین لوٹ پلٹ کر سکتے ہو۔ اپنی
گھر جی اڈے نے اب رکھی ہے، اڈے کی گانچہ نہیں پڑی
ہی قیامت اور ہوئی ان دا نا!“ بھٹل نے پوچھل آواز میں
کہا۔

پولیس افسر کے سانولے چہرے پر آگ بھڑکی تھی لیکن
اس نے مشتاقانہ لہجہ اختیار کیا ”ہاں، ابھی بھیجی ہی کے رکھو
تاد، تم کو جانے دیا ہے۔ درما نہیں ہوتا تو ایسے دھلے
ٹلاے نہیں آجاتے، پروا ہو یا دوسرے۔ صاف بول دیں،“
ابراہن کا دھیان جانا تمہاری ہی طرف ہے۔“

”ٹھیک ہے صاحب!“ بھٹل نے گھری سانس بھری اور
مرار کیا ”بیٹھو صاحب! گھر آگے ایسے جانا اپنے کو۔“
”نہیں استاد!“ پولیس افسر نے بھٹل کا شانہ پکڑ کے
نہرو کی سے کہا ”پھر دیکھیں گے۔ ذرا یہ آنکھ بھونکی، کیسے سمجھ
لایا جا کا اتارنے دو۔ آئیں گے ضرور، ہم کو تو ادھر ہی
بنا ہے۔“

جب تک وہ آجوں میں بیٹھ نہیں گئے، ہم چہوڑے پر
گئے انہیں جانا دیکھتے رہے۔
ان کی آمد اور روانگی میں چند ہی منٹ صرف ہوئے
تھے۔ ہم بیٹھک میں واپس بیٹھے تو نیسان اور یا سمن کے
دو کو موجود نہیں تھا۔ ہمیں دیکھ کے ان کے چہروں پر جیسے
دشمنی پھوٹنے لگی۔ دونوں ادھر ادھر بکھری ہوئی خشک میوے

کی تشنیاں اور قبوے کی بالیاں سمیٹ رہی تھیں۔ بھٹل
نے اپنی جگہ بیٹھ کے چلم کی راہ کریدی اور پوچھنے لگی
مار مار کے سوئی ہوئی آگ بیدار کی۔ نیسان نے گوتازہ حقہ
بھر کے لانے کے لیے کہا لیکن حقہ کے رموز سے بھٹل خوب
واقف تھا۔ دو چار کتوں کی جھٹ کے بعد نے سے دھواں
افراط سے آنے لگا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمباکو میں
ابھی جلنے کی سکت ہے۔ دھوئیں کا بھی ذائقہ ہوتا ہے۔ میں
نے پہلے کبھی ایک دو غش لے کے دیکھے تھے، میرا تو سر گھونٹنے
لگا۔ حلق میں دھواں جیسے انک گیا ہو۔ بھٹل نے فرمائش
نہیں کی تھی۔ نیسان بھگم بھگ کہیں سے تیل کی شیشی لے
آئی۔ شاید بھٹل کو بھی کچھ سکون یا توجہ منشر ہونے کی
ضرورت تھی۔ نیسان کا ارادہ بھاپ کے اس نے سردال
دی۔ آنکھیں موندے حقہ گزرتا آ رہا۔ نیسان حویلی کے
کینوں کی دل جوئی کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔ ہر دم کوئی
خدمت بجالانے کے لیے مستعد۔ اشارے کی بجائے اور
اشارے پر قہقہے کے لیے کھل۔ ماتش کی تودہ ماہر تھی۔ ایسی
پھوکی پھوکی انگلیوں سے سردبانی اور بالوں میں تیل پیوست
کرتی تھی کہ ایک سرور سا رنگ دے میں اترنے لگتا تھا۔
بھٹل کے عقب میں کھڑی نیسان نے مسکراتے ہوئے
آنکھوں آنکھوں میں مجھے اشارہ کیا کہ بھٹل کے بعد میری
باری ہے۔ ادھر یا سمن نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے
گاؤنکے ترتیب سے رکھنے اور فرش وغیرہ کی دسٹی کا کام اپنے
ذمے لے لیا تھا۔ کچھ دیر تو میں چپ چاپ بیٹھا انہیں دیکھتا
رہا پھر دبے قدموں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دیگر ضرورتوں
کے علاوہ ہر آدمی کو کسی خلوت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ
گھر اور کمرے میں گوشہ نہ ہوتے تو آدمی کو خود سے نمٹنا کیا
دشوار ہوتا ہے۔ کتنے ہیں، آدمی گروہ بند غول پسند مخلوق ہے
لیکن تنہائی کی بھی اس شدت سے طلب ہوتی ہے۔

رات اتنی گھری نہیں ہوئی تھی۔ بستر پر جسم پھیلا کے
میں نے بھی بھٹل کے مانند آنکھیں بند کر لیں مگر کھلی آنکھوں
میں سامنے کے منظر کی ایک حقیقت یادوار جا مل رہی تھی۔
بند آنکھوں میں گزرا ہوا منظر اور اجاگر ہو جاتا ہے۔ گزرا ہوا
منظر آنکھوں میں کھبا ہوا تھا۔ پولیس افسر نہیں دیکھنے آیا تھا۔
وہ ہمیں ساتھ بھی لے جاسکتا تھا، پھر سب کچھ بدلا ہوا ہوتا،
حالات کا بوسیدہ کرا، سلاخیں، مردہ روشنائیاں، شکستہ شیشیں
اور پھرے داروں کی دھمکتی چابیں، ان کی گھڑکیاں، دھمکیاں
اور جانے کیا کیا۔ ماما کے بیٹے کے بے قول شرمیں طرح طرح
کی انوائس گردش کر رہی تھیں۔ ہماری روپوشی کی افواہ ہی

نے پولیس کو اس وقت حویلی پر پینار کرنے کے لیے مجبور کیا ہوگا۔ ایک بات تو واضح ہوگئی تھی اور پولیس افسر بھی کچھ باور کر رہا تھا کہ پورا ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی وہ ہماری طرف سے غافل نہیں ہوئے ہیں۔ حویلی کے گرد پولیس کی نفری ابھی تک تعینات تھی۔ شہر کے ناکوں کا ہر جانے والے راستوں پر وہ مسلسل نگرانی کر رہے تھے۔ اس حصار کے بعد انہیں ہمارے بارے میں کسی افواہ پر توجہ نہیں دینی چاہیے تھی۔ اس سے پولیس کی بدحواسی اور بے چارگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ دو دن پہلے جھل دوسری بار اڑے کی طرف گیا تھا۔ اس مرتبہ ماما کاجیبا اس کے ساتھ نہیں تھا، سو مجھے نہ معلوم ہو سکا کہ اب کے اڑے جانے والے راستوں پر اسے کتنی جگہ روکا گیا اور کیا تو تکرار ہوئی۔ سر پر کو وہ حویلی واپس آیا تھا۔

ایک ایک ایک خیال نے مجھے بستر سے اٹھا دیا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ فیض آباد سے ہمارے فرار کی شوش طرازی اڑے کے آدمیوں ہی نے کی ہو۔ ظاہر ہے، جھل کی ایما پر اس کی اجازت سے۔ جھل سے کچھ بعد نہیں تھا۔ اس طرح وہ پولیس پر اپنا اعتبار برقرار رکھنے کا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہو۔ گزشتہ سات دن میں ٹھاکر بستی کی واردات کی تفتیش سے متعلق کسی افسر سے یہ ہمارا پسلا رابطہ تھا۔ ہو سکتا ہے، اتنا وقت گزر جانے کے بعد جھل نے اپنے اطمینان اور استغنا کا اظہار ضروری سمجھا ہو۔ کسی افواہ کی ترغیب ہی پر حویلی میں پولیس کی آمد ممکن تھی۔ یہ ایک بالواسطہ دعوت تھی۔ ہماری طمانیت اور بے نیازی یقیناً پولیس کا شک متزلزل ہونے کا باعث ہو سکتی ہے۔ دوسری جانب جھل کو بھی کچھ پولیس کا رجحان اس کی فکر کی مست جاننے کی جستجو ہوئی چاہیے۔ اس اقدام میں کئی پہلو مضمر تھے۔ پولیس کو اس یقین کا اعادہ بھی جھل کا مقصد ہوگا کہ ہم اس کی دسترس سے دور نہیں ہیں۔ یہ امکان تو قطعاً نہیں ہے کہ جھل کے ذہن میں شہر سے فرار کا کوئی ارادہ پنپ رہا ہو اور یوں وہ حویلی کے گرد پولیس کا محاصرہ ختم کرنا چاہتا ہو۔ اس کے چرے پر فکر و تردد کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ کچھ لکھا ہو تو کچھ بڑھا جائے۔ آدمی لفظ بڑھ سکتا ہے، 'شانات'، 'شناخت' کر سکتا ہے۔ جھل کا چہرہ تو کورے کانڈ کی طرح تھا۔ وہ تو کوئی بت تھا، پتلا بھرتا بت۔ جس نے جو کچھ نہیں دیکھا اور جس نے جو کچھ نہیں جانا، اس کی آنکھیں کتنی ہی روشن ہوں وہ دیکھتا تو جینا کے مانند ہے اور کسی ناپائیدار کی طرح جیسے ٹوٹنا اور راتے کھوجنا ہی میرا کام تھا۔ میں تو سرے ہی ذمہ دار تھا۔

میرے اندیشے اور دوسرے اس واقعے پر انحصار کرتے تھے کہ ٹھاکر بستی کی خوں ریزی سے جھل کا کوئی واسطہ ہے کہ نہیں۔ برسر حال کچھ جھل کو بھی احساس ہوگا کہ پولیس ٹھاکر بستی کے اتنے بڑے سانحے سے یوں دستبردار نہیں ہو جائے گی۔

دروازہ کھلا ہوا اور کمرے میں خوب اجالا تھا۔ نیساں شور مچاتی، کوئی پھاندتی، چاکاں اور دھوئی، ہاں باہر بھائی، اب تیار ہو جائیے،' ناٹش والوں کی طرح تھل کی خیشی اس کے ہاتھ میں دبی اور سفید تولیہ کھلائی پر لگی ہوئی تھی۔ "ارے ارے" یہ ایک دم حملہ۔ آج چھوڑو بھی، کل دیکھیں گے،" میں نے کتراتے آواز میں کہا، "تم تھک گئی ہو گی۔"

"تھکنا کیسا؟" وہ جھپٹنے لگی، "آزمائیں۔ پوری رات کی شرٹ۔ اچھا، ٹھیک ہے جب تک آپ کو نیند نہ آجائے۔" اس نے مزید کچھ بے خبر حویلی کا متوجع نہیں دیا، مسہری کے سرہانے کے عقب میں کھڑی ہو کے اس نے تیزی اور مہارت سے ابھی طرح تولیہ میری گردن اور سینے پر پیٹھ دی۔ تھل کے قطروں کی ٹھنڈک مجھے سر میں محسوس ہوئی۔ شیشی بند کر کے پہلے وہ بھتیجیوں کی نرم نرم چٹکیوں سے ماسوں میں تھل سموتی رہی پھر اس کی موتی، رتی، انگلیار بالوں میں تیرنے، سرسراتے لگیں۔ ہاتھوں کی بھی کیا کرشمہ کاری ہوئی ہے۔ آدمی کے حواس جیسے خواص ہوتے ہیں ہاتھوں میں ہاتھ بولتے، ہاتھ سنتے، ہاتھ دیکھتے ہیں۔ نرم وخت، گرم و سرد، تلخ و شیریں، ریشم بھی، چتر بھی، ہاتھوں کی انچ ایک حیثیت ہوئی ہے۔ نیساں کے ہاتھوں کی پگ اس۔ "پاک" اس کی وارفتگی کی منظر تھی۔ آنکھوں میں غبار، چھانے لگا۔ وہ باہر انگلیوں کے پیٹنے پر ہلتی تھی۔ ہاتھ سے کپٹیاں دہاتی، پوروں کی دھمی دھمی چٹکیوں سے بھجور گرفت میں لیتی، کبھی پیشانی پر وہ ایک تازہ و توازن۔ انگلیاں تھرکاٹی، انگلیاں بجاتی تھیں، ناٹش میں انگلیوں کا درد بہت ضروری ہوتا ہے۔ وہ اس رجز سے بھی بے خوبی واقعہ تھی کہ ناٹش کے دوران میں اندازہ ہوتا ہے کہ سر میں درد چھپا ہوا تھا۔ نیساں کی انگلیاں میرے سر پر رقص کرتی تھیں اور مجھ پر ایک سرور آمیز، نشاط انگیز کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ میرا جسم نیساں کی انگلیوں کی لوری میں جھول رہا تھا، پورا ہوا تھا کہ دروازے پر ابھرتی آہٹ نے چوٹا دیا۔ نیساں نے اسے مجھ سے پہلے دیکھ لیا تھا۔ وہ یا مسن تھی نیساں کے اصرار کے باوجود دروازے پر کھڑی رہی۔ میرا

میں دس بج رہے تھے۔ اس دن جھل صبح سویرے حویلی سے نکل گیا تھا۔ اس کے سوا کون سی منزل ہوگی۔ سورج ڈوبتے وقت وہ اپنی عیاد۔ دوسرے دن ماما کے بچپنے نے مجھے بتایا کہ شہر میں خبیثات غیر مقامی پولیس واپس چلی گئی ہے۔ اب مقامی پولیس کی خاص مقامات پر گشت کر رہی ہے۔ صبح دکان میں وقت کھلے گئے ہیں لیکن شام کو جلد بند ہو جاتی ہیں۔ لوگ جلد ہی گھروں میں چلے جاتے ہیں۔ کون دن پہلے بازار کا علاقہ کھل گیا، لیکن بالا خانے سونے پڑے ہیں۔ شہر میں مسافروں کی آمد و رفت بہت کم ہے۔ باہر سے ضروری اشیاء اور دیگر سامان لانے والے تاجروں نے جگہ جگہ پولیس کی مداخلت کی وجہ سے بار بار دکانیاں لانی بند کر دی ہیں اس لیے شہر میں بعض ناپاک قوت ہو گئی ہے۔ ماما کے بچپنے کو اس کے کسی شناسا پولیس والے نے بتایا تھا کہ گوروں کے حکم پر عسکین واردات کی تفتیش کرنے والے خاص ماہروں کی ایک اور جماعت آکر بستی پہنچی گئی ہے۔ دو دن سے وہ حویلی کے خاستریں بل ایک چیز کبھ رہے ہیں لیکن شاید وہ بھی ناکام ہو جائیں۔ رات کے روز پولیس واردات کی جگہ دیر سے پہنچی تھی۔ سنا ہے اس پاس کے دیسواؤں کو لوٹ کھسوٹ کا خوب وقت مل گیا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے، پولیس نے بھی دیسواؤں سے بچنے والے سازو سامان کماں چھوڑا ہوگا۔ ٹھاکروں کی حویلی۔ قدیم اور وسیع و عریض حویلی تھی۔ بہت مال و اسباب تھا۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حملہ آوروں نے روپے پیسے، ہر اور نادر اشیاء سے سرور کار نہیں رکھا تھا۔ روز بخی پخت اور تاویلات کی جاری ہیں۔ کچھ لوگ مصر ہیں کہ لی اور نہیں، پولیس خود الجھ رہی ہے۔ مختلف شہروں اور یوں میں مقیم، مرنے والے ٹھاکروں کے دور و نزدیک کے لئے دایوں کی باہی، رجسٹر، عداوت اور حسد اس خزانے کی اصل وجہ ہے۔ ٹھاکروں کی زمینوں پر کام کرنے لے کسانوں کے ایک گروہ کے مطابق، ٹھاکروں کے ساتھ بننے والے واحد چارہ چاڑھائی ٹھاکر ہر جن کی وفا شعار بیوہ اپنی جان کا نذرانہ دے کے اپنے شوہر کی راتھی پر کیا ہوا بھجایا ہے۔ ٹھاکروں نے آبائی جائیداد میں بڑی حصے داری دجے سے اس کے شوہر کو زندہ رہنے نہیں دیا۔ اسے اپنے ہر طبی موت کا یقین نہیں تھا۔ وہ مسلسل آگ میں جل رہی تھی۔ یہ تو لوگ پہلے ہی کہتے تھے کہ سارا کچھ کشمی داس بیکار کھانہ کی روح کی پاداش ہے۔ وہ ایک نہایت پاک باز اور ہونہر لڑکی تھی۔

زلی گمر 6

اس سے اگلے دن شام کو میں تھالا بھری میں بیٹھا تھا کہ جھانکیر نے آ کے کہا، "گلو آپ کو یاد کر رہا ہے۔ کتا ہے، آپ اپنے کام سے منت جائیں تو ذرا ڈیوڑھی کی طرف آجائیں۔"

میرا دل پھر کسی کتاب میں کیسے لگ سکتا تھا۔ یقیناً ماما جیسا پھر کوئی نئی خبر لے کے آیا ہے۔ ڈیوڑھی میں وہ میرا منتظر تھا۔ اسے یقین تھا کہ پیغام ملتے ہی میں آجائوں گا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں سلام کیا، پھر زاردارانہ لہجے میں کہنے لگا، "چھوٹے صاحب سیدھا بازار سے آ رہا ہوں۔ دہلی ہوٹل کے مالک شدن میاں سے اپنی یاد اللہ ہے۔ آتے جاتے سلام دعا ہو جاتی ہے۔ میں نے خیریت پوچھی تو پاس بلا کے بولے، بر خوردار، وہ تو نقشہ ہی دوسرا بن رہا ہے، ابھی سہ پہر کے وقت تین چار وردی والے لاٹ صاحب اپنے ہاں چلے پیسے کو آتے تھے، وہ تو کچھ اور ہی راگ الاپ رہے تھے۔"

ماما کے بچپنے نے مجھے بتایا کہ ٹھاکر بستی میں واردات سے ایک دن پہلے لکھنؤ سے مینا نامی راقصہ اپنے چند سازندوں کے ساتھ محفل آرائی کے لیے آئی تھی۔ اسے حویلی کے مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ دو دن بعد اس کی محفل طے ہو گئی تھی۔ ارد گرد کے روسا اور اعلیٰ حکام مدعو کیے جا چکے تھے۔ کسی کے سان و گمان میں نہیں تھا کہ مینا، جیٹا کی بیوی بن ہے۔ جیٹا کچھ عرصے پہلے حویلی سے چند کوس کے فاصلے پر ٹھاکروں کے باغات میں واقع غنیمت گاہ میں اسیرہ چکی تھی۔ بنارس کے بازار میں ٹھاکر کل دیو نے اسے دیکھا تھا، پھر وہ روز بالا خانے جانے اور مال و زر لانے لگا۔ اس نے جیٹا کی ماں لایا کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی طور حسن و جمال میں بے پایاں، زرت بھاؤ میں بے مثل بیٹی سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوئی۔ ٹھاکر میں انکار سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ ناشاد بنارس سے واپس آیا۔ کچھ مدت اس نے جیٹا کو آخراک دن اس کے شوہر پشت نمک خواروں نے جیٹا کو اپنے آقا کی جناب میں پیش کر دیا۔ جیٹا باغات والی غنیمت گاہ میں محصور کر دیا گیا۔ آس پاس بیٹی کی تلاش میں ناکامی کے بعد لایا کی نظرس ٹھاکر خاں دیو پر پڑ گئی لیکن ٹھاکر بستی پہنچ کر اسے اپنی کم قاستی اور ٹھاکروں کی بلند آفتاب کا اندازہ ہوا۔ اس نے بہت دیا ہاں دیں، کون اس کی فریاد سنتا۔ اوپر سے نیچے تک عمال، حکام ٹھاکروں کے تابع تھے۔ وہ آہ و بکا کرتی ہوئی بنارس لوٹ گئی۔ بنارس میں ٹھاکروں کا سکہ نہیں چلتا تھا۔ کوئی کتابی عالی مرتبت ہو مگر یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ لایا

ایک ممتاز خاندان طوائف تھی۔ زندگی بھر دونوں ہاتھوں سے سمیٹا تھا اور ایسی دو بیٹیوں کی ماں تھی جن پر اہل ثروت لعل و جواہر بچھا کر دیتے تھے۔ بنارس سے اسی نے خماروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا ارادہ کیا لیکن اسے کچھ مہلت ہی نہیں ملی۔ خمار کے کارندے اس کے تعاقب میں تھے۔ ایک صبح اس سمیت سارے کین مرہہ بائے گئے۔ اور خمار بستی میں جینا کا بھی یہی انجام ہوا۔ سنا ہے وہاں بننے والی تھی۔

کھٹنوں میں قیام لینا کی بڑی بیٹی، مینا کی بڑی بہن مینا کے ساتھ سازندے بھی خمار بستی آئے تھے۔ سازندے یا کوئی اور۔ قیاس ہے اس نے باہر بھی بھتیجا بند لوگ تیار رکھے ہوں گے۔ اسی سر ہاتھ غضب نے خمار بستی کھنڈر کی ہے۔ وہ پورے اہتمام و انتظام سے آئی ہوگی۔ بعض لاشیں ایسی مسخ ہو چکی تھیں کہ انہیں پہچانا مشکل تھا۔ مینا کھٹن واپس نہیں گئی۔ وہ اور اس کے سازندے کہاں چلے گئے؟ پولیس نے مختلف شہروں کے بالائے خانوں پر چھاپے مارے، مینا کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ ابھی تک وہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ یا تو یہ قصہ ہی سرے سے غلط ہے۔ مینا بھی خماروں کے خاندان اور ملازموں کے ساتھ لپیٹ میں آگئی یا پھر وہ خود کو خاک روینے کا کوئی عزم کر کے کھٹنوں سے چلی ہوگی۔ دولت کی اس کے پاس کی نہیں ہوگی۔ دولت ہوئی چاہیے۔ آدمی کو بچانے والے، آدمی کو ختم کرنے والے بے کثرت مل جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، مینا نے بالائے خانے کی زندگی ہی ترک کر دی ہو اور دور دراز کسی شہر میں شرفناک بستی کا رخ کر لیا ہو۔ ماں اور بہن کے چلے جانے کے بعد اب اس پر گزر بھی کیسی رہی ہوگی۔ اس خون ریز واقعات کے انجام کا اسے خوب علم ہوگا اور اس نے ہر ممکن احتیاط کی ہوگی۔ آدمی کبھی اس نتیجے پر بھی پہنچتا ہے کہ کیا جینا اور کیا مرنا۔ کبھی کسی کی زندگی خود اس کی نظروں میں بہت حقیر ہو جاتی ہے۔

مما کا بیٹیا جھگو کہہ رہا تھا کہ شہر میں بھی مفتی ہیں، مرنے والوں کی جتنی تعداد پولیس نے بتائی ہے، اس سے کہیں زیادہ ہے۔

کچھ سادہ دل یہ سانحہ خماروں کے اعمال کا مال قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے، خدا کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ ہر شخص بے قدر قوتیں تخلیق کار ہوتا ہے اور کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ رائے کی اعابت و بگڑ بات ہے۔ جب کسی معقول اور مستند ذریعے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تو لوگ خود ہی جیسا تیسرا افادہ شروع کر دیتے ہیں اور فیصلے صادر کرنے لگتے ہیں، اندھیرے میں تمہیں قیاس ہی

کی جاسکتی ہیں، کوئی ایک ان میں درست بھی ہوتی ہے۔ کچھ داستانیں مجرموں نے بھی عام کی ہوں گی۔ تو بے تودا ستانوں کی بھول بھلیوں میں مجرم تک رسائی آسان نہیں رہتی۔

مما کے نتیجے سے حویلی کے باہر کا احوال سن کے میں خاموش رہا۔ میں نے اس سے نہیں کہا، ظاہر ہے پولیس نے ہر قبائل، امکان ہر جگہ کاوی کی ہوگی۔ وہ شہر میں منڈلائی خیال آفرینوں اور قیاس آرائیوں سے بھی بے بہرہ نہیں رہے ہوں گے۔ ان میں درجہ دیدہ ویر، تدبیر گرا افسر موجود ہیں۔ دروازے اس واقعے سے ہمارے تعلق کی جس نشیانی اور منطقی انداز میں توجیہ کی تھی، اسے سن کے میں ششدر رہ گیا تھا۔ دروازے مجھے بھی دگرگوں کر دیا تھا۔ جیسا کہ اس نے کہا تھا، بے شک خمار بستی کی واردات کسی نہایت منظم، باہر و مشاقت پیشہ دروں کی شدہ گری ہے۔ ان کی تعداد بھی کم نہیں ہوگی۔ انہیں خمار بستی کی طرف کوچ کرنے سے پہلے دہار سے بہ سلامت واپسی کی فکر ہوگی۔ نہ وہ ایک ساتھ دہار داخل ہوئے ہوں گے نہ ایک ساتھ واپس۔ کسی دل نگار پر وہ کسی برگشتہ بہن اور بیٹی اور کسی حاسد رشتہ دار کی آغوش انتقام شاید اتنی شدید واردات کی متحمل نہیں ہوتی۔ حالت غضب میں مینا کی مائثر ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی چوک ہو جاتا ہے۔ فریق اور فریق کے فرستادے میں فرق ہوتا ہے۔ خمار بستی میں جانے والے کسی فریق کے فرستادے ہی ہو سکتے ہیں۔ اصل فریقین کی دودھ دلی میں خون کی گردش کا عالم کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ تو خود کو قابو میں رکھنے والوں کا کام نظر آتا ہے۔ یہ کتنے پولیس اور بہ طور خاص دروازے کے ذہن رسا۔ پیوست ہو جانا چاہیے۔

گزشتہ تین چار دن سے بھٹل نے اڑے جانا معمول بنالیا تھا۔ کبھی سے پیر بھی شام کو وہ واپس آ جاتا۔ کو تو لائی ہمارے پیشی کے چند رہویں روز، دو سر پیر تھا کہ سن رسیدہ، ٹیلیس بھرتا میرے پاس آیا۔ اس وقت بھٹل گھر پر نہیں تھا۔ ممانے دھڑکی آواز میں حویلی کے اطراف پولیس۔ ہٹ جانے کا شہرہ سنایا۔ دو دن پہلے اڑے اور شہر کے بس سے مقامات سے پولیس کے دست کش ہو جانے کی خبریں اس کے نتیجے سے مل ہی چکی تھیں۔ شہر میں زندگی معمول آ رہی تھی۔ روز و شب کی ضرورتیں ایک حد تک ہی ڈھیلے دے سکتی ہیں۔ ضرورتیں بھی قرصے کی طرح ہوتی ہیں۔ بھٹل نے شروع میں منیر علی کے بھائیے اور بیٹے ارشد اور تورو کو حویلی تک محدود رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ مشورہ، حکم و وجہ رکھتا تھا، پھر چند دن بعد انہیں شہر جانے کی اجازت

باری گرا

ہدایت کے ساتھ دی گئی کہ وہ گھر واپسی میں دیر نہ لگائیں اور غیر ضروری لوگوں سے پرست رسم دروازہ موخر رکھیں۔ اب کوئی تین چار دن پہلے اپنے کام کی دیکھ بھال کے لیے انہیں زمینوں پر جانے کا اختیار بھی دے دیا گیا تھا۔ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور معاملہ قلم بھی۔ انہوں نے اپنے طور پر دور اندیشی کی۔ بیش تر وقت حویلی میں گزارا۔ اس احتیاط میں ذہن بھی شامل ہوگا، خوف ہر موقع پر بڑی نہیں ہوتا۔

یقیناً بھٹل کو حویلی کے محاصرے کے باوجود رفتہ رفتہ ہوا کا رخ اپنے حق میں بدلنے کا اندازہ ہو چلا تھا۔ بہر حال اب نوپلی سے پولیس بھائی گئی تھی۔ یہ ظاہر ہے دھند چھٹ جانے کی علامت ہے مگر حویلی شہر میں سب سے آخری مقام ہے ماسلحہ و دروی پوش دھڑا بے بیٹھے رہے۔ یہ حقیقت محل نظر ہے۔ بھٹل کو ہمد دم اس کا احساس ہوگا، ہونا چاہیے۔

بھٹل نے مجھ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی لیکن میں نے از خود شہر کا رخ نہیں کیا۔ مجھے اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا، لائی کو تابی کوئی ناوا لائی مجھ سے سرزد ہو ہی جاتی تھی اور میں ہر نکل کے کرتا بھی کیا۔ گلو سے شہر بھر کی اطلاعات مل ہی آ کر تھیں۔ دن بھر میں حویلی کے کینوں کے ساتھ رہتا۔ رات نیاں اور یا سمن کے ساتھ کچھ وقت گزار کے اپنے ال بنگلی اور خوش نو دی کا جیسے کوئی نسخہ ہاتھ لگا لیا۔ اب پھر میں ان سب میں شامل رہا۔ شام کو بیڈ سٹن، دن بھر لہن، جو پیر، کیرم، نئے نئے کھانوں کے تجربے، خوش گشیاں، مطالعہ، کبھی لاپرواہی میں، کبھی اپنے کمرے میں، رات کو رینگ کمرے میں محفل جمی رہتی۔ میں انہیں خود مدعو کرتا۔ جب میں اکیلا ہوتا تو اپنے سامنے آ جاتا تھا۔ میں اپنا مائیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا دل پھر اچھے، بکیرانے لگتا تھا۔ وہ اخبار ہوا ان دن تھا۔ صبح ناشتے کے بعد بھٹل نے مجھے تھ چلنے کا اشارہ کیا۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے منہل نہیں چاہی مگر چپ رہا۔ کسی جواب سے حاصل بھی کیا تھا۔

اب بہر صورت تعمیل واجب تھی۔ کچھ بے صاف ستھرے لہ۔ منہل نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ باہر آنا ہمارا فر تھا۔ اتنے دنوں بعد باہر آ کے گلیوں اور بازاروں سے نارتے ہوئے انبیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ گیارہ بج بے ہوں گے۔ دھوپ ہر سو قابض ہو چکی تھی۔ گلو ٹھک ہی رہا تھا، سارا کچھ بحال ہونے کے باوجود شہر ٹھہرا ٹھہرا، اٹکا سا نظر آ رہا تھا۔ راستے میں کئی جگہ لوگوں نے چونک کر ہماری طرف انگلیاں اٹھائیں۔ لگتا تھا، اتنے دنوں میں لوگ بھٹل کو پہچان گئے ہیں۔ چوک میں اڑے کے

لی گرا

آدی گشت پر تھے۔ ہمیں دیکھ کے پھڑکنے لگے۔ وہ اس کے تیور شناس تھے کسی کو قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جس کڑو سے اڑے کی طرف راستہ جاتا تھا، ٹانگا وہاں سے آگے گزر گیا تو مجھے ٹھن ہونے لگی اور جلدی دور ہو گئی۔

کو تو لائی کی عمارت کے سامنے آنا رک گیا۔ عمارت میں سپاہیوں کی ایک بڑی نفری اور دھوا دھرم بکھری ہوئی تھی اور پہلے جیسی چمک چمک نہیں تھی۔ ان میں کئی ہمارے صورت آشنا تھے۔ ہمیں یوں عمارت کی طرف بڑھتا دیکھ کے وہ گڑبڑا سے لگے اور دو سپاہیوں نے تیزی سے عین ہمارے مقابل آگے، روکھی آواز میں ہماری آمد کا مقصد جانا چاہا۔ دروازے کا نام سن کے ان کے جسم تن گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مضطرب نظروں سے دیکھا۔ انہیں متذبذب چھوڑ کے ہم عمارت میں داخل ہو گئے۔ دونوں سپاہی لوگوں کے تامل کے بعد ہمارے پیچھے لپک پڑے اور انہوں نے ہمیں ٹھہر جانے کا حکم دیا۔ ایک سپاہی راہ داری میں آگے چلا گیا۔ وہ فوراً ہی لوٹ آیا اور ایک کشادہ اور صاف کمرے میں ہمیں لے گیا۔ وہ کوئی نیا پولیس افسر تھا۔ پشیمت سے چائیں کے درمیان عمر رنگ سرسبز قد مناسب، الٹی مانگ نکالے ہوئے، کڑک و روی پنے ہوئے تھا۔ رسمی سلام کے بعد بھٹل نے نرمی سے کہا، "اپنے کو بڑے صاحب دور مانی سے ملنا ہے۔"

"کیا کام ہے؟" پولیس افسر نے ناگواری سے پوچھا۔

"اسی کو ملنا ہے صاحب!"

"کس واسطے؟" پولیس افسر کے لیے میں درشتی چکی۔

"ان کو معلوم ہے، استاد بھٹل بولو گے تو پورا سمجھ جائیں گے۔"

"اوہ، استاد بھٹل!" پولیس افسر کرسی پر چل سا گیا۔

اس کی مجلس نگاہیں بھٹل کے چہرے پر الٹ گئیں "بہت نام سنا ہے تمہارا۔"

"دھری آپ نے سنے آئے ہو؟"

"ہاں، تین چار دن ہی ہوئے لیکن بار بار تمہارا نام سنا ہے۔" پولیس افسر کے لیے میں نظر نمایاں تھا پھر تخت سے بولا، "کیوں ملنا چاہتے ہو بڑے صاحب سے؟ وہ اس وقت میٹنگ میں ہیں۔"

"اپنے پاس ٹائم ہے۔"

"تم کو بولو کیا بات ہے؟"

"تھوڑی سی ان کی بات ہے" بھٹل نے سرسری انداز میں کہا، "آپ جان کے کیا کرو گے؟"

پولیس افسر کی آنکھوں میں خشونت اتر آئی، چہرے پر

کتابیات پبلی کیشنز

کتابیات پبلی کیشنز

کتابیات پبلی کیشنز

خریداری میں تمام کر ڈالے۔ ایک ہالی مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کا دائرہ درمیانے درجے کا تھا اور ٹیکے بڑے ہوئے تھے۔ سارے پاس تین چار جوڑیاں ہی تھیں۔ میرے اصرار پر وہ شش و پنج میں پڑ گیا اور اس نے کسی اور جگہ جانے نہیں دیا۔ کچھ مہلت طلب کی اور جانے کہاں سے بھاگ دوڑ کر کے وہ اور اس کے ملازم کم و بیش اسی طرز کی بالیاں مطلوبہ تعداد میں اکٹھی کر لائے۔ اتنی دیر میں میں نے کچھ اور کپڑے خریدے۔ کپڑوں میں یکساں ضروری نہیں تھی۔ مجھے انتخاب کا سلیقہ آتا تھا نہ خریداری کا ایسا تجربہ تھا۔ بس جو کپڑا سب سے زیادہ مزگا دیکھنے میں خوش نما اور چھونے میں نرم و لطیف لگا، میں الگ کرتا رہا۔ واپس میں اچھا خاصا گھر بن گیا۔ ہم لدے پھندے گھر لوٹے۔ بٹھل اڑے پر گیا ہوا تھا۔ دوسرے کھانے کے بعد میرے اشارے پر نصیر بابا نے خانم کی خدمت میں گھڑی پیش کر دی۔ ان کے چروں کی تابانی دیکھنے کے لائق تھی۔ گو میں نے دکان دار سے کہہ دیا تھا کہ کوئی چیز پسند نہ آنے کی صورت میں واپس کر دی جائے گی۔ شکر ہے تبھی کے چرے کھلے ہوئے تھے۔ ارشد خور، جو میاں اور جہانگیر کے لیے انگریزی سوٹ اور شروانی کا کپڑا میں نے الگ خریدا تھا۔ نصیر بابا، "مما" اس کے جینے گلو اور دیگر ملازمین کا بھی خیال رکھا تھا۔ بالیاں لینے وقت گنتی میں کچھ چوک ہو گئی۔ ایک بالی بچ گئی۔ میں نے اسے خانم کے سپرد کر دیا۔

تختہ کتابتی قیتی یا بے حیثیت ہو، اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ رات کو کھانے کے بعد میں نے دیکھا۔ بٹھل بھی حیران ہوا۔ سب نے وہی بالیاں پسلی ہوئی تھیں اور بالیاں ان پر خوب ج رہی تھیں۔ روشنی میں بالیوں کے رنگ برنگے ٹیکے دکھ رہے تھے۔ ان سب کی آنکھیں بھی دکھ رہی تھیں اور یہ روشنی جیسے میرے سینے میں اتر رہی تھی۔ چار دن گزر گئے۔ بٹھل نے روانگی کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ وہ دروازے جا رہا تھا۔ جانے اب کیا رکاوٹ تھی۔ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔ ماما کے جینے گلو نے بھی ان دنوں شہر سے متعلق کوئی خاص بات نہیں بتائی تھی، بس یہی کہ شہر بتر تریج اپنے پرانے روز و شب کی طرف واپس آ رہا ہے، پولیس کا گفت جاری ہے لیکن پولیس اب دوڑ دوڑ رہی رہی ہے۔ ہاں، گلو سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ٹھاکر بستی کا ملہ کرینے، کھرینے، وادوات کی رات بچ جانے اور حویلی میں موجود نہ رہنے والے ٹھاکروں کے اہل کار اور عام کسانوں سے فقیٹش پر پولیس نے ساری توجہ مرکوز کی ہوئی ہے۔ ابھی

تک باہر سے افسران کی آمدورفت جاری ہے۔ ان میں گورے افسر بھی ہیں۔ صبح دھما پولیس کی گاڑیاں ٹھاکر بستی کی طرف آتی جاتی نظر آتی ہیں اور شہر کے لوگوں کا وہی عام ہے، صبح کوئی رائے قائم کرتے ہیں، شام کو کوئی اور قصہ سناتے ہیں۔

بٹھل کے ذہن نشیں ہو گا کہ چار دن پہلے کوتوالی میں حاضری کے وقت جس نوجوان پولیس افسر سے ہمارا واسطہ پڑا تھا، اس نے کیا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ شہر میں اس کا چاولہ ہوئے چند ہی دن ہوئے ہیں اور اس نے متعدد بار بٹھل کا نام سنا ہے۔ یہ نام بے سبب تو نہیں لیا جا رہا ہو گا۔ شہر میں ہماری موجودگی کی تصدیق کے لیے حویلی آنے والے پولیس افسر نے بٹھل کو محتاط رہنے کی صلاح دی تھی، پھر کوئی نزاکت ہی بٹھل کو روکے ہوئے ہے۔ کیا شہر اطراف اور خصوصاً حویلی سے پولیس کا ہٹ جانا محض ایک سراب ہے۔ ہمارے لیے کوئی ذہنی آسائش اور باقی سارا کچھ جوں کا توں ہے۔ ایسا ہوتا تو۔۔۔ اس دن کوتوالی میں بٹھل صاف طور سے متنبہ کر آیا تھا کہ اب وہ شہر سے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پولیس کو روکنا ہوتا تو ضرور کوئی کارروائی کرتی۔ اس خاموشی سے یہی ظاہر ہے کہ ہمارے شہر میں موجود رہنے نہ رہنے سے پولیس کو کوئی غرض نہیں ہے۔ کیا معلوم، بٹھل اب پابندی سے اڑے جا رہا ہے، اس دوران میں پولیس کا کوئی قاصد نیا علم لے کے اڑے آیا ہو اور بٹھل نے روانگی کو سرخرو کر دی ہو۔ کسی کی تعمیل میں یا از خود حفظ المذم کے طور پر۔ کون جانے یہ سلسلہ کہاں جا کے ختم ہو۔ معذور کے پاس اپنی بے جانی و بے حالی سے مفاہمت کے سوا کیا چارہ رہ جاتا ہے۔ بالکل بھی ایک معذوری ہے اور مجھے اپنی یہ ناتوانی و ناتواری تسلیم کرتے رہنا چاہیے۔

پانچویں دن بٹھل ناشتے کے بعد معمول کے مطابق اڑے جانے کے لیے تیار تھا اور بیٹھک میں حقے کے آخری کش لے رہا تھا کہ ملازمہ شگورن بی نے آگے مطلع کیا، کوئی مہمان موثر میں بٹھل سے ملے آیا ہے۔ "ہو ٹرین؟" میں نے چونک کے پوچھا "کون؟" "بٹھل نے تھو چھوڑ دیا۔ شگورن بی کو اس سے زیادہ یہ معلوم نہیں تھا۔ اڑے یا پولیس کا کوئی آدمی ہوا تو ماما شگورن بی کو کوئی حوالہ ضرور بتاتا۔ اڑے سے متعلق آنے والوں کے نام اسے ازہر تھے۔ میں نے غلٹ کی اور بیٹھک سے اتر کے ڈیو ڈھی کی طرف لپک پڑا۔ ڈیو ڈھی میں داخل ہوتے ہوتے بٹھل کے آنے کے انتظار میں، میں نے بٹھل

مجھے کوئی جھکا سا لگا۔ میری طرح بٹھل کو بھی اپنی آنکھوں پر ٹینس نہیں آیا ہو گا۔ ڈیو ڈھی میں کرسی پر پولیس فزورما بیٹھا تھا۔ مجھے تو کسی خواب کا لگانا ہوا۔ درمیان تھا در سوٹ اور ٹائی میں لمبوس نہایت تازہ تازہ لنگ رہا تھا صاحب، "آپ؟" بٹھل نے عجب سے کہا، "کوئی خبر بھی نہیں" بٹھل نے اسے سلام کیا۔ میں بے حس و حرکت کھڑا ہوا اور دیکھتا رہا۔

"ہاں استاد تم نے اس روز حویلی آنے کی دعوت دی لی یاد ہے؟ سوچا، اس سے پہلے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ، اسے مل لیں۔" درما کے چہرے پر نہ نرمی تھی نہ ترشی۔ اس لہجہ بھی کسی قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا با۔

"آپ نے مان بڑھایا صاحب، کسی کو بول دیتے، ہم جاتے۔" بٹھل نے سادگی سے کہا، "میں نے سمجھ میں نہیں رہا کیا پولیس۔ سب ٹھک تو ہے صاحب؟"

"ہاں آں۔" وہ آنکھیں چڑھا کے بولا "ابھی تک تو ارا ٹھیک ہے۔ دھیر دھیر رکھو کوئی پرچی ورنہ پی لے کے نہیں لے۔"

"وہ تو صاحب پرچی نکلتی تو آپ ادھر ہی کیوں ہوتے۔" بٹھل نے مسکراتے ہوئے کہا "آؤ صاحب اندر آؤ، اندر۔"

درمانے کوئی تکلف نہیں کیا، کرسی سے اٹھ گیا، بٹھل نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ درمانے آگے جاتے ہی بٹھل کو دروازے میں داخل ہونے کی پیش کش ہے۔ بٹھل آگے چلا گیا "آؤ صاحب ادھر سے۔" ڈیو ڈھی کے نکل کے اس نے دائیں جانب چلنے کا اشارہ کیا۔ درمانے رکتے ہی، ہر ٹھک کے ایک سرسری نظر حویلی کے اندرونی نیز زالی پھر بٹھل کی معیت میں تیزی سے چند قدم کا فاصلہ لے کر کے بیٹھک کے قریب آ گیا۔ بٹھل نے جوتے اتارے کس نے بھی تھلیدی۔ ہمیں اندر مطلع کرنے کا موقع نہیں اسکا تھا۔ زہرہ اور زریں بیٹھک میں موجود تھیں۔ ہمارے تھ ایک ایک دیکھ کے وہ سٹ ٹانگیں اور منہ چھپائے۔ دم بیٹھک سے نکل جانا چاہتی تھیں کہ بٹھل نے انہیں لک لیا۔

دونوں نے سروں پر دوپٹے اس طرح ڈھانپ لیے کہ ان کے چہرے آٹھ چھپ گئے اندر جانے والے دروازے کی لپاس دیوار سے چپک کے وہ سکڑی ٹھکی کھڑی رہیں۔ "یہ

درما صاحب ہیں بیٹا! پولیس کے بڑے اونچے افسر۔ ان سے پردہ نہیں۔ یہ اپنے کھڑے ہیں۔" بٹھل نے بلند آواز میں کہا "اور صاحب، یہ دونوں بیٹا ہیں اپنی۔ ایک کا نام زری ہے، دوسری کا زہرہ۔" بٹھل کے لیے سے خرواز جھلک رہا تھا۔ زہرہ اور زریں نے اضطرابی انداز میں سر کے ایک خفیف خم سے درما کو آداب کیا۔

"اب جاؤ، جا کے بڑے صاحب کے لیے کچھ چائے پانی کا کرو۔"

"نہیں نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔" درمانے ہاتھ اٹھا کے شدت سے منع کیا۔

"کیا صاحب، ادھر ہی آ کے ایسے چلے جاؤ گے آپ۔" بٹھل شکایتی ٹیکائی لہجے میں بولا۔ "ادھر ہی کوتوالی میں ہم آپ کے بندے تھے، ادھر آپ ہمارے گھر میں ہو۔" بٹھل کو یکایک خیال آیا اور وہ مزدور آوازیں بولا "آپ کو اپنے ہاں جل بیان کرنے میں کوئی۔"

"نہیں نہیں۔" درمانے فوراً تردید کی۔ "ہم بہت دنوں ولایت میں رہے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے صاحب۔" بٹھل نے شکستگی سے کہا "اب ہم پر چھوڑ دو، ڈیکھو، اپنی راج کاریوں کے ہاتھ میں کیسا سوا ہے۔ بول دیتے ہیں، کوٹ کے بھی آؤ گے۔"

درما کا جسم پیٹھڑا رہ گیا۔

میں نے نہیں دیکھا، زہرہ اور زریں کس لمحے بیٹھک سے نکل گئیں۔

"آپ کو دیکھ کے اپنا میں بھی ولایت جانے کو ہمتا ہے۔" بٹھل نے خوش دلی سے کہا "آدمی آپ جیسا ہو جاتا ہے تو ایک بار سب کو ادھر ہی کا چکر لگانا چاہیے۔"

درما کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی "وہاں کی بات دوسری ہے۔" وہ خوابیدہ سی آوازیں بولا۔

"ہاں صاحب، ایسا ہی سنتے ہیں۔ گوروں میں کچھ الگ سے ہو گا۔ سارے میں انہی کا ٹھکانا چلتا ہے۔"

"ان کے پاس گیان ہے۔" درمانے کی آواز میں مایوسی شامل تھی۔

"بٹھل نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے سنا اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔" آپ ٹھیک سے بیٹھو صاحب، تھوڑا آرام سے۔" اس نے گڈونک دیر کے آگے کر دیا۔

انگریزی لباس کو فرشی نشست سے مناسبت نہیں ہے لیکن درمانے لباس کی پردا نہیں کی۔ ٹیکے سے نیک لگا کے کسی قدر پاؤں پھیلا لیے۔ اس کے سکون سے میری رگوں

کتابیات پبلی کیشنز

کے بل کھل رہے تھے۔ ”کب جا رہے ہو؟“ اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔
 ”بس آج کل میں صاحب۔“
 ”کس طرف جانا ہے؟“
 ”ایک ٹھکانا ہو تو بولیں۔“
 ”کس کام سے؟“ ورنہ بے ظاہر سادگی سے پوچھا۔
 ”آپ کو بولا تھا اپنے کو کسی کو کھوج ہے۔“ بھل نے گہری سانس لی۔
 ”کون ہے کون ہے وہ؟“
 ”کیا بولیں صاحب۔“ بھل کی آواز بجھنے لگی ”اچھا ہے، مت پوچھو۔“
 ”نہیں پوچھتے۔“ ورنہ سر جھٹک کے بولا۔
 ”آپ کی تھاکر بستی سے اس کا کوئی ناتا نہیں ہے۔“
 ورنہ کے چہرے پر لہرس گزر گئیں پھر وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے لگا اور تھیکے لہجے میں بولا ”تو جس کا ٹھاکر بستی سے ناتا ہو اس کی بات کرو۔“
 ”لگتا ہے سوئی انگ مٹی ہے۔“
 ”ہاں استاد، ایسا ہی ہے کچھ، مٹی چالی بھرو، سوئی ایک جگہ پر آگے پھنس جاتی ہے۔“ ورنہ نے سنجیدگی سے کہا ”اس پاس کوئی اور دکھائی نہیں دے رہا۔“
 ”پھر صاحب، آپ کے سب چلیں۔“
 ”اس کا سے نہیں آیا لیکن آجائے گا۔“
 ”راہے کو اب آگے جانا ہے۔“
 ”معلوم ہے۔“ ورنہ سر ہلا کے بولا ”کتنے آگے جاؤ گے، ہندوستان کے پار؟“
 ”بہت ہی بڑا ہے صاحب۔“
 ”لیکن رات ایک ہی ہے۔“
 ”اپنے کو آپ نے کیا جانا ہے؟“
 ورنہ نے کچھ توقف کیا اور جیسے خود سے مخاطب ہو، بددلتے ہوئے بولا ”تم جیسا نہیں دیکھا۔“
 ”کچھ زیادہ ہی جان لیا آپ نے۔“
 ”نہیں استاد، لگتا ہے، ابھی بہت کم ہے لیکن ابھی تو گیان دھیان چل رہا ہے۔ آگے دیکھو، اور کیا کیا دیکھنے اور سننے کو ملتا ہے۔“
 ”ایک بات تو جیسے صاحب؟“ بھل کی آواز میں کوئی کچی نہیں تھی ”دیر کا ہے کی ہے؟“
 ”ہاں استاد! یہ سوال اچھا ہے۔ ہمارے ساتھی بھی کل یہی بول رہے تھے دیر کیوں کرتے ہو صاحب۔“

”پھر آپ نے کیا بولا؟“
 ”جواب تم بھی جانتے ہو۔“
 ”اور جواب یہی رہے گا۔“
 ”نہیں استاد، اتنی جلدی ہاتھ پیر نہیں ڈالتے ہم۔“
 ”ہر ایک دن ڈال دو گے۔ اگلے چلنے پر دیوار دکھائی نہیں پڑتی۔“
 ”دیکھتے ہیں۔“ ورنہ بے نیازی سے بولا ”سلاٹ لگایا ہے تو دوسرا بھی مل جائے گا۔“
 ”یہ تو اچھے پر ہے صاحب، کتنا بڑا ہے۔ کبھی دوسرے کے چکر میں پھلا بھی ہاتھ سے نکل پڑتا ہے۔“
 ابھی تک دونوں کے چہروں پر کشیدگی اور لمبوں میں کدورت نہیں تھی لیکن نظر اترتا تھا کہ کسی بھی وقت یہ طرز کلام مٹی میں بدل سکتی ہے۔ بھل کو بھی اس کا احساس ہوگا اور اسے حوصلی میں ورنہ کی آمد کا سبب مہین کرنے کی جستجو بھینتا ہوگی۔ ورنہ کو آخر اچانک اسے پاؤں سے متعلق ایسے اجنبیوں کے گھر آنے کی کیا ضرورت تھی جنہیں وہ اکودہ قرار دینے کے درپے تھا مگر اس کا اظہار کتنا سیدھے گھر کنا لایے میں کوئی ابہام بھی نہیں تھا اور بے شک ایک دوسرا امکان بھی قیاس کیا جاسکتا تھا کہ یوں منہ اٹھائے حوصلی میں آنے سے مراد خود اس کے اپنے ہاں کا کوئی ابہام ہے۔ اچھا ہوا، شکورن بی نے آگے کچھ دیر کے لیے دونوں کو خاموش کر دیا۔ وہ دوسرا خان لے کے آئی تھی۔ میں نے دوسرا خان بچھائے اور چینی کی چٹیلیں، پیچھے ورنہ اور بھل کے آگے رکھنے میں شکورن بی کی مدد کی۔ وہ چٹلی گئی تو ورنہ کی تور بھری آواز بیشک میں گونجی ”ہم بھی ناکام نہیں ہوئے استاد۔“
 ”اس بار بھی کیوں ہو گے صاحب۔“
 ”ہو نہیں چاہیے۔“ ورنہ غمزہ سے بولا۔
 ”اسی لیے تو آپ کو ادھر بھیجنا ہے کچھ جان بوجھ کے پہلے کا دیکھ کے ہی۔“
 ”اور اس بار ہم ناکام ہوئے تو پولیس چھوڑ دیں گے۔“
 ”کیوں صاحب، آپ اکیلے تو ادھر ہی نہیں ہو۔ ایک بار نشانے پر نہیں بیٹھا تو پچھلے پر پائی پڑ جائے گا کیا؟“
 ”ان کا نہیں۔“ ہمیں کسی کی فکر نہیں۔ یہاں گورنہ افسر بھی آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں تو اپنی فکر ہے۔ اپنے آپ کا بھی تو سامنا کرنا پڑتا ہے۔“
 ”ایسا ہے تو ایک دن آپ پہنچ جاؤ گے۔“
 ”پہنچ تو ہم اب بھی گئے ہیں۔“ ورنہ کے لیے میں بھلی مرتبہ نخوت کی جھلک دکھائی دی۔

بازی گری ۵

”پھر کھنچو اور صاحب۔“
 ”ہم راج گدی پر نہیں بیٹھے۔“
 ”یہ تو بڑا جاکے بھاگ ہے۔“

ورنہ کی آنکھوں میں سرخی کوندی لیکن اس نے سرد آواز میں کہا ”پولیس بھی بندھی ہوئی ہے۔ اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں، چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔“
 ”ادھر کی کون کھلا ہے اور کون سارے پہ بھاری ہے۔ چھوڑ (کنارہ) بنا تو کوئی نہیں، کچھ بھی نہیں۔“ بھل زیر لبی سے بولا ”اپنے کو معاف کرنا، پھر پتہ کیا صاحب؟“
 ”ہاں۔“ ورنہ کا چہرہ سوچ سا گیا ”تم ٹھیک کہتے ہو۔“
 دروازے پر آئیں نمودار ہونے پر پھر مدھمتھ ہوئے۔ دروازے کے پاس مجھے زریں زہرہ اور نیساں کے چہرے دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں خزان پوشوں سے ڈھکے تھتھے۔ میں نے جلدی سے دروازے کا رخ کیا، زہرہ کے ہاتھ سے تھتھ لیا۔ اتنے میں جہاں گہر بھی آگیا۔ تھتھ ہمارے حوالے کر کے وہ تینوں پلک جھپکتے میں غائب ہو گئیں۔ میں نے خزان پوش بنائے تو ورنہ بے قرار ہو گیا ”یہ کیا ہے استاد! وہ تھتھوں میں غصا سے رکھی چیزیں دیکھ کے حیرانی سے بولا۔“

”آپ کو پتا ہے، ہم نے کچھ نہیں بولا تھا۔ آپ شروع کرو صاحب، سارا نازہ نازہ ہے۔“
 کئی قسم کی شیرینی، کئی قسم کا نمکین، خشک میوہ، پھل، ایک تھتھ میں چائے دانی، پالیاں، گچے، کانٹے، چھری اور پھلوں کے رس سے بھرا شیشہ کا جگ، سارے برتن چمکتے دیکھے ہوئے۔

ورنہ نے ابتدا میں تکلف سے کام لیا تھا پھر اس سے رہا نہیں گیا اور اس کی آنکھوں کی تابالی فزوں ہوئی گئی۔ کتنے لگا کہ وہ ناشتہ کر کے گھر سے چلا تھا۔ ہم دونوں بھی ناشتہ کر چکے تھے لیکن میزبانی کے آداب واجب تھے۔ ادھر زریں نے کچھ زیادہ ہی ابہام کر لیا تھا۔ ورنہ داد و تحسین میں کفایت کا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں۔ یہی تو شعر کی خوبی ہے کہ سننے اور پڑھنے والے کو متلاطم کردے۔ بندرتج اس کے ہاتھ کھلے گئے اور زبان بھی رواں ہونے لگی۔ مجھے معلوم تھا لوکی کے طوے کی ترتیب خانم نے زریں کو تعلیم کی تھی۔ حیدر آباد میں پہلی بار ہم نے نواب ثروت کے ہاں یہ طوہ لکھایا تھا۔ زریں نے اپنی طرف سے کچھ ترسیم و اضافہ بھی کیا ہوگا کہ ذاتی نقطہ اور سوا ہو گیا تھا۔ زعفران کی آئینش نے اسے اور اشتہار انگیز کر دیا تھا۔ چاندی کے ورق اور طرح طرح کے

بازی گری ۵

میووں سے اس کی آرائش کی گئی تھی۔ ورنہ کو بہت مرغوب ہوا اور اس نے ٹیلی آواز میں پوچھا ”تم یہی کچھ کھاتے ہو استاد؟“

”کیوں صاحب؟“ بھل نے تجسس ظاہر کیا۔
 ”سوچتے تھے اس گہری، تیزی پھرتی کا کوئی کارن تو ہوگا، سو اب یہ بھی ہے۔ اچھی خوراک سے دماغ برا بھلا رہتا ہے۔“

”جب تلک آپ شہر میں ہو، ادھر آجایا کرو، آپ کو آج کل تھوڑی ضرورت بھی ہے۔“
 بھل کی یہ برہنگی خود کھائی کے انداز میں تھی۔ ورنہ کے حواس بہت تیز تھے، اس نے سن لیا اور نقطہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ وہ اپنی ہنسی نہ روک سکا ”ہاں ہاں، پھر یہی کرتے ہیں، پر تم اپنے لیے دو چار کرو، اس طرح تمہارا کھانا نہ ہو جائے۔“

”اپنی چھوڑو صاحب۔“ بھل نے بے نیازانہ کہا ”مٹی سب ایک جیسی نہیں ہوتی اور، اور کوئی ایک تو آخری دن ہوتا ہی ہے۔“

ورنہ نے ایک لمبی ہنکار بھری اور کہیں گم سا ہو گیا۔
 بھل نے اس کے رکے ہوئے ہاتھ پر اعتراض کیا اور پیر کے پکڑوں کی قاب اس کی طرف بڑھا دی۔ ان پکڑوں کی بھل خود فرائض کرتا تھا۔ پکڑے واقعی خست و لذیذ تھے۔ ورنہ تعریف و توصیف میں سرگھمٹا لگا ”ادھر کی ولایت میں تو صاحب سارا سوا دلوت پلٹ گیا ہوگا۔“ بھل کے استفسار میں بھرو بھی شامل تھا۔

”شروع شروع میں پریشانی ضرور ہوئی۔“ ورنہ نے جواب کا اعزاز بخشا ”بعد میں منہ کو ایسا لگا کہ دیکھ کی یاد ہی نہیں آتی تھی۔ لگتا تھا اب ٹھیک سے کھانے کو ملتا ہے۔ پہلے تو جیسے گھاس کھاتا تھا۔ وہاں کی کیا بات ہے۔ وہ لوگ کھانا پکانے اور کھانا سنانے پر ایک سادھیان دیتے ہیں۔ روزنی نئی ترکیبیں نکالتے ہیں۔ وہ اتنا پکاتے اور بھونکتے نہیں کہ سبزی ماس کا اپنا رنگ جاتا ہے نہ سوا۔ ادھر تو مرج مسالے کی بھرمار سے اصلی رنگ اور سواد کا پتا ہی نہیں چلتا۔ یہاں آگے دو بارہ اپنے کھانوں کی طرف لوٹنے میں بڑی مشکل ہوئی۔ ہم سے اب زیادہ مرج مسالے نہیں کھائے جاتے لیکن یہ، یہ تو بہت سواشٹ (ڈائٹ) (ار) ہے۔“ اس نے سامنے رکھے ہوئے خزان کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا ”ہم نے ایک ساتھ اتنی سوا بھری چیزیں کبھی نہیں کھائیں اور پھر یہ، یہ۔“ اس کا اشارہ بھینٹا کھانا پیش کرنے کی غصا سے

کتابیات پبلی کیشنز

ولطافت، خوش رنگی و رنگارنگی سے متعلق تھا۔

بھٹل نے اس پسندیدگی پر ممنونیت کا اظہار کیا اور دوپہر کے کھانے تک ٹھہر جانے کی درخواست کی۔ بھٹل نے کہا کہ یہ سارا کچھ تو بگلت میں تیار ہوا ہے اور یہ تو کھانا نہیں تھا۔ دوپہر کا باقاعدہ کھانا درما کے لیے مزید لطف و لذت کا باعث ہوگا۔ درما نے صاف انکار کر دیا وہ تادیر نہیں ٹھہر سکتا اور اتنی شکم میری کے بعد دوپہر کے کھانے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ اس نے ابھی تک اپنی آمد کے مقصد کا سراغ نہیں لگنے دیا تھا۔ ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ کسی طور اسے آمادہ گذار رکھا جائے کھانے کے دوران، بھٹل اسے مسلسل ٹوکتا اور ادھر ادھر کے موضوعات و معاملات پر اسکا تارہا۔ ہم دستار خوانی کی صروت بھی خوب ہوتی ہے اور جب کوئی میزبان مشکل و شائستگی سے ایسے سوالات اٹھا رہا ہو جن کے جواب میں کسی پیچیدگی اور ناگواری کا پھلو نہ نکلتا ہو تو چاہے کوئی طبیعتا کتنا ہی کم سخن ہو یا اپنے رتبہ و منصب کی وجہ سے دانستہ کم غنی و کم کوئی شعار کئے ہو، کتنی دیر تک اپنے اس ناروا، نازیبا سکوت کا تحمل ہو سکتا ہے۔ میں نے اور بھٹل نے کسی تردید اور اختلاف سے بھی اجتناب کیا تھا۔ ہم ایک بہترین سامع بنے ہوئے تھے، کسی طالب علم اور کسب فیض کرنے والے عاجز کے مانند۔ اچھے سامع ہر ایک کو مرغوب ہوتے ہیں بلکہ ان کی تلاش رہتی ہے۔ بھٹل کی کوشش رازیں لگ جاتی رہی۔ وہ درما کی آمد کی غرض و غایت جاننے میں ناکام رہا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ درما کے چہرے پر کچھ مغازت اور کدورت کی لکیریں کم ہوتی رہیں۔ وقت خاصا لڑ گیا۔

قوے کی چسکیاں لیتے ہوئے درما نے ایک بار پھر مجھے کشش سے دوچار کیا۔ کہنے لگا "تم نے سنا ہوگا استاد، پولیس کی دوستی اچھی ہے نہ دشمنی۔"

"اپنی آپ کی دشمنی کا کوئی کارون نہیں بنتا۔" بھٹل نے مستعدی سے کہا۔

"اور دوستی کا بھی تو۔" درما بے باکی سے بولا۔

"دوستی کا ایک ہی کارن بہت ہے، ایک کا دوسرے کو

بھلا لگنا۔"

"ہم، ہم تمہیں کیسے لگتے ہیں؟"

"ہم آپ کو ابھی باہر سے لوٹا سکتے تھے۔"

درما بیٹھے بیٹھے لہرا سا گیا اور خاموش رہا پھر اٹھنے کے لیے کھمٹا لگا "اب چلتے ہیں استاد۔"

"ایسا کیسے صاحب۔" بھٹل کی استدعا رہی تھی

"تھوڑا اور بیٹھے۔"

"جانا ہے۔" درما نے مختصراً کہا اور کسی قدر بے چینی سے بولا "تم نے نہیں پوچھا، ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔"

"کیا جانا ہے۔ اپنے واسطے آپ کا ادھری آنا اور ساتھ بیٹھنا بہت ہے اور کوئی بات ہو تو بولو۔"

"تم کو دوبارہ دیکھنے کو من کرتا تھا استاد۔" درما اپنے لمبے کاٹھنہ چھپا رکھا۔

"ہم تو دین کرانے اس دن کو تو اپنی بیٹھے تھے۔"

"ہاں!" درما تیور پر چڑھا کہ بولا "اس دن ضروری میٹنگ تھی۔"

"بعد کو کسی نچت ٹائم پر اپنے کو بلوا لیتے۔"

"سے ہی نہیں ملا اور ہم کو خود یہاں آنا بھی تھا۔" درما

نے بیٹھک کے دروہام پر اچھتی نظر ڈالتے ہوئے کہا "تم کو"

دیکھنے، تمہارا یہ راج سنگھاسن دیکھنے۔"

"یہ اپنا راج سنگھاسن نہیں ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے، راج بھون بولو، سنا بہت تھا پر آج اپنی

آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔"

"کدھری دیکھا ابھی، تھوڑا ٹائم اور دو، اندر چلتے

ہیں۔"

"نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں۔ اتنا ہی بہت ہے۔"

اٹ اذیری میٹیرس۔ اس کو دیکھنے کے بعد۔" درما پہلو

بدل کے بولا "کوئی شک نہیں، کسی کو بھی اس کی فکر دہنی

چاہیے۔ کوئی بھی اور کبھی بھی ٹھاکروں جیسے راون رستہ بھگ

کے ادھر کام نہ کر سکتے ہیں۔"

درما نے اب کوئی ابہام رہنے نہیں دیا تھا۔ "بھٹل نے

غیر متوقع طور پر جواب نہیں دیا۔

درما اپنی نشست سے یکایک اٹھ کھڑا ہوا اور کپڑوں کی

ٹشکینیں، ٹالی درست کرتا ہوا، بھٹل کے روہ رو آ کے بولا

"ہمارا کام جاری ہے، ہم نے ہر طرف چھان بین کر لیا ہے

اور کر رہے ہیں اور یہی نہیں، سینئر سے گورے باٹر بھی آگے

ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں مل رہا۔ لوٹ کے وہ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں

کہ اتنا ڈی پلینڈ جرم کوئی بڑا گروہ ہی کر سکتا ہے وہ

ٹھاکروں کے رشتے دار یا ان کے مال پر نظر رکھنے والے ڈاکو

لیبرے نہیں ہو سکتے۔ یہ تو بہت پلانڈ، سوچا سمجھا ہوا، ایکس

پرٹ لوگوں کا ایڈونچر ہے۔"

بھٹل نے آنکھیں موند لیں۔

اس کی خاموشی سے درما جڑبڑھونے لگا اور سرد آواز

میں بولا "اور یہ معاملہ ایسا نہیں، ایک دو آدمیوں کا نہیں،

بازی گری

42 آدمیوں کا خون کا ہے۔ وہ سائیں نہیں تھیں۔ یہاں کی پولیس نے جان بوجھ کے گنتی کم کی یا اسے اس رات ٹھکر بستی میں باہر سے آنے والوں کے بارے میں پوری جان کاری نہیں سمجھی۔ پولیس ٹھک کے چپ ہو جائے اور ہاتھ پیر چھوڑے تو اوپر سرکار کئی نیچی ہے۔

”ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ ٹھکل نے ہم کوئی کی۔

”اور صرف دو سرا رات لے کی دیر ہے۔“

”شاید نہیں ملے آپ کو۔“

”یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟“

”آپ ہی بول رہے تھے۔ کوئی سورا لوگ تھے۔ پورا دیکھ بھال تھے ادھر کی گتے ہوں گے۔“

لیکن پولیس میں بھی کمی نہیں دیکھنے، سننے سوچنے اور بال کی کھال ٹکانے والوں کی۔

”پھر تو مل جائے گا۔“ بھل کالجہ استہ لائی نہیں تھا۔ اس نے یہ ظاہر آتا ہٹ سے کہا ”اپنے لیے کوئی حکم ہو تو بولو۔“

”تمہیں معلوم ہے، تم کس وجہ سے کھل پھر رہے ہو؟“

”آپ برا مانو گے، صرف پولیس۔“ بھل نے انہیسی ہوئی آواز میں کہا ”مج میں آپ کے ہونے سے اتنا تاثر نہیں ہوا، اپنے کو بھل گئے رہے۔“

”ورنہ کیا ہو؟“ ورنہ نے تکی سے پوچھا۔

”جتنی جلدی وہ کرتے، اتنی جلدی اپنی کتی ہو جاتی۔ ایک ہاتھ سے پھندا ڈالتے، دوسرے سے گانٹھ کھولتے۔ اپنے ساتھ اب کچھ نیا نہیں ہوتا۔ ادھر ہم بھی ایسے سے کے لیے ڈوریاں ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ آپ نے کوئی چھوٹ ڈھیل نہیں دی اپنے کو۔ آپ ان میں زیادہ سامنے ہو۔ نئی پہ کپے کی بات اور ہوتی ہے۔ توڑا اپنے کو دکھانا آگے پیچھے کا وچار بھی کرنا تھا آپ کو۔ ذرا تھپڑ پڑنے پہ پچھلے کا سارا کاکرت ہو جاتا۔ سامنے صاف ہونے پہ ٹھوڑا دانا ٹھکر رہتا ہے۔ کیا پولیس آپ سارا جانتے ہو۔ اور سر کے ابلے کالے سے اندر گودے کا کوئی نانا نہیں۔ کوئی آگے کی بات ہو تو بولو صاحب۔“ بھل نے ناگوار سی کہا۔ ”پکلی دفعہ سامنے پڑنے پہ ہم نے سارا برابر کر دیا تھا۔ اس کے بعد اپنے پاس کچھ نہیں ہے اور اب ہم ادھر سے جا رہے ہیں۔“

ورما کا چہرہ جھجک رہا تھا۔ بھل کے چپ ہو جانے پر اس نے جیسے کب کی رکی ہوئی سانوں سے سینہ ہلکا کیا اور زہر خند سے بولا ”اور جلدی تم کو کولت کے بھی آتا ہے۔“

”وہ بھی دیکھ لیں گے صاحب“ جدھر ی ہوں گے،

آجائیں گے، بعد کو پورا ہر جانہ خرچا بھی لیں گے اور آپ دھیر چڑھ کر رہو، آپ پہ بھاری نہیں پڑنے گا۔“ بھل نے ورنہ کو مزید کچھ کہنے نہیں دیا اور ٹانگی کی انداز میں وہی پیچہ دہرایا مناسب سمجھا جو وہ چند پہلے کو تو لائی میں ورنہ کے ماتحت پولیس افسر سے کہہ چکا تھا۔ اس نے کہا کہ ہر ہر ہوگا، ہماری عدم موجودگی میں حویلی کے کینوں سے کوئی علاقہ نہ رکھا جائے۔ انہیں پھینچنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ پیچیدگی ہی بڑھ سکے۔ ہماری طلبی مقصود ہو تو کلکتے میں استاد جامو سے رابطہ کیا جائے۔ ہم تک طلبی کی اطلاع پہنچنے اور ہمارے فیض آباد آنے میں کچھ وقت صرف ہو سکتا ہے لیکن پولیس اطمینان رکھے، ہم ہر صورت واپس آجائیں گے۔

ورما کے ہونٹوں پر فطرد نغوت سے آلودہ مسکراہٹ عود کر آئی۔ اس نے سر ہلایا اور ڈیوڑھی کی طرف جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جوتے پن کر ہم تینوں ایک دوسرے کے پیچھے ڈیوڑھی میں آئے۔ ادھر سے ٹھکروں کی ہڑبائی چاہیں سنائی دیں۔ تینوں رک گئے۔ ٹھکروں کی خاص وان لائی تھی۔ میں نے خاص دان اس کے ہاتھ سے لے کے ورنہ کے سامنے پیش کر دیا ”ہم ہم پان نہیں کھاتے۔“ وہ گھبرا کے بولا۔

”ادھر ی جیسا پیچھے نہیں کھایا ہوگا۔“ بھل نے اسے حوصلہ دیا اور اشتیاق پیدا کیا۔

ورما نے ایک کھائی تامل و تردد کے بعد چاندی کے ورق میں بلبوس بیڑا اٹھایا۔ ابھی اس نے بیڑا منہ میں رکھا تھا کہ پلکیں جھپکاتے لگا اور انگریزی میں بے ساختہ بولا ”ہا! انڈی ملی ش۔۔۔ مارولیں۔“

اس کے چہرے کی بشارت کسی قدر لوٹ آئی تھی۔ حویلی کے وسیع چوترے کے نیچے گلی میں سیاہ رنگ کی موٹر کھڑی تھی۔ بدندق بردار اردلی اور وردی پوش ڈرائیور وہاں موجود تھے۔ بیڑہ میاں اترتے ہوئے بھل نے بیڑا تے انداز میں کہا ”پولیس کا الٹا سیدھا بھیچے لے نہیں پڑتا صاحب“ راوون کو منانے والے کو بھی شامیں ڈیٹی۔“ ورنہ ایک ڈکی اٹھس اور تیز قسم شخص تھا، اس نے بھل کا مفہوم سمجھ لیا ہوگا کہ کسی ستم کار سے غلط خدا کو نجات دلانے والا بھی مستوجب سزا ہے، مگر دن زدنی ہے، یہ بولے بھی بھی خوب ہے۔

مونز میں بیٹھنے سے پہلے ورنہ چند لمحے مجھے اور بھل کو متلاطم نظروں سے دیکھا کیا اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانے میں بھی پہل نہیں کی تو ہم نے بھی اپنے ہاتھ کھینچے

رکے لیکن ہمارے سلام کا جواب اس نے سر کی خفیف جنبش سے ضرور دیا۔ اس کے پیچھے ہی موٹر روانہ ہو گئی۔

بھل اور میں دیر تک چوترے پر کھڑے رہے، دیکھتے ہی دیکھتے مونز گلی کے کھڑے او بھل ہوئی۔

ہم ٹھیک آٹھ بجے فیض آباد اسٹیشن پہنچ گئے۔

اندر آنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی چالیس منٹ کی تاخیر سے کھنڈ سے آ رہی ہے۔ بھل وینٹنگ روم کا رخ کیا۔ فرٹ کلاس کے اس وینٹنگ روم میں نسبتاً سکون تھا۔ پلیٹ فارم پر قوت بمیز بھی اور چچ و دیکار بھی ہوئی تھی۔ بارودی ٹھکانے میں ایک گوشے میں آرام کر سیں پر بٹھا دیا اور چائے کے لیے پوچھا۔ خالی بیٹھے رہنے سے کچھ شغل بہتر تھا۔ بھل سے اجازت ملنے پر ٹھکانے نے فڈو یا نہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھا اور سر جھکا کے باہر چلا گیا۔

اس کشادہ اور عمدہ قسم کے ساز و سامان سے آراستہ صاف ستھری انتظار گاہ میں پہلے سے ایک جوڑا موجود تھا۔ ایک خوش پوش ادیب آدی اور گلابی ساڑھی میں بلبوس، ٹگ جگ تیس سال کی عمر کی سائوئی نازک اندام عورت۔ موٹر کی بڑا افسر معلوم ہوا تھا۔ ہماری آمد پر اس کا چہرہ واضح طور پر بگڑ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ ہماری وضع قطع اول درجے کے مسافروں سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

دو ہر کھانے کے بعد، بھل نے روائی کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت بھی دسترخوان سے اٹھا چاہتے تھے۔ بھی کو چپے جھکا سا لگے حالانکہ بھل نے دو تین دن پہلے ہی انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کے بجائے بھل حویلی سے نکل گیا اور سورج غروب ہوتے وقت واپس آیا، یقیناً وہ اڑے کے لوگوں سے دعا کی ملاقات کے لیے گیا ہو گا یا پھر کسیر اور وکیل بھارگو سے صلاح مشورہ کرنے، اسے کچھ ہدایتیں دینے، ورنہ خانہ بری والا افسر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کوئی ابہام بھی نہیں رہنے دیا تھا۔ صاف بتا دیا تھا کہ حقائق جاننے کے لیے وہ کتنا مضطرب ہے اور کہاں تک جا سکتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں اس نے پولیس کی ملازمت سے دست بردار ہو جانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ کون جانے ہماری روائی میں رکاوٹ نہ ڈالنے میں بھی کوئی مضطرب چھپی ہو۔ ورنہ سے کچھ بعد نہیں تھا۔ اس کے کام کرنے کا انداز ہی مختلف تھا۔ بھل کو بھی اس کا احساس ہوگا کہ ابھی دھند پوری طرح نہیں چھٹی ہے۔ ہمیں بہت قیلولہ رہنا تھا۔ پولیس نے کوئی شرط عائد نہیں کی تھی لیکن بھل نے اپنی جانب سے ایک طرح کا وعدہ کیا تھا کہ ایک

جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہوئے ٹھکے میں مقیم استاد جامو کو باخبر رکھے گا۔ بہتر ہے، حویلی کے کینوں کو ٹنگ کرنے کے بجائے پولیس پہلے استاد جامو سے رابطہ قائم کرے۔ ہر چند یہ ایک مشکل کام تھا۔ نئے مقامات پر ہمیں اپنی سلوکت کا کچھ علم نہیں ہوتا تھا۔ بس یہی ہو سکتا تھا کہ ریل سے اترتے ہی ہم اس مقام کے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کا دروازہ کھٹکنا میں اور اسٹیشن ماسٹر کی معرفت جامو سے تار منگوائیں۔ ہر جگہ آمد اور روانگی کے وقت اسٹیشن ماسٹر کی خدمت میں حاضری لازم قرار دیں۔ ٹھکروں کو جس طرح صبح و شام تھانے میں حاضری دینے کے لیے پابند کئے جاتے ہیں۔

انتظار گاہ کے ٹھکانے کے ساتھ سفید وردی پوش خادم ہاتھ میں تشت اٹھائے اندر آیا۔ تشت سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ ضیاع بھی اقبال مندی کی ایک نشانی ہے۔ ضیاع سے دولت کو واد ملتی ہے۔ بھل نے صرف چائے کے لیے کہا تھا۔ تشت میں چائے کے علاوہ تشریوں میں کئی طرح کے لوازم سبجے ہوئے تھے، کھن توں، انگریزی بکٹ، ٹیک اور پیشیاں۔ ہم میں سے کسی کو ان کی طرف رغبت نہیں ہوئی۔ گھر سے ہم خوب کھانے کے پلے تھے اور زریں نے منہ کرنے کے بعد جوڑے لے لیا کیا چیزیں ساتھ کر لیں تھیں۔ بھل نے چائے نوشی سے پہلے کمرے میں موجود مسافر سے چائے کے لیے پوچھا۔ مسافر لمحے بھر کے لیے سٹ پٹایا پھر اس نے انکسار سے انکار کر دیا۔ انکسار صاف مصنوعی تھا۔

اتنے دن گھر میں رہنے اور گھر میں تقریب بند رہنے کے بعد مجھے یہ گروہ پیش عجیب سا لگ رہا تھا جیسے سفر کرتے ہوئے وقت گزر گیا ہو۔ ان سب کے چہرے آنکھوں میں گھوم رہے تھے کاٹوں میں ان کی آوازیں، آہیں، ہنسی ہوئی تھیں۔ ہمیں رخصت کرنے کے لیے وہ سبھی اسٹیشن آنے کے خواہش مند تھے۔ بھل نے انہیں روک دیا۔ ان آخری لمحوں میں جب حویلی سے باہر جانے کے لیے ہم دروازے کی طرف بڑھا چاہتے تھے، ہمیں ٹھیکر جانا پڑا۔ یا سمن بڑے گلی تھی۔ بھل نے لپٹ کے اسے بازوؤں میں چمپا لیا اور اسے تھکیاں دیتا رہا۔ نیاں اور فردزاں، بڑی اور چھوٹی سملی بھی بھر ضبط نہ کر سکیں۔ زریں، خانم اور زہرہ کو اپنے آپ کو قابو میں رکھنا آتا تھا لیکن کبھی خاموشی آنسوؤں سے زیادہ کاری ہوتی ہے۔ ادھر ارشد، خوبر اور نصیر بابا بھی بہت سرا سید گھبرائے گھبرائے سے لگتے تھے۔ فیض آباد میں ہمارے آنے کے بعد پیش آنے والے حالات سے وہ کم و بیش واقف تھے۔ یہ کم و

بیش کی شناسائی بھی بڑی ستم ناک ہوتی ہے۔ تاہم کسی نے ہم سے مزید کچھ عرصے ٹھہر جانے کی التجا نہیں کی۔ انہیں احساس ہوتا چاہیے تھا کہ بھٹل نے روانگی کا ارادہ کسی اطمینان کے بعد ہی کیا ہوگا۔ بھٹل نے انہیں یہی کچھ بتانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ایک بار پھر باری باری سب کے سروں پر ہاتھ رکھے اور بہ طور خاص فروزاں کے پاس جا کے اس کی پیشانی کو ہوسہ دیتے ہوئے بولا ”جلدی آنے کا کریں گے اب کے اور پیچھے خیر خبر بھی رکھیں گے۔ کوئی بات ہو تو اپنے کو کھٹکے کے پتے پر جی ڈال دیتا۔“ فروزاں ہلک بڑی۔ اسے زیریں کے حوالے کر کے بھٹل نے پھر مڑ کے نہیں دیکھا اور بہ غلت دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے جلدی نہیں کی۔ میں نے بھی جو لفظ مجھے آتے تھے ”فروزاں کی دل جوئی کرنی چاہی مگر وہ کچھ اور ہی سننا چاہتی تھی۔ کوئی کچھ اور سننا چاہتا ہو اور کچھ کہا اور جارہا ہو تو لفظ بڑے بے وقت ہو جاتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اٹھ اٹھ کے آ رہے تھے۔ میرا سینہ بھی پھٹنے لگا تھا۔ میں نے طے کیا کہ بھٹل سے کسوں کا پہلے وہ دن وھن باد اترے اور ظفر کو فیض آباد روانہ کرنے کی تحویل کرے۔ وہ تو اشارے کا منتظر ہوگا۔ اس کی آمد سے دونوں بہنوں کے اضطراب میں کمی ہو جائے گی۔“

ویننگ روم میں ہمیں آئے بندہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ سامنے دروازے کے پٹ جھٹکے سے کھلے۔ وہ استاد سلامی تھا۔ اس کے ساتھ اڈے کے دو اور آدمی دیو اور بنا بھی تھے۔ تینوں قاعدے کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ انہیں دلہے کے بھٹل کا جسم تن گیا اور پیشانی پر لکیریں کھینچ آئیں۔ استاد سلامی دروازے ہی سے ہاتھ باندھے آیا تھا۔ ”اپنے کو معاف کرو استاد!“ وہ بھتیجی آواز میں بولا ”تم نے منع بولا تھا پر ایمان سے جی نہیں مانا۔“

بھٹل بہت بنا رہا۔ استاد سلامی نے اس کے سپر کپڑے ”جبل پور سے تمہارے لیے خاص قسم کی بیڑی منگوائی تھی۔ سامنے دھڑکی نے آنے میں دیر لگادی۔ سوچا ادھر ہی پڑی پڑی سوکھ جاویں گی۔ اب پھر تمہارا کب پھیرا لگے۔“ اس نے دائیں طرف بیٹھے دیو کی طرف جلدی سے ہاتھ بڑھایا۔ دیو نے ہڑبڑاتے ہوئے ریسی کپڑے کی ایک چھوٹی پوٹلی بھٹل کے آگے کردی۔ بھٹل نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں نے دیو سے پوٹلی لے کے بیک میں ڈال دی۔

”چاہیئے ہے۔“ بھٹل نے تنک کے پوچھا۔

”نانا استاد۔“ سلامی سر جھٹک کے بولا ”تم کو دیکھ لیا،“

جانو ساری پیاس ٹھکن دور ہو گئی۔ من میں شام سے بے کھی ہو رہی تھی۔ وہ تو سالے سالے کے سارے آنے کو چڑھ کر رہے تھے۔ مشکل سے کھنٹے سے باندھ کے آیا ہوں گی، پوچھو ان حرام خوردوں سے۔“ استاد سلامی نے دیو اور پٹا کی تائید چاہی۔

”بیٹھ جا رہے چپک۔“ بھٹل نے ناگواری سے کہا پھر لمبے بھر کے توقف کے بعد بولا ”ان کو کھینچ کے رکھنا ہے۔“

”نکا استاد!“ سلامی سینہ ٹھونک کے بولا ”جو حرام کہتا مستی کرے گا، اپنی منی خراب کرے گا۔ تم آرام سے جاؤ۔ آگے تم دیکھنا۔ چاروں خانے ٹھیک رہے گا۔“

سلامی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ رک گیا۔ انگریزی لباس میں تیس بیس سالہ شخص ہاتھ میں بڑا سا چرمی بیگ لیے انتظار گاہ میں داخل ہوا اور ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے ہمارے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی رسالہ دبا ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کے وہ رسالے کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ سلامی نے مفتی خیر نظروں سے بھٹل کو دیکھا اور تھکے لمبے میں بولا ”کیا بولتے ہو استاد!“

بھٹل نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔

”اپنے کو نوٹکی والا جان پڑے ہے۔“

بھٹل نے ہنکاری بھری۔

”پھر تو استاد تیری تیر تھ تیرا اچھی گرامر م رہے گی۔“

سلامی جیلے پن سے بولا ”بھٹل کی خاموشی پر وہ بخیدہ ہو گیا اور اس کا منہ بن گیا۔“ حرام کے اور سرکاری مال میں ٹھوڑا ہی انتر ہے۔ سالے اوپر والوں کو گھما رہے ہیں اور خوب مال پانی بنا رہے ہیں۔ اوپر والوں کو گھیرا بھی لوٹی لگتی ہے۔ تم جارہے ہو پر ابھی سارا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ سو رکھانے آگے بھی بہت اندھا پن کریں گے۔“

”پر ادھر ہی چوکی پر تو جی تو رہا جانا بیٹھا ہے۔“

”بیٹھا چاہے جو تے مارلو، تمہارا حق ہے۔ اپنے کو پتا ہے، کوئی مانی کالال ہی چوکی پر بیٹھتا ہے۔ تمہارے اس غلام نے بھی اپنی ماں ہی کا دودھ پیا ہے۔ وہ تو تم اور تھے۔ اپنے لیے دیکھتے اور کرنے کو کیا رہ جاتا تھا۔ آگے جو ہوگا، دیکھ لیں گے استاد۔ تم سے بھی سارا جان لیا ہے اور اپنے سب حرام زادوں کو بھی بول دیا ہے۔ تم بے فکر ہو کے جاؤ اور بیٹھ زیادہ انہیں میں ہوا تو اپنا استاد جامو کتا دور ہے۔ شام کو نارٹے گا۔ سویرے ادھر آجاوے گا۔ اب اپنے پتھوڑا بھروسہ کرنا۔ جامو اور جمرو استاد نے کچھ سمجھ ہی گئے چوکی پر راجا گیری کرنے کا مان دیا ہے۔“ سلامی کے عجز میں کھڑکھی نمایاں

تھا۔ بھٹل نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ سلامی اس کے سپر دبانے لگا۔ اول درجے کی انتظار گاہ میں ایسا کچھ نہیں ہوتا ہوگا۔ پہلے سے موجود میاں بیوی ہم سے دور بیٹھے تھے۔ سلامی کی آواز شاید ان تک نہ پہنچ رہی ہو لیکن کمرے میں خوب روشنی تھی اور بیٹائی کے وہ دونوں کمزور بھی نہیں معلوم ہوتے تھے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ سلامی کی نظریں بار بار رسالے کے مطالعے میں مصروف مسافر پر جاتی تھیں۔ وہ شخص بے نیاز بیٹھا تھا۔ سلامی کو جیسے کسی نے کانٹا چھو رہا ہو، ایک ایک اور وہ جھنجھتی آواز میں بولا ”ایک بات بے نہیں پڑتی استاد۔ جس رات تھاکوں کے پاں ہوئی تھیلی گئی، ہم لوگ دلن بیگم کے کوٹھے پہ بھرے کی محفل میں تھے۔ ایک دو نہیں، کچھ گانے کے پورے نہ ہوں پر آنکھ کے پورے، میں گواہ تھے اور پھر ان سرے تیس ماروں نے خود بھی اچھی طرح چھان چھک کر لی ہوگی۔ یہ بات تو سامنے کی ہے کہ اس رات ہم ادھر شرمیں تھے۔ پھر کیا رہ جاتا ہے کون سے قانون سے۔“

”چپ رہ۔“ بھٹل نے اسے دھکار دیا۔ ”قانون کے آگے ڈوری کھینچنے والا بھی اتنا ہی پالی ہوتا ہے۔ ان کا بولنا ہے، ڈوری ان کے ہاتھ میں تھیں۔“

”ہا!“ سلامی نے کسی قدر بیانی انداز میں کہا ”ایسا کیسے۔ اپنا کیا واسطہ۔“ وہ بھٹل کے لگا اور گالی بکتے ہوئے بولا۔ ”سارے بالکل ہی پیدل ہو گئے ہیں۔“

”نقشانہ ٹپ نہیں رہا رہے۔“ بھٹل کی آواز بھری تھی۔

”تیر کمان تو چاروں اور گھمانا پڑے گا۔“

”اور بیچ میں جو دس بیس حرام موت کام آجاویں گے۔“

”آجائے دے۔ سرکار کو معاف ہوتا ہے، پھر سرکار کا بے کی ہوگی۔“ بھٹل نے سرد مہری سے کہا۔

”اتنا بھی اندر نہیں ہوتا۔“ سلامی کی آواز بھجھ سی گئی اور وہ کسی حد تک بچوں کی طرح چل کے بولا ”ایک بات بولوں استاد! ایسے وقت تم ادھر ہی نہ ہوتے تو یہ سو رکی اولاد اپنے کو تو ٹنگی کا نچا دیتے۔ کو تو ایل میں اس رات جب اپنے بیٹروں کی بے وجہ دھنائی کی جارہی تھی تو سب بولا گئے تھے۔ ایک دم پڑی سے اتر گئے تھے ایمان سے۔ دو چار کو تو اس رات ضرور ٹھکانے لگا دیتے۔ بعد کو کیا ہوتا، بعد کو دیکھا جاتا۔ ان پر تو خون سوار تھا۔ وہ تو بس تمہارا دھیان تھا استاد!“

میری توجہ کسی اور طرف تھی۔ میری سمجھ میں دیر سے آیا کہ ان کا مقصد ایک دوسرے کو قائل کرنا نہیں، انہیں اپنے بازو میں بیٹھے ہوئے شخص پر شبہ ہے اور وہ اسے اپنی تکرار سے کچھ یاد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سوال دو جواب، حیرانی، غصہ، نفرت اور بیزاری کا اظہار عداوت ہے۔ سلامی نے ٹھکانا کہ بستی میں خون خرابے کی رات بھرے کی محفل میں ہماری موجودگی کا ذکر بہت چوٹک کے بھٹل سے کیا تھا۔ جیسے پہلی بار یہ نکتہ اس کے دماغ میں روشن ہوا ہو۔ ابھی ابھی یہ دلیل اسے سوجھی ہو۔ یہ دلیل ہماری سب سے بڑی سپر تھی۔ دلیل کیا شہادت۔ اس سے ہماری برات کے پہلو اٹھتے تھے۔ سلامی کی حیرانی کے جواب میں بھٹل کی وضاحت اور وضاحت کی سادگی بھی دلنست تھی۔ سلامی کا شبہ پتہ ایسا خیالی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ رسالے کے مطالعے میں مصروف شخص ہم سے اتنے قریب بیٹھے رہے کہ باوجود کیسا بے گانہ بنا ہوا تھا۔ وہ اندھا نہیں تھا، ہر بھی یقیناً نہیں ہوگا۔ بھٹل اور سلامی کے درمیان ہونے والی اس قسم کی گفتگو سن کے کسی تشویش اور اضطراب کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں ہونے چاہیے تھے۔ اس کے برعکس مستند دور بیٹھے میاں بیوی خاصے بے چین نظر آ رہے تھے۔ اگر واقعی وہ آدمی پولیس کا فرستادہ ہے تو سلامی کا یہ اندیشہ بھی درست ہوتا چاہیے کہ آگے سفر میں بھی ہمارے قریب غائب۔ جاری رہے گا۔ پولیس افسر رمانے بھی صبح دلی میں آئے ہیں۔ کچھ کہا تھا کہ پولیس نے ہمیں شبہ سے بری نہیں کیا ہے۔ ادھر بھٹل اور سلامی کو بھی اڈے میں کچھ کئی بیڑیوں کی موجودگی کا تلخ احساس ہونا چاہیے۔ ہم نے سر پیرا اڈے جا کے اپنی روانگی کے متعلق بتایا تھا۔ اڈے ہی کے کسی آدمی سے اس نے ٹکٹ منگوائے ہوں گے۔ پولیس کیسے خبر ہوگی۔ یہ الگ بات ہے، بھٹل ہی نے اڈے کے لوگوں کو اپنی خبری پر مامور کیا ہو کہ پولیس کو ہمارے تعاقب سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا بلکہ ہمارے لیے تو یہ کچھ بہتر ہی تھا۔ ہمارے سفر کی مصروفیت جان کے ان کی شدت میں کمی ہو سکتی تھی۔ یہ تعاقب ان کے لیے اعصاب شکن بھی تھا اس کا احساس چند بیسیوں کے بعد ہی انہیں ہونا چاہیے۔

انتظار گاہ کے ٹھکانے سے جھٹک کے ہمیں بتایا کہ گاڑی کی آمد کا اعلان ہو چکا ہے۔ چند لمحوں میں جائے آنے والا خادم بھی آئے۔ بھٹل نے اسے بخشش کے ساتھ چائے کے پیسے ادا کئے۔ ٹھکانے کو بھی اس نے بند مٹی سے چھ رقم دی۔ ہم سارا جسم لہرایا۔ ہم اٹھا چاہتے تھے کہ سلامی

ہاتھوں میں تھما دیئے انہوں نے سر سے، آنکھوں سے لگایا اور جیبوں میں واپس رکھ لیے۔
 ”چاقو سے پہلے انگلیوں پہ دھار رکھ۔“ بٹھل کا لہجہ تلخ تھا۔
 تین تین بھی تھا تیسری بھی۔ یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ دونوں میاں بیوی نے کرسیاں چھوڑ دی تھیں۔ ان کے لیے یہ منظر ایک تجربہ ہو گا۔ اس اثنا میں ان کا قلی بھی اٹھ گیا تھا لیکن ہمیں اٹھنا دیکھ کے وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔ پڑوس کا مسافر رسالہ تہ کر کے بیگ اٹھائے بے نیازانہ پہلے ہی دروازے سے نکل چکا تھا۔ ہمارا قلی بھی اپنا کانپا اندر آ گیا تھا۔ دیو اور پنا نے اسے سامان اٹھانے نہیں دیا۔ قلی خالی ساتھ ساتھ چلا رہا۔ ڈب تک اس نے ہماری رہنمائی کی۔ گاڑی آنے پر افراتفری سی ہو گئی تھی۔ مگر جلد ہی پلیٹ فارم پر گونجتے شور اور بھاگ دوڑ میں ٹھہراؤ آ گیا۔ جب تک گاڑی نے حرکت نہیں کی، سلائی، دیو اور پنا ہمارے ساتھ ہی بیٹھے رہے اور چلتی گاڑی سے کود کے رخصت ہوئے۔ ان کا بس چلتا تو ہمارے پاس ہی بیٹھے رہتے۔ منٹوں میں گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ فیض آباد شہر کی روشتیاں کچھ دور ساتھ چلتی رہیں پھر گاڑی اندھروں میں آ گئی۔

نے بٹھل کے پیر پکڑ لیے۔ ”استاد! بس ایک منٹ۔۔۔ اپنے یہ دیو اور پنا۔“ بٹھل کی آنکھوں میں تندی دیکھ کے سلائی کی آواز حلق میں پھنس گئی۔
 ”کیا ہے رے؟“ بٹھل نے جھڑکتی آواز میں پوچھا۔
 سلائی کے اشارے پر دیو اور پنا نے نہایت محنت سے اپنی جیبوں سے کھینکے وار چاقو نکال کے بٹھل کے قدموں میں ڈال دیئے۔ چاقو نے معلوم ہوتے تھے۔ یہ ایک قدیم رسم تھی۔ نئے چاقو پر کسی مستند استاد کا ہاتھ پھروانا اچھی علامت سمجھا جاتا تھا مگر اس مظاہرے کا اس وقت کوئی عمل نہیں تھا۔ مجھے ناگوار محسوس ہوا۔ بٹھل کا چہرہ بھی مکدر ہوا لیکن اس نے نکل سے دونوں چاقو اٹھالے۔ ان کے دستے نقشین تھے۔ پورے چھ انچ لمبائی ہوگی۔ بٹھل نے باری باری انہیں کھولا۔ کھنکے دبتے ہی تیزی سے پھکا باہر آ جاتا تھا۔ روشنی میں پالش کئے ہوئے پھلکے چھچھارے تھے۔ بٹھل نے انگلی پھیر کے دھار کا اندازہ کیا ”اتھیں ہیں رے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”پھر قبول کرو استاد۔“ سلائی جھٹ سے بولا۔
 ”نارے۔“ بٹھل نے چاقو بند کر کے دیو اور پنا کے



اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات
 ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں